زندگی نقاب چہرے

غلام عباس

زندگی، نقاب، چہرے

افسانوں کا مجموعہ

زندگی، نقاب، چہرے

غلام عباس

دانیال

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر : حوری نورانی
مکتبۂ دانیال، وکٹوریہ چیمبرز ۲
عبداللہ ہارون روڈ۔ کراچی
طابع : ذکی سنز پرنٹرز۔ کراچی
سرورق : کریم راٹھور
اِشاعت : ششم ۲۰۰۰ء
تزئین : اظہر عباس جعفری
کمپوزنگ : راشد شہزاد۔۔ میڈیا سروسز
قیمت : ۳۰۰ روپے

ترتیب

۱	جواری	۷
۲	ہمسائے	۲۰
۳	کتبہ	۳۴
۴	حمام میں	۴۵
۵	ناک کاٹنے والے	۹۱
۶	چکر	۱۰۶
۷	اندھیرے میں	۱۱۵
۸	سمجھوتہ	۱۲۹
۹	سیاہ و سفید	۱۴۱
۱۰	آنندی	۱۵۵
۱۱	اوور کوٹ	۱۷۳
۱۲	اس کی بیوی	۱۸۴
۱۳	بھنور	۱۹۸
۱۴	باجے والا	۲۱۲
۱۵	سایہ	۲۲۲
۱۶	سرخ جلوس	۲۳۹

۱۷	فینسی ہیر کٹنگ سیلون	۲۵۰
۱۸	بردہ فروش	۲۶۵
۱۹	تنکے کا سہارا	۲۸۵
۲۰	تِتلی بائی	۲۹۷
۲۱	مگر جی بابو کی ڈائری	۳۰۸
۲۲	ایک درد مند دِل	۳۱۶
۲۳	دو تماشے	۳۲۸
۲۴	غازی مرد	۳۳۲
۲۵	کن رس	۳۴۰
۲۶	بہروپیا	۳۷۲
۲۷	جوار بھاٹا	۳۸۳
۲۸	یہ پری چہرہ لوگ	۳۹۱
۲۹	بحران	۳۹۸
۳۰	سرخ گلاب	۴۰۸
۳۱	فرار	۴۲۷
۳۲	ہندروالا	۴۴۰
۳۳	زوجی	۴۴۵

جواری

پولیس نے ایسی ہوشیاری سے چھاپہ مارا تھا کہ ان میں سے ایک بھی بچ کر نہیں نکل سکا تھا اور پھر جاتا بھی تو کہاں، بیٹھک کا ایک ہی زینہ تھا جس پر پولیس کے سپاہیوں نے پہلے ہی قبضہ جما لیا تھا۔ رہی کھڑکی، اگر کوئی منچلا جان کی پروانہ کر کے اس میں سے کود بھی پڑتا تو اوّل تو اس کے گھٹنے ہی سلامت نہ رہتے اور بالفرض زیادہ چوٹ نہ آتی تو بھی اسے بھاگنے کا موقع نہ ملتا کیونکہ پولیس کے نصف درجن سپاہی نیچے بازار میں بیٹھک کو گھیرے ہوئے تھے اور یوں وہ سب کے سب جواری، جن کی تعداد دس تھی پکڑ لئے گئے تھے۔

اتفاق سے اس دن جو جواری اس بیٹھک میں آئے تھے ان میں دو ایک پیشہ وروں کو چھوڑ کر باقی سب کبھی کبھار کے شوقیہ کھیلنے والے تھے اور یوں بھی عزت دار اور آسودہ حال تھے۔ ایک ٹھیکہ دار تھا، ایک سرکاری دفتر کا عہدہ دار۔ ایک مہاجن کا بیٹا تھا۔ ایک لاری ڈرائیور تھا اور ایک شخص چمڑے کا کاروبار کرتا تھا۔

ان میں دو شخص ایسے بھی تھے جو بے گناہ پکڑ لیے گئے تھے۔ ان میں ایک تو من سکھ پنواڑی تھا۔ ہر چند وہ کبھی کبھی کھیل بھی لیا کرتا تھا مگر اس شام وہ قطعاً اس مقصد سے وہاں نہیں گیا۔ وہ دکان پر ایک دوست کو بٹھا کر دس کے نوٹ کی ریزگاری لینے آیا تھا۔ ریزگاری لے چکا تو چلتے چلتے ایک کھلاڑی کے پتوں پر نظر پڑ گئی، پتے غیر معمولی طور پر اچھے تھے۔ یہ

دیکھنے کو کہ وہ کھلاڑی کیا چال چلتا ہے یہ ذرا کی ذرا رُکا تھا کہ اتنے میں پولیس آگئی۔ بس پھر کہاں جاسکتا تھا!

دوسرا شخص ایک عمر رسیدہ وثیقہ نویس تھا جو ٹھیکہ دار کو ڈھونڈتا ڈھونڈتا اس بیٹھک میں پہنچ گیا تھا۔ ٹھیکہ دار سے اس کی پرانی صاحب سلامت تھی اور وہ چاہتا تھا کہ ٹھیکہ دار اس کے بیٹے کو بھی چھوٹا موٹا ٹھیکہ کا کام دلادیا کرے۔ یہ وثیقہ نویس کئی دن سے ٹھیکہ دار کی تلاش میں سرگرداں تھا اور آخر ملا بھی تو کہاں، جہاں نہ تو ٹھیکہ دار کو کھیل سے فرصت اور نہ اسے اتنے آدمیوں کے سامنے مطلب کی بات کہنے کا یارا۔ ٹھیکہ دار کھیل میں منہمک تھا اور وثیقہ نویس اس سوچ میں کہ وہ کون سی ترکیب ہو سکتی ہے جس سے یہ کھیل گھڑی بھر کے لیے ختم جائے اور دوسرے سب لوگ اُٹھ کر باہر چلے جائیں مگر اس قسم کی کوئی صورت اسے نظر نہ آتی تھی۔ ادھر ٹھیکہ دار تھا کہ گھنٹوں سے برابر کھیلے جارہا تھا۔ آخر وثیقہ نویس مایوس ہوکر چلنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اتنے ہی میں پولیس آگئی اور جواریوں کے ساتھ اسے بھی دھر لیا گیا۔

ان دونوں نے اپنی بے گناہی کے بہتیرے ثبوت پیش کیے مگر پولیس نے ایک نہ سنی۔ باقی کے لوگ پولیس کے اس اچانک دھاوے سے ایسے دم بخود رہ گئے تھے کہ کسی کے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔ سپاہیوں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ پہلے سب کو بیٹھک سے نیچے اتارا، پھر ان کے گرد گھیرا ڈال انہیں پیدل تھانے لے چلے۔

یہ بھی غنیمت ہوا کہ جھٹپٹا وقت تھا۔ دُھندلکے میں زیادہ لوگوں کی نظر نہ پڑی اور یہ لوگ کوٹ کے کالر یا پگڑی کے شملے میں منہ چھپائے، تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے جلد ہی تھانے پہنچ گئے جہاں تھانے دار کے حکم سے ان سب کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

حوالات کی یکسوئی میں جب ان لوگوں کو تماشائیوں کی استہزا بھری نظروں اور سپاہیوں کے کڑے تیوروں اور کرخت لہجوں سے امان ملی اور جان پہچان کے لوگوں سے

مڈبھیر کا خوف بھی نہ رہا تو قدرتی طور پر سب سے پہلے ان کا دھیان بیٹھک کے مالک کی طرف گیا جو اُن سب کے ساتھ ہی حوالات میں بند تھا۔ ہر شخص اس کو اپنی بربادی کا باعث سمجھتا تھا۔ چنانچہ سب کو اس پر سخت غصہ آرہا تھا۔ اگر یہ شخص احتیاط سے کام لیتا مکان کو سرائے نہ بنالیتا کہ ہرایراغیرا منہ اٹھائے چلا آرہا ہے، بیٹھک کے باہر کسی مخبر کا انتظام کرتا، نیز پولیس والوں سے اپنے تعلقات خوشگوار رکھتا توان لوگوں پر یہ برا وقت کبھی نہ آتا۔

بیٹھک کے مالک کا نام تو خدا جانے کیا تھا مگر سب لوگ اسے نکو نکو کہا کرتے تھے یہ شخص درمیانے قد اور چھریرے بدن کا تھا۔ شربتی آنکھیں جن میں سُرمے کے ڈورے۔ سفید رنگت، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، چہرے پر چیچک کے مٹے مٹے سے داغ، دانت پانوں کے کثرتِ استعمال سے سیاہی مائل سُرخ ہوگئے تھے۔ گھنگھریالے بال جو ہر وقت آنولے کے تیل میں بسے رہتے۔ بائیں طرف سے مانگ نکلی ہوئی۔ دائیں طرف کے بال ایک لہر کی صورت میں پیشانی پر پڑے ہوئے، ململ کا کرتا جس میں سونے کے بٹن لگے ہوئے۔ گلے میں چھوٹا سا سونے کا تعویذ، سیاہ ڈورے میں بندھا ہوا۔ اس کا کرتا ہمیشہ اُجلا ہوتا مگر دھوتی عموماً میلی۔ سردیوں میں اس لباس پر ایک پرانا سُرخ دوشالہ زری کے حاشیے والا اوڑھ لیا کرتا۔ اس کی حرکات میں بلا کی پھرتی تھی۔ جتنی دیر میں کوئی مشاق سے مشاق جواری ایک دفعہ تاش پھینٹے اور بانٹے یہ اتنی دیر میں کم سے کم دو دفعہ تاش پھینٹتا اور بانٹ لیتا تھا۔

نکو پہلے ہی اس حملے کے لیے تیار تھا۔ پولیس کے چھاپہ مارنے سے لے کر اس وقت تک تو اس نے چپ سادھے رکھی تھی اور اس سارے قضیے میں اس کا رویہ ایک بیگانے کا سا رہا تھا مگر اب جب کہ سب طرف سے اس پر تیز تیز نظروں کے حملے شروع ہوئے تو اس نے ایک جُھرجھری لی اور اپنی مدافعت میں ایک لطیف مسکراہٹ، جس میں خفیف سی شوخی ملی ہوئی تھی، اپنے ہونٹوں پر طاری کی۔ یہ مسکراہٹ چند لمحے قائم رہی پھر اس نے نہایت اطمینان کے ساتھ سب پر ایک نظر ڈالی اور بڑی خود اعتمادی کے لہجہ میں کہا:

"آپ لوگ بالکل بھی فکر نہ کریں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ میں سے کسی کا بھی بال بیکا نہ ہوگا۔ میرے ہاں پچھلے پانچ برس میں آج تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ اسے تو، کیا کہنا چاہیے، مذاق سمجھو مذاق۔"

جواریوں نے نکو کی اس بات کو سُنا پر اس سے ان کے غصے میں ذرا بھی کمی نہ ہوئی بعض نے گردن ہلائی، بعض نے بازو جھٹک دیئے۔

"ہوں۔ مذاق سمجھیں۔ یہ اچھی رہی!" ٹھیکہ دار نے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ" چمڑے کے سوداگر نے ذرا چمک کر کہا۔ "عجیب آدمی ہو یار، یہاں لاکھ کی عزت خاک میں مل رہی ہے اور تم اسے مذاق بتا رہے ہو!"

"ناراض کیوں ہوتے ہو شیخ جی، میں نے جو کہا، آپ کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔" مونچھوں پر تاؤ دیتے نکلو گے مونچھوں پر تاؤ دیتے!"

"چل ہٹ لپاڑیا کہیں کا۔" ٹھیکہ دار نے کہا۔

"لپاڑیا کون۔ میں؟" نکو نے تنک کر کہا۔ "خیر جو جی میں آئے کہہ لو مگر میں پھر کہتا ہوں کہ تم میں سے کسی پر آنچ تک نہ آئے گی۔"

وہ جواری جو کسی سرکاری دفتر میں اکاؤنٹنٹ تھا اسے جوئے سے سخت نفرت تھی مگر جب کبھی اس کی بیوی، بچوں کو لے کر میکے جاتی تو اسے بیٹھک ہی کی سُوجھتی۔ دفتر سے اُٹھ کر سیدھا وہیں کا رُخ کیا کرتا۔ ہر بار ہارتا اور اپنے کو کوستا، عہد کرتا پھر کبھی نہ آؤں گا، مگر اگلے روز سب سے پہلے پہنچتا۔ اس شخص نے نکو کی یہ بات اَن سنی کر کے فریاد کے لہجے میں کہنا شروع کیا:

"ارے بھائی میں لُٹ گیا، میں سرکاری آدمی، میری عزت دو کوڑی کی ہوگئی ہائے میری بیوی بچے، نکو نے مجھے برباد کر دیا، ہائے ...."

"سنو تو سہی ملک صاحب....."

"ارے کیا خاک سنوں، ہائے وہ کون سا منحوس دن تھا جب میں نے تیری صورت دیکھی، ارے یارو میں سرکاری ملازم۔ اگر میرے دفتر والوں کے کان میں بھنک بھی پڑ جائے تو بدنامی...... ارے بدنامی کو تو گولی مارو، یہاں پندرہ برس کی ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑیں، ہائے میرے بیوی بچے ......"

مہاجن کا بیٹا جس نے دولت کمانے کا یہ سہل اور دلچسپ طریقہ نیا نیا سیکھا تھا اب تک تو بڑے ضبط سے کام لے رہا تھا مگر ملک کا یہ واویلا سن کر یکبارگی دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ سب لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"صبر کرو چھوٹے شاہ جی صبر کرو۔" تلو نے کہا۔ "تم تو یار عورتوں کی طرح رونے لگے۔ مرد بنو۔ ارے بھائی یہ تو بات ہی کچھ نہیں ہے۔"

"میرے پتا جی کو پتہ چل گیا۔" مہاجن کے بیٹے نے سسکیاں لے لے کے کہا۔ "تو وہ ایک دم مجھے گھر سے نکال دیں گے۔"

"ارے یار چھوڑ بھی، کوئی گھر سے نہ نکالے گا۔" تلو نے کہا:

"تلو" ملک نے کہا۔ "یہ سب تیرا کیا دھرا ہے۔"

"ملک صاحب۔" تلو نے پُر زور لہجہ میں کہا۔ "آپ بالکل بھی پریشان نہ ہوں۔ آپ میری بات مانیں، میں جو کہہ رہا ہوں کہ آپ پر ذرا آنچ نہ آئے گی۔ یوں نکال لاؤں گا جیسے مکھن میں سے بال نکالتے ہیں۔"

"بس رہنے دے بھائی۔" ملک نے ملامت آمیز لہجہ میں کہا۔ "اگر یہی دَم خم تھا تو پولیس کو آنے ہی کیوں دیا ہوتا!"

"ملک صاحب آپ میری بات مانیں۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں آپ کا بال بھی بیکا نہ ہو گا۔ بات اصل میں یوں ہے کہ تھانے دار اپنا ہی آدمی ہے۔ سمجھے آپ، وہ میرا بڑا مہربان ہے۔ وہ آپ کو کچھ نہیں کہے گا۔ میرے منہ پر تھوک دینا اگر کچھ کہا۔"

نلو کی یہ بات سن کر سب جواری پل بھر کو خاموش کچھ سوچتے رہے۔ بعض تو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق اس کی بات کا یقین کر لینا چاہتے تھے اور بعض کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ کچھ فیصلہ نہیں کر سکے کہ انہیں نلو پر بھروسہ کرنا چاہیے یا نہیں۔ البتہ یہ ظاہر تھا کہ رفتہ رفتہ ان کا غصہ اترتا جا رہا تھا۔

"دیکھو نلو۔" چمڑے والے شیخ جی نے کہا۔ "میں سو پچاس کی پروا نہیں کرتا، مگر میری عزت بچ جائے۔ ویسے بات تو کچھ بھی نہیں ہے اور یوں میرا بہنوئی خود سب انسپکٹر پولیس ہے، مگر توبہ توبہ یہ کسی سے کہنے والی بات ہے!"

"شیخ جی آپ ذرا بھی چنتا نہ کریں۔ میں جو کہہ رہا ہوں۔ اسے آپ مذاق ہی سمجھیں۔ کبھی کبھی دل لگی کر لیا کرتا ہے میرا یار۔"

"کون؟" من سکھ پٹواڑی کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ وہ اتنے بڑے بڑے آدمیوں کو اس مصیبت میں اپنا ساجھی دیکھ کر اپنا دُکھڑا بھول گیا تھا۔

"اجی یہی آپ کے تھانے دار صاحب بہادر۔" یہ کہہ کر نلو ہنس پڑا۔

وہ جواری جو لاری چلاتا تھا کونے میں کھڑا کچھ دیر نلو کو بہت غور سے دیکھتا رہا، پھر اس کے قریب آیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہنے لگا:

"دیکھو نلو! مجھے صبح سویرے لاری میں خشک میوہ بھر کے دور لے جانا ہے ٹھیکہ دار میرا انتظار کر رہا ہو گا۔ اگر تیری واقعی یہاں کسی سے واقفیت ہے تو کوئی ایسی ترکیب کر کہ میں صبح سے پہلے پہلے یہاں سے خلاصی پا جاؤں۔"

یوں تو دھیرے دھیرے سبھی لوگ آخر کار نلو کی باتوں پر کان دھرنے لگے تھے مگر اس لاری ڈرائیور نے جس لہجہ میں نلو سے خطاب کیا اس نے قطعی طور پر نلو کے ساتھیوں میں اس کا اقتدار قائم کر دیا۔ نلو نے بھی اسے محسوس کیا اور اپنی اس کامیابی پر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں، البتہ لاری ڈرائیور نے جماعت سے علیحدہ ہو کر تنہا اپنی ذات کے لیے جو

سفارش کی تھی اس کو سب نے ناپسند کیا اور اسے لاری ڈرائیور کی خود غرضی اور کمینگی پر محمول کیا گیا۔

نکو نے، جس کے لہجہ میں اب اور بھی خود اعتمادی پیدا ہو چکی تھی، لاری ڈرائیور سے بڑے سرپرستانہ انداز میں کہا:

"مرزا جی! میری جان گھبراؤ نہیں۔ اس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔"

"انتظام و نتظام خاک نہیں ہو گا۔" اچانک وثیقہ نویس نے جھلا کر کہا۔ "مرزا تم بھی اس ڈینگئے کی باتوں میں آگئے جو سر پر پڑی ہے اسے خود ہی بھگتو۔"

نکو نے وثیقہ نویس کے اس غیر متوقع حملے کو بڑی چابک دستی سے روکا، وہ کھکھلا کر ہنس پڑا۔

"لو بڑے میاں کی بات سنو۔" اس نے کہا۔ "ہوں، انتظام نہیں ہو گا اور یہاں مال جو کھلایا جاتا ہے ہر مہینے۔ بھائیو میں پھر کہتا ہوں کہ اسے مذاق ہی سمجھو۔ میں ہندو مسلمان والی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ کسی کا بال بھی بیکا نہ ہو گا۔ وہ یوں کہ تھانیدار... اب کیا بتاؤں تمہیں۔" وہ ہنس پڑا "کہہ جو دیا اپنا ہی آدمی ہے...... اب تم کہلوا کے ہی رہو گے پر ذکر وِکر نہ کر بیٹھنا کسی سے ورنہ پھنس جاؤ گے، میرا دوش نہیں ہو گا۔ وہ بات یوں ہے کہ تھانے دار... اب تم سے کیا چھپانا بھئی میری اس کی رشتہ داری ہے۔ سن لیا؟ کیوں بڑے میاں اب تو ہو گئی تسلی۔ اتنا نہیں سمجھتے کہ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو پچھلے پانچ برس سے اتنے بڑے شہر میں یہ دَھندا بھلا کیسے چلتا رہتا۔"

نکو نے اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اقتدار کی عمارت پہلے سے کہیں زیادہ مستحکم ہو چکی تھی۔

ان جواریوں میں ایک شخص تھا جس کے بشرے سے کوئی صدمہ یا رنج ظاہر نہیں ہوتا تھا وہ اس سارے واقعہ کے دوران میں بالکل خاموش رہا تھا۔ وہ اٹھائیس برس کا ایک دُبلا پتلا

نوجوان تھا، لباس اور وضع قطع کی طرف سے خاصا بے پروا معلوم ہوتا تھا۔ مدت ہوئی اس شخص نے ناتجربہ کاری کی وجہ سے ایک خاصی معقول رقم ہار دی تھی بس اسی دن سے یہ عہد کر رکھا تھا کہ جس روز ہاری ہوئی رقم کو واپس جیت لوں گا جوئے کا پھر کبھی نام نہ لوں گا۔ اس بیٹھک میں آنے سے گھنٹہ دو گھنٹے پہلے کسی باغ میں بیٹھ کر کھیل کا ایک پروگرام سا بنالیا کرتا۔ چالیس تک سوچ رکھتا۔ بے حد احتیاط سے کھیلتا۔ نہ تاؤ کھاتا نہ جوش، مگر بدقسمتی سے ہاری ہوئی رقم روز بروز بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا قرض بھی۔

اس شخص کو رُسوائی یا قید اور جرمانے کا تو ذرا غم نہ تھا، البتہ اس بات کی فکر ضرور تھی کہ یہ سب کے سب ڈرپوک ہیں۔ بچ گئے جب بھی اور پھنس گئے جب بھی اس بیٹھک کا رُخ نہ کریں گے۔

ادھر نکو نے اب حالات پر قابو پالیا تھا۔ اگرچہ وہ رات رات میں کسی مخلصی کا انتظام بھی نہیں کر سکا تھا تاہم اس نے کسی نہ کسی طرح ہر شخص کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ تھانے دار اگر اس کا قریب کا نہیں تو دور کا قرابت دار ضرور ہے اور صبح ہوتے ہی انہیں رہا کر دیا جائے گا چنانچہ سب لوگ زمین پر وہ پھٹے پرانے بدبودار کمبل بچھا کر جو سپاہیوں نے لا دیئے تھے نچنت سے ہو کر پڑ رہے۔

”اوہو۔ غضب ہو گیا!“ اچانک نکو نے کہا اور لیٹے لیٹے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

”کیوں، کیوں، خیر تو ہے؟“ اندھیرے میں جواریوں نے پوچھا۔

”بھئی اگر پتا ہوتا کہ یہاں رات کاٹنی پڑے گی تو تاش ساتھ لیتے آتے اور مزے سے ساری رات کھیلتے... کہو تو ابھی کسی سپاہی کو بھیج کر تاش اور موم بتی منگالوں؟“

”نہ نہ بابا معاف کرو۔“ کئی آوازیں ایک ساتھ سنائی دیں۔

”تم جانو۔“ نکو نے بے پروائی سے کہا گویا ایسا نہ کرنے میں انہیں کا نقصان ہے۔ ”ورنہ اچھی خاصی دل لگی رہتی۔ صبح کو تھانے دار کو سناتے تو وہ بھی خوب ہنستا۔ “

اگلے روز صبح نو بجے کے قریب ایک سپاہی حوالات کے سلاخ دار دروازے کے باہر آ کر کھڑا ہوا اور بلند آواز سے پکار کر کہنے لگا:

''او جواریو اٹھو۔ تمہاری داروغہ صاحب کے سامنے پیشی ہے۔''

جواری دیر سے اس حکم کے منتظر تھے۔ سب کی نظریں بے اختیار نکو کی طرف اٹھ گئیں۔ نکو نظریں ترچھی کر کے ایک خاص ادا سے مسکرا دیا۔

پانچ منٹ کے بعد یہ دسوں آدمی تھانے کے چھوٹے سے میدان میں قطار باندھے کھڑے تھے۔ پانچ منٹ، دس منٹ، آدھا گھنٹہ گزر گیا مگر تھانے دار کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس دوران نکو برابر اپنے لطیفوں، پھبتیوں اور ہنسی مذاق کی باتوں سے اپنے ساتھیوں کا جی بہلاتا رہا، مگر جب ایک گھنٹہ گزر گیا اور تھانیدار نظر نہ آیا تب تو سب جواری بہت گھبرائے، ہنسی ان کے ہونٹوں سے غائب ہو گئی، سب کے چہرے اُتر گئے اور ایک بدگمانی کی لہر ان میں پھیل چلی۔ وہ بار بار فکرمندی کے ساتھ نکو کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھتے اور نکو جواب میں ہر ایک کو ہاتھ سے صبر کا اشارہ کر دیتا۔ اس عرصے میں دو تین سپاہی ان جواریوں کے پاس سے گزرے اور نکو نے ہر ایک کو ''خانصاحب جی''، ''خان صاحب جی'' کہہ کر اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا، مگر نہ تو انہوں نے نکو کی بات کا کوئی جواب دیا اور نہ پلٹ کر ہی اس کی طرف دیکھا۔

آخر جب انہیں کھڑے کھڑے پورے دو گھنٹے گزر گئے اور ان کی ٹانگیں تھک کر چُور ہو گئیں تو ایک سیاہ لاری تھانے کے اندر داخل ہوئی۔ اس میں سے تھانے دار اور کئی سپاہی نکلے۔ تھانے دار کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے اور سپاہیوں کے کندھوں پر بندوقیں۔ انہیں خالی ہاتھ لوٹتے دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ جس مہم پر وہ صبح ہی صبح گئے تھے اس میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی اور یہ مہم ضرور کچھ بڑی ہی اہم مہم ہو گی، جبھی تو تھانیدار پریشان سا نظر آ رہا تھا۔

نکو دور ہی سے تھانے دار کو دیکھ کر اچھل پڑا۔

"وہ آ گیا میرا موتیوں والا۔" اس نے کہا۔ "بس اب گھبراؤ نہیں۔ دو تین ہی منٹ میں بیڑا پار ہو چاہتا ہے۔"

یہ کہہ کر نکو نے دور ہی سے تھانے دار کو ایک فرشی سلام کیا۔ تھانے دار کی یا تو اس پر نظر نہیں پڑی یا پھر اس نے دانستہ نظریں پھیر لیں اور وہ سپاہیوں کی بیرکوں میں چلا گیا۔

"نکو۔" وثیقہ نویس نے طعن آمیز لہجہ میں کہا۔ "میں جانوں تھانے دار کی تم پر نظر نہیں پڑی ورنہ تمہارے سلام کا جواب ضرور دیتا۔"

"اجی توبہ کرو۔" نکو نے کہا۔ "تھانے دار میرے سلام کا جواب کبھی نہیں دے گا۔ بھائی وہ اس وقت رعب میں ہے، رعب میں، کیا سمجھے! تھانیداری ہے کچھ مذاق تھوڑا ہی ہے۔ ہم سے سیدھے منہ بات کرے تو سپاہیوں پر رُعب کیسے جمارہے۔ کل کو یہی سپاہی اس کے ناک چنے نہ چبوادیں اور سپاہی تم جانو مداری کے بندر کی طرح ہوتے ہیں کہ جب تک لاٹھی نظر آتی رہے ڈگڈگی پر ناچتے رہتے ہیں، جہاں مداری نے ذرا ڈھیل دی بس لگے اینٹھنے، سر پر سوار ہونے......"

پانچ منٹ کے بعد تھانے دار چند سپاہیوں کے ساتھ باتیں کرتا ہوا بارکوں میں سے نکلا اور ان جواریوں کے پاس سے گذرتا ہوا تھانے کے پھاٹک پر جا کھڑا ہوا اور وہاں کھڑے کھڑے بدستور سپاہیوں سے باتیں کرتا رہا۔

اتنے میں تھانیدار کے دفتر میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ذرا سی دیر میں ایک سپاہی دوڑتا ہوا تھانے دار کے پاس پہنچا۔ جب تھانے دار تنہا واپس آرہا تھا تو نکو نے ایک بار پھر اسے سلام کیا۔ تھانے دار نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دفتر میں چلا گیا۔

"کہا تھا نا۔" نکو نے فتح مندانہ لہجہ میں کہا۔ "میرے سلام کا جواب نہیں دے گا۔ کیوں دیا جواب؟"

سب جواری خاموش رہے۔

"ایک دن۔" نکو نے پھر کہنا شروع کیا۔ "تھانے میں بس وہ اور میں ہی تھے کوئی سپاہی آس پاس نہیں تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ اتنی گدگدیاں کیں کہ ہنسا ہنسا کے بر اُحال کر دیا۔"

تھانے دار کوئی آدھ گھنٹے تک دفتر کے اندر ہی رہا۔ یہ لوگ پھر بے صبر ہو چلے تھے کہ اتنے میں وہی سپاہی جس نے صبح آ کر پیشی کی اطلاع دی تھی دفتر سے نکلا اور سیدھا ان کے پاس آ کر اپنے اکھڑ لہجے میں کہنے لگا:

"او جواریو! سنو۔ داروغہ صاحب نے حکم دیا ہے کہ تم سب کے سب دھوتی پاجامہ کھول کے زمین پر ایک قطار میں اوندھے لیٹ جاؤ۔ پھر تم میں سے سرے والا آدمی ایک ایک کر کے اُٹھے اور ہر ایک کے دس دس جوتے لگا کے خود دوسرے سرے پر اوندھا لیٹ جائے۔ غرض اسی طرح سب کے سب باری باری ہر ایک کے دس دس جوتے لگائیں۔"

تھانے دار کا یہ حکم اتنا غیر متوقع تھا کہ سب جواری ہکابکا رہ گئے اور سراسیمہ ہو کر سپاہی کا منہ تکنے لگے۔

"الوؤں کی طرح میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ اگر حکم سمجھ میں نہ آیا ہو تو پھر سنا دوں؟"

یہ کہہ کر جواب کا انتظار کیے بغیر سپاہی نے وہی الفاظ پھر دہرا دیے۔

اس پر وثیقہ نویس اور من سکھ پنواڑی بے اختیار آگے لپک کر سپاہی کے قدموں سے لپٹ گئے۔

"خان صاحب ہم بالکل بے قصور ہیں۔" انھوں نے یک زبان ہو گڑگڑا کر کہا۔ "یہ سب لوگ گواہی دیں گے کہ ہم بالکل بے گناہ ہیں۔ جس وقت پولیس آئی ہم نہ تو کھیل رہے تھے اور نہ اس ارادے سے وہاں گئے تھے ہم بے گناہ ہیں۔ خدا جانتا ہے کہ ہم بالکل بے قصور ہیں۔"

"میں گواہی وواہی کچھ نہیں جانتا۔" سپاہی نے کہا۔ "داروغہ صاحب نے سب کے لیے یہی حکم دیا ہے۔ ہاں اور سنو! انھوں نے کہا ہے کہ اگر یہ لوگ راضی نہ ہوں تو ان سب

کو پھر حوالات میں بند کر دیا جائے۔ دیکھو، دیر نہ کرو۔ مجھے داروغہ صاحب کے ساتھ ابھی ابھی باہر جانا ہے۔ لاری تیار کھڑی ہے۔ تم نے دیر کی تو میں پھر سب کو حوالات میں بند کر دوں گا۔"

وثیقہ نویس اور من سکھ دونوں مایوس ہو کے پھر قطار میں آ کھڑے ہوئے۔ ان کا یہ انجام دیکھ کے کسی جواری کو لب ہلانے کی جرأت نہ ہوئی اور وہ سخت پریشان ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کیا جائے۔ ان کی نظریں بار بار نکو پر پڑتی تھیں، مگر وہ ان کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں تھانے کے دفتر کی دیواروں پر گڑی ہوئی تھیں جو گویا دیواروں کو چھیدتی ہوئی تھانیدار کو ڈھونڈ نکالنا چاہتی تھیں۔

"دیکھو دیکھو۔" سپاہی نے کہا۔ "تم لوگ دیر کر رہے ہو مجھے مجبوراً تم سب کو حوالات ہی میں بند کر دینا پڑے گا۔"

اس پر بھی جواری ابھی لیت و لعل ہی کر رہے تھے کہ اچانک کسی کے دھڑام سے زمین پر گرنے کی آواز آئی۔

یہ نکو تھا جو دھوتی کھولے زمین پر اوندھا پڑا تھا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر من سکھ کی ہمت بندھی اور اس نے بھی نکو کی پیروی کر ہی دی۔ اکاؤنٹنٹ ملک اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ سپاہی نے پیچھے سے آ، گدی سے پکڑ زبردستی نیچے بٹھا دیا اور اس نے ناچار اپنے نیکر کے بٹن کھول دیئے۔

سپاہی کے اس سلوک کو دیکھ کر دوسرے جواری آپ ہی آپ زمین پر لیٹ گئے صرف چھڑے والے شیخ جی کھڑے رہ گئے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور صورت سے انتہا درجہ کی مظلومی برس رہی تھی۔ ان کا ہاتھ بار بار کمربند پر پڑتا تھا مگر وہیں رہ جاتا تھا۔

ایسے معزز اور شریف صورت آدمی کو ایسی پریشانی میں دیکھ کر سپاہی کا دل پسیج گیا اور

وہ جان بوجھ کر وہاں سے ٹل گیا۔ شیخ جی نے دل کڑا کیا، پگڑی کے شملے سے آنسو پونچھے، گردن پھرا کر اپنے اردگرد نظر ڈالی اور پھر انتہائی مجبوری کے ساتھ بالآخر انھوں نے بھی تھانیدار کے حکم کی تعمیل کر دی۔

سرے پر لاری ڈرائیور تھا۔ سب سے پہلے جوتے لگانے کی اسی کی باری تھی جس وقت وہ اٹھا تو نکو زور سے کھنکھارا۔ ''مرزا جی سنبھل کے۔'' اس نے کہا۔ ''سب اپنے ہی آدمی ہیں ہاں۔ دیکھنے میں زور کا ہاتھ پڑے مگر .. سمجھ گئے نا .....''

لاری ڈرائیور نے ابھی پانچ تک ہی گنتی کی تھی کہ وہی سپاہی تھانے کے دفتر سے نکلا اور اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ ''داروغہ صاحب کہتے ہیں۔'' اس نے پاس آ کر کہا۔ ''اگر تم لوگوں نے ٹھیک طرح سے جوتے نہ لگائے تو میں اپنے سپاہیوں سے جوتے لگواؤں گا۔'' یہ کہہ کر وہ پھر چلا گیا۔

جواریوں نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ خود ہی آپس میں زور زور کے جوتے لگوا لیں چنانچہ کوئی بیس منٹ کے بعد، جب ہر ایک نے ہر ایک کے دس دس جوتے لگائے تو وہ اس کام سے نمٹ، کپڑے جھاڑ، اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اتنے میں وہی سپاہی پھر آیا اور کہنے لگا۔ ''جاؤ اب کے داروغہ صاحب نے تمہارا قصور معاف کر دیا ہے، پھر کبھی جوا نہ کھیلنا۔''

یہ لوگ تھانے میں سے یوں نکلے جیسے اپنے کسی بڑے ہی عزیز قریبی رشتہ دار کو دفن کر کے قبرستان سے نکلے ہوں۔ تھانے سے نکل کر کوئی سو گز تک تو وہ چپ چاپ گردنیں ڈالے چلا کیے۔ اس کے بعد نکو نے یکبارگی زور کا قہقہہ لگایا۔ اتنے زور کا کہ وہ ہنستے ہنستے دوہرا ہو گیا۔ ''کیوں دیکھا!'' اس نے کہا ''نہ چالان، نہ مقدمہ، نہ قید، نہ جرمانہ میں نہ کہتا تھا اسے مذاق ہی سمجھو!''

۱۹۴۷ء

ہمسائے

اس پہاڑی پر وہ فقط دو ہی گھر تھے۔ مکان تو اصل میں ایک تھا مگر بعد میں اس کے مالک نے اس کے بیچوں بیچ لکڑی کی ایک پتلی سی دیوار کھڑی کر کے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا اور اب اس میں الگ الگ دو خاندان رہتے تھے۔ پہاڑوں پر مکان ویسے ہی چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ اس پر دو حصوں میں بٹ جانے سے اس کی مکانیت محض نام کو رہ گئی تھی، چنانچہ اس کے رہنے والوں کو اگر یہ تسلی نہ ہوتی کہ وہ گرمی کا زمانہ پہاڑ پر بسر کر رہے ہیں تو بہت ہی آزردہ رہا کرتے۔

لکڑی کا بنا ہوا مخروطی وضع کا یہ مکان جس پر سرخ روغن کیا گیا تھا پہاڑی کی ایک ڈھال پر واقع تھا۔ اس تک پہنچنے کے لیے لکڑی کا ایک لمبا زینہ چڑھنا پڑتا تھا۔ مکان کے سامنے تھوڑی سی زمین تھی جس کو ہموار کر کے پھلواری بنانے کی کوشش کی گئی تھی مگر وہ پھلواری بے توجہی کا شکار ہو کر رہ گئی تھی اور اب اس میں ڈیلیا کا ایک آدھ پودا ہی رہ گیا جو بڑی ڈھٹائی سے اس کی یاد کو قائم رکھنے پر مُصر تھا۔

اس پھلواری کے سرے پر لکڑی کا ایک بنچ رکھا تھا۔ اس پر بیٹھیے تو نیچے وادی کا حسین مگر اُداس اُداس منظر دکھائی دیتا۔ جتنی دیر سورج غائب رہتا ہلکی ہلکی نیلی دُھند مکڑی کے جالے کی طرح اس منظر پر چھائی رہتی اور ایسا نظر آتا جیسے پانی میں عکس دیکھ رہے ہوں جب

سورج نکلتا تو دُھندلا یکا ایکی سنہری ہو کر اس مرقّع کو اور بھی حسین بنا دیتی مگر چند ہی لمحوں بعد آنکھوں میں چکا چوند ہونے لگتی ہیں اور دیکھنے والا جلد ہی اپنی نظریں پھیر لیتا۔

اگست کی ایک صبح کو ابھی آفتاب نے مشرقی سلسلۂ کوہ کی دو پہاڑیوں کے بیچ میں سے سر نکالا ہی تھا کہ ایک چھوٹا سا لڑکا ایک گھر میں سے نکلا۔ اس کی عمر مشکل سے آٹھ نو برس کی ہو گی۔ اس نے سرخ اُون کا ٹِپل اور درادر نیکر پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں بادامی رنگ کا فُل بوٹ تھا جس کے کنارے مینہ سے بھیگ بھیگ کے سیاہ پڑ گئے تھے۔ لکڑی کے برآمدے سے اُترتے ہی لڑکے کی نظر بے اختیار ساتھ والے گھر کی طرف اٹھ گئی مگر اس کا دروازہ ابھی بند تھا۔ لڑکے کی نظریں اس کی طرف سے اس طرح مایوس پلٹیں گویا وہ کوئی مٹھائی یا کھلونوں کی دکان ہو جسے دکاندار اپنی سُستی کی وجہ سے وقت پر نہ کھولتا ہو۔ اس کے بعد اس کی نظر سامنے ڈیلیا کے پودے پر پڑی جس میں ایک بڑا سا پھول صبح کی سنہری دھوپ میں بڑی تمکنت سے جھم جھما رہا تھا۔ اس پھول نے لڑکے کے دل کو لبھا لیا اور وہ لپک کر اس کی طرف گیا۔ وہ کئی لمحوں تک حیرت سے اس کی طرف تکتا رہا۔ اوس کی ننھی ننھی بوندیں اس کی پنکھڑیوں پر لرز رہی تھیں اور ان میں پھول کا عنابی رنگ جھلکتا ہوا بہت بھلا لگتا تھا۔ لڑکے نے ایک بار پھر ساتھ والے گھر پر نظر ڈالی اور پھر بڑی احتیاط سے پھول کو توڑ لیا۔

وہ خوشی خوشی پھول کو ہاتھ میں تھامے ساتھ والے گھر کے برآمدے میں پہنچا اور کمرے کے دروازے کو آہستہ آہستہ دھکا دیا۔ مگر وہ اندر سے بند تھا۔ اس دروازے کے اوپر کے حصے میں شیشے جڑے ہوئے تھے جن میں سے اندر کا اُودے رنگ کا ملگجا سا پردہ نظر آرہا تھا وہ کچھ دیر دروازے کے پاس ہی کھڑا رہا جیسے سوچ رہا ہو دروازہ کھٹکھٹائے یا نہیں کہ اتنے میں لکڑی کے فرش پر بھاری بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی اور ساتھ ہی چٹخنی کے کھلنے کی آواز آئی۔ لڑکا سہم کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور اس کا وہ ہاتھ جس میں ڈیلیا کا پھول تھا آپ سے آپ پیٹھ کے پیچھے چلا گیا۔

ایک بھاری بھرکم آدمی شب خوابی کا لباس پہنے، کمبل کی بکل مارے ایک ہاتھ سے مسواک کرتا، دوسرے میں تھیلا تھامے، باہر نکلا۔ پہلے تو اس نے لڑکے کی طرف توجہ نہ دی مگر برآمدے سے نیچے قدم رکھتے ہی وہ مڑا۔

"کیا بات ہے اکبر میاں؟" اس نے لڑکے سے پوچھا۔

"جی کچھ نہیں۔" لڑکے کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک اچانک مدھم پڑ گئی تھی۔

"بیری سے کھیلنے آئے ہو؟"

"جی......" اور وہ مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔

"بیری تو سو رہی ہے ابھی۔"

لڑکے نے نظریں جھکا لیں مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔

"تمہارے ہاتھ میں کیا ہے اکبر میاں؟" اس شخص نے پوچھا۔

"جی پھول ہے۔" اور اس نے ڈرتے ڈرتے پھول سامنے کر دیا۔ اس کا چھوٹا سا ہاتھ شبنم سے ابھی تک گیلا ہو رہا تھا۔

"بیری کے لیے؟"

"جی ... ..."

"بیری تو سو رہی ہے اور پھر ابھی سویرا بھی تو ہے۔"

لڑکے نے اس کا بھی کچھ جواب نہ دیا۔

"آج اتوار ہے نا؟ تم اور بیری دن بھر خوب کھیلنا۔"

یہ اس شخص نے چلتے چلتے کہا، پھر وہ مسواک کرتا ہوا کاٹھ کے زینے سے اُتر گیا اور اس پگڈنڈی پر ہو لیا جو بل کھاتی ہوئی نیچے پہاڑی کے دامن تک چلی گئی ہے۔ جب تک پگڈنڈی کے پیچ و خم اس شخص کو کبھی چھپاتے کبھی دکھاتے رہے۔ اکبر برابر برآمدے میں کھڑا

اسے دیکھتا رہا۔ آخر جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اکبر نے ایک اور مایوسانہ نظر ساتھ والے کمرے پر ڈالی اور پھر برآمدے سے اتر کر وہ ڈیلیا کے پودے کے پاس چلا آیا جس میں اب کوئی دل کشی نہیں رہی تھی۔ وہ شاخ جس سے اس نے پھول توڑا تھا ننگی ننگی سی نظر آ رہی تھی، جیسے کہہ رہی ہو "اب مجھ میں اور کوئی پھول نہیں آئے گا۔"

اکبر پودے کے پاس سے ہٹ آیا اور بینچ پر بیٹھ گیا۔ سورج اب لمبے لمبے پیازی بادلوں کو پیچھے چھوڑ کر پہاڑیوں کے جھرمٹ سے نکل آیا تھا اور اس نے نڈر ہو کر اپنا سفر طے کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ دُھند جو نچلی وادی پر چھائی ہوئی تھی دھیرے دھیرے دھوپ میں تحلیل ہو رہی تھی اور نیچے کا منظر لمحہ بہ لمحہ نکھرتا آ رہا تھا۔ آس پاس کے مکانوں کی کھڑکیوں میں انسانی چہرے نمودار ہونے شروع ہو گئے تھے۔ طرح طرح کی اضطراری حرکتیں ان سے ظاہر ہو رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ دماغ نے جس پر ابھی نیند کا اثر تھا جسم کی حرکات پر قابو رکھنا شروع نہیں کیا۔

نیچے دور سے اکبر کے اسکول کی گرجا نما عمارت نظر آ رہی تھی جس پر بادنما مور بنا ہوا تھا ایک مکان کی انگنائی میں، جو نشیب میں واقع تھا، ایک گرہستن چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے کپڑے نچوڑ نچوڑ کر الگنی پر ڈال رہی تھی۔ قریب ہی دیودار کی ایک شاخ پر ایک خوش رنگ چڑیا اپنی لمبی چونچ سے اپنی دُم کے بال سونت رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ اُداسی سے چہک بھی اٹھتی تھی۔

اکبر اس نظارے میں ایسا محو ہوا کہ اسے خبر بھی نہ ہوئی اور اس نے ڈیلیا کے پھول کی ایک پتی نوچ لی۔ جب اسے اپنی اس حرکت کا علم ہوا تو اس نے ایک ایک کر کے ساری پتیاں نوچ ڈالیں اور ڈنٹھل کو ہوا میں اچھال دیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ڈنٹھل کو نیچے دور تک کھڈ میں گرتے دیکھتا رہے گا۔ مگر وہ تھوڑی ہی دور پر ایک جھاڑی میں اٹک کر رہ گیا۔

ایکا ایکی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ سورج کی ساری دوڑ دھوپ کو بادلوں کے ایک جھرمٹ

نے چھپالیا اور پھر ایک ہی دم بوندیاں آنے لگیں۔

گرہستن نے منہ اٹھا کر کے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر جلد ہی سارے کپڑے الگنی پر سے اتار لیے۔ جس گھر سے اکبر نکلا تھا اسی میں سے ایک اور لڑکا دوڑتا ہوا برآمدے میں آیا۔ اس کا لباس بھی قریب قریب ویسا ہی تھا جیسا اکبر کا تھا مگر اس کی عمر پانچ برس سے زیادہ نہ تھی۔

''بھائی جان۔'' اس نے چلّا کر کہا۔ ''امّی بلا رہی ہیں۔''

اکبر نے کچھ جواب نہ دیا۔

''بھائی جان۔ امّی کہتی ہیں ناشتہ کرلو۔''

اکبر نے اب بھی کچھ جواب نہ دیا۔ وہ بدستور گھر کی طرف پیٹھ کیے بنچ پر بیٹھا رہا۔

لڑکا اندر چلا گیا مگر پل بھر کے بعد وہ پھر آیا۔

''بھائی جان امّی خفا ہو رہی ہیں'' اس نے کہا۔

''سن لیا، سن لیا'' بالآخر اکبر نے گردن پھیری۔ ''آتا ہوں، آتا ہوں''

چھوٹا لڑکا پھر اندر چلا گیا۔ ایک لمحہ بھی نہ گزرا تھا کہ ایک عورت جس کی جوانی ڈھل چکی تھی بڑے بڑے پھولوں والی بنفشی رنگ کی ساری کو کولہے پر سے سنبھالتی ہوئی برآمدے میں نمودار ہوئی۔

''اکبر بیٹے! اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ اندر کیوں نہیں آتے میرے لعل، ناشتہ کیوں نہیں کرتے، بوندیاں آرہی ہیں اور تم مینہ میں بیٹھے بھیگ رہے ہو۔ واہ بھی واہ اور کہیں زکام ہو گیا تو۔ ابھی تو بیماری سے اٹھے ہو۔ جلدی سے آجاؤ پیارے۔''

''میں آہی رہا تھا امّی جان''۔ اکبر نے بنچ سے اٹھتے ہوئے کہا، پھر وہ مینہ سے بچنے کی ذرا بھی کوشش نہ کرتا، سہج سہج قدم اٹھاتا ہوا برآمدے میں آیا، اپنے گھر میں داخل ہونے سے پہلے اس نے ایک بار پھر ساتھ والے گھر کے دروازے پر نظر ڈالی۔

مینہ کوئی پاؤ گھنٹہ تک برسا۔اس کے بعد ایک دم مطلع صاف ہو گیا اور سورج نے پہلے سے بھی زیادہ بلند ہو کر اپنا سفر شروع کر دیا۔

دونوں لڑکے پھر اسی طرح سے نکلے۔اکبر ڈیلیا کے پودے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور چھوٹا لڑکا ساتھ والے گھر کے برآمدے میں پہنچا اور اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے بے دھڑک دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

''بیری!''اس نے چلّا کر کہا:

''بیری!!''اس نے جواب کا انتظار کیے بغیر اور بھی زور سے چلّا کر کہا۔''تمہیں بھائی جان بُلا رہے ہیں سچ مچ کا ہوائی جہاز ہے ان کے پاس آؤ دیکھو۔''

''کیا ہے منیر میاں؟''اندر سے ایک ننھی سی آواز آئی۔

''دروازہ کھولو۔''منیر نے کہا۔

''چٹخنی لگ رہی ہے، میرا ہاتھ نہیں جاتا، امّی غسل خانے میں ہیں۔''

''رات ماموں ہمارے لیے بڑا اچھا ہوائی جہاز لائے۔''منیر نے کہا۔

''کہاں ہے وہ ہوائی جہاز؟''

''بھائی جان کے پاس۔''

''اچھا میں آتی ہوں۔''

پانچ منٹ کے بعد دروازہ کھلا اور ایک ننھی سی لڑکی جس کی عمر کوئی سات برس کی ہو گی، برآمدے میں آئی۔اس نے ہلکے سبز رنگ کا پھولدار ریشمی کرتا اور کلی دار پاجامہ پہن رکھا تھا۔فراک کے اوپر فیروزی اون کا کوٹ نما سویٹر تھا۔دونوں شانوں پر ایک ایک چٹیا تھی جس کے سرے پر سفید ربن بندھا ہوا تھا سینے پر آسمانی رنگ کے ہوائی ریشم کا ننھا سا دوپٹہ لہرا رہا تھا پاؤں میں چھوٹے چھوٹے سبز سوئیڈ کے سینڈل تھے۔

ان دونوں بھائیوں کو بنچ پر بیٹھے دیکھ کر وہ ایک جھونکے کی طرح ان کے پاس پہنچی جیسے

ہی منیر کی نظر اس کے چہرے پر پڑی، وہ ٹھٹھا مار کے ہنسنے لگا۔

"اوہو ہو بیری!" اس نے کہا۔ "کتنا پوڈر مَل رکھا ہے تم نے۔ تمہاری پلکیں کیسی سفید ہو رہی ہیں پوڈر سے۔"

"کب؟" لڑکی کی ساری چونچالی کافور ہو گئی۔

"چپ رہو منیر۔" اکبر نے چھوٹے بھائی کو ڈانٹ بتائی۔

"ذرا شیشے میں جا کر منہ تو دیکھو۔" منیر نے کہا۔

بیری نے انگلی سے اپنے گال کو چُھوا۔ تھوڑا سا پوڈر اس کی انگلی کے سرے پر لگ گیا۔

"دیکھا۔"

"بس جی بس۔" بیری نے اچانک بگڑ کر منیر کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا۔ "ہم نہیں بولتے تم سے۔"

"منیر تم چپکے نہیں رہے تو میں پیٹ دوں گا تمہیں۔" اکبر نے منیر پر آنکھیں نکالیں۔

"اکبر میاں۔" بیری نے منیر کو بالکل نظر انداز کر کے، گویا وہ وہاں موجود ہی نہ تھا، اکبر کی طرف متوجہ ہوئی۔ "کہاں ہے وہ ہوائی جہاز جو تمہارے ماموں رات لائے ہیں؟"

"ابھی دکھاتا ہوں۔"

"ہے کہاں وہ؟"

"گھر میں رکھا ہے۔"

"تو لاؤ ابھی۔"

"ابھی لاتا ہوں۔"

"نہیں ابھی لاؤ۔"

"گھر میں رکھا ہے چل کے دیکھ لو نہ اندر۔"

"نا بھئی ہم نہیں جانے کے تمہارے گھر۔" بیری نے آنکھیں پھرا کر کہا۔ "اس دن

تمہاری امّی خفا ہوئی تھیں ہم پر۔"

"واہ۔ تم پر تھوڑا ہی خفا ہوئی تھیں۔ وہ تو مجھ سے کہہ رہی تھیں۔"

"تو تم یہیں لے آؤ نا ہوائی جہاز!"

"اچھی بات۔ تم یہیں ٹھہرو، جانا نہیں۔ ابھی لاتا ہوں۔" اور وہ گھر کی طرف دوڑا۔ منیر ٹکٹکی باندھے بیری کے چہرے کو تک رہا تھا، مگر بیری نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھا۔ وہ نیچے وادی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ عین اس وقت وہ شخص جو صبح کمبل اوڑھے تھیلا لے کے گیا تھا کاٹھ کے زینے پر چڑھتا دکھائی دیا اور بیری مارے خوشی کے۔ "ابا جان" "ابا جان چلّاتی ہوئی اس کی طرف دوڑی۔

جس وقت اکبر ہوائی جہاز لے کر گھر سے باہر آیا تو بیری ابا کے تھیلے کو جو پھل اور سبزی وغیرہ سے لبالب بھرا ہوا تھا ایک طرف سے پکڑے ان کے ساتھ ساتھ اپنے گھر میں داخل ہو رہی تھی۔

پانچ منٹ گزر گئے۔ اکبر اور منیر بنچ کے پاس کھڑے بیری کی راہ دیکھا کیے۔ مگر وہ باہر نہ آئی۔

اکبر نے منیر کو ہوائی جہاز دے کر کہا۔ "یہ ہوائی جہاز لے جا کر بیری کو دکھا دو۔"

"آپ نہیں چلتے؟"

"نہیں میں یہیں ٹھہرتا ہوں۔ کہنا بھائی جان تمہیں بلا رہے ہیں، شاباش۔"

لکڑی کا یہ ہوائی جہاز جس پر ہلکا ہلکا آسمانی رنگ کیا گیا تھا، خاصا بڑا تھا۔ منیر اسے بڑی مشکل سے سنبھالتا ہوا بیری کے دروازے پر پہنچا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا مگر اسے اندر جانے کی جرأت نہ ہوئی۔

"بیری۔" اس نے باہر ہی سے چلّا کر کہا۔ "لو دیکھ لو یہ رہا ہوائی جہاز!"

"بیری آم چوستی ہوئی دروازے کے پاس آئی۔

”چیخ کیوں رہے ہو تم .... اچھا تو یہ ہے ہوائی جہاز جو کل تمہارے ماموں لائے ہیں؟ افوہ کتنا بڑا ہے!“

”بھائی جان سامنے کھڑے ہیں۔ تمہیں بُلا رہے ہیں۔“

بیری اور اکبر کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اکبر اسے دیکھ کر بنچ سے اٹھ کھڑا ہوا اور مسکرانے لگا۔

”منیر میاں“ بیری نے کہا۔ اپنے بھائی جان سے کہو میں ٹھہر کے آؤں گی۔ ہم آم چُوس رہے ہیں اس وقت۔“

منیر ہوائی جہاز لے کر اکبر کے پاس پہنچا۔ دونوں بنچ پر بیٹھ گئے اور وادی کی سیر دیکھنے لگے۔ دس منٹ گزر گئے مگر بیری نہ آئی۔

آسمان پر رفتہ رفتہ بادل پھر چھا گئے تھے۔ اب کے بادل بہت گھنے اور قریب تھے چنانچہ ہر طرف بھاپ ہی بھاپ پھیل گئی جس نے ہر چیز کو اوجھل کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک دَم زور کا جھما کا پڑنے لگا۔ اکبر اور منیر کو ہوائی جہاز اُٹھا کر گھر میں گھستے ہی بنی۔

یہ بارش کوئی گھنٹہ سوا گھنٹہ رہی اور اس کے بعد پھر دھوپ نکل آئی۔

”بیری۔“ اکبر ایک ہاتھ میں بڑی سی گیند لئے جس پر انگریز بچّوں کی رنگین تصویریں بنی ہوئی تھیں اور دوسرے میں ایک بڑی سی کتاب تھامے بیری کے دروازے پر کھڑا تھا۔

”بیری“ اس نے دوبارہ آہستہ سے کہا۔

”کیا ہے اکبر میاں؟“ بیری نے اس کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔

”تم تو آئیں ہی نہیں!“

”کب؟“

”اُس وقت۔“

”واہ مینہ جو پڑ رہا تھا موسلا دھار۔ کہاں ہے ہوائی جہاز؟“

''وہ تو میں نے رکھ دیا ہے۔ لو یہ دیکھو تصویروں کی کتاب!''

''اسی لڑکی کی کہانی ہو گی جو چڑیا نہیں کراتی تھی؟''

''ہاں''

''واہ یہ تو ہم دیکھ چکے ہیں۔'' اس نے تنک کر کہا۔

''اچھا تو آؤ گیند سے کھیلیں۔''

''ہم گیند سے نہیں کھیلتے بھئی۔ امّی کہتی ہیں، پھلسن ہو رہی ہے، باہر نہ جانا، پاؤں رپٹ گیا تو کھڈ میں گر کر ہڈی پسلی چور چور ہو جائے گی۔

''اچھا تو ہم تمھارے برآمدے ہی میں کھیلیں گے۔''

''بھئی شام کو کھیلیں گے۔ اس وقت تو ہم ابا اور امّی کے ساتھ کپڑا خرید نے جا رہے ہیں۔''

اور سچ مچ تھوڑی ہی دیر میں بیری ابا کی انگلی پکڑے، جنھوں نے اس وقت ڈھیلا ڈھالا انگریزی سوٹ اور ہیٹ پہن رکھا تھا، کاٹھ کے زینے سے اترتی دکھائی دے رہی تھی۔ پیچھے پیچھے اسکی امّی مصری وضع کا سیاہ ریشمی برقعہ پہنے پان چباتی ہوئی آ رہی تھی۔ اکبر بنچ پر بیٹھا ان لوگوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ اس کی نظر بار بار بیری پر پڑتی تھی جس نے اب کلی دار پاجامہ اور دوپٹہ اتار کر فراک پہن لیا تھا۔ دور سے اس کی گوری گوری بھری بھری پنڈلیاں بہت بھلی لگتی تھیں۔ اس کے کان کے پاس بھورے بالوں کی ایک لٹ ہوا سے اُڑ اُڑ کے بار بار اس کے منہ پر آ پڑتی تھی جسے وہ اپنے ننّھے سے ہاتھ سے ہٹا ہٹا دیتی تھی۔

اکبر بنچ پر بیٹھا دیر تک اس چھوٹے سے سست گام قافلے کو پگڈنڈی کی بھول بھلیاں میں غائب ہوتے اور ابھرتے دیکھا کیا۔ آخر جب وہ پہاڑ کے سب سے نچلے موڑ پر آخری جھلک دکھا کر اوجھل ہو گیا تو اس نے اپنی نظریں اس طرف سے ہٹا لیں۔

بارش کبھی کی تھم چکی تھی مگر ہوا کا کوئی تیز جھونکا چلتا تو دیودار کے درختوں سے

بوندیاں جھڑنے لگتیں۔ دور کہیں نالا تھا جس کا پانی بارش کی وجہ سے زور شور سے بہنے لگا تھا۔ اس کی شائیں شائیں کی آواز یہاں سے ایسی صاف سنائی دے رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا نالا کہیں آس پاس ہی ہے۔

ایک درخت پر ایک بڑا سا نیل کنٹھ اپنی کھوکھلی آواز سے چیخا، پر تولے، ہوا میں ایک زقند بھری اور پھر دوسرے درخت پر آبیٹھا۔ بظاہر اس نقل مکانی کی کوئی وجہ نظر نہ آتی تھی۔

دور افق کے پاس وہ پہاڑیاں جو عموماً بادلوں کے غبار میں کھوئی کھوئی رہتی تھیں اچانک مطلع صاف ہو جانے سے اب واضح طور پر نظر آ رہی تھیں۔ وہ دور تک ایک کے پیچھے ایک اس طرح دکھائی دے رہی تھیں جیسے شرمیلی لڑکیاں بڑی عمر کی لڑکیوں کی اوٹ لے کر جھانک رہی ہوں۔ بعض پہاڑیاں ہری بھری تھیں اور بعض لُنڈ مُنڈ، مگر وہ آپس میں ایسی خلط ملط ہو رہی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کوئی لحاف کو بے ترتیبی سے ہٹا کر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا ہے اور لحاف کی کہیں تو اوپر کی سبز مخمل دکھائی دے رہی ہے اور کہیں اندر کا خاکستری اَستر۔

اکبر اس نظارے کو بڑی محویت سے دیکھ رہا تھا کہ اسے معلوم بھی نہ ہوا کہ اس کے تین ہم جماعت اس کی بچ کو گھیرے ہنس رہے ہیں۔

"اوہو! تم لوگ ہو۔" وہ چونک اٹھا۔ "تم کب آئے؟"

"اکبر۔" ان میں سے ایک نے کہا۔ "یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو، چلو ہمارے ساتھ، فٹ بال کھیلنے!"

"تم جاؤ، مجھے کام ہے بھئی۔" اکبر نے کہا۔

"واہ یہ خوب کہی۔" دوسرے لڑکے نے کہا۔ "نہیں تمہیں چلنا ہوگا۔ دیکھو ہم نے آج ہی تو یہ نیا فٹ بال خریدا ہے۔"

"نہیں میں آج نہیں جاؤں گا۔"

"آخر کیوں؟"

"مجھے کام جو کرنا ہے بھئی۔"

"کیسا کام؟"

"کیسا کام... واہ اسکول کا کام جو دیا تھا ماسٹر صاحب نے!"

"تم تو سچ مچ نہیں چلو گے؟"

"نہیں آج نہیں کل" اور وہ بنچ سے اٹھ کھڑا ہوا اور گھر کی طرف چل دیا۔

"رہنے دو بھئی۔" ایک لڑکے نے کہا "نہیں چلتا تو نہ چلے۔" اور وہ بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔

شام کے چھ بج چکے تھے جب بیری اپنے ابا اور امّی کے ساتھ واپس آئی۔ اس نے ایک بقچہ اٹھا رکھا تھا۔

ابا جیب سے چابی نکال کر کمرے کا دروازہ کھولنے لگے امّی برقعہ اتار کر برآمدے کی ایک کرسی پر بیٹھ گئیں۔ وہ بہت تھکی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

ذرا سی دیر میں بیری گھر میں بقچہ چھوڑ کر باہر بنچ کے پاس آ گئی جہاں اکبر بیٹھا ہوا تھا۔

"بیری تم آ گئیں!" اور وہ جلدی سے بنچ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "کپڑا خرید لیا؟"

"ہاں میرا بڑا خوبصورت ریشمی سوٹ بنے گا۔ اس پر بڑے بڑے گلاب کے پھول ہیں اور پھر ابا نے ہمیں بنارسی اوڑھنی بھی لے دی اور نئی سینڈل بھی۔ پھر ہم نے سینٹ بھی خریدا لپ اسٹک بھی اور نیل پالش بھی۔" اس کی آنکھیں خوشی سے ناچ رہی تھیں۔

"بیری تم "

"مجھے بیری نہ کہا کرو جی۔" ایک لمحہ ہی میں وہ بگڑ گئی۔

"پھر کیا کہا کروں؟"

"میرا نام ہے امیر النساء بیگم۔" یہ کہتے کہتے اس کے لہجہ میں بڑوں جیسی سنجیدگی پیدا ہو گئی۔

"مگر تمہاری امّی تو تمہیں بیری ہی کہتی ہیں۔"

"اونہہ۔"

"اور تمہارے ابا بھی۔"

"انہیں کہنے دو۔"

"ہم بھی تمہیں بیری ہی کہیں گے۔" . . . "بیری!"

"دیکھو جی میں پھر کہے دیتی ہوں، مجھے بیری نہ کہا کرو۔"

"اگر کہوں تو . . ؟"

"ہم تم سے نہیں بولیں گے جاؤ میں تم سے نہیں بولتی، میں گھر جاتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اکبر کی طرف سے منہ پھیر لیا پَل بھر کو رُکی، پھر گھر کا رُخ کر پھلواری میں دوڑتی ہوئی تتلی کی سی ادا کے ساتھ آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اکبر نے اسے واپس بلانے کی کوشش نہیں کی، وہ چند لمحے دم بخود کھڑا رہا۔ پھر سنبھل کے آ کر اسی بنچ پر بیٹھ گیا۔

ذرا سی دیر میں سورج ڈوب گیا اور آس پاس کی پہاڑیاں قرمزی بادلوں میں کھو گئیں نیچے وادی میں جابجا سفید سفید دھوئیں پھوٹ رہے تھے، درختوں کی چوٹیوں سے، مکانوں کی چھتوں سے، پہاڑوں کی ڈھالوں سے، جس سے وادی کا منظر دُھندلا دُھندلا ہو گیا تھا اکبر کی نظر اپنے اسکول کی عمارت پر پڑی جس کے بادنما مور کو اس وقت ابخرات کے غبار نے نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ بلاشبہ اس کے ہم جماعت ابھی اسکول کی گراؤنڈ میں فٹ بال کھیل رہے ہوں گے اس کو اس بات کا افسوس نہیں تھا کہ وہ ان کے ساتھ نہیں گیا اور نہ اس کی پرواکہ شاید وہ اس سے ناراض ہو گئے ہوں۔ رہا اسکول کا کام تو اس کی بھی اس کو زیادہ فکر نہ تھی۔ شاید کوئی بہانہ کارگر ہو جائے اور وہ اگلے روز ماسٹر کی جھڑکیوں اور تھپڑ سے بچ جائے۔

ہَوا میں اب خاصی خنکی پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے مٹھیاں بھینچ کر بغلوں میں دبالیں اور شانوں کو سکوڑ لیا۔ شاید اسے بیری کو بیری نہیں کہنا چاہیے تھا . وہ سوچ رہا تھا، خوامخواہ کی

لڑائی اس نے مول لی۔ وہ اب خاصی بڑی ہو گئی ہے سبز رنگ کے پھول دار ریشمی کرتے اور کلی دار پاجامے میں وہ کتنی سمجھ دار معلوم ہوتی تھی۔ اکبر کی آنکھیں بھر بھر آ رہی تھیں مگر وہ رونا نہیں چاہتا تھا۔

اب شام ہو چکی تھی، نیچے وادی پر اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے درختوں کے تنوں سے لپٹنا، مکانوں کا احاطہ کرنا اور پہاڑیوں پر لمبے لمبے سائے ڈالنا شروع کیا۔ ذرا سی دیر میں اکبر کا اسکول، گھنٹہ گھر اور دوسری عمارتیں نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے زمین سے آسمان تک ایک سیاہ چادر تن گئی جو انسان، حیوان، شجر، حجر ہر شے کو اپنے میں لپیٹنے لگی اور بالآخر اس نے اکبر کو بھی چھپا لیا، اس کے جسم کو ہی نہیں، اس کی روح کو بھی۔

۱۹۴۷ء

کتبہ

شہر سے کوئی ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پرپُر فضا باغوں اور پھلواریوں میں گھری ہوئی قریب قریب ایک ہی وضع کی بنی ہوئی عمارتوں کا ایک سلسلہ ہے جو دُور تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ ان عمارتوں میں کئی چھوٹے بڑے دفتر ہیں جن میں کم و بیش چار ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ دن کے وقت اس علاقے کی چہل پہل اور گہما گہمی عموماً کمروں کی چار دیواریوں ہی میں محدود رہتی ہے مگر صبح کو ساڑھے دس بجے سے پہلے اور سہ پہر کو ساڑھے چار بجے کے بعد وہ سیدھی اور چوڑی چکلی سڑک جو شہر کے بڑے دروازے سے اس علاقے تک جاتی ہے، ایک ایسے دریا کا روپ دھار لیتی ہے جو پہاڑوں پر سے آیا ہو اور اپنے ساتھ بہت سا خس و خاشاک بہا لایا ہو۔

گرمی کا زمانہ، سہ پہر کا وقت، سڑکوں پر درختوں کے سائے لمبے ہونے شروع ہو گئے تھے مگر ابھی تک زمین کی تپش کا یہ حال تھا کہ جوتوں کے اندر تلوے جُھلسے جاتے تھے۔ ابھی ابھی ایک چھڑکاؤ گاڑی گزری تھی۔ سڑک پر جہاں جہاں پانی پڑا تھا ابخرات اُٹھ رہے تھے۔

شریف حسین کلرک درجہ دوم معمول سے کچھ سویرے دفتر سے نکلا اور اس بڑے پھاٹک کے باہر آ کر کھڑا ہو گیا جہاں سے تانگے والے شہر کی سواریاں لے جایا کرتے تھے۔

گھر کو لوٹتے ہوئے آدھے راستے تک تانگے میں سوار ہو کر جانا ایک ایسا لطف تھا جو اسے مہینے کے شروع کے صرف چار پانچ روز ہی ملا کرتا تھا اور آج کا دن بھی انہی مبارک دنوں میں سے ایک تھا۔ آج خلافِ معمول تنخواہ کے آٹھ روز بعد اس کی جیب میں پانچ روپے کا نوٹ اور کچھ آنے پیسے پڑے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی بیوی مہینے کے شروع ہی میں بچّوں کو لے کر میکے چلی گئی تھی اور گھر میں وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ دن میں دفتر کے حلوائی سے دو چار پوریاں لے کر کھالی تھیں اور اوپر سے پانی پی کر پیٹ بھر لیا تھا۔ رات کو شہر کے کسی سستے سے ہوٹل میں جانے کی ٹھہرائی تھی۔ بس بے فکری ہی بے فکری تھی۔ گھر میں کچھ ایسا اثاثہ تھا نہیں جس کی رکھوالی کرنی پڑتی۔ اس لیے وہ آزاد تھا کہ جب چاہے گھر جائے اور چاہے تو ساری رات سڑکوں ہی پر گھومتا رہے۔

تھوڑی دیر میں دفتروں سے کلرکوں کی ٹولیاں نکلنی شروع ہوئیں ان میں ٹائپسٹ ریکارڈ کیپر، ڈسپیچر، اکاؤنٹنٹ، ہیڈ کلرک، سپرنٹنڈنٹ غرض ادنیٰ و اعلیٰ ہر درجہ اور حیثیت کے کلرک تھے اور اسی لحاظ سے ان کی وضع قطع بھی ایک دوسرے سے جدا تھی۔ مگر بعض ٹائپ خاص طور پر نمایاں تھے۔ سائیکل سوار آدھی آستینوں کی قمیص، خاکی زین کے نیکر اور چپل پہنے، سر پر سولا ہیٹ رکھے، کلائی پر گھڑی باندھے، رنگدار چشمہ لگائے، بڑی بڑی توندوں والے بابو چھاتا کھولے، منہ میں بیڑی، بغلوں میں فائلوں کے گٹھے دبائے ان فائلوں کو وہ قریب قریب ہر روز اس امید میں ساتھ لے جاتے کہ جو گتھیاں وہ دفتر کے غل غپاڑے میں نہیں سُلجھا سکے۔ ممکن ہے گھر کی یکسوئی میں ان کا کوئی حل سُوجھ جائے مگر گھر پہنچتے ہی وہ گرہستی کاموں میں ایسے الجھ جاتے کہ انھیں دیکھنے تک کا موقع نہ ملتا اور اگلے روز انھیں یہ مفت کا بوجھ جوں کا توں واپس لے آنا پڑتا۔

بعض منچلے تانگے، سائیکل اور چھاتے سے بے نیاز، ٹوپی ہاتھ میں، کوٹ کاندھے پر، گریبان کھلا ہوا جسے بٹن ٹوٹ جانے پر انھوں نے سیفٹی پن سے بند کرنے کی کوشش کی

تھی اور جس کے نیچے سے چھاتی کے گھنے بال پسینے میں تربتر نظر آتے تھے۔ نئے رنگروٹ سستے، سلے سلائے ڈھیلے ڈھالے بدقطع سوٹ پہنے اس گرمی کے عالم میں واسکٹ اور نکٹائی کالر تک سے لیس، کوٹ کی بالائی جیب میں دو دو تین تین فونٹین پن اور پنسلیں لگائے خراماں خراماں چلے آرہے تھے۔

گو ان میں سے زیادہ تر کلرکوں کی مادری زبان ایک ہی تھی مگر وہ لہجہ بگاڑ بگاڑ کر غیر زبان میں باتیں کرنے پر تلے ہوئے تھے اس کی وجہ وہ طمانیت نہ تھی جو کسی غیر زبان پر قدرت حاصل ہونے پر اس میں باتیں کرنے پر اکساتی ہے بلکہ یہ کہ انھیں دفتر میں دن بھر اپنے افسروں سے اسی غیر زبان میں بولنا پڑتا تھا اور اس وقت وہ باہم بات چیت کرکے اس کی مشق بہم پہنچا رہے تھے۔

ان کلرکوں میں ہر عمر کے لوگ تھے۔ ایسے کم عمر بھولے بھالے ناتجربہ کار بھی جن کی ابھی مسیں بھی پوری نہیں بھیگی تھیں اور جنھیں ابھی اسکول سے نکلے تین مہینے بھی نہیں ہوئے تھے اور ایسے عمر رسیدہ جہاں دیدہ گھاگھ بھی جن کی ناک پر سالہا سال عینک کے استعمال کے باعث گہرا نشان پڑ گیا تھا اور جنھیں اس سڑک کے اتار چڑھاؤ دیکھتے دیکھتے پچیس پچیس تیس تیس برس ہو چکے تھے۔ بیشتر کارکنوں کی پیٹھ میں گدی سے ذرا نیچے خم سا آگیا تھا اور کند اُستروں سے متواتر ڈاڑھی مونڈتے رہنے کے باعث ان کے گالوں اور ٹھوڑی پر بالوں میں جڑیں پھوٹ نکلی تھیں جنھوں نے بے شمار ننھی پھنسیوں کی شکل اختیار کرلی تھی۔

پیدل چلنے والوں میں بہتیرے لوگ بخوبی جانتے تھے کہ دفتر سے ان کے گھر کو جتنے راستے جاتے ہیں ان کا فاصلہ کے کے ہزار قدم ہے۔ ہر شخص افسروں کے چڑچڑے پن یا ماتحتوں کی نالائقی پر نالاں نظر آتا تھا۔

ایک تانگے کی سواریوں میں ایک کی کمی دیکھ کر شریف حسین لپک کر اس میں سوار ہوگیا تانگہ چلا اور تھوڑی دیر میں شہر کے دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ شریف

حسین نے اکنّی نکال کر کوچوان کو دی اور گھر کے بجائے شہر کی جامع مسجد کی طرف چل پڑا جس کی سیڑھیوں کے گرداگرد ہر روز شام کو کہنہ فروشوں اور سستا مال بیچنے والوں کی دکانیں سجا کرتی تھیں اور میلہ سا لگا کرتا تھا۔ دنیا بھر کی چیزیں اور ہر وضع اور ہر قماش کے لوگ یہاں ملتے تھے۔ اگر مقصد خرید و فروخت نہ ہو تو بھی یہاں اور لوگوں کو چیز خریدتے، مول تول کرتے دیکھنا بجائے خود ایک پُرلطف تماشا تھا۔

شریف حسین لیکچرباز حکیموں، سنیاسیوں، تعویذ گنڈے بیچنے والے سیانوں اور کھڑے کھڑے تصویر اتار دینے والے فوٹوگرافروں کے جمگھٹوں کے پاس ایک ایک دو دو منٹ رکتا، سیر دیکھتا اس طرف جا نکلا جہاں کباڑیوں کی دکانیں تھیں۔ یہاں اسے مختلف قسم کی بے شمار چیزیں نظر آئیں۔ ان میں سے بعض ایسی تھیں جو اپنی اصلی حالت میں بلاشبہ صنعت کا اعلیٰ نمونہ ہوں گی مگر ان کباڑیوں کے ہاتھ پڑتے پڑتے یا تو ان کی صورت اس قدر مسخ ہو گئی تھی کہ پہچانی ہی نہ جاتی تھی یا ان کا کوئی حصہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہو جس سے وہ بیکار ہو گئی تھیں۔ چینی کے ظروف اور گلدان، ٹیبل لیپ، گھڑیاں، جلی ہوئی بیٹریاں، چوکھٹے، گراموفون کے کل پُرزے، جراحی کے آلات، ستار، بھُس بھرا ہرن، پیتل کے لم ڈھینگ، بدھ کا نیم قد مجسمہ۔

ایک دکان پر اس کی نظر سنگِ مرمر کے ایک ٹکڑے پر پڑی جو معلوم ہوتا تھا کہ مغل بادشاہوں کے کسی مقبرے یا بارہ دری سے اکھاڑا گیا ہے۔ اس کا طول کوئی سوا فٹ تھا اور عرض ایک فٹ۔ شریف حسین نے اس ٹکڑے کو اُٹھا کر دیکھا یہ ٹکڑا ایسی نفاست سے تراشا گیا تھا کہ اس نے محض یہ دیکھنے کے لیے کہ بھلا کباڑی اس کے کیا دام بتائے گا قیمت دریافت کی۔

تین روپے! کباڑی نے اس کے دام کچھ زیادہ نہیں بتائے تھے مگر آخر اسے اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے ٹکڑا رکھ دیا اور چلنے لگا۔

"کیوں حضرت چل دیئے؟ آپ بتائیے کیا دیجئے گا!"

وہ رُک گیا۔ اسے یہ ظاہر کرتے ہوئے شرم سی آئی کہ اسے اس چیز کی ضرورت نہ تھی اور اس نے محض اپنے شوقِ تحقیق کو پورا کرنے کے لیے قیمت پوچھی تھی۔ اس نے سوچا، دام اس قدر کم بتاؤ کہ جو کباڑی کو منظور نہ ہوں۔ کم از کم وہ اپنے دل میں یہ تو نہ کہے کہ یہ کوئی کنگلا ہے جو دکانداروں کا وقت ضائع اور اپنی حرص پوری کرنے آیا ہے۔

"ہم تو ایک روپیہ دیں گے۔" یہ کہہ کر شریف حسین نے چاہا کہ جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا کباڑی کی نظروں سے اوجھل ہو جائے مگر اُس نے اس کی مہلت ہی نہ دی۔

"اجی سنیے تو، کچھ زیادہ نہیں دیں گے؟ سوا روپیہ بھی نہیں...... اچھا لے جایئے۔"

شریف حسین کو اپنے آپ پر غصہ آیا کہ میں نے بارہ آنے کیوں نہ کہے۔ اب لوٹنے کے سوا کوئی چارہ ہی کیا تھا۔ قیمت ادا کرنے سے پہلے اس نے اس مرمریں ٹکڑے کو اُٹھا کر دوبارہ دیکھا بھالا کہ اگر ذرا سا بھی نقص نظر آئے تو اس سودے کو منسوخ کر دے۔ مگر وہ ٹکڑا بے عیب تھا۔ نہ جانے کباڑی نے اسے اس قدر سستا بیچنا کیوں قبول کیا تھا۔

رات کو جب وہ کھلے آسمان کے نیچے اپنے گھر کی چھت پر اکیلا بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا تو اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے کا ایک مصرف اس کے ذہن میں آیا۔ خدا کے کارخانے عجیب ہیں۔ وہ بڑا غفور الرّحیم ہے۔ کیا عجب اس کے دن پھر جائیں۔ وہ کلرک درجہ دوم سے ترقی کر کے سپرنٹنڈنٹ بن جائے اور اس کی تنخواہ چالیس سے بڑھ کر چار سو ہو جائے۔ یہ نہیں تو کم سے کم ہیڈ کلرکی ہی سہی۔ پھر اسے ساجھے کے مکان میں رہنے کی ضرورت نہ رہے بلکہ وہ کوئی چھوٹا سا مکان لے لے اور اس مرمریں ٹکڑے پر اپنا نام کندہ کرا کے دروازے کے باہر نصب کر دے۔

مستقبل کی یہ خیالی تصویر اس کے ذہن پر کچھ اس طرح چھا گئی کہ یا تو وہ اس مرمریں ٹکڑے کو بالکل بے مصرف سمجھتا تھا یا اب اسے ایسا محسوس ہونے لگا گویا وہ ایک

عرصے سے اس قسم کے ٹکڑے کی تلاش میں تھا اور اگر اسے نہ خرید تا تو بڑی بھول ہوتی۔

شروع شروع میں جب وہ ملازم ہوا تھا تو اس کا کام کرنے کا جوش اور ترقی کا ولولہ انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ مگر دو سال کی سعیٔ لاحاصل کے بعد رفتہ رفتہ اس کا یہ جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور مزاج میں سکون آچلا تھا۔ مگر سنگِ مرمر کے ٹکڑے نے پھر اس کے خیالوں میں ہلچل ڈال دی۔ مستقبل کے متعلق طرح طرح کے خوش آئندہ خیالات ہر روز اس کے دماغ میں چکر لگانے لگے۔ اٹھتے بیٹھتے ، سوتے جاگتے، دفتر جاتے، دفتر سے آتے، کوٹھیوں کے باہر لوگوں کے نام کے بورڈ دیکھ کر۔ یہاں تک کہ جب مہینہ ختم ہوا اور اسے تنخواہ ملی تو اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے کو شہر کے ایک مشہور سنگ تراش کے پاس لے گیا جس نے بہت چابکدستی سے اس پر اس کا نام کندہ کر کے کونوں میں چھوٹی چھوٹی خوشنما بیلیں بنادیں۔

اس سنگِ مرمر کے ٹکڑے پر اپنا نام کھدا ہوا دیکھ کر اسے ایک عجیب سی خوشی ہوئی۔ زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنا نام اس قدر جلی حروف میں لکھا ہوا دیکھا ہو۔

سنگ تراش کی دکان سے روانہ ہوا تو بازار میں کئی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ کتبہ پر سے اس اخبار کو اتار ڈالے جس میں سنگ تراش نے اسے لپیٹ دیا تھا اور اس پر ایک نظر اور ڈال لے مگر ہر بار ایک نامعلوم حجاب جیسے اس کے ہاتھ پکڑ لیتا۔ شاید وہ راہ چلتوں کی نگاہوں سے ڈرتا کہ کہیں وہ اس کتبہ کو دیکھ کر اس کے ان خیالات کو نہ بھانپ جائیں جو پچھلے کئی دنوں سے دماغ پر مسلط تھے۔

گھر کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی اس نے اخبار اتار پھینکا اور نظریں کتبہ کی دلکش تحریر پر گاڑے دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ بالائی منزل میں اپنے مکان کے دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ جیب سے چابی نکالی، قفل کھولنے لگا۔ پچھلے دو برس میں آج پہلی مرتبہ اس پر یہ انکشاف ہوا کہ اس کے مکان کے باہر ایسی کوئی جگہ ہی نہیں کہ

اس پر کوئی بورڈ لگایا جا سکے۔ اگر جگہ ہوتی بھی تو اس قسم کے کتبے وہاں تھوڑا ہی لگائے جاتے ہیں۔ ان کے لیے تو بڑا سا مکان چاہیے جس کے پھاٹک کے باہر لگایا جائے تو آتے جاتے کی نظر بھی پڑے

قفل کھول کر مکان کے اندر پہنچا اور سوچنے لگا کہ فی الحال اس کتبہ کو کہاں رکھوں، اس کے ایک حصہ مکان میں دو کوٹھڑیاں، ایک غسل خانہ اور ایک باورچی خانہ تھا۔ الماری صرف ایک ہی کوٹھڑی میں تھی مگر اس کے کواڑ نہیں تھے بالآخر اس نے کتبہ کو اسی بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔

ہر روز شام کو جب وہ دفتر سے تھکا ہارا واپس آتا تو سب سے پہلے اس کی نظر اس کتبہ ہی پر پڑتی۔ امیدیں اسے سبز باغ دکھاتیں اور دفتر کی مشقت کی تکان کسی قدر کم ہو جاتی۔ دفتر میں جب کبھی اس کا کوئی ساتھی کسی معاملے میں اس کی رہنمائی کا جویا ہوتا تو اپنی برتری کے احساس سے اس کی آنکھیں چمک اٹھتیں جب کبھی کسی ساتھی کی ترقی کی خبر سنتا، آرزوئیں اس کے سینے میں ہیجان پیدا کر دیتیں۔ افسر کی ایک ایک نگاہ لطف و کرم کا نشہ اسے آٹھ آٹھ دن رہتا۔

جب تک اس کی بیوی بچے نہیں آئے وہ اپنے خیالوں ہی میں مگن رہا۔ نہ دوستوں سے ملتا نہ کھیل تماشوں میں حصہ لیتا، رات کو جلد ہی ہوٹل سے کھانا کھا کر گھر آجاتا اور سونے سے پہلے گھنٹوں عجیب عجیب خیالی دنیاؤں میں رہتا، مگر ان کے آنے کی دیر تھی کہ نہ تو وہ فراغت ہی رہی اور نہ وہ سکون ہی ملا۔ ایک بار پھر گرہستی کے فکروں نے اسے ایسا گھیر لیا کہ مستقبل کی یہ سہانی تصویریں رفتہ رفتہ دھندلی پڑ گئیں۔

کتبہ سال بھر تک اسی بے کواڑ کی الماری میں پڑا رہا۔ اس عرصے میں اس نے نہایت محنت سے کام کیا۔ اپنے افسروں کو خوش رکھنے کی انتہائی کوشش کی مگر اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

اب اس کے بیٹے کی عمر چار برس کی ہو گئی تھی اور اس کا ہاتھ اس بے کواڑ کی الماری تک بخوبی پہنچ جاتا تھا۔ شریف حسین نے اس خیال سے کہ کہیں اس کا بیٹا کتبہ کو گرا نہ دے اسے وہاں سے اٹھالیا اور اپنے صندوق میں کپڑوں کے نیچے رکھ دیا۔

ساری سردیاں یہ کتبہ اس صندوق ہی میں پڑا رہا۔ جب گرمی کا موسم آیا تو اس کی بیوی کو اس کے صندوق سے فالتو چیزوں کو نکالنا پڑا۔ چنانچہ دوسری چیزوں کے ساتھ بیوی نے کتبہ بھی نکال کر کاٹھ کے اس پرانے بکس میں ڈال دیا جس میں ٹوٹے ہوئے چوکھٹے بے بال کے برش، بیکار صابن دانیاں، ٹوٹے ہوئے کھلونے اور ایسی ہی اور دوسری چیزیں پڑی رہتی تھیں۔

شریف حسین نے اپنے مستقبل کے متعلق زیادہ سوچنا شروع کر دیا تھا۔ دفتروں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر وہ اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ ترقی لطیفہ غیبی سے نصیب ہوتی ہے، کڑی محنت جھیلنے اور جان کھپانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس کی تنخواہ میں ہر دوسرے برس تین روپے کا اضافہ ہو جاتا جس سے بچوں کی تعلیم وغیرہ کا خرچ نکل آتا اور اسے زیادہ تنگی نہ اٹھانی پڑتی،

پے در پے مایوسیوں کے بعد جب اس کو ملازمت کرتے بارہ برس ہو چکے تھے اور اس کے دل سے رفتہ رفتہ ترقی کے تمام ولولے نکل چکے تھے اور کتبہ کی یاد تک ذہن سے محو ہو چکی تھی تو اس کے افسروں نے اس کی دیانت داری اور پرانی کارگزاری کا خیال کر کے اسے تین مہینے کے لیے عارضی طور پر درجۂ اوّل کے ایک کلرک کی جگہ دے دی جو چھٹی جانا چاہتا تھا۔

جس روز اسے یہ عہدہ ملا اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی، اس نے تانگے کا بھی انتظار نہ کیا بلکہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا پیدل ہی بیوی کو یہ مژدہ سنانے چل دیا۔ شاید تانگہ اسے کچھ زیادہ جلدی گھر نہ پہنچا سکتا!

اگلے مہینے اس نے نیلام گھر سے ایک سستی سی لکھنے کی میز اور ایک گھومنے والی کرسی

خریدی، میز کے آتے ہی اسے پھر کتبہ کی یاد آئی اور اس کے ساتھ ہی اس کی سوئی ہوئی امنگیں جاگ اٹھیں۔ اس نے ڈھونڈ ڈھانڈ کے کاٹھ کی پیٹی میں سے کتبہ نکالا، صابن سے دھویا پونچھا اور دیوار کے سہارے میز پر ٹکادیا۔

یہ زمانہ اس کے لیے بہت کٹھن تھا کیونکہ وہ اپنے افسروں کو اپنی برتر کارگزاری دکھانے کے لیے چھٹی پر گئے ہوئے کلرک سے دُگنا کام کرتا۔ اپنے ماتحتوں کو خوش رکھنے کے لیے بہت سا ان کا کام بھی کر دیتا گھر پر آدھی رات تک فائلوں میں غرق رہتا۔ پھر بھی وہ خوش تھا۔ ہاں جب کبھی اسے اس کلرک کی واپسی کا خیال آتا تو اس کا دل بجھ سا جاتا کبھی کبھی وہ سوچتا، ممکن ہے وہ اپنی چھٹی کی میعاد بڑھوا لے.... ممکن ہے وہ بیمار پڑ جائے.... ممکن ہے وہ کبھی نہ آئے۔

مگر جب تین مہینے گزرے تو نہ تو اس کلرک نے چھٹی کی میعاد ہی بڑھوائی اور نہ بیمار ہی پڑا، البتہ شریف حسین کو اپنی جگہ پر آجانا پڑا۔

اس کے بعد جو دن گزرے وہ اس کے لیے بڑی مایوسی اور افسردگی کے تھے۔ تھوڑی سی خوشحالی کی جھلک دیکھ لینے کے بعد اب اسے اپنی حالت پہلے سے بھی زیادہ ابتر معلوم ہونے لگی تھی۔ اس کا جی کام میں مطلق نہ لگتا تھا۔ مزاج میں آلکس اور حرکات میں سُستی سی پیدا ہونے لگی۔ ہر وقت بیزار بیزار سا رہتا۔ نہ کبھی ہنستا، نہ کسی سے بولتا چالتا مگر یہ کیفیت چند دن سے زیادہ نہ رہی۔ افسروں کے تیور جلد ہی اسے راہِ راست پر لے آئے۔

اب اس کا بڑا لڑکا چھٹی میں پڑھتا تھا اور چھوٹا چوتھی میں اور منجھلی لڑکی ماں سے قرآن مجید پڑھتی، سینا پرونا سیکھتی اور گھر کے کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹاتی۔ باپ کی میز کرسی پر بڑے لڑکے نے قبضہ جمالیا۔ وہاں بیٹھ کر وہ اسکول کا کام کیا کرتا۔ چونکہ میز کے ہلنے سے کتبہ گر جانے کا خدشہ رہتا تھا اور پھر اس نے میز کی بہت سی جگہ بھی گھیر رکھی تھی اس لیے اس لڑکے نے اسے اٹھا کر پھر اسی بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا۔

سال پر سال گزرتے گئے۔ اس عرصہ میں کتبہ نے کئی جگہیں بدلیں، کبھی بے کواڑ کی الماری میں تو کبھی میز پر۔ کبھی صندوقوں کے اوپر تو کبھی چارپائی کے نیچے۔ کبھی بوری میں تو کبھی کاٹھ کے بکس میں۔ ایک دفعہ کسی نے اٹھا کر باورچی خانے کے اس بڑے طاق میں رکھ دیا جس میں روزمرہ کے استعمال کے برتن رکھے رہتے تھے۔ شریف حسین کی نظر پڑ گئی، دیکھا تو دھوئیں سے اس کا سفید رنگ پیلا پڑ چلا تھا، اٹھا کر دھویا پونچھا اور پھر بے کواڑ کی الماری میں رکھ دیا مگر چند ہی روز میں اسے پھر غائب کر دیا گیا اور اس کی جگہ وہاں کاغذی پھولوں کے بڑے بڑے گملے رکھ دیئے گئے جو شریف حسین کے بڑے بیٹے کے کسی دوست نے اسے تحفے میں دیئے تھے۔ رنگ پیلا پڑ جانے سے کتبہ الماری میں رکھا ہوا بدنما معلوم ہوتا تھا مگر اب کاغذی پھولوں کے سرخ سرخ رنگوں سے الماری میں جیسے جان پڑ گئی تھی اور ساری کوٹھڑی دہک اٹھی تھی۔

اب شریف حسین کو ملازم ہوئے پورے بیس سال گزر چکے تھے۔ اس کے سر کے بال نصف سے زیادہ سفید ہو چکے تھے اور پیٹھ میں کبڑی سے ذرا نیچے خم آ گیا تھا۔ اب بھی کبھی کبھی اس کے دماغ میں خوشحالی و فارغ البالی کے خیالات چکر لگاتے مگر اب ان کی کیفیت پہلے کی سی نہ تھی کہ خواہ وہ کوئی کام کر رہا ہو۔ تصورات کا ایک تسلسل ہے کہ پہروں ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اب اکثر اوقات ایک آدھ دم بھر میں ان تصورات کو اُڑا لے جاتی اور پھر بیٹی کی شادی، لڑکوں کی تعلیم، اس کے بڑھتے ہوئے اخراجات، پھر ساتھ ہی ساتھ ان کے لیے نوکریوں کی تلاش... یہ ایسی فکریں نہ تھیں کہ پَل بھر کو بھی اس خیال کو کسی اور طرف بھٹکنے دیتیں۔

پچپن برس کی عمر میں اسے پنشن مل گئی۔ اب اس کا بڑا بیٹا ریل کے مال گودام میں کام کرتا تھا۔ چھوٹا کسی دفتر میں ٹائپسٹ تھا اور اس سے چھوٹا انٹرنس میں پڑھتا تھا۔ اپنی پنشن اور لڑکوں کی تنخواہیں سب مل ملا کے کوئی ڈیڑھ سو روپے ماہوار کے لگ بھگ آمدنی ہو جاتی

تھی جس میں بخوبی گزر ہونے لگی۔ علاوہ ازیں اس کا ارادہ کوئی چھوٹا موٹا بیوپار شروع کرنے کا بھی تھا مگر مندے کے ڈر سے ابھی پورا نہ ہو سکا تھا۔

اپنی کفایت شعاری اور بیوی کی سلیقہ مندی کی بدولت اس نے بڑے بیٹے اور بیٹی کی شادیاں خاصی دھوم دھام سے کردی تھیں۔ ان ضروری کاموں سے نمٹ کر اس کے جی میں آئی کہ حج کر آئے مگر اس کی توفیق نہ ہو سکی۔ البتہ کچھ دنوں مسجدوں کی رونق خوب بڑھائی مگر پھر جلد ہی بڑھاپے کی کمزوریوں اور بیماریوں نے دبانا شروع کردیا اور زیادہ تر چارپائی ہی پر پڑا رہنے لگا۔

جب اسے پنشن وصول کرتے تین سال گزر گئے تو جاڑے کی ایک رات کو وہ کسی کام سے بستر سے اٹھا۔ گرم گرم لحاف سے نکلا تھا۔ پچھلے پہر کی سرد اور تند ہوا تیر کی طرح اس کے سینے میں لگی اور اسے نمونیا ہو گیا۔ بیٹوں نے اس کے بہتیرے علاج معالجے کرائے۔ اس کی بیوی اور بہو دن رات اس کی پٹی سے لگی بیٹھی رہیں مگر افاقہ نہ ہوا اور وہ کوئی چار دن بستر پر پڑے رہنے کے بعد مر گیا۔

اس کی موت کے بعد اس کا بڑا بیٹا مکان کی صفائی کرا رہا تھا کہ پرانے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بوری میں اسے یہ کتبہ مل گیا بیٹے کو باپ سے بے حد محبت تھی، کتبہ پر باپ کا نام دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے اور وہ دیر تک ایک محویت کے عالم میں اس کی خطاطی اور نقش و نگار کو دیکھتا رہا۔ اچانک اسے ایک بات سوجھی جس نے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا کردی۔

اگلے روز وہ کتبہ کو ایک سنگ تراش کے پاس لے گیا اور اس سے کتبہ کی عبارت میں تھوڑی سی ترمیم کرائی اور پھر اسی شام اسے اپنے باپ کی قبر پر نصب کردیا۔

۱۹۴۷ء

حمام میں

(۱)

نام تو تھا اس کا فرخندہ بیگم مگر سب لوگ اسے فرخ بھابی، فرخ بھابی کہا کرتے تھے۔ یہ ایک طرح کی رسم سی پڑ گئی تھی ورنہ رشتہ ناطہ تو کیا کسی نے اس کے مرحوم شوہر کو دیکھا تک نہ تھا۔ وہ کسی کی بھابی تھی یا نہ تھی مگر اس کی خدمت گزاریوں کو دیکھتے ہوئے یہ نام اس پر پھبتا خوب تھا اور وہ خود بھی اسے ناپسند نہیں کرتی تھی، وہ ان عورتوں میں سے تھی جو مَردوں کی خدمت کا خاص جذبہ لے کر دنیا میں آتی ہیں، بچپن میں بھائیوں پر جان چھڑکتی ہیں، کنوار پنے میں باپ کو سکھ پہنچاتی ہیں، شادی کے بعد شوہر کی تابعداری کرتی ہیں اور بڑھاپے میں بیٹوں کے ناز اُٹھاتی ہیں۔

وہ چھوٹے سے قد کی ایک چھوٹی سی عورت تھی مگر اس کا چہرہ اس کے قد کے تناسب سے کافی بڑا تھا۔ اگر کبھی وہ آپ کے سامنے فرش پر سر سے پاؤں تک چادر اوڑھے بیٹھی ہو اور آپ نے اسے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو اور اسے کسی ضرورت سے اُٹھ کر کھڑا ہونا پڑے تو آپ کی آنکھیں یہ انتظار ہی کرتی رہ جائیں گی کہ ابھی وہ اور اونچی ہوگی۔

اس کی عمر اٹھائیس برس کے لگ بھگ تھی مگر دیکھنے میں وہ اس سے کہیں کم

معلوم ہوتی تھی۔ پہلی ہی نظر میں جو چیز دیکھنے والے کو اپنی جانب متوجہ کرتی وہ اس کی آنکھوں کی غیر معمولی چمک تھی جس نے اس کے چہرے کے سادہ خدوخال کو حد درجہ جاذب بنادیا تھا علاوہ ازیں یہ بڑے بڑے دقیق مسائل کی گفتگو میں بھی اس کی کم علمی کو چھپائے رکھتی تھی اس کا رنگ کھلتا ہوا گندمی تھا اور پیشانی پر بال کچھ ایسے گچھے دار تھے کہ اسے مانگ نکالنے میں بہت دقت پیش آتی۔ چنانچہ وہ اکثر اپنے بالوں کو مَردوں کی طرح پیچھے اُلٹ دیا کرتی۔ سفید کُرتا، سفید شلوار اور اس کے ساتھ سفید ہی دوپٹہ، یہ سادہ ہندوستانی لباس اسے بے حد مرغوب تھا۔ اس لباس کے ساتھ جس وقت وہ شام کے جھٹپٹے میں مصلےٰ پر اپنے سامنے موتیا کی اَدھ کھلی کلیاں رکھ کر نماز میں مشغول ہوتی تو دیکھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا۔

کبھی کبھی اپنے دوستوں کے اصرار پر وہ ساری بھی پہنا کرتی مگر اس میں بھی بھڑکیلے رنگوں سے گریز کرتی۔ ساری کے ساتھ وہ ایک خاص بلاؤز پہنتی جس کا گلا بند ہوتا اور آستینیں پوری۔ یہ اس کی اپنی ایجاد تھی۔ ایسے موقع پر بربط کی شکل کا ایک ننھا سا طلائی زیور جس میں نگینے جڑے ہوئے تھے ایک سیاہ ربن کے ساتھ اس کے گلے میں بندھا ہوا نظر آتا تھا۔

شہر کی فصیل کے پاس ایک بدبودار احاطے میں اس کا مکان تھا۔ مکان کی سیڑھیوں تک پہنچنے کے لیے ایک لمبی اور تنگ ڈیوڑھی میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ بارہ تیرہ ٹوٹی پھوٹی بے ڈھنگی سیڑھیوں کا زینہ چڑھنے پر ایک وسیع دالان آتا تھا، آدھا کھلا ہوا آدھے پر چھت، کھلے ہوئے حصے کے ایک کونے میں بیت الخلا تھا اور چھت والے حصے میں دیوار سے ملا ہوا مٹی کا چولہا چولہے کے اغل بغل دو کوٹھڑیاں تھیں۔ یہ تھی اس مکان کی مختصر کیفیت جس میں فرخ بھابی رہتی تھی۔

یہ ان مکانوں میں سے تھا جن میں سفیدی وغیرہ یا تو اس وقت ہوتی ہے جب وہ بنائے

جاتے ہیں یا پھر اس وقت جب ان کی خرید و فروخت کی بات چل رہی ہوتی ہے اس مکان کی دیواروں کو دیکھ کر، جن پر سے چونے کا پلستر اکھڑ کر اینٹیں نظر آنے لگی تھیں، گمان ہوتا تھا کہ کم سے کم پچھلے بیس برس میں اس کے مالکوں کے ساتھ اس قسم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ دیواروں میں جگہ جگہ گوب نکل آیا تھا۔ دھوئیں نے دروازوں اور چھت کی کڑیوں پر سیاہی پھیر کر ان کے کئی عیبوں کو چھپا لیا تھا۔ دونوں کوٹھڑیوں میں ایک ایک طاق تھا۔ قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ شروع شروع میں یہ طاق بہت چھوٹے چھوٹے ہوں گے جیسے پرانی وضع کے غریب ہندوستانی گھروں میں دیا رکھنے کے لیے بنائے جاتے ہیں مگر کرایہ داروں نے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق اینٹیں نکال نکال کر انہیں کافی فراخ کر لیا تھا اور اب وہ اس نقب کی طرح معلوم ہوتے تھے جسے چور کھٹکا سن کر ادھ بیچ ہی چھوڑ گئے ہوں مگر ان سب باتوں کے باوجود اس مکان کی شان میں کیا کیا قصیدے نہ کہے گئے، کن کن خوبصورت ناموں سے اسے موسوم نہ کیا گیا اور وہ کون سے زاویے رہ گئے جن سے اس کے در و دیوار کی تصویر کشی نہ کی گئی!

مکان کی ظاہری خستہ حالی سے قطع نظر جہاں تک اس کی اندرونی صفائی اور رکھ رکھاؤ کا تعلق تھا کوئی شخص فرخندہ کی نفاست پسندی اور سگھڑاپے پر حرف نہ رکھ سکتا تھا۔ وہ صبح شام دالان اور کوٹھڑیوں میں جھاڑو دیتی اور ہنڈیا چولہے اور دوسرے کاموں سے جو وقت بچتا اسے مکان کی لیپ پوت ہی میں گزارا کرتی تھی۔ دونوں کوٹھڑیوں میں سے جس کی حالت نسبتاً بہتر تھی، اس نے اس میں چاندنی کا فرش کر کے اور گاؤ تکیے لگا کر اسے بیٹھنے کا کمرہ بنا لیا تھا۔ دیواروں پر گز گز بھر اونچی سیتل پاٹی لگوا دی تھی تاکہ ٹیک لگانے میں دیواروں کی مٹی کپڑوں میں نہ لگنے پائے۔ دوسری کوٹھڑی اس کی خواب گاہ، غسل خانے اور سنگھار کے کمرے کا کام دیتی تھی۔ اس کوٹھری میں ایک تخت بھی تھا جس پر فرائض پنجگانہ ادا کیا کرتی تھی علاوہ ازیں اس کے کپڑوں کا صندوق، روزمرہ کے استعمال کے برتن اور دوسرا چھوٹا موٹا

سامان بھی اسی میں رہتا تھا۔

کسی کسی روز اس کے دوست بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق دستر خوان کی آرائش میں اس کا ہاتھ بٹاتے۔ مثلاً کوئی صاحب شام کو لوٹتے ہوئے ڈبل روٹی خریدتے لاتے ڈبل روٹی اپنی اور دال بھاجی فرخ بھابی کے ہاں کی۔ کوئی صاحب نصف درجن کیلے یا پاؤ بھر مونگ پھلی لفافے میں لیتے آتے۔ کوئی صاحب تیسرے پہر چھوکرے کے ہاتھ سالم کلیجی بھجوا کر کہلوا دیتے:

"میاں نے سلام کہا ہے کہ رات کو کھانا وہ اور ان کے ایک دوست یہیں کھائیں گے۔"

کبھی دستر خوان پر آدمی زیادہ ہوتے اور کھانا کم تو کوئی صاحب جیب سے جھٹ چونّی نکال چھوکرے کو دیتے کہ جا جھٹ پٹ بازار سے چار گرم گرم روٹیاں اور چار کباب لے آ۔ وہ ان باتوں کا کبھی برا نہ مانتی بلکہ ایسی نظروں سے ان صاحب کی طرف دیکھتی گویا ان دونوں میں پوری پوری مفاہمت ہے۔

اس کو کمتری کا کبھی احساس نہیں ہوا، جو موجود ہے وہ حاضر ہے، جو موجود نہیں اس کی توفیق نہیں۔ نہ اس نے اپنی حیثیت کو کبھی چھپانے کی کوشش کی نہ کسی خشک دعوت پر اگلی پچھلی کسی تر دعوت کے ذکر سے کمی پوری کرنی چاہی۔ اگر کسی نے اس کی کچھ مدد کی تو مسکرا کر قبول کر لی مگر خود کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔

کھانے پینے ہی پر موقوف نہیں وہ اور طرح سے بھی اپنے دوستوں کی خدمت کرنے سے دریغ نہیں کرتی تھی۔ مثلاً صبح کو دس بجنے سے کچھ ہی منٹ پہلے کوئی صاحب آدھمکتے:

"بھابی میری پتلون کا بٹن اکھڑ گیا ہے۔ کم بخت ابھی ابھی راستے ہی میں اکھڑا ہے میں ویسے ہی دفتر چلا جاتا مگر راستے میں تمہارا گھر پڑتا تھا، خیال آیا تمہیں سے ٹنکواتا چلوں، اور کہیں سے اکھڑا ہوتا تو گزارہ ہو جاتا، کم بخت سامنے ہی سے اکھڑا ہے۔"

اور وہ ایک شفیق بہن کی طرح پیار اور ملامت کی ملی جلی نظروں سے ان صاحب کی طرف دیکھتی جو گویا کہہ رہی ہوتیں، تم سب شریر ہو، تم اپنے کپڑے سنبھال کر کیوں نہیں رکھتے اور وہ جلدی جلدی بٹن ٹانک دیتی۔

یا مثلاً کوئی صاحب اچانک رات کے دو بجے آ کر اس کے مکان کا دروازہ پیٹنا شروع کر دیتے:

"فرخ بھابی، فرخ بھابی! میری بیوی کنڈی نہیں کھولتی، کہتی ہے وہیں جاؤ جہاں رات رات بھر غائب رہتے ہو۔ خدا کے لیے تم چل کے اسے سمجھاؤ۔"

اور وہ اسی وقت آنکھیں ملتی اور دوپٹہ سنبھالتی ہوئی ان صاحب کے ہمراہ ہو لیتی۔ یہ اور بات ہے کہ اس قسم کی مہموں سے عموماً اسے ناکام اور خفیف ہو کے لوٹ آنا پڑتا۔

اس کے ہاں یوں تو کبھی کبھی دن کو بھی ہنگامہ برپا رہا کرتا مگر اصل محفل رات کو آٹھ بجے کے بعد ہی سجا کرتی تھی۔ سب سے پہلے عموماً محسن عدیل آیا کرتا۔ وہ درمیانے قد کا دُبلا پتلا نوجوان تھا تیس کے قریب عمر، زردہ چہرہ، آنکھیں بڑی بڑی، اداس اور ایسی لبریز کہ معلوم ہوتا بوند ٹپکا ہی چاہتی ہے۔ اگر وہ اپنے کو ذرا سنبھالے ہوئے رکھتا تو خاصا معقول آدمی معلوم ہوتا مگر اس کے بال اکثر وحشیوں کی طرح بڑھے ہوئے ہوتے۔ داہنے ہاتھ کی انگلیاں نکوٹین سے مستقل طور پر پیلی ہو گئی تھیں جیسے ٹنکچر آیوڈین پینٹ کیا گیا ہو، ناخنوں میں نیلا نیلا سا میل بھرا ہوا۔ اگر کبھی چلتے چلتے انگلیوں پر نظر پڑ جاتی تو دیا سلائی یا سگریٹ کی ڈبیا کے کنارے سے اوپر اوپر سے میل کرید لیتا۔ سردی گرمی ہر موسم میں ایک سیاہ بوسیدہ سی شیروانی پہنے رہتا اور ایک سرخ سوتی مفلر جس میں جا بجا سوراخ ہو گئے تھے ہر وقت گلے میں ڈالے رکھتا۔ جب اس کی حالت بہت ناگفتہ بہ ہو جاتی تو کسی شام وہ اس سے کہتی۔

"عدیل میاں! ایک بہت ضروری کام میں آپ سے مشورہ لینا ہے۔ کل دوپہر کو میرے ہاں تشریف لایئے، آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ دیکھئے بھولیے گا نہیں، بڑا ہی ضروری

کام ہے۔"

اور جب عدیل اگلے روز دوپہر کو اس کے ہاں پہنچتا تو وہ اِدھر اُدھر کی باتوں میں اس سے کہتی:

"عدیل میاں کچھ اپنے کپڑوں کی بھی فکر ہے؟ دیکھئے آپ کی شیروانی میں کھونچ لگ رہی ہے، لائیے میں سی دوں ورنہ شیروانی زیادہ پھٹ جائے گی۔"

عدیل کے سوکھے ہوئے زرد گلوں پر ہلکی سی سرخی دوڑ جاتی اور وہ اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا:

"نہیں نہیں رہنے دو تکلیف نہ کرو، پھر کبھی سہی۔"

مگر وہ اس کی ایک نہ سنتی اور شیروانی اتروا ہی لیتی۔ پھر بجائے سینے کے وہ اسے لے جا کر پانی کے ٹب میں ڈال دیتی۔ عدیل اس کا منہ تکتا کا تکتا رہ جاتا، ادھر وہ جھٹ شیروانی کو ٹب سے نکال تسلے میں ڈال اس پر صابن رگڑنا شروع کر دیتی۔

تھوڑی دیر میں چھوکرا حجام کو لیے ہوئے آجاتا۔

اور اب عدیل سمجھ جاتا۔ اس کے ہونٹوں پر مہر لگ جاتی اور وہ ان باتوں کو دل ہی دل میں سخت ناپسند کرتے ہوئے بھی چپ چاپ اس کا ہر حکم مانے جاتا جیسے کوئی بھیڑ بال کٹائی کے وقت دو چار دفعہ ممیں ممیں کرنے کے بعد اپنی قسمت کو اپنے مالکوں کے ہاتھ سونپ چپ سادھ لیتی ہے۔ وہ کپڑے اُتار کر میلی سی چادر باندھ لیتا اور حجامت بنوانے بیٹھ جاتا۔ ادھر شیروانی کے بعد فرخندہ اس کا کرتا پاجامہ اور مفلر دھوتی۔ ساتھ ساتھ حجام کو تاکید بھی کرتی جاتی:

"خلیفہ جی! بال کافی چھوٹے ہوں گے۔ دیکھنا ہاتھوں اور پیروں کے ناخن لینا نہ بھول جانا۔"

حجامت کے بعد عدیل کو گرم پانی سے نہلایا جاتا۔ وہ خود اس کی پیٹھ اور سر میں صابن

ملتی۔ اس کے بعد وہ اپنے صندوق میں سے پلنگ کی ایک اُجلی چادر نکال کر اسے دیتی:

"لیجیے عدیل میاں! اسے لپیٹ کر دھوپ میں چارپائی پر بیٹھ جایئے، ذرا سی دیر میں کپڑے سُوکھا چاہتے ہیں۔ میں اتنے میں استری گرم کرتی ہوں۔"

عدیل دھوپ میں چارپائی پر بیٹھا پہلے سے بھی زیادہ اُداس نظروں سے اسے اِدھر سے اُدھر آتے جاتے دیکھتا رہتا اور اس کی لبریز آنکھوں سے بوند ٹپکنے کے بالکل قریب ہو جاتی۔

غرض اس طرح دو تین گھنٹے میں اسے آدم صورت بنا دیا جاتا۔

محسن عدیل ایک ناول نویس تھا مگر بدقسمتی سے ابھی اس کا جوہر اہلِ وطن پر نہیں کھلا تھا۔ اسے اپنا پہلا ناول لکھے پانچ برس ہو چکے تھے مگر اس کے ابھی تک چھپنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اس طویل قصے میں مصنف نے حیرت انگیز واقعیت اور جامعیت کے ساتھ جنسی لذتوں کا کھوج لگانے کی سعی کی تھی۔ خیر یہ تو کچھ زیادہ قابلِ اعتراض بات نہ تھی مشکل یہ تھی کہ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے اپنے نظریوں کے جواز میں پیغمبروں اور اوتاروں کی خانگی زندگیوں کو تختۂ مشق بنا دیا تھا اور یہ ایسی بات تھی کہ کتاب کا شائع ہوتے ہی ضبط ہو جانا یقینی امر تھا۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ کوئی ناشر اسے چھاپنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔

کتب فروشوں نے عدیل کو معقول معاوضہ پیش کرتے ہوئے مشورہ دیا تھا کہ ناول میں سے قابلِ اعتراض حصوں کو حذف کر دو مگر وہ مسودے میں سے ایک نقطہ بھی کاٹنے کو تیار نہ تھا۔ وہ کہا کرتا:

"ایک سچا فن کار ہمیشہ اپنی روح کو تخلیقات میں منتقل کیا کرتا ہے۔ میری روح اچھی ہو یا بری، میں مادی منفعت کے لیے اسے بدلنے کو ہرگز تیار نہیں ہوں۔"

عدیل کو اپنی ضِد کے طفیل کافی تنگ دست ہونا پڑا تھا اور وہ رفتہ رفتہ تصنیف و تالیف کے کام ہی سے بددل ہو گیا تھا۔ جب اس کی ناداری حد سے بڑھ جاتی تو ایک دوست اسے کسی چھاپے خانے سے زیرِ طبع کتابوں کے کچھ پروف پڑھنے کے لیے لا دیا کرتا اور اس طرح

اسے دو چار روپے مل جایا کرتے۔

عدیل سے فرخندہ کی دوستی سب سے پرانی تھی۔ اب سے کوئی سال بھر پہلے جب وہ اپنے شوہر کی جوانامرگی کے بعد سسرال والوں کی سختیوں سے تنگ آ کر بھاگ آئی تھی تو ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر سب سے پہلے اس کی ملاقات عدیل ہی سے ہوئی تھی اور عدیل ہی نے اسے اس مکار بڑھیا کے پنجے سے چھڑایا تھا جو اسے کھاتے پیتے گھر میں استانی کی جگہ دلوانے کا لالچ دے کر نکال لائی تھی، پھر چونکہ اس کے میکے میں اس کا کوئی حقیقی رشتہ دار زندہ نہیں تھا جو اس کی معاش کا کفیل ہوتا، یہ عدیل ہی تھا جس نے اس کے رہنے سہنے کا انتظام کیا تھا اور اسی کے مشورے سے اس نے قسطوں پر سلائی کی مشین لے کر نکٹائیاں، بٹوے وغیرہ سینے کا کام شروع کیا تھا جو اس نے اسکول میں اپنی ایک شفیق استانی سے سیکھا تھا۔ عدیل ہی نے نہ معلوم کہاں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر بارہ چودہ برس کا ایک ہوشیار سا لڑکا لادیا تھا جو نہ صرف گھر کا اوپر کا کام ہی کیا کرتا تھا بلکہ ہر روز تیسرے پہر اس کی تیار کی ہوئی نکٹائیاں وغیرہ بیچنے بھی جایا کرتا۔ غرض وہ عدیل کی بڑی قدر کرتی اور اسے ملک کا بہت بڑا متاع سمجھتی تھی۔

محسن عدیل کے بعد یا تو بیمہ ایجنٹ بھٹناگر آتا اور یا ڈاکٹر ہمدانی یا دونوں ساتھ ساتھ آتے۔ بھٹناگر اَدھیڑ عمر کا بھاری بھرکم آدمی تھا۔ گندمی رنگ، مٹیالے رنگ کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جو ہر وقت کھوئی کھوئی سی رہا کرتیں۔ ان کو دیکھ کر ایسا گمان ہوتا گویا کسی حاصل نہ ہو سکنے والے مطلب کے بر لانے کے لیے نت نئی چالوں کا تصور پیش رہتا ہے۔ فرخ بھابی کے ہاں آتے ہی وہ اپنی بادامی رنگ کی پتلون اتار کے اور تہہ کر کے ایک کونے میں رکھ دیتا اور ایک پرانی سی دھوتی باندھ لیتا جو اسی مقصد کے لیے اس نے وہاں لا کر رکھ دی تھی۔ جس روز وہ معمول سے کچھ سویرے آجاتا اور فرخندہ ابھی ہنڈیا چولہے میں لگی ہوتی تو وہ کسی سے بات نہ کرتا بس جیب سے تاش کا پیکٹ نکال اکیلا ہی فرش پر بازی لگاتا رہتا۔

انشورنس والے عموماً ہر اس جگہ جانے کے آرزو مند رہا کرتے ہیں جہاں دو چار صورتیں مل بیٹھتی ہوں کہ شاید وہاں کوئی شکار ہاتھ آئے اور بھٹنا گر بھی۔ فرخ بھائی کے ایک دوست کے ذریعے اس کے ہاں یہی مقصد لے کر پہنچا تھا مگر یہاں اسے اپنے ڈھب کی کوئی آسامی تو نظر نہ آئی البتہ یہاں کا ماحول اسے ایسا راس آ گیا کہ یہ جگہ شام گزرانے کے لیے مستقل ٹھکانہ بن گئی۔

ڈاکٹر ہمدانی کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی مگر دیکھنے میں وہ چالیس سے زیادہ کا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ گٹھا ہوا جسم، سرخ و سفید چہرہ، ڈاڑھی مونچھ صاف، سر کے بال تقریباً غائب۔ ایک آنکھ پر سنہری زنجیر والا چشمہ لگایا کرتا، ململ کا کرتا، بوسکی کا تہمد، پاؤں میں سلیپر، ہاتھ میں موٹی سی چھڑی چاندی کی موٹھ والی۔ سردیوں میں اس لباس میں فقط اس قدر اضافہ ہوتا کہ پشمینے کی ایک خودرنگ چادر کو ایک خاص ڈھب سے تہہ کر چھاتی پر لپیٹ بغل سے نکال شانے پر اس طرح ڈال لیتا کہ اس میں ایک بارعب سیاسی لیڈر کی سی ادا پیدا ہو جاتی۔

وہ طب یونانی، ایلوپیتھی اور ہومیوپیتھی تینوں میں ماہر سمجھا جاتا تھا۔ گو باقاعدہ طور پر ان میں سے کسی کی بھی سند اس کے پاس نہ تھی۔ اس نے شوقیہ طور پر انسانی روگوں کا مطالعہ کیا تھا اور علاج کے قدیم و جدید تمام اصولوں کو ملا کر ایک نیا طریقہ نکالا تھا جس کے باعث غیر طبی حلقوں میں اس کی کافی شہرت تھی۔ وہ اپنی چھوٹی سی دارالتجارب میں اپنے کو بند کر کے عجیب و غریب اور پُر اسرار تجربے کیا کرتا جن کا حال کسی کو معلوم نہ تھا۔ فرخ بھائی ایک مرتبہ اس کے زیرِ علاج رہ چکی تھی اور یہی اس کی دوستی کی بنا تھی۔

سیڑھیوں میں ہلکے قدموں کی چاپ سنائی دیتی اور سب جان لیتے کہ دیپ کمار آ رہا ہے۔ وہ ایک بائیس سالہ خوشرو شرمیلا نوجوان تھا۔ چمپئی رنگ، گھنگھریالے بال۔ وہ ایک امیر زمیندار کا بیٹا تھا اور اعلیٰ تعلیم کے لیے دارالسلطنت میں آیا تھا، مگر ایم اے میں فیل ہونے کے بعد ایسا دل برداشتہ ہوا کہ نہ تو باپ کے بے شمار خطوں اور تاروں کا کوئی جواب دیا اور نہ گھر

جانے کا نام ہی لیا۔ اس کا مخصوص لباس یہ تھا، کھدر کا کرتا، کھدر کا پاجامہ، پیروں میں چپل اور سر سے ننگا۔ سردیوں میں ایک سیاہ کمبل جس کے حاشیے پر سرخ سرخ ڈورے تھے اوڑھ لیا کرتا۔ باپ کی نشانی یہی ایک کمبل اس کے پاس رہ گیا تھا۔

اسے فرخندہ کے ہاں عدیل لایا تھا۔ فرخندہ نے پہلی ہی ملاقات میں اس سے کہا تھا "آپ کے لیے فلم لائن بہت موزوں رہے گی۔" یہ سن کر اس کے رخسار کانوں تک تمتما اُٹھے تھے کوئی مہینے بھر کے بعد جب وہ فرخندہ سے کسی قدر بے تکلف ہو گیا تو ایک دن جھجکتے ہوئے پوچھا:

"فرخ بھابی کیا میں سچ مچ فلم لائن کے لیے موزوں ہوں؟"

فرخندہ مسکرا دی:

"تو کیا اس دن آپ کو میری بات کا یقین نہیں ہوا تھا؟"

دیپ کمار یہ جواب سن کر خاموش ہو گیا اور پھر کبھی اس موضوع پر گفتگو نہیں کی۔

عدیل، بھٹناگر، ڈاکٹر ہمدانی اور دیپ کمار کے آجانے سے اب محفل خاصی سج جاتی ادھر فرخندہ بھی عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر محفل میں آ بیٹھی۔ علاوہ ازیں "مولانا" جو آٹھوں پہر فرخندہ ہی کے ہاں پڑے رہتے تھے اور زیادہ وقت سونے میں گزارتے تھے اپنی کمبلی سنبھالتے ہوئے آکر محفل میں شریک ہو جاتے۔

نام تو خدا جانے ان کا کیا تھا مگر سب انہیں "مولانا" کہا کرتے تھے۔ یہ مقدس خطاب دلوانے میں ان کی بزرگی یا دین داری سے کہیں زیادہ ان کی کھڑبڑی ڈاڑھی نے حصہ لیا تھا۔ گلوں پر تو بال خال خال تھے البتہ ٹھوڑی خوب بھری ہوئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی، ناک پتلی اور ستواں، کان بڑے بڑے۔ کہتے تھے مسجد کے ملاں نے کھینچ کھینچ کر بڑے کر دیے تھے۔

یہ حضرت دیہات کے رہنے والے تھے۔ اَدھیڑ عمر میں علم دین کی تکمیل کا شوق

چرایا اور یہ اپنے گاؤں کو خیر باد کہہ شہر پہنچے۔ کچھ دنوں مختلف مسجدوں میں فقہ حدیث وغیرہ کا درس لیتے رہے۔ پھر ایک مسجد میں امام بنا دیے گئے جو ٹوٹی ہوئی اور شہر سے دور ایک اجاڑ سے مقام میں تھی۔ مسجد کے قریب ہی سے ریل کی لائن گزرتی تھی۔ نمازی تو اس مسجد میں شاذ ہی کبھی آتا۔ البتہ ریل گاڑیاں دن رات گزرا کرتیں۔ مولانا دن بھر حجرے میں اپنی جھلنگی چارپائی پر پڑے حجرے کے شگاف میں سے آنے جانے والی گاڑیوں کی سواریوں کو اداسی سے دیکھتے رہتے۔ ان کا معمول تھا کہ جمعہ کے جمعہ کپڑے دھو کر شہر کی جامع مسجد میں جایا کرتے جہاں ایک مشہور عالم دین جمعہ کی نماز سے پہلے وعظ کیا کرتے۔ ایک دن وہ وعظ کو جانے لگے تو اپنی ساری درسی کتابیں بھی ساتھ لیتے گئے۔ پورے دو گھنٹے تک وہ حضوریٔ قلب کے ساتھ عالم صاحب کا وعظ سنتے رہے۔ جب وعظ ختم ہوا تو وہ زار و قطار رو رہے تھے۔ روتے روتے ان کی ہچکی بندھ گئی تھی مسجد سے نکل کر انھوں نے اپنی ساری کتابیں ایک نادار طالب علم کو دے دیں، اس کے بعد پھر کسی نے ان کو مسجد یا درس میں نہیں دیکھا۔

فرخندہ سے ان کی ملاقات یوں ہوئی کہ پچھلے سال جاڑوں کی ایک شام کو وہ ایک بازار سے گزر رہی تھی کہ اس نے دیکھا، ایک شخص کمبل اوڑھے سرکاری نل کے کنارے بیٹھا زور زور سے کانپ رہا ہے، وہ ٹھہر گئی، اس پر اس شخص نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا:

”میں بیمار ہوں۔ اس شہر میں میرا کوئی نہیں۔ میں بچّوں کو کلام مجید پڑھا سکتا ہوں اگر کہیں کام مل جائے “

غرض فرخندہ انہیں گھر لے آئی۔ چھ سات روز میں وہ بالکل تندرست ہو گئے مگر وہ دن اور آج کا دن، نہ تو انھوں نے بچوں کو کلام مجید پڑھانے کا کبھی ذکر کیا اور نہ فرخندہ کے ہاں سے جانے کا نام ہی لیا۔ وہ گھر کے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹا دیا کرتے۔ مثلاً برتن مانجھ دیے، چولہے میں آگ سلگا دی، کنوئیں سے پانی بھر لائے اور اگر کبھی فرخندہ کے سر میں درد ہوتا تو دیر تک اس کی پیشانی کو دباتے اور آیاتِ قرآنی پڑھ پڑھ کر دم کرتے رہتے۔ علاوہ

ازیں کبھی کبھی فرخندہ کے دوستوں کا چھوٹا موٹا کام بھی کر دیا کرتے مگر ہمیشہ ناخوشی کے ساتھ۔ وہ سب کے سب ایک ہی دستر خوان پر کھانا کھاتے تھے۔

زیادہ دیر نہ ہونے پاتی کہ نوجوان انقلابی شاعر شکیبیؔ بھی آپہنچتا۔ وہ تھا تو جلد ساز مگر طبع موزوں رکھتا تھا نفسیات کے ایک پروفیسر کی صحبت نے جو اس سے جلدیں بندھوایا کرتا تھا اسے شاعر بنا دیا تھا شکیبی کا تخلص اسی کا رہین منت تھا، چیچک رو تھا مگر آواز خدا کی دین ہے، جس وقت لہک لہک کے اپنا کلام سناتا تو اپنی کم رُوئی اور خستہ حالی کے باوجود ایک خاص طرح کا حسن اور بھول پن اس کے چہرے پر برسنے لگتا۔ اس نے مزدوروں کے متعلق متعدد نظمیں لکھی تھیں۔ ہرچند ان میں عروض و محاورہ کی غلطیاں جابجا پائی جاتی تھیں پھر بھی ان میں سے بعض واقعی معرکہ کی تھیں، خصوصاً وہ نظم جس میں ایک مزدور اپنی شادی کے روز حجام سے خط بنوانے جاتا ہے۔ اس کی بے تابی کا یہ عالم ہے کہ پےَ در پے استرے کے زخم کھاتا ہے اور بالآخر اپنا نصف نچلا ہونٹ ہی کٹوا بیٹھتا ہے، حقیقت نگاری اور انقلابی مزاح کی عمدہ ترین مثال تھی۔

یہ محفل اپنے عروج پر نہیں پہنچتی تھی جب تک کہ قاسم نہ آجاتا۔ وہ ٹرام کمپنی میں کرایہ اگاہنے پر ملازم تھا مگر ساتھ ہی ساتھ وہ ایک افسانہ نویس بھی تھا۔ ان نے ٹرام کی نوکری محض بیکاری کی وجہ سے کی تھی مگر دو چار ہی روز میں جب اس نے دیکھ لیا کہ اس کے ذریعے اسے انسانی کردار کے مطالعے کا، جو اس کی افسانہ نویسی کے لیے ازبس ضروری تھا، کس قدر نادر موقع ملتا ہے تو اسے اس کام سے بے حد دل بستگی ہو گئی، چنانچہ جب بعد میں ایک دوست نے اس کے لیے اور جگہ بہتر ملازمت تلاش کی تو اس نے جانے سے انکار کر دیا۔ سچ یہ ہے کہ ٹرام میں اس کی مڈ بھیڑ اس قدر گوناگوں انسانوں سے ہوتی تھی کہ نہ تو ریل میں ممکن ہے اور نہ جہاز میں کیونکہ ان کے مسافر عموماً لمبے لمبے سفر کرتے ہیں مگر ٹرام میں پاؤ میل کے بعد پوری کھیپ کی کھیپ نئے مسافروں کی لیجیے۔

وہ دراز قامت اور خوش شکل نوجوان تھا۔ ٹرام کی میلی اور پھٹی ہوئی وردی میں بھی وہ ایک فوجی کی سی شان رکھتا تھا۔ دنیا میں اس کا کوئی عزیز یا رشتہ دار نہ تھا۔ دوپہر کو تنور پر کوچوانوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھالیتا اور شام کو ٹرام کے ایک اسٹیشن کے قریب سے نان کباب خرید لاتا اور چلتی گاڑی میں کھڑے کھڑے کھالیتا۔ اگلے اسٹیشن پر گاڑی رکتی تو سرکاری نل سے پیٹ بھر کر پانی پی لیتا غرض بہت مرنجاں مرنج آدمی تھا۔

قاسم اور شکیبی، محسن عدیل کے دوستوں میں سے تھے اور پہلے پہل اسی کے ذریعے فرخ بھابی کے ہاں آئے تھے۔ یہ سب لوگ محفل کے خاص رکن تھے اور قریب قریب ہر روز کے آنے والے۔ ان کے علاوہ کچھ اور اصحاب بھی تھے مگر ان کے آنے کا کچھ ٹھیک نہ تھا۔ جب آنے لگتے تو متواتر کئی کئی دن آتے رہتے اور جب نہ آتے تو مہینوں شکل نہ دکھاتے۔

ان میں ایک صاحب تھے مسٹر سنگھا جو ایک باکمال مصوّر اور فوٹو گرافر تھے مگر اپنے فن سے فائدہ اٹھانا ان کی قسمت میں نہ تھا کیونکہ کبھی کوئی اسٹوڈیو نصیب ہوا اور نہ کبھی کوئی بڑھیا سا کیمرہ خریدنے کی توفیق ہوئی۔ چنانچہ کبھی ادنیٰ تھیٹریکل کمپنیوں کے پردے رنگ کر تو کبھی دُکانوں کے سائن بورڈ لکھ کر گزارہ کرتے۔ ان کی یہ بڑی تمنا تھی کہ وہ فرخ بھابی کی ایک ایسی تصویر کھینچیں جس میں وہ فوجی وردی پہنے گھوڑے پر سوار ہو۔ وہ کئی مرتبہ اس کا اظہار بھی کر چکے تھے مگر یہ تمنا پوری ہونے میں نہ آتی تھی۔

کبھی کبھی ایک خانصاحب بھی، مان نہ مان میں تیرا مہمان کے مصداق آجایا کرتے وہ کبھی تھانے دار رہ چکے تھے مگر کسی بے اعتدالی کے باعث معطل کر دیے گئے تھے شملے دار پگڑی کلاہ پر بندھی ہوئی، مونچھوں کو تل دیا ہوا، سرخ سرخ آنکھیں، ہاتھ میں پتلی سی بید کی چھڑی جسے عادتاً لرزاتے رہتے، پاؤں میں پشاوری چپل۔ خدا ہی جانتا ہے کہ وہ کس طرح گزر کیا کرتے تھے مگر جب آتے پیئے ہوئے آتے اور آتے ہی فرمائش شروع کر دیتے:

"فرخندہ خانم کبھی گانا نہ سنایا تم نے!"

"ایلو اور سنو۔" فرخندہ جواب دیتی۔ "یہ کس نے کہہ دیا آپ سے کہ میں گاتی ہوں؟"

"واللہ تم ضرور گاتی ہو اور آج ہم بے سُنے نہ جائیں گے۔"

"خان صاحب! آپ باور کریں، میں گانا بالکل نہیں جانتی۔"

"فرخندہ خانم! تمہاری آواز واللہ بے حد رسیلی ہے۔ تم گایا کرو، سکھانے کا بندوبست ہم کر دیں گے۔"

"جی شکریہ!"

"بہت اچھا گویا ہے آج کل ہمارے ہاتھ میں۔"

ان خان صاحب کا آنا فرخندہ کے سب دوستوں کو بُرا لگتا مگر وہ خاموش اور الگ تھلگ رہنے ہی میں مصلحت سمجھتے۔ آخر خدا خدا کر کے جب وہ رخصت ہوتے تو سب لوگ اطمینان کا سانس لیتے۔

جب یہ محفل بھر جاتی تو گفتگو کا سلسلہ شروع ہوتا۔ اس کے لیے کسی خاص موضوع کی پابندی نہ تھی۔ عام طور پر کسی اخبار کے ضمیمہ کی خبر، قتل یا لوٹ مار کا کوئی واقعہ، کسی مغنّیہ کی آمد یا کسی لیڈر کا اغوا، مچھر وغیرہ گفتگو کے آغاز کا باعث ہوتے۔ شروع شروع میں بات چیت دو ایک آدمیوں ہی تک محدود رہتی مگر جلد ہی کوئی صاحب موضوع میں تھوڑی سی ترمیم کر کے شریک ہو جاتے۔ باتوں باتوں میں کوئی واقعہ مثال کے طور پر سنایا جا رہا ہوتا تو سامعین میں سے کسی اور صاحب کو ویسا ہی یا اس سے ملتا جلتا واقعہ یاد آ جاتا جسے وہ سنائے بغیر نہ رہتے۔ اسی طرح کسی صاحب کو بات کا کوئی پہلو کھٹکتا جس کی تردید کرنا وہ ضروری سمجھتے۔ غرض یوں رفتہ رفتہ سبھی لوگ گفتگو میں حصہ لینے لگتے۔

بعض اوقات گفتگو شروع ہی سے عالمانہ رنگ اختیار کر لیتی۔ ایسے موقعوں پر قوموں

کے عروج وزوال کی داستانیں دہرائی جاتیں۔ تاریخ کے لاینحل عقدوں کی گرہ کشائی کی جاتی حکمرانوں اور جہاں بانوں کی حکمتِ عملیوں پر روشنی ڈالی جاتی۔ اقتصادیات، عمرانیات نفسیات اور حیات بعد الممات پر خیال آرائیاں ہوتیں اور فرخندہ انتہائی غور و خوض کے ساتھ اپنے رفیقوں کی تقریروں کو سُنتی رہتی۔ ہر چند بہت سی باتیں اس کی سمجھ سے بالا ہوتیں مگر اس سے اس کے انہماک میں ذرا فرق نہ آتا۔ وہ دل ہی دل میں ان کی قابلیت اور وسعتِ معلومات پر عش عش کر اُٹھتی اور جب اسے یہ خیال آتا کہ علم و فضل کے یہ دریا اس کے چھوٹے سے ناچیز گھر میں بہائے جا رہے ہیں تو اس کی آنکھوں کی قدرتی چمک دوچند ہو جاتی اور اس کا سانس تیز تیز چلنے لگتا۔

کبھی کبھی جادو اور دوسرے سفلی علوم پر بھی اظہارِ خیال کیا جاتا۔ صرف یہی ایک موضوع ایسا تھا جسے وہ پسند نہیں کرتی تھی بلکہ اس کے ذکر سے اسے وحشت سی ہونے لگتی تھی۔ اس گفتگو میں سب سے زیادہ جوش و خروش سے حصہ مولانا لیا کرتے۔ ان کا قول تھا کہ موجودہ تہذیب کی بے چینیوں اور ناانصافیوں کو دُور کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ انسان سے بالاتر قوتوں پر قابو حاصل کیا جائے اور ان کی مدد سے دنیا میں انصاف، بھائی بندی اور امن قائم کیا جائے۔ وہ یہ بھی کہا کرتے، خدا جانے اس میں کہاں تک سچ ہے کہ کم و بیش تمام قدیم تہذیبوں کے عروج و ترقی میں سفلی علوم کو بہت دخل رہا ہے۔

”مولانا صاحب!“ ڈاکٹر ہمدانی پوچھتا۔ ”کیا جن و ملک آج بھی دنیا میں موجود ہیں؟“

”ہیں کیوں نہیں!“

”پھر وہ نظر کیوں نہیں آتے؟“

”اس لیے کہ انسان کے حواس کا ارتقا اس قدر کامل نہیں ہوتا کہ وہ جن و ملک کا جن کی روح انسان کی روح سے فی الواقع اعلیٰ ہوتی ہے، ادراک کر سکے۔“

”حواس کا کامل ارتقاء کیسے ہوتا ہے۔“

''سخت ریاضت اور قوتِ ارادی سے۔'' مولانا جواب دیتے۔

''کیا کبھی آپ کو بھی جن نظر آیا؟'' بھٹناگر پوچھتا۔

''آیا کیوں نہیں۔'' مولانا شگفتگی سے فرماتے۔ ''لیکن بس صرف ایک بار۔''

اس کے بعد وہ مزے میں آ کر اس زمانے کا ایک واقعہ سنانا شروع کرتے جب ریلوے لائن کے پاس ٹوٹی ہوئی مسجد میں رہتے اور انھیں سفلی علوم کا نیا نیا شوق ہوا تھا۔ ابھی ان کا جن طہارت کے لوٹے میں سے آدھا ہی نکلنے پاتا کہ فرخندہ جو کچھ لمحے چپکے سے اٹھ کر چلی گئی تھی واپس آ جاتی اور مولانا کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہتی:

''اجی مولانا صاحب قبلہ! یہ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی، ذرا جا کر مسجد سے گھڑا تو بھر لائیے۔''

''لیکن وہ پانی کیا ہوا جو میں شام کو بھر کر لایا تھا؟'' مولانا پوچھتے۔

بھٹناگر بول اٹھتا:

''آپ کا کوئی یارِ غار جن آ کر پی گیا ہوگا۔'' اور اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑتا۔

''بات یہ ہے مولانا صاحب!'' فرخندہ بیان کرتی۔ ''اس میں جھینگر مرا پڑا تھا۔ میں نے لے کے سارا پانی لنڈھا دیا۔ جائیے جائیے میرے اچھے مولانا صاحب! ابھی تو مسجد کا دروازہ کھلا ہوگا، بند ہو گیا تو رات بھر سب کے سب پیاسے مریں گے۔''

اس وقت جب کہ وہ محیر العقول چشم دید واقعہ سنا رہے ہوتے انھیں یوں بات کو ادھ بیچ میں چھوڑ کے جانا سخت ناگوار گزرتا۔ گھڑے تک پہنچنے اور پھر اسے اٹھا کر سیڑھیاں اترنے میں تو انھیں خاصا وقت لگ جاتا مگر ڈیوڑھی سے باہر قدم رکھتے ہی ان میں یک لخت چستی پیدا ہو جاتی، یہ اُمید، کہ شاید وہ واپس آ کر قصے کا سلسلہ اسی جگہ سے دوبارہ شروع کر سکیں جہاں اچانک اسے منقطع کر دیا گیا، انھیں تیزی سے مسجد میں پہنچا دیتی اور وہ جلد از جلد کنوئیں سے پانی نکالنا شروع کر دیتے۔ مگر آخر جب وہ گھڑا بھر کر گھر پہنچتے تو وہاں کا

نقشہ ہی بدلا ہوا پاتے۔ جہاں پہلے روحانیت کے اثر سے فضا میں پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کا سا گمان ہونے لگتا تھا وہاں اب نغمے لرز رہے تھے۔

نوجوان انقلابی شاعر شکیبی اپنی نظم "سرخ برکھا" سینتالیسویں بار ترنم سے سنا رہا تھا۔ یہ نظم کافی طویل تھی اور فرخ بھابی کو حد سے زیادہ مرغوب مولانا کا دل ٹوٹ جاتا اور اس رات وہ پھر کسی سے بات نہ کرتے اور جلد ہی کملی تان کے پڑ رہتے۔

اس محفل میں آئے دن اہم ملکی و معاشری مسائل پر گرما گرم بحثیں تو ہوا ہی کرتی تھیں مگر اس شام اہلِ مجلس کا جوش و خروش خاص طور پر دیکھنے کے قابل ہوتا جب کوئی صاحب نئی تجویز لے کر آتے، مثلاً ملک کی صحافت روز بروز گرتی جارہی ہے۔ ضرورت ہے کہ صحیح معنوں میں کوئی معقول روزانہ اخبار نکالا جائے مگر معقولیت کے لیے چونکہ مالی ذرائع کا وسیع ہونا ضروری تھا اس لیے صرف ایک پیسے والے ضمیمہ ہی پر اکتفا کیا جاتا۔ اس کا کچھ زیادہ خرچ بھی نہ ہوگا۔ یہی بیس پچیس روپے روز۔ اتنے کے تو صرف سینما ہی کے اشتہار فراہم کیے جاسکتے ہیں مگر نہ معلوم کام کی زیادتی کی وجہ سے یا ہر روز کی ذمہ داری کے خیال سے اس تجویز کا خیر مقدم زیادہ گرمجوشی سے نہ کیا جاتا اور روزانہ اخبار کی اسکیم جلد ہی ہفتہ وار اور ہفتہ وار سے ماہانہ رسالے میں بدل جاتی۔ اس پر نئے سرے سے خرچ کی میزان جوڑی جاتی۔ رسالے کا نام اور اس کے اغراض و مقاصد تجویز کرنے پر کافی بحثا بحثی ہوتی۔ رسالے کی ادارت کسی ایک صاحب کے سپرد نہیں کی جاسکتی بلکہ ایک پورا بورڈ اس کام کے لیے مقرر کرنا پڑے گا۔ بھٹناگر اپنے انشورنس کے کام کے ساتھ ساتھ رسالے کے لئے کنویسنگ بھی کرتا رہے گا۔ ڈاکٹر ہمدانی اپنے مریضوں میں توسیعِ اشاعت کی کوشش کرے گا۔ نیز رسالے کے خریداروں کو اس کے ہاں کی ادویہ رعایتی قیمت پر دستیاب ہوسکیں گی۔ مقامی پروپیگنڈے کا کام ٹرام کے کنڈکٹر قاسم اور نوجوان شاعر شکیبی کے سپرد ہوگا۔ رسالے کے سرورق اور اس کی ظاہری زیبائش کے لیے مسٹر سنگھا کی خدمات لی جائیں گی۔ رسالے کے

دفتر کے لیے کچھ زیادہ تردّد کی ضرورت نہیں، اس مقصد کے لیے بھلا فرخ بھابی کے گھر سے زیادہ موزوں جگہ اور کون سی ہو سکتی ہے۔ ۔ ۔ غرض یہ سارے مرحلے طے ہو جاتے اور اراکینِ مجلس کے شوق و گرمجوشی کو دیکھ کر گمان ہونے لگتا ہے کہ بس ہفتے عشرے تک رسالہ نکلا ہی چاہتا ہے مگر آخر میں ڈیکلریشن داخل کرنے کا کام کچھ ایسا بے ڈھب ثابت ہوتا کہ رسالے کی اشاعت برابر معرضِ تعویق میں پڑتی اور کچھ دنوں کے بعد یہ تجویز پرانی ہو کر اپنی ساری دل کشی کھو بیٹھتی۔

اسی طرح کبھی اس قسم کی تجویز ہوتی کہ اہلِ وطن کی صحت ناقص غذا کے باعث روز بروز گرتی جا رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ ان کیلئے وسیع پیمانے پر خالص دودھ اور گھی مہیا کیا جائے یعنی ایک ڈیری فارم کھولا جائے مگر سرمائے کی کمی اور فارم کی اہم ذمہ داریوں کو دیکھتے ہوئے اس اسکیم میں بھی برابر ترمیمیں ہوتی رہتیں یہاں تک کہ گائیں بھینس چھوٹی ہوتے ہوتے مرغیوں کی شکل اختیار کر لیتیں اور آخر میں کوئی صاحب مرغیوں کی کسی متعدی بیماری کا ذکر کر کے سب کو ہمیشہ کی نیند سُلا دیتے۔

ایسا ہی حشر نکالا لانڈری، کھادی بھنڈار اور غریبوں کے ہوٹل کا ہوا۔

کسی کسی روز خصوصاً سخت سردی کی راتوں میں یہ مجلس خالص تفریحی بھی ہوا کرتی اس شب تمام گفتگوؤں اور بحث مباحثوں کو بالائے طاق رکھ کر تاش کھیلا جاتا، عموماً ایک ہی کھیل غلام چور، جس میں ہر دفعہ چور کے لیے نرالی سے نرالی سزا تجویز کی جاتی۔

اس کھیل کی ابتدا یوں ہوتی کہ محفل میں ایک بارگی کسی صاحب کو سخت جاڑا لگنے لگتا۔ چنانچہ فرخ بھابی کے بستر سے اس کا ریشمی لحاف منگوایا جاتا جسے چاروں طرف پھیلا کر سب لوگ اپنی اپنی ٹانگوں پر لے لیتے۔ پھر کوئی صاحب چپکے سے بھٹناگر کے کوٹ کی جیب میں سے تاش نکال لیتے اور کسی سے پوچھے گچھے بغیر لحاف ہی پر سب کو پتے بانٹنے شروع کر دیتے، چنانچہ اس طرح بغیر کسی تمہید کے کھیل شروع ہو جاتا اور جب تک لالٹین میں

تیل ختم نہ ہو جاتا، برابر جاری رہتا۔ بعض دفعہ اذانیں تک سنائی دے دے گئیں۔ اس رات تاش کے ساتھ ساتھ مونگ پھلی بھی خوب کھائی جاتی چنانچہ فرش پر، لحاف پر، پتلون کی جیبوں میں، پاجامے کے نیفے میں، غرض جس جگہ دیکھو مونگ پھلی کے چھلکے ہی چھلکے ہاتھ آتے۔

یہ عجیب بات تھی کہ ہر چند فرخ بھائی کے دوستوں کی بے دینی، کفر والحاد کے درجے تک پہنچی ہوئی تھی، یہاں تک کہ مولانا بھی اپنے بعض عقاید کی بنا پر سخت گمراہ سمجھے جاتے تھے مگر وہ دینی معاملوں میں بڑی کٹر تھی۔ یہ ایک ایسا امر تھا جس میں اس کے دوستوں کے فعل اور کردار اس پر کچھ اثر نہیں ڈال سکے تھے۔ وہ سختی سے صوم وصلوۃ کی پابند تھی۔ ایسا تو کبھی ہوا کہ اس نے کسی وقت کی نماز قضا پڑھ لی ہو، مگر یہ کبھی نہیں ہوا کہ اس نے چھوڑ ہی دی ہو۔ جب نماز کا وقت ہوتا وہ چپکے سے اُٹھ کر اپنی کوٹھڑی میں چلی جاتی اور فریضہ ادا کر کے چلی آتی کبھی کبھی وہ محفل ہی میں بیٹھی دوپٹے کے نیچے تسبیح پھیرتی رہتی اور ساتھ ہی ساتھ دلچسپی سے کھیل اور کھلاڑیوں کو بھی دیکھتی اور مسکراتی رہتی۔

(۲)

کہتے ہیں جب کسی پر بُرا وقت آتا ہے تو خود بخود ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں کہ ان کا سان گمان بھی نہیں ہوتا۔

جنوری کی ایک صبح کو ابھی اندھیرا ہی تھا کہ فرخندہ کی آنکھ کھل گئی۔ یوں تو وہ نماز کے لیے ہر روز منہ اندھیرے اٹھنے کی عادی تھی مگر اس روز ابھی کچھ زیادہ ہی رات باقی تھی۔ دراصل اسے سوتے سوتے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اس نے اپنی کوٹھڑی کے باہر دالان میں کچھ کھٹر کا سا سُنا ہو۔ اور وہ چونک اُٹھی تھی۔ پہلے تو اس نے سوچا ممکن ہے یہ میرا وہم ہی ہو، پھر اسے مولانا اور ملازم لڑکے کا خیال آیا جو ساتھ والی کوٹھڑی میں سویا کرتے تھے،

ممکن ہے ان میں سے کوئی کسی ضرورت سے باہر نکلا ہو۔ یہ سوچ کر اس نے آنکھیں بند کرلیں مگر نیند نہ آئی اس نے دِل میں کہا، کیوں نہ آواز دے کر ان لوگوں سے پوچھ لوں چنانچہ اس نے لیٹے ہی لیٹے پکار کر کہا:

"مولانا صاحب! اجی مولانا صاحب . غفار، ارے او غفار!"

مگر دونوں میں سے کسی نے بھی رسید نہ دی۔ اس نے سوچا، کوٹھڑی کا دروازہ بند ہے، اس پر یہ لوگ گہری نیند سو رہے ہوں گے، میری آواز بھلا کہاں سنائی دی ہو گی، پھر خیال آیا، ان میں سے اگر کوئی باہر نکلا تھا تو ظاہر ہے کہ وہ اتنی جلدی دوبارہ سو نہیں گیا ہو گا جی تو ابھی گرم گرم بستر سے نکلنے کو نہیں چاہتا تھا مگر ظن جو بیٹھ چکا تھا۔ مجبوراً اٹھی۔ سرہانے کی کھونٹی پر سے گرم چادر اتار لی اوڑھ لی، پھر لالٹین روشن کی۔ اسے ہاتھ میں تھام کوٹھڑی کی کنڈی کھول باہر آگئی۔

باہر اس وقت کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی اور ہوا تھی کہ زناٹے سے چل رہی تھی۔ دانتوں کو بھینچ کپکپاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتی، سمٹتی سمٹاتی دوسری کوٹھڑی کے دروازے پر پہنچی۔

"مولانا صاحب! اجی مولانا صاحب!" اس نے پکار کر کہا۔

مگر مولانا نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا۔ دروازے کو ہاتھ لگانا تھا کہ کواڑ ایک دم سے "چی یوں" کر کے کھل گئے۔ وہ کچھ ڈر سی گئی، مگر پھر اس نے دل کو مضبوط کیا اور جس ہاتھ میں لالٹین تھی اسے اونچا کر کے کوٹھڑی میں داخل ہو گئی لالٹین کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ مولانا تو حسبِ معمول فرش پر اپنی کملی میں گٹھڑی سے بنے پڑے ہیں مگر ملازم لڑکا غفار موجود نہیں، نہ اس کا بستر ہی اسے نظر آیا۔ معاً اسے اپنی سلائی کی مشین کا خیال آیا جو اسی کوٹھڑی کے ایک کونے میں پڑی رہا کرتی تھی اور اس کی نظریں آپ سے آپ کونے کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا مشین وہاں نہیں تھی۔

"مولانا صاحب! مولانا صاحب!" اس نے مولانا کو جھنجھوڑتے ہوئے پُر اضطراب لہجے میں کہا: "اٹھیے اُٹھیے۔ چوری ہوگئی۔"

"ایں چوری ہو گئی؟" مولانا آخر ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ "کب؟ کس کے ہاں؟" اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے فرخندہ کا منہ تکنے لگا۔

"ہمارے ہاں اور کس کے!" فرخندہ نے کہا۔ "غفار میری سلائی کی نئی مشین چُرا لے گیا۔"

"غفار؟"

"ہاں وہی"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا!"

"تو پھر کہاں ہے وہ؟ بستر بھی تو نہیں ہے اس کا۔"

اس کے جواب میں مولانا نے اپنی آنکھوں کی پتلیوں کو پھرا کر کوٹھڑی کا جائزہ لیا پھر لمحہ بھر خاموش رہے پھر وہ بڑبڑائے:

"ہات تیرے مردُود کی!"

"ابھی اس کی آدھی قسطیں بھی تو میں نے ادا نہیں کی تھی۔ ہائے اب کیا ہو گا۔ مجھے کئی دِنوں سے اس کے طور بدلے ہوئے نظر آرہے تھے۔ دو ایک بار خیال بھی آیا کہ رات کو مشین اپنے کمرے میں رکھوالیا کروں مگر ایک تو اس میں جگہ ہی کہاں تھی، دوسرے آپ پر بھروسہ تھا کہ آپ یہاں سوتے ہیں، دیکھ بھال کرتے رہیں گے۔"

مولانا کچھ دیر قصورواروں کی طرح گردن جھکائے چپ بیٹھے رہے۔ علاوہ ازیں ابھی اعضا پر نیند کا کچھ کچھ اثر باقی تھا۔ اچانک انھوں نے جھرجھری لی اور بولے:

"فرخ بھابی! فکر نہ کرو مشین کہیں نہیں جا سکتی۔ اللہ نے چاہا تو کل ہی پکڑا جائے گا مردُود۔"

"میں سو رہی تھی کہ کھڑ کا سُن کر میری آنکھ کھل گئی۔ وہ ابھی ابھی لے گیا ہے کچھ دور نہیں گیا ہوگا۔ ہائے ہوتا کوئی ہمت والا، ابھی جا کر اسے پکڑ لاتا۔"

"گھبراؤ نہیں، میں ابھی اس کے پیچھے جاتا ہوں۔" اچانک مولانا کی مردانگی نے جوش مارا مگر باہر اس وقت ایسی ہمت شکن سردی پڑ رہی تھی کہ فوراً اُن کو اپنے ارادے میں ترمیم کرنی پڑی۔

"پکڑ تو میں اسے ضرور لاؤں گا۔" وہ بولے۔ "پاتال میں ہوگا، پاتال سے بھی کان پکڑ کر کھینچتا ہوا لے آؤں گا، مگر ذرا دن نکل آئے، اس وقت اندھیرے میں کہیں چھپ گیا تو نظر تھوڑا ہی آئے گا سوّر کا بچہ۔"

"بس رہنے دو مولانا صاحب۔" فرخندہ نے کسی قدر تلخی سے کہا: "اس وقت آپ کے جانے کی ضرورت نہیں، صبح کو میں خود ہی کسی کو تھانے بھیج کر رپٹ لکھوادوں گی۔"

مولانا کو اپنے معقول عذر کے جواب میں یہ سرد مہرانہ کلام سننے کی توقع نہ تھی۔ وہ کچھ دیر تک سر جھکائے سوچتے رہے۔ پھر جانے کیا خیال آیا کہ انہوں نے تکیے کے نیچے سے اپنی پگڑی نکالی، دو ایک دفعہ اسے پھٹکا اور پھر اسے سر پر باندھ لیا۔ پھر کملی جھاڑ اس کی بکل ماری اور جوتی پہن کوٹھڑی سے باہر نکل گئے۔

"کوئی آدھ گھنٹے کے بعد وہ ٹھٹھرتے ہوئے واپس آئے۔ اس اثنا میں فرخندہ غم سے نڈھال، اپنی کوٹھڑی میں جا کر لیٹ رہی تھی۔

"میں سارے میں دیکھ آیا مردُود کو۔" وہ فرخندہ کے پلنگ کے پاس آ کر کہنے لگے: "پہلے اسٹیشن پہنچا۔ وہاں سارے مسافر خانے دیکھ ڈالے۔ ایک ایک قلی سے پوچھا، جب کہیں نظر نہ آیا تو وہاں سے سیدھا لاریوں کے اڈے پر پہنچا۔ لاری میں دو مسافر سو رہے تھے۔ باقی سب خالی پڑی تھیں، پھر ادھر سے باغ میں دیکھتا بھالتا ٹھٹھر والی سرائے میں آیا مگر وہاں بھی اس مرُدود کا کھوج نہ ملا ... بی بی تم فکر نہ کرو۔ تمہاری مشین کہیں جا نہیں سکتی۔

راستے میں مجھے جتنے سپاہی اور چوکیدار ملے میں نے سب کو اس کا حلیہ بتا دیا ہے میرے مولا نے چاہا تو آپ ہی آپ پکڑا ہوا آئے گا، نامراد۔"

فرخندہ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا، ادھر اَب مولانا نے بھی اس کی ضرورت نہ سمجھی اور وہ اپنی کوٹھڑی میں آ کر پہلے کی طرح دراز ہو گئے۔

اس شام جب فرخندہ کے دوستوں نے اس چوری کا حال سنا تو سب کو انتہائی افسوس ہوا۔ خاص طور پر محسن عدیل کو سخت رنج اور غصہ تھا کیونکہ اس لڑکے کو لانے اور فرخندہ کے ہاں رکھوانے کی ذمہ داری اسی کی تھی۔ اس نے فرخندہ کو تسکین دیتے ہوئے کہا:

"بھابی فکر نہ کرو، میں غفار کے باپ کو جانتا ہوں اور مجھے اس گاؤں کا بھی پتا ہے جہاں وہ رہتا ہے۔ اگر دو چار دن میں اس کا سراغ نہ ملا تو میں خود اس گاؤں میں جاؤں گا اور اس کا کھوج نکالوں گا۔"

دن میں تھانے میں رپٹ لکھوا دی گئی تھی۔ چنانچہ ضابطے کی کارروائی پوری کرنے کے لیے ایک بے وردی حوالدار ایک سپاہی کو ساتھ لے کر موقع واردات کا معائنہ کر گیا تھا۔ فی الحال اس کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا تھا چنانچہ سب نے فرخ بھابی کو صبر کی تلقین کی اور یقین دلایا کہ ہم میں سے ہر ایک ہر روز شہر کے مختلف حصوں کا چکر لگائے گا اور جہاں جہاں درزیوں کی دُکانیں ہیں ان سب سے پوچھ گچھ کرے گا۔ فرخندہ کے دوستوں کی یہ متفقہ رائے تھی کہ غفار مشین لے کر شہر سے باہر نہیں جا سکتا کیونکہ خفیہ پولیس والے اسٹیشن اور شہر کے ناکوں کی کڑی نگرانی کرتے ہیں اور جہاں کسی مشتبہ آدمی کو کوئی قیمتی چیز لے جاتے دیکھتے ہیں وہیں روک لیتے اور تحقیقات کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ گمان غالب یہی ہے کہ اس نے چوری سے پہلے ہی کسی درزی سے بات طے کر رکھی ہو گی۔

فرخندہ گم سم بیٹھی ان کی باتیں سنتی رہی۔ اس چوری سے اسے سخت دھکا لگا تھا۔ مشین کیا گئی گویا درزی کا دھندا ہی جاتا رہا تھا۔ اب تکنائیاں اور بٹوے سیئے تو کس سے۔ علاوہ

ازیں جو کچھ اسٹاک پہلے کا اس کے پاس تیار تھا اس کے نکاس کی بھی کوئی صورت نہیں رہی تھی۔ مستقبل کے خیال نے اسے دن بھر ایسا مغموم اور پریشان رکھا تھا کہ اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ جب اس کے دوستوں کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ اسے سمجھانے لگے۔

"واہ فرخ بھائی واہ!" قاسم نے کہا۔ "تم نے تو حد کر دی میں تمہیں اتنے کمزور دل کی نہ سمجھتا تھا۔ ایسے واقعات تو پیش آتے ہی رہتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ انسان اپنے کو بھوکوں مار ڈالے۔"

"فرخ بھائی! انشورنس ایجنٹ بھٹناگر نے کہا۔ "اوّل تو پوری اُمید ہے کہ تمہاری مشین مل جائے گی لیکن فرض کرو اگر نہ ملی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہفتہ بھر میں کسی اور مشین کا انتظام کر دوں گا۔ بس اَب مطلق غم نہ کرو۔ اُٹھو کھانا کھاؤ۔ مولانا صاحب! دسترخوان بچھائیے!"

"دسترخوان بچھ کر کیا کرے گا۔ کچھ پکا بھی ہو۔" مولانا نے کہا۔

"ارے بھئی گھر میں کچھ نہیں پکا تو بازار تو نہیں اُجڑ گیا۔" بھٹناگر نے یہ کہتے کہتے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک نئی چمکدار اٹھنی نکالی۔

"بھئی کچھ ٹوٹے، ہوئے پیسے میرے پاس بھی ہیں۔" قاسم نے کہا اور اپنی قمیص کی جیب سے ریزگاری نکالی۔ اس میں ایک دوّنی، دو اکنیاں، چار اوھنے اور تین پیسے تھے۔

"ایک دوّنی میرے پاس بھی ہے۔" نوجوان انقلابی شاعر شکیبی نے اپنی شیروانی کی جیب ٹٹولتے ہوئے کہا۔ ' اگر گر نہیں گئی تو نہیں گری نہیں یہ رہی۔"

غرض بازار سے سالن روٹی اور کباب وغیرہ منگوائے گئے اور روز کی طرح دسترخوان بچھایا گیا اور سب کھانے میں شریک ہوئے۔ فرخ بھائی نے بڑے اصرار اور قسمیں دلانے کے بعد صرف چند لقمے کھائے اور اُٹھ گئی۔

اس شام محفل خاصی اداس اور بے رونق ۔ رہی اور سب لوگ جلد ہی اپنے اپنے گھر

چلے گئے۔

اس واقعہ کو چار روز گزر گئے۔ اس دوران میں نہ تو غفار ہی کا کچھ پتہ چلا اور نہ نکٹائیاں اور بٹوے وغیرہ بیچنے کے لیے کسی دوسرے آدمی کا انتظام ہی ہو سکا، علاوہ ازیں بجتا گرنے دوسری مشین لانے کا جو وعدہ کیا تھا وہ بھی کسی وجہ سے پورا نہ ہو سکا۔ فرخندہ نے اپنی پہلے دن کی کمزوری کے بعد اپنا غم پھر کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ دوسرے روز سے اس کے ہاں پھر سے دونوں وقت چولہا جلنے لگا تھا۔ کچھ تو وہ پکا لیتی اور کچھ اس کے دوست لے آتے اور وہ پہلے کی طرح سب کے ساتھ مل کر کھا لیتی۔ کبھی کبھی وہ ہنس بول بھی لیتی مگر دل ہی دل میں خوب سمجھتی تھی کہ اس حالت میں کے دن گزر ہو سکے گی۔

ساتویں روز سہ پہر کو جب گھر میں اس کے اور مولانا کے سوا اور کوئی نہ تھا تو اس نے مولانا سے بڑی لجاجت سے کہا: "مولانا صاحب! مجھے ابھی بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ جب تک دوسرے لڑکے کا انتظام نہیں ہو جاتا، میری نکٹائیاں اور بٹوے آپ بازار لے جائیں تو کیسا رہے؟"

مولانا نے ایسی نظروں سے فرخندہ کی طرف دیکھا گویا یہ بات ان کی سمجھ میں مطلق نہیں آئی۔

"میرے اچھے مولانا صاحب! آپ لے جائیں گے نا؟"

"دیکھیں بات یہ ہے کہ میں نے ایسا کام کبھی کیا نہیں۔"

"واہ اس میں کون سی مشکل بات ہے۔ نکٹائیاں لے کر نکڑ پر کھڑے ہو جایئے۔ بولنے کی بھی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی دیکھنے کو ٹھہر جائے اور دام پوچھے تو بتا دیجئے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر..."

"مگر کیا؟"

"مجھے شرم آتی ہے۔"

”واہ محنت میں بھلا کیا شرم۔ کیا محنت کوئی عیب کی بات ہے؟“

”نہیں یہ بات تو نہیں مگر ......“

غرض بڑی ہچکچاہٹوں کے بعد مولانا باوِلِ ناخواستہ نکٹائیاں اور بٹوے لے کر بازار گئے۔ فرخندہ دل ہی دل میں دعائیں مانگتی اور بے تابی سے ان کا انتظار کرتی رہی، آخر کوئی ساڑھے آٹھ بجے کے قریب وہ واپس آئے۔ ان کے چہرے سے ایسی پریشانی اور تکان ظاہر ہو رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا وہ کسی سخت آزمائش میں سے گزر کر آرہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ صرف ایک بٹوا چونی میں بیچ سکے۔ فرخندہ نے جب ان سے نکٹائیاں واپس لے کر گنیں تو دو درجن میں سے پانچ غائب تھیں۔ وہ ہزار ہزار قسمیں کھانے لگے کہ انھیں ان کا کچھ علم نہیں۔ بار بار یہی کہتے تھے کہ اصل میں وہ تھیں ہی اتنی اور فرخندہ سے گننے میں غلطی ہوگئی تھی۔ بہرحال یہ ظاہر تھا کہ یا تو راستے میں ان سے کہیں گر پڑی تھیں اور یا دیکھنے دیکھنے میں یار لوگ اُڑا لے گئے تھے۔

پورے دو ہفتے گزر گئے۔ محسن عدیل ابھی تک اس گاؤں میں نہیں جا سکا تھا جہاں غفار کا باپ رہتا تھا۔ اس نے فرخ بھابی سے وہ وعدہ تو کر لیا تھا مگر ہر روز کچھ ایسا کام نکل آتا کہ اس کا جانا معرضِ التوا میں پڑ جاتا۔ اس کے دوسرے دوستوں نے تھانے، اسٹیشن اور شہر کے گلی کوچوں کے بہتیرے چکر کاٹ لیے تھے مگر نہ تو انھیں غفار ہی کہیں نظر آیا تھا اور نہ مشین ہی کا کچھ سراغ مل سکا تھا۔

فرخندہ نے یہ زمانہ بڑے صبر اور حوصلے سے گزارا اور اپنی ظاہری حالت کو برقرار رکھنے کے لیے انتہائی جدوجہد کی۔ وہ اپنے دوستوں کو اپنی پریشانیوں میں شریک کرنا نہیں چاہتی تھی چنانچہ نہ تو اس نے کسی دوست سے کوئی فرمائش کی اور نہ اشارے کنائے سے ہی کچھ امداد چاہی۔ اس کے دوست اپنی خوشی سے شام کو کھانے کے لیے کچھ لے آتے تھے تو اپنے ہاں کی دال بھاجی کے ساتھ اسے بھی دسترخوان پر چن دیتی اور پھر ہنسی خوشی سب کے

ساتھ مل کر کھالیتی۔ محفل برخاست ہونے پر جب اس کے دوست اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے تو وہ دیر تک بستر پر پڑی اپنی حالت پر غور کرتی رہتی۔ اس مصیبت میں اسے کسی دوست سے گلہ یا شکایت نہ تھی کیونکہ وہ خوب جانتی تھی کہ خود ان میں سے کسی کی حالت بھی اطمینان بخش نہ تھی۔ اگر وہ دس روز کام کرتے تھے تو بیس روز بیکار پھرتے تھے۔ پھر جو مستقل طور پر کسی دُھندے میں لگے تھے ان کی آمدنی بھی اس درجہ قلیل تھی کہ وہ اس میں بمشکل اپنا اور متعلقین کا پیٹ ہی بھر سکتے تھے، کسی دوسرے کی امداد تو کیا کرسکتے۔ انہی غموں فکروں میں پڑی رات رات بھر جاگا کرتی یہاں تک کہ مؤذن کی آواز سنائی دینے لگتی اور وہ جلدی سے اُٹھ کر نماز کی تیاری میں لگ جاتی۔

اس نے اپنی کفایت شعاری اور سلیقہ مندی سے جو تھوڑی سی پونجی آڑے وقت کے لیے بچا رکھی تھی وہ تو بیکاری کے پہلے ہفتے ہی کی نذر ہو چکی تھی۔ اس کے بعد گھر کی چھوٹی چھوٹی چیزوں اور ان برتنوں کی باری آئی جو بہت ضروری نہیں تھے۔ وہ چپکے چپکے مولانا کی معرفت انھیں بیچتی رہتی۔ مولانا کو سخت تاکید تھی کہ کسی سے کہنا نہیں۔ جب مہینہ ختم ہوا اور مکان دار کا آدمی کرایہ اور مشین والا قسط اگاہنے آیا تو وہ مولانا کو ساتھ لے کر بازار گئی اور اپنا وہ ننھا منا طلائی بربط جسے وہ کبھی کبھی سیاہ ربن کے ساتھ گلے میں باندھا کرتی تھی سنار کے ہاتھ بیچ ڈالا اور اس طرح کسی کو کانوں کان خبر ہوئے بغیر اس نے مکان کا کرایہ بھی ادا کردیا اور مشین کی قسط بھی دے دی۔

اسی زمانے کا ذکر ہے ایک شام ابھی فرخ بھابی کی محفل میں چار پانچ ہی آدمی آئے تھے کہ مولانا ایک اجنبی کو لیے ہوئے آگئے۔ وہ دوپہر کے بعد نہ جانے کب سے غائب رہے تھے۔ دالان سے گزرتے ہوئے انھوں نے بڑی گرمجوشی سے اپنے ساتھی سے کہا:

''بلا تکلف اندر تشریف لے چلئے میر صاحب! اپنا ہی گھر ہے۔'' ان کے لہجے سے بڑی چونچالی ٹپک رہی تھی۔

سب لوگ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ شخص کون ہے اور کیوں آیا ہے۔ فرخندہ نے جلدی سے سر پر دوپٹہ درست کیا۔ وہ بار بار مولانا کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھتی تھی مگر مولانا تھے کہ ملتفت ہی نہ ہوتے تھے۔

”آئیے آئیے! غریب خانہ میں تشریف لے آئیے ... بہت مدت بعد آنا ہوا ... ٹھہریے میں ذرا فرش جھاڑ دوں۔“

کھونٹی پر ایک میلا سا تولیا ٹنگا ہوا تھا، مولانا نے جلدی سے اسے اتار کر فرش کے ایک کونے کو جھاڑا۔ چاندنی کی سلوٹیں نکالیں اور اجنبی کو اس جگہ بٹھا دیا۔ سب لوگ اس دوران میں آپ ہی آپ ذرا ذرا پرے کھسک گئے تھے۔ ہر شخص نقادانہ نگاہوں سے نووارد کو دیکھ رہا تھا اور واقعی وہ شخص تھا بھی نقادوں ہی کے دیکھنے کی چیز، بلند و بالا قد، چوڑا سینہ، لمبے لمبے ہاتھ پاؤں، عمر تقریباً چالیس برس، گندمی رنگ، آنکھیں چھوٹی چھوٹی جن میں سرمے کے ڈورے، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، ان کو بل دیا ہوا سر سے پیر تک دیہاتی امارت اور بانکپن کا نمونہ، کرتے میں سونے کے بٹن لگے ہوئے اس پر سرخ بانات کی واسکٹ اور اس پر سیاہ شیروانی۔ شیروانی کے سینے سے اوپر کے بٹن کھلے ہوئے جس کی وجہ سے نیچے کی واسکٹ اور کرتا دکھائی دے رہا تھا۔ شیروانی کی جیب میں گھڑی، جس کی طلائی زنجیر شیروانی کے کاج سے اٹکی ہوئی۔ زنجیر کے ساتھ ایک ننھا سا طلائی قطب نما آویزاں۔ ایک گھڑی کلائی پر بندھی ہوئی۔ اس کے سنہرے رنگ کی حفاظت کے لیے اس پر سفید سلولائڈ کا خول چڑھا ہوا۔ شیروانی کے بٹن چاندی کے بڑے بڑے چوکور جن پر نیلا نیلا چاند تارا بنا ہوا۔ ایک ریشمی رومال شیروانی کی بائیں آستین کے اندر ٹھنسا ہوا۔ داہنے ہاتھ کی چھنگلیاں میں سونے کی انگوٹھی جس میں بڑا سا ہلکے آسمانی رنگ کا نگینہ جڑا ہوا۔ چوڑی دار پاجامہ، پاؤں میں سرخ ریشمی جرابیں، سر پر رامپوری وضع کی اودے رنگ کی مخملی ٹوپی۔

دو تین لمحے خاموشی رہی جس کے دوران میں مولانا کے سوا ہر شخص بے چینی محسوس

کرتا رہا۔

"آپ ہیں۔" بالآخر مولانا نے زبان کھولی۔ "میرے خاص کرم فرما اور ہم وطن، میر نوازش علی۔ ہمارے قصبے کے سب سے بڑے تعلقہ دار قبلہ میر حشمت علی کے بڑے صاحبزادے مجھے بچپن سے آپ کی دوستی کا فخر حاصل ہے اور، میر صاحب یہی ہیں ہماری فرخ بھابی اور یہ ہیں ان کے وہ دوست جن کا حال میں راستے میں آپ سے عرض کر چکا ہوں۔"

تعارف کا یہ طریقہ فرخندہ کے دوستوں کو کچھ بے تکا معلوم ہوا، چنانچہ بعض نے منہ پھیر کر تو بعض نے ناک سکوڑ کر اظہارِ ناپسندیدگی کیا۔

"ہمارے میر صاحب کو شعر و شاعری سے خاص لگاؤ ہے۔" مولانا نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "ماشاءاللہ بچپن ہی سے تو ایسے ذہین تھے کہ سات برس کی عمر میں کلام مجید ختم کیا۔ دس برس کی عمر میں گلستان اور بوستان پڑھ لی۔ گیارہ برس کی عمر میں دیوانِ حافظ ختم کر لیا۔ "بارہ برس کی عمر میں بھئی۔" میر صاحب نے دبی آواز میں قطع کلام کرتے ہوئے کہا:

"چلئے بارہ برس ہی میں سہی۔" مولانا نے خندہ پیشانی سے اپنی غلطی کو تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن بارہ برس کا سن بھی کوئی سن ہے۔ آج کل کے نئی روشنی کے زمانے کے کسی پڑھے لکھے سے کہیے تو حافظ کا ایک مصرع بھی صحیح پڑھ دے۔ بس بغلیں جھانکنے لگے گا وہیں۔ البتہ انگریزی انہوں نے نہیں پڑھی، وہ یوں کہ خاندانی وضع داری کے خلاف تھا اور ضرورت بھی کیا تھی۔ خدانخواستہ کسی انگریز کی نوکری تھوڑی کرنی تھی اللہ رکھے اپنی لاکھوں کی جاگیر ہے۔ ہم جیسے بیسیوں جوتیاں چٹخاتے ان کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔ .."

"ارے بھئی چھوڑو بھی ان باتوں کو۔" میر صاحب بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے بولے۔ دراصل وہ حاضرین کے چہروں سے بھانپ گئے تھے کہ وہ اس ذکر سے اُکتا گئے ہیں انھوں نے شیروانی کی جیب سے پانوں کی مراد آبادی منقش ڈبیا نکالی اور اسے کھولتے ہوئے

محسن عدیل کی طرف بڑھایا جو اُن کے قریب ہی بیٹھا تھا۔

"شوق فرمایئے۔"

"تسلیم۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس نعمت سے محروم ہوں۔"

"آپ لیجیے۔" میر صاحب نے ڈبیا دیپ کمار کو پیش کی۔

"معاف کیجیے گا۔پان تو میں بھی نہیں کھایا کرتا۔"

"ارے کھا بھی لو میرے یار۔" مولانا بولے۔"ایسا ہی ہے تو تھوک دینا۔"

مگر دیپ کمار نے ڈبیا کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا۔دو آدمیوں کے انکار کر دینے پر میر صاحب کو پھر کسی کو پان پیش کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔

"لایئے مجھے دیجیے۔" فرخندہ کو میر صاحب پر رحم آ گیا، اور وہ بولی۔"اگرچہ یہ نہایت نازیبا بات ہو گی کیونکہ پان پیش کرنے کا فرض تو میرا تھا۔" اور ایک خاص ادا کے ساتھ مسکراتے ہوئے اس نے میر صاحب سے ڈبیا لے لی۔ میر صاحب نے خوش خوش شیروانی کی دوسری جیب سے چھالیا کا بٹوا، جو کمخواب کا بنا ہوا تھا، نکالا اور بڑے تکلف سے پیش کیا۔

"میر صاحب! یہ بٹوا تو بہت نفیس ہے۔" فرخندہ نے بٹوے کو ایک ماہر کی طرح پرکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کی نذر ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔"

"تسلیم۔" فرخ بھابی نے مسکرا کر کہا۔

مولانا کی باچھیں کھل گئیں۔

"فرخ بھابی خود بہت اچھے بٹوے بنانا جانتی ہیں۔" وہ میر صاحب سے بولے، "کپڑا آپ لا دیجیے، سلوا ہم دیں گے۔"

بھٹناگر دیر سے ضبط کیے بیٹھا تھا مگر اب اس سے نہ رہا گیا۔ اس نے اچانک بڑے زور سے جمائی لی اور میر صاحب کو اس انداز سے مخاطب کرتے ہوئے گویا برسوں کی شناسائی ہے،

کہنے لگا:

"کہیے میر صاحب! دِلّی کیسے آنا ہوا؟ تفریح یا کوئی اور مقصد تھا؟"

قبل اس کے کہ میر صاحب جواب دیتے مولانا فوراً بول اُٹھے:

"اجی تفریح کی ان کو اپنے وطن میں کیا کمی ہے، یہاں تو ایک مقدمے کے سلسلے میں آئے ہیں۔"

"آپ کو یہ مل کیسے گئے؟" بھٹناگر نے پوچھا۔

"یہ بھی حُسنِ اتفاق تھا۔" مولانا بولے۔ "میں گھنٹہ گھر سے گزر رہا تھا کہ میری نظر ایک بزاز کی دُکان پر پڑی۔ دیکھا کہ زربفت کے تھانوں کے ڈھیر سامنے لگے ہیں اور حضرت ہیں کہ سب کو ناپسند کرتے چلے جاتے ہیں، مجھے دیکھا تو پہچانا تھوڑا ہی۔"

"بھئی مولانا صاحب!" میر صاحب قطع کلام کر کے بولے۔ "میں پھر کہتا ہوں، معاف کرنا، میں پہلے واقعی آپ کو نہیں پہچان سکا تھا۔"

"خیر وہ پہلے نہ سہی، بعد میں سہی پہچان تو لیا نا۔ بس میں پھر اصرار کر کے انھیں ساتھ ہی لیتا آیا۔"

چند لمحے خاموشی رہی جس میں اس بے کیف بات چیت کے بجائے سب کو ایک طرح کا سکون نصیب ہوا۔ محسن عدیل کے بشرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے ان میر صاحب کا آنا اور سب کے درمیان یوں بے تکلف بیٹھنا اور فرخ بھابی سے باتیں کرنا سخت ناگوار گزر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے مولانا پر بھی بے حد غصہ آ رہا تھا جس نے بغیر بتائے، بغیر صاحبِ خانہ سے اجازت لیے، ایک اجنبی کو ان سب کے سر پر لا مسلط کیا تھا۔

"کیوں تعلقہدار صاحب۔" عدیل نے استہزا آمیز سنجیدگی سے میر صاحب کو مخاطب کیا "آپ کے ہاں تو سب خیریت ہے نا؟"

"کیا مطلب؟" میر صاحب نے متعجب ہو کر پوچھا۔

"مطلب یہ کہ گڑبڑ تو نہیں کچھ؟"

"معاف کیجیے گا، میں اَب بھی آپ کا مطلب سمجھنے سے قاصر ہوں۔"

"اجی وہ نئی تحریک چلی ہے نا آج کل کسانوں میں۔"

"کیسی تحریک؟ واللہ مجھے تو اس کا مطلق علم نہیں۔"

"اجی یہی کسان کہتے ہیں نا، زمین میں ہل ہم جوتتے ہیں، کھیتی کسانی ہم کرتے ہیں جاڑے گرمی کی سب تکلیفیں ہم سہتے ہیں مگر جب فصل پک کر تیار ہوتی ہے تو زمیندار سارے اناج کا دعوی دار بن جاتا ہے اور ہمارے لیے اتنا بھی نہیں چھوڑتا کہ ہمارے بیوی بچے دو وقت اپنا پیٹ بھر سکیں۔ وہ کہتے ہیں یہ سچ ہے کہ زمیندار زمین کا مالک ہوتا ہے مگر وہ اتنی سی بات کا ہم سے بدرجہا زیادہ فائدہ اُٹھاتا ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنی محنت کا پورا پورا حصہ ملنا چاہیے۔ یہ تحریک رفتہ رفتہ مختلف صوبوں میں پھیلتی جارہی ہے اور وہ دن دُور نہیں کہ سارے ملک کے کسان ایک جھنڈے تلے جمع ہو جائیں اور تمام تعلقہ داروں اور زمینداروں کے خلاف بغاوت کردیں۔

"الحمدللہ۔" میر صاحب نے کہا۔ "میرا علاقہ اس قسم کی لغویات سے پاک ہے اور بفضلہٖ میرے ہاں کے کسان سب کے سب خوش اور میرے وفادار ہیں۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ خوش ہیں۔"

"بس ہیں خوش۔"

"آخر اس کا کوئی ثبوت بھی؟"

"ثبوت؟ یہی کیا کم ثبوت ہے کہ ان میں سے کسی نے آج تک مجھ سے کوئی شکایت نہیں کی۔"

ممکن ہے وہ آپ کے پاس آتے ہوئے ڈرتے ہوں یا ممکن ہے کہ وہ آپ کے سنگدلانہ نظام سے اس قدر مایوس ہو چکے ہوں کہ وہ اس سے کسی انصاف یا رحم و کرم کی توقع ہی نہ رکھتے

ہوں۔"

"اجی چھوڑیے بھی۔" مولانا جنہیں اب صبر کی تاب نہ رہی تھی اچانک بیچ میں بول اٹھے۔ ""کیا قصہ لے بیٹھے ہو، ہم تو میر صاحب کو لائے تھے کہ کچھ شعر وشاعری کی باتیں ہوں گی، کچھ گل دبلبل کے قصے دہرائے جائیں گے، کچھ میر صاحب کا دل بہلے گا، کچھ میر صاحب آپ کا دل بہلائیں گے۔ گھڑی دو گھڑی کے لیے پُر لطف صحبت رہے گی مگر یہاں خشک سیاسیات کی بحث چھڑ گئی۔ لاحول ولا قوۃ۔ہاں شکیبیؔ صاحب کوئی ہلکا پھلکا گیت نہ ہو جائے۔"

"مجھے تو اس وقت معاف ہی رکھیے۔" شکیبیؔ نے جواب دیا۔ "صبح سے میرے سر میں درد ہے۔"

"مولانا نے دیکھا کہ یہ تیر کارگر نہیں ہوا تو وہ فرخندہ کی طرف متوجہ ہوئے:

"فرخ بھابی! آج کچھ کھلاؤ گی نہیں، بھوکا ہی مارو گی؟"

اس غیر متوقع فرمائش پر فرخ بھابی اچانک جھینپ کر رہ گئی۔ مولانا نے آج شام جو رویہ اختیار کیا تھا اس نے سب کو محوِ حیرت کر دیا۔ اگر ان کا دماغ چل نہیں گیا تھا تو وہ آج ضرور کوئی نشہ کر کے آئے تھے جس نے ایک ہی دم ان کی سوئی ہوئی نامعلوم قوتوں کو بیدار کر دیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ فرخندہ کے ہاں ان کی حیثیت اگر نوکر کی نہیں تو ایک ایسے غریب اور لاچار رشتہ دار کی ضرور تھی جو اپنے نسبتاً خوش حال عزیزوں کے ٹکڑوں پر پڑا ہو اور نوکر سے زیادہ کام کرتا اور اس سے بدتر حال میں رہتا ہو۔ یا تو وہ عام تضحیک کا شکار ہو کر ہر وقت دبے دبے اور چپ چپ رہتا اور کسی نے کوئی کام کرنے کو کہا تو جل کڑھ کر کرتا اور یا آج یہ حالت تھی کہ وہ خود صاحبِ خانہ بنے ہر ایک پر حکم چلا رہے تھے، پھر دنیا بھر کی زندہ دلی ان میں بھر گئی تھی۔ فرخندہ، جو طبعاً حلیم تھی ان کی کایا پلٹ پر دل ہی دل میں محظوظ ہو رہی تھی مگر جب انھوں نے کھانے کی فرمائش کی تو وہ بلبلا ہی تو اٹھی۔ کم بخت کو اچھی طرح

معلوم ہے کہ ان دنوں کس قدر تنگی ترشی میں گزر رہی ہے، اس کے باوجود یہ ایک غیر آدمی کے سامنے رسوا کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ ادھر فرخندہ کے دوست بار بار تیز تیز نظروں سے مولانا کو گھور رہے تھے۔ ان نظروں سے جو مستقبل قریب میں نہایت ناخوشگوار نتائج کی طرف کھلے بندوں اشارے کر رہی تھیں مگر مولانا کو آج کسی کا ڈر نہ تھا۔

"ارے بھئی فرخ بھابی!" وہ اپنی چونچالی کو بدستور قائم رکھے ہوئے کہہ رہے تھے۔ "تم تو سوچ میں پڑ گئیں، جو کچھ دال دلیا موجود ہے، لے آیئے۔ میر صاحب سے کیا پردہ، یہ تو اپنے ہی آدمی ہیں ... ہاں بھٹناگر صاحب کچھ ریزگاری ہو تو نکالیے، کباب و باب کے لیے۔"

بھٹناگر کے چہرے کا رنگ اچانک متغیر ہو گیا۔ اس کا ہاتھ کوٹ کی اندرونی جیب تک گیا اور وہیں رہ گیا۔

اس پر میر صاحب نے کھنکھار اور حاضرین پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بڑی ملائمت سے کہا:

"حضرات میری گستاخی کو معاف فرمایئے گا۔ مجھے اس محفل کی بے تکلفی کا پورا پورا حال مولانا صاحب سے معلوم ہو چکا ہے اور اسی لیے مجھے جرأت ہوئی کہ دسترخوان میں کچھ میرا بھی حصہ ہو۔ یہ حقیر رقم اس خاکسار کی طرف سے قبول کیجیے۔"

قبل اس کے کہ فرخ بھابی یا محفل کا کوئی رکن احتجاج کرنے پاتا، انھوں نے جھٹ بٹوے میں سے دس روپے کا نوٹ نکال، فرش پر ڈال دیا۔

لمحہ بھر کے لیے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے ذلت، غصے، نفرت اور بیزاری کے مِلے جُلے جذبات کا وہ طوفان جو آدھ گھنٹے سے دلوں میں بڑھتا ہی جاتا تھا یک لخت اپنے بند توڑ کر پھوٹ پڑے گا مگر میر صاحب کے چہرے سے ایسا خلوص اور نیک نیتی برس رہی تھی کہ کسی کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا اور وہ سب دم بخود رہ گئے۔

لمحہ بھر تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد میر صاحب نے مولانا سے کہا:

"حضرت جائیے آپ ہی ہمت کیجئے۔"

"بسرو چشم۔" یہ کہہ کر مولانا نے فرش سے نوٹ اٹھالیا اور کسی سے کچھ کہے سُنے بغیر وہ سیڑھیوں سے اُتر گئے۔

وہ وقت جو اُن کے جانے کے بعد محفل میں گزرا انتہا درجہ کا تکلیف دہ تھا۔ ہر چند بظاہر خاموشی رہی مگر اندر ہی اندر ہر شخص بے کلی محسوس کر رہا تھا۔ فرخندہ میر صاحب سے معذرت کر کے عشاء کی نماز کے لیے اپنی کوٹھڑی میں اُٹھ آئی۔ محسن عدیل جو گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھا تھا اس نے پہلو بدل کر اپنا سر گاؤ تکیے پر ڈال دیا اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔ دیپ کمار انگریزی اخبار کا ضمیمہ پڑھنے لگا تھا حالانکہ لالٹین کی روشنی اس کے لیے ناکافی تھی اور اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا جسے وہ بار بار انگلیوں سے پونچھ لیتا تھا۔ بھٹناگر نے کوٹ کی جیب سے تاش نکال کر فرش پر بازی لگانی شروع کر دی تھی۔ ادھر میر صاحب نے بھی کسی کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا تھا۔ وہ اس عرصے میں بڑی دل جمعی کے ساتھ پانوں کی ڈبیا سے پان نکال نکال کر کھاتے رہے۔ جب فرخندہ نماز سے فارغ ہو کر آئی تو انھوں نے ایک پان اسے بھی پیش کیا جسے اس نے تسلیم کر کے لے لیا۔

کوئی پون گھنٹے کے بعد مولانا کی آواز سیڑھیوں میں سنائی دی۔ وہ کسی کو سنبھل سنبھل کر آنے کی تاکید کر رہے تھے۔ یہ ہوٹل کا ایک بیرا تھا جو بڑا سا ایک خوان اپنے کندھے پر اُٹھائے ان کے پیچھے آ رہا تھا۔

"اِدھر لے آؤ بھئی اس کمرے میں۔ شاباش۔" مولانا پُر اعتماد لہجہ میں بیرے سے کہہ رہے تھے۔ "تمہیں خوش کر دیں گے۔"

کمرے میں ابھی دستر خوان بچھایا ہی جا رہا تھا کہ دالان میں سے ٹرام کے کنڈکٹر قاسم کی آواز سنائی دی۔

”آہاہا ہو ہو ہو! فرخ بھائی! آج کیا بات ہے، بڑی بڑی ضیافتیں اُڑ رہی ہیں یہاں۔ واللہ پلاؤ کی خوشبو نے بے چین کر دیا۔“

مگر جیسے ہی اس نے کوٹھڑی کے اندر قدم رکھا اور ایک اجنبی کی شکل دیکھی، اس کی ساری خوشی اور زندہ دِلی کافور ہو گئی اور وہ کھسیانا ہو کر رہ گیا۔

”آؤ بھئی قاسم۔“ مولانا نے بڑے سرپرستانہ لہجہ میں قاسم سے کہا۔ ”خوب وقت پر آئے۔ ان سے ملو، یہ میرے خاص کرم فرما میر نوازش علی ہیں۔“

قاسم کو اس غصّے اور ملال کا کچھ علم نہ تھا جو اس ناخواندہ مہمان کے خلاف اس کے دوستوں میں تھا، چنانچہ اس نے اپنی جھینپ مٹانے کے لیے ضرورت سے زیادہ گرم جوشی کے ساتھ میر صاحب سے مصافحہ کیا۔

اب دستر خوان بچھ چکا تھا۔ محسن عدیل اور دیپ کمار تو کھانا کھا کر آنے کا عذر کر کے الگ ہو گئے مگر مولانا، فرخ بھائی، میر صاحب اور قاسم کی متفقہ کوششیں بھٹناگر اور شکیبی کو دستر خوان پر بٹھانے میں کامیاب ہو گئیں۔ اس عرصے میں میر صاحب ان لوگوں سے کسی قدر اور بے تکلف ہو گئے تھے۔ کھانا کھانے کے دوران میں انھوں نے سعدیؔ کے دو ایک شعر بھی پڑھے جو تھے تو فرسودہ مگر چونکہ طعام ہی کے متعلق تھے اس لیے پسند کر لیے گئے۔

کھانے کے بعد مولانا نے پھر شکیبی سے شعر کی فرمائش شروع کر دی۔ اب کے میر صاحب نے بھی اصرار کیا اور فرخ بھائی نے بھی ان کا ساتھ دیا کہ ہاں ہاں بھئی ہو جائے وہی نظم چنانچہ شکیبی کو ”سرخ برکھا۔“ ایک مرتبہ پھر سناتے ہی بنی۔

رات کے کوئی دس بجے کا عمل ہو گا کہ یہ محفل برخاست ہوئی۔ میر صاحب نے رخصت ہوتے وقت بڑی گرمجوشی سے فرخ بھائی اور اس کے دوستوں کا شکریہ ادا کیا، وہ ان سے اجازت لے کر مولانا کو بھی اپنے ساتھ ہی لیتے گئے۔

اگلے روز صبح کو کوئی نو ساڑھے نو بجے مولانا واپس آئے مگر اس شان سے کہ آگے

آگے یہ دونوں بغلوں میں دو مرغ دبائے تھے اور ان کے پیچھے ایک جھلّی والا تھا جس کا ٹوکرا قسم قسم کے اجناس، ترکاریوں اور پھل پھلاریوں سے لبالب بھرا ہوا تھا۔

"خست خیر باشد۔" فرخندہ نے مولانا اور جھلّی والے کو تعجب سے دیکھتے ہوئے پوچھا: "یہ سب کہاں سے اُٹھا لائے۔"

"ذرا دَم تو لینے دو فرخ بھابی! ابھی بتاتا ہوں۔" یہ کہہ کر مولانا مسکرائے پھر دَم لیے بغیر خود ہی کہنا شروع کیا۔ "میر صاحب نے تم کو سلام کہا ہے وہ تمہارے حسنِ سلوک اور تمہاری طبیعت داری کی بے حد تعریف کرتے تھے۔ پھر کہنے لگے، رات ہوٹل کا کھانا سخت بدمزہ تھا میں چاہتا ہوں کہ آج محفل کے جملہ اراکین کی دعوت کروں مگر چونکہ پردیس کا معاملہ ہے اور میں ہوٹل میں مقیم ہوں جہاں دعوت کا خاطر خواہ انتظام نہیں ہو سکتا، اس لیے آپ کو یہ زحمت دی گئی ہے، میں اس کے لیے سخت شرمندہ اور معافی کا خواست گار ہوں۔"

شام سے پہلے ہی سب کھانے پک کر تیار ہو گئے۔ ادھر میر صاحب بھی وقت سے کچھ پہلے ہی آگئے۔ اس وقت گھر میں فرخندہ اور مولانا کے سوا جو چولہے کے پاس بیٹھے تھے اور کوئی نہ تھا۔ میر صاحب کل کی نسبت آج کافی سادہ لباس پہن کر آئے تھے۔

"معاف کیجیے گا۔" وہ کہنے لگے۔ "میں ابھی سے حاضر ہو گیا ہوں تاکہ انتظام میں میں بھی آپ لوگوں کا ہاتھ بٹاؤں۔"

یہ کہتے ہی انھوں نے بڑی بے تکلفی سے اپنی شیروانی اور ٹوپی اتار کر کھونٹی پر ٹانگ دی اور صرف کرتا پاجامہ پہنے ہوئے اپنے کو بڑی معصومیت کے ساتھ فرخ بھابی کے سامنے پیش کر دیا۔

فرخندہ نے میر صاحب پر سر سے پیر تک ایک نظر ڈالی اس لباس میں وہ بڑے وجیہہ اور گھریلو معلوم ہو رہے تھے، پھر اس نے لمحہ بھر کے لیے تامل کیا، گویا دل ہی دل میں سوچ

رہی ہے کہ ان سے کیا خدمت لوں۔ دھیرے دھیرے ایک دلآویز مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیلتی گئی۔

"آپ کی ہمدروی کا شکریہ۔" آخر وہ بولی۔ "اب آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے دن میں ایک کھانا پکانے والی منگوالی تھی قریب قریب سب کھانے پک چکے ہیں آپ چل کر آرام سے اندر بیٹھیے۔"

اس شام جب فرخندہ کے دوستوں کو اس دعوت کا حال معلوم ہوا تو انہیں بہت تعجب ہوا۔ بعض نے تو اس بات کو سخت ناپسند کیا مگر زیادہ تر نے اسے خوش طبعی میں اڑانا چاہا کہ اچھا کاٹھ کا الو پھنسا ہے۔ بہر حال اس دعوت میں ویپ کمار کے سوا جو ایک ضروری کام کا بہانہ کر کے محفل ہی سے اٹھ گیا تھا اور سب لوگ شریک ہوئے۔ کھانا بے حد لذیز تھا۔ فرخ بھابی نے بڑی محنت اور جانفشانی سے پکایا تھا چنانچہ ہر شخص نے پیٹ بھر بھر کر کھایا۔ میر صاحب بار بار کھانے کی تعریفیں کرتے تھے۔ اب وہ سب لوگوں سے کافی گھل مل گئے تھے اور ہر ایک سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے تھے اہلِ محفل کو بھی اب ان سے وہ کل والا عناد نہیں رہا تھا۔ یا کم سے کم وہ اس کو ظاہر نہیں کرتے تھے۔ محسن عدیل نے البتہ دو ایک دفعہ اشاروں کنایوں میں ان پر چوٹ کی مگر وہ ایسی گہری تھی کہ ڈاکٹر ہمدانی اور ایک آدھ اور کے سوا اسے کوئی نہیں سمجھ سکا۔ ڈاکٹر ہمدانی سے اور میر صاحب سے آج پہلی مرتبہ شناسائی ہوئی تھی اور میر صاحب ڈاکٹر ہمدانی کی بذلہ سنجی سے بہت محظوظ ہوئے تھے۔

اس رات یہ محفل کوئی گیارہ بجے تک جاری رہی۔

اس سے اگلے روز میر صاحب سہ پہر ہی کو فرخندہ کے ہاں آگئے۔ آج پہلے دن کی طرح وہ پھر بَن ٹھن کر آئے تھے۔ آتے ہی انھوں نے بغیر کسی تمہید کے فرخندہ سے کہنا شروع کیا۔

"کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ۔" فرخندہ خانم آپ بھی کہیں گی کہ یہ روز روز کی

مصیبت اچھی گلے پڑی۔ لیکن واقع یہ ہے کہ مجھے ایک امر میں آپ کی امداد کی اشد ضرورت ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ دو ماہ میں میری چھوٹی ہمشیرہ کا عقد ہونے والا ہے۔ میں اپنے مقدمے کے سلسلے میں یہاں آنے لگا تو قبلہ والدِ محترم نے فرمایا۔ ''جا تو رہے ہو، بچی کے جہیز کے لیے پارچات بھی خریدتے لانا، سنا ہے دِلّی میں پارچات کی بڑی بڑی دکانیں ہیں۔ میں نے حکم عدولی کرنا مناسب نہ سمجھا حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ میں اس معاملے میں جاہل محض ہوں۔ آپ کا مجھ پر بڑا احسان ہوگا کہ آپ میرے ساتھ چل کر مجھے کپڑا دلوا دیں۔ مولانا کہتے ہیں کہ آپ ماشاء اللہ اس کام میں بہت ہوشیار ہیں اور پھر عورتوں کی پسند کچھ عورتیں ہی بہتر سمجھتی ہیں۔

میر صاحب نے یہ درخواست کچھ ایسی سادگی کے ساتھ کی تھی کہ نیک دل اور خدمت گزار فرخ بھابی کو انکار کرتے نہ بنی۔ چنانچہ تھوڑے سے تامل کے بعد وہ مولانا کو ہمراہ لے کر میر صاحب کے ساتھ ہو لی۔ تھوڑی دور پر بازار میں میر صاحب کی ٹیکسی کھڑی تھی تینوں اس میں سوار ہو، چاندنی چوک روانہ ہو گئے۔

شام کا اندھیرا خاصا پھیل چکا تھا جب یہ لوگ گھر لوٹے۔ واپسی پر میر صاحب ان کے ہمراہ نہیں تھے وہ اپنے ہوٹل پر اُتر گئے تھے اور ٹیکسی والے سے کہہ دیا تھا کہ ان کو ان کے گھر پہنچا آئے۔

اس رات جب محفل جمی تو محسن عدیل نے آتے ہی فرخ بھابی اور مولانا سے پوچھنا شروع کیا :

''یہ آپ لوگ آج شام کو کہاں غائب ہو گئے تھے؟ میں دو دفعہ آیا مگر گھر میں تالا پڑا دیکھ کر چلا گیا۔''

اس پر فرخندہ نے میر صاحب کا حال سنایا کہ کس غرض سے وہ آئے اور پھر کس طرح ان کے ساتھ جا کر اس نے ڈیڑھ ہزار روپے کا کپڑا ان کی ہمشیرہ کے جہیز کے لیے

خریدا۔ آخر میں اس نے بتایا کہ جب سب کپڑا وغیرہ خرید چکے تو میر صاحب نے زبردستی ایک بنارسی ساری سو روپے کی اسے بھی خرید دی۔ وہ بہتیرا نہیں نہیں کرتی رہی مگر میر صاحب نے ایک نہ سنی۔ مولانا کو بھی ایک گرم اونی سویٹر لے دیا۔

پھر فرخندہ اپنی کوٹھڑی میں گئی اور وہ ساری لاکر سب کو دکھائی۔

محسن عدیل کچھ دیر خاموشی سے ساری کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا:

"فرخ بھابی! اس میں شک نہیں کہ یہ ساری بہت خوبصورت ہے مگر میں تمھیں مشورہ دوں گا کہ جس قدر بھی جلدی ہو سکے اسے لوٹا دو۔"

یہ سن کر فرخندہ کے چہرے کا رنگ ایک دَم متغیر ہو گیا۔ اس نے گردن جھکا لی۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔

"تم خود ہی سوچو۔" محسن عدیل نے پھر کہنا شروع کیا۔ "ایک شخص جس سے ہماری جان نہ پہچان ان دو دنوں سے پہلے ہم نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔"

"لیکن میں تو جانتا ہوں۔" مولانا بیچ میں بول اُٹھے۔

"تم چپ رہو جی۔ . . ایک شخص جو پہلی ہی ملاقات میں دوسروں پر اس طرح بے دریغ روپیہ خرچ کرنے لگتا ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ اس کے دل میں کیا ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ" مولانا سے پھر چپ نہ رہا گیا۔ "عدیل میاں! آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ خوانخواستہ انھوں نے فرخ بھابی کو یہ ساری کسی بُری نیت سے تھوڑا ہی لے کر دی ہے وہ تو ہمیشہ سے ایسے ہی فیاض واقع ہوئے ہیں۔"

"ہمیں ان کی فیاضی کی کوئی ضرورت نہیں۔" بھٹناگر نے تاؤ کھا کر کہا۔ "آخر کیا مطلب ہے اس کا؟"

محسن عدیل پھر فرخندہ کی طرف متوجہ ہوا:

”فرخ بھابی! میں نے جو کچھ کہا آپ نے سن لیا! اب کے وہ آئیں تو یہ ساری انھیں لوٹا دینا۔ کہنا اس میں بُرا ماننے کی بات نہیں ہے۔ آخر کیا حق ہے ان کو اس قسم کا تحفہ دینے کا اور اگر ہو سکے تو کسی طرح یہ بھی جتا دینا کہ ہم سب لوگ ان کے یہاں آنے کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ اگر تم نہ کہو گی تو پھر مجبوراً یہ ناگوار فرض ہمیں ادا کرنا ہوگا اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس کے نتائج کیا ہوں ... سمجھ گئیں؟“

”اچھی بات ہے۔“ فرخندہ نے ہلکے سے کہا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اپنی کوٹھری میں چلی گئی اور اس رات پھر محفل میں نہ آئی۔

اگلے روز محسن عدیل، بھٹناگر اور دیپ کمار سہ پہر ہی سے فرخندہ کے ہاں آ دھمکے۔ وہ بڑی دیر تک بھرے بیٹھے میر صاحب کا انتظار کرتے رہے مگر میر صاحب نہ آئے۔ دوسرے روز بھی یہ لوگ سویرے ہی سے آ گئے مگر میر صاحب اس دن بھی نہ آئے معلوم ہوتا تھا کہ یا تو مقدمے کے سلسلے میں انھیں فرصت ہی نہیں ملی کہ ادھر کا رخ کرتے اور یا پھر وہ شہر ہی سے چلے گئے ہیں۔ اسی طرح ایک ہفتہ گزر گیا مگر انھوں نے فرخندہ کے ہاں اپنی شکل نہ دکھائی۔

اس قضیئے کو بغیر کسی بدمزگی کے یوں آپ ہی ختم ہوتا دیکھ کر فرخندہ کے دوستوں نے اطمینان کا سانس لیا اور ان میں پھر وہ پہلی سی خود اعتمادی پیدا ہو گئی۔ یہ سچ ہے کہ شروع کے دو تین دنوں میں فرخ بھابی زیادہ تر اپنی کوٹھری ہی میں رہی مگر پھر آپ ہی آپ ملاپ ہو گیا اور ان کی محفل میں پھر پہلی سی چہل پہل نظر آنے لگی۔

مگر ان کے دل کا یہ سکون فقط چند روزہ تھا کیونکہ اس کے بعد جوں جوں دن گزرنے لگے، فرخ بھابی کے مزاج اور کردار میں ایک تبدیلی پیدا ہوتی گئی۔ انھوں نے دیکھا کہ یا تو وہ سنگھار اور زیب و زینت سے کوسوں دور بھاگتی تھی یا اب وہ اس کا خاص اہتمام کرنے لگی تھی۔ شام کو محفل میں بیٹھتی تو اس کے لباس اور چہرے سے قسم قسم کے عطروں، لونڈروں

اور غازوں کی خوشبوئیں پھوٹا کرتیں، گھر کا کام کاج اب وہ خود نہیں کرتی تھی بلکہ ایک مہری کو نوکر رکھ لیا تھا جو دونوں وقت کا آ کر کھانا پکا جاتی اور جھاڑو بہارو دے جایا کرتی تھی۔ علاوہ ازیں اس کی حرکات اور نگاہوں سے ایک سستی اور آلکس سی بھی ظاہر ہونے لگی تھی۔ اس زمانے میں کسی نے اسے سیتے پروتے نہیں دیکھا تھا۔ البتہ ایک چیز ایسی تھی جس کی باقاعدگی میں اس نے ذرہ بھر فرق نہ آنے دیا تھا اور وہ تھی نماز۔ وہ اب بھی اس فریضہ کو پابندیٔ وقت کے ساتھ ادا کرتی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کا مذہبی جوش کچھ پہلے سے بھی بڑھ گیا تھا۔

ایک اور تبدیلی جسے فرخ بھابی کے دوستوں نے محسوس کیا یہ تھی کہ کیا تو پہلے وہ شاذ ہی کبھی گھر سے باہر نکلتی تھی اور کیا اب وہ ہفتے میں دو دو تین تین دن چپکے سے دوپہر کو گھنٹے دو گھنٹے کے لیے غائب ہو جایا کرتی۔ یہ لوگ مولانا سے پوچھتے تو وہ بڑے اکھڑ پن سے جواب دیتے:

"میں کیا جانوں! مجھ سے کہہ کے تھوڑا ہی جاتی ہیں۔"

"فرخ بھابی سے پوچھا جاتا کہ کہاں تھیں تو لمحہ بھر کو اس کے رخساروں پر ہلکی سی سُرخی دوڑ جاتی۔ مگر وہ جلد ہی سنبھل کر جواب دیتی۔

"کہیں بھی نہیں۔ یہیں قریب ہی میری ایک سہیلی بن گئی ہے مجھ سے سلائی کا کام سیکھتی ہے بچاری بڑی اخلاص والی بیوی ہے میری چوری کا حال سنا تو کہنے لگیں، میرے ہاں ایک مشین فالتو پڑی ہے، تم چاہو تو لے جا سکتی ہو مگر مجھے شرم آگئی۔ "اور یہ لوگ سُن کر خاموش ہو جاتے۔

انہی دنوں کا ذکر ہے، ایک دوپہر وہ ایسی گھر سے غائب ہوئی کہ رات کے آٹھ بج گئے مگر اس نے صورت نہ دکھائی۔ آج تک کسی شام وہ محفل سے غیر حاضر نہ رہی تھی اس پر جاڑے کا موسم، رات کے ساتھ ساتھ سردی بھی بڑھتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے دوستوں کی تشویش بھی، جب نو بج گئے اور وہ نہ آئی تو ان لوگوں کو سخت

پریشانی ہوئی، مولانا سے دوبارہ پوچھا گیا، ان کے پاس ایک ہی جواب تھا: ''میں کیا جانوں!'' بھٹناگر، قاسم اور دیپ کمار نے ارادہ کیا کہ بازار میں جا کر اسے تلاش کریں مگر ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ جائیں تو کہاں جائیں اور پوچھیں تو کس سے پوچھیں، آخر جب دس بج چکے تو سیڑھیوں پر اس کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور وہ تیزی سے دالان سے گزرتی ہوئی اپنی کوٹھڑی میں پہنچ گئی۔

محسن عدیل، بھٹناگر اور دوسرے سب لوگ اس کی اس حرکت پر تلملا ہی تو گئے یہاں اس کی راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور اس کے عوض میں یہ بے اعتنائی کہ ان کو یہ جاننے تک کا مستحق نہیں سمجھا گیا کہ آخر وہ اتنا عرصہ کہاں رہی، خیر تو تھی۔ اس پر کیا بیتی۔

''میں جا کے پوچھتا ہوں۔'' اچانک قاسم بولا۔

''نہیں مت جاؤ۔'' محسن عدیل نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ''انھیں غرض ہوگی تو خود آئیں گی۔''

مگر اس رات فرخ بھابی کو غرض نہ ہوئی اور وہ نہ آئی، البتہ اس نے آواز دے کر مولانا کو بلایا:

''مولانا صاحب! وہ ذرا پانی کا گھڑا تو اُٹھا کے اندر رکھ دیجیے۔''

اس سے اگلے روز فرخ بھابی گھر سے کہیں باہر نہ گئی بلکہ کسی قسم کا سنگھار بھی نہ کیا۔ شام کو جب اس کے دوست آئے تو وہ ہر ایک سے ہنس ہنس کر ملی مگر پچھلی رات کے واقعہ کے متعلق ایک لفظ تک نہ کہا۔ ادھر لوگوں نے بھی مصلحتاً اس کا ذکر نہ کیا مگر دل میں سب کے غبار بھرا تھا۔ اس دن اس نے اپنے دوستوں کے لیے دو تین قسم کے کھانے خود پکائے تھے، چنانچہ سب کو مجبور کر کے ان کی بھوک سے زیادہ انھیں کھلایا اس رات وہ ذرا دیر کو بھی ان کے پاس سے نہ اٹھی اور جب اس کے دوستوں میں سے کوئی رخصت ہونے لگتا تو ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیتی۔ غرض اس طرح یہ محفل بڑی رات گئے تک جمی رہی۔

اس کے بعد جو چار دن گزرے ان میں بھی اس نے گھر سے باہر قدم نہ رکھا بلکہ بہت سادہ لباس پہنے وہ اپنے دوستوں ہی کی تواضع اور دلجوئی میں لگی رہی۔ اس پر اس کے دوستوں کے دلوں میں جو ملال تھا وہ بڑی حد تک دور ہو گیا۔ انھوں نے خیال کیا، گو یہ زبان سے کچھ نہ کہے مگر اس میں شک نہیں کہ دل ہی دل میں یہ اپنی حرکتوں پر سخت نادم ہے اور یہ ساری نوازشیں اس ندامت کو مٹانے ہی کے لیے تو ہیں اور یہ کہ صبح کا بھولا شام کو گھر آجائے تو اسے بُھولا نہیں کہنا چاہیے غرض اس کے دوستوں کے دل اس کی طرف سے صاف ہو گئے اور انھیں پھر سے یقین ہو چلا کہ وہ اپنی پچھلی حرکتوں سے تائب ہو کر پھر ان کی وفا شعار اور اطاعت گزار فرخ بھابی بن گئی ہے۔

مگر پانچویں روز سہ پہر کو وہ پہلے سے بھی زیادہ بناؤ سنگھار کر کے کسی کو بتائے بغیر پھر غائب ہو گئی۔

جب وہ نو بجے تک نہ آئی تو محسن عدیل نے ایک لمبی انگڑائی لیتے ہوئے بھٹناگر سے کہا: ''بھئی بھٹناگر! اب تو یہ حالت برداشت سے باہر ہوئی جا رہی ہے۔''

''اس میں کلام ہی کیا ہے۔'' بھٹناگر نے جواب دیا۔

''مجھے کئی دنوں سے ایک خیال آ رہا ہے۔'' قاسم نے کہا۔

''وہ کیا؟'' محسن عدیل نے پوچھا۔

''وہ یہ کہ جس سے کوئی ملنا چاہے کہیں بھی مل سکتا ہے۔ گھر نہ سہی باہر سہی۔''

''تمہارا اشارہ میر صاحب کی طرف ہے؟'' بھٹناگر نے پوچھا۔

''میر صاحب ہو یا کوئی اور ہو۔'' قاسم نے کہا۔

لمحہ بھر تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد عدیل نے جیسے ایک گہری سوچ میں سے اُبھرتے ہوئے قاسم سے کہا:

''شاید تمہارا خیال صحیح ہے۔''

"پھر آخر اس کا کیا علاج کیا جائے؟" بھٹناگر نے پوچھا۔

"علاج اس کا صرف ایک ہی ہے۔" عدیل نے کہا۔ "وہ یہ کہ ہم اس سے قطع تعلق کر لیں اور یہاں کا آنا جانا بالکل چھوڑ دیں۔"

مگر فرخ بھابی اور اس کی محفل کے بغیر ان لوگوں کو اپنی زندگیاں اس قدر سُونی سُونی دکھائی دیں کہ ہر شخص ایک گہری سوچ میں ڈوب گیا اور گفتگو آگے نہ بڑھ سکی۔

جب شہر کے گھڑیال نے دس بجائے تو باہر بڑے زور کا جھکڑ چل رہا تھا۔ یکایک محسن عدیل چونک اُٹھا۔

"مولانا! مولانا!" اس نے مولانا کو ہلایا جو پاس ہی فرش پر کملی تانے پڑے تھے۔

"کیا ہے بھئی؟" مولانا نے مُنہ سے کمبلی ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

"مولانا صاحب! آپ کو زحمت تو ہوگی مگر ایک بہت ضروری کام ہے۔"

"سونے نہیں دو گے یار۔ کیا کام ہے؟" وہ بڑبڑائے۔

"میں پوچھتا ہوں، گھر میں کچھ لکڑیاں ہیں؟"

"ہاں ہوں گی دو چار۔"

"تو ذرا مہربانی کر کے چولہے میں آگ تو جلا دیجئے۔"

"ارے بھئی اس وقت آگ کا کیا کام؟"

"آپ جلایئے تو، کام بھی بتاؤں گا۔ اٹھیے اٹھیے، ہمت کیجئے۔"

فرخ بھابی کی عدم موجودگی میں مولانا محسن عدیل سے دب جایا کرتے تھے۔ وہ نہ جانے منہ ہی منہ میں کیا کہتے ہوئے اٹھے۔ لالٹین کے پاس طاق میں دیا سلائی کی ڈبیا رکھی تھی، اسے اٹھایا اور کوٹھڑی سے باہر نکل آئے۔ تھوڑی ہی دیر میں تڑتڑ کی آواز آنے لگی ساتھ ہی مولانا نے للکار کر کہا:

"لو جل گئی آگ، اب کیا ہو گا؟"

"اب ایک دیگچے میں پانی بھر کر اس پر رکھ دیجیے۔"

مولانا کا صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا تھا۔ انھوں نے جھنجھلا کر کہا:

"آخر بتاؤ تو پانی کا کیا ہو گا؟"

اس کا جواب سننے کے لیے مولانا ہی نہیں بلکہ محسن عدیل کے سارے ساتھی بھی انھی جیسا اشتیاق رکھتے تھے، چنانچہ بھٹناگر جو اکیلا ہی فرش پر بازی لگا رہا تھا اس کے ہاتھ میں تاش کا پتا پکڑا کر پکڑا رہ گیا۔ ویپ کمار سراغ رسانی کا ایک انگریزی ناول پڑھ رہا تھا اس کی نظریں پڑھتے پڑھتے آخری لفظ پر جم کر رہ گئیں اور اس کے کان محسن عدیل کی آواز پر لگ گئے قاسم اور شکیبی پاس ہی پاس بیٹھے تھے نہ جانے کن تصورات میں غرق تھے، دونوں نے چونک کر پُر معنی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر نظریں عدیل کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"بھئی تم نہیں سمجھتے۔" آخر محسن نے عدیل نے کہا۔ اس کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے ایک سرگوشی سی بن گئی تھی۔ "بات یہ ہے، اس دن وہ آئی تھیں نارات کو، اور پھر غسل کیا تھا ناٹھنڈے پانی سے۔ آج سردی بہت زیادہ ہے۔ میں نے سوچا، بیکار بیٹھے ہیں اور کچھ نہیں تو لگے ہاتھوں پانی ہی گرم کر دیں۔"

یہ کہتے کہتے اس نے پہلو بدلا، اپنا سر گاؤ تکیے پر ڈال دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

۱۹۴۷ء

ناک کاٹنے والے

تین شخص چغے پہنے، سر پر آڑی ترچھی پگڑیاں باندھے، ننھی جان کے کمرے میں داخل ہوئے اور چاندنی پر گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ گئے۔

"مزاج تو اچھے ہیں سرکار!" رنگ علی نے کہا۔

ان تینوں میں سے کسی نے اس کی مزاج پرسی کی رسید نہ دی۔

گلابی جاڑوں کے دن تھے۔ باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ رات خاصی جا چکی تھی۔ ایک منٹ تک خاموشی رہی جس کے دوران میں تینوں آدمی تیز تیز نظروں سے کمرے کا جائزہ لیتے رہے۔ اس کمرے سے ملا ہوا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جو خواب گاہ کا کام دیتا تھا۔ انھوں نے اپنے کیچڑ بھرے چپل نہیں اُتارے تھے جس کی وجہ سے اُجلی چاندنی پر دھبے ہی دھبے پڑ گئے تھے۔

"جبار خانا:" ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا۔ "پتوس دوکہ پوچھو تمہارا رنڈی لوگ کدھر ہے۔"

"تمہارا رنڈی لوگ کدھر ہے؟" جبار خان نے رنگ علی سے کہا۔

"باہر گیا ہے۔" رنگ علی نے کہا جس وقت وہ آئے تو یہ پان بنا رہا تھا۔

"باہر کدھر؟" جبار خان نے پوچھا۔

''سینما دیکھنے۔ سینما، بائیسکوپ'' رنگ علی نے پوچھا۔

''کیا کہتا ہے؟'' پہلے آدمی نے جبار خان نے پوچھا۔

''کہتا ہے باہر گیا ہے بائیسکوپ کا تماشہ دیکھنے۔''

''بائی جی تو جاتی بھی نہیں تھیں۔'' رنگ علی بولا۔ ''وہ تو چشتی صاحب زبردستی لے گئے۔''

''کیا کہتا ہے؟'' پہلے آدمی نے جبار خان سے پوچھا۔

''کہتا ہے چشتی صاحب زبردستی لے گیا۔''

''خو چشتی کے ساتھ جاتا ہے۔'' پہلے آدمی نے کہا۔ وہ ڈیل ڈول میں اپنے دونوں ساتھیوں سے کم تھا مگر اس کے خدوخال دونوں سے زیادہ درشت تھے۔ گلے میں سیاہ دھاریوں والے سرخ گلوبند کے دو بل دے کر، سرے چغے کے اندر کر رکھے تھے۔ اس کے دانت پیلے پیلے تھے۔ چوڑا دہانہ، بائیں رخسار پر آنکھ سے ذرا نیچے ایک گہرے زخم کا نشان تھا۔

''خو رنڈی منڈی کوئی نہیں تو اتنا روشنی کس واسطے کیا؟'' اس نے رنگ علی سے پوچھا۔ جب وہ بات کرتا تو اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو فقرے کے ادھ بیچ میں آدھا بند کر لیتا۔

رنگ علی نے کوئی جواب نہ دیا۔

''بولو۔'' جبار خان نے کہا۔ ''ہم تم سے کیا کہتا ہے؟'' اس کا رنگ سانولا تھا۔ عمر میں وہ اپنے دونوں ساتھیوں سے کافی بڑا تھا۔ اس کے اوپر کے ایک دانت پر پلیٹینم کا خول چڑھا تھا جو کافی گھس چکا تھا اور ربڑی نظر آنے لگی تھی۔

رنگ علی اب بھی خاموش رہا۔

''ہم اتنا سیڑھی کس واسطے چڑھ کے آیا؟'' تیسرے آدمی نے پوچھا۔ اپنے دونوں

ساتھیوں کی طرح اس نے بھی گلے میں گلوبند لپیٹ رکھا تھا۔ اس کی پیشانی تنگ تھی اور ناک پر ایک بڑا سا مسا۔ اس کی آنکھوں میں سُرخی اس طرح نظر آتی تھی جیسے خون کی چھینٹ پڑ گئی ہو۔ ان میں سے کسی کی ڈاڑھی بھی ہفتے بھر سے کم کی منڈی ہوئی نہیں تھی۔

رنگ علی بیوقوفوں کی طرح ایک ایک کا منہ تک رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا جواب دے۔

"خو تمہارا منہ میں زبان نہیں ہے؟" تیسرے آدمی نے کہا۔ پھر وہ پہلے آدمی کی طرف متوجہ ہوا۔ "صحبت خان! اس کا منہ میں زبان نہیں ہے!"

"سرکار کیا عرض کروں۔" رنگ علی نے کہا۔ "بائی جی تو جاتی بھی نہیں وہ "

"جبار خان۔" صحبت خان نے کہا۔ "اس سے پوچھو کب آئے گا؟"

"تمہارا رنڈی لوگ کب آئے گا؟" جبار خان نے رنگ علی سے پوچھا۔

"شو ساڑھے بارہ بجے ختم ہوتا ہے سرکار۔ بس کوئی گھنٹے تک آجائے گا۔"

"کیا کہتا ہے؟" صحبت خان نے جبار خان سے پوچھا۔

"کہتا ہے تین پاؤ گھنٹے میں آجائے گا۔"

"چشتی صاحب کئی دنوں سے سر ہو رہے تھے۔" رنگ علی بولا۔ "بائی جی ہر بار نہیں نہیں کرتی رہیں۔ آج تو بہت ہی سر ہوئے۔ کہنے لگے فلم ایک نمبر ہے۔ بڑی مشکلوں سے سیٹیں ریزرو کرائی ہیں قسمیں دینے لگے۔"

عین اس وقت سیڑھیوں میں کچھ آہٹ ہوئی۔ تینوں آدمی چوکنے ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"جبار خان!" صحبت خان نے کہا۔ "اس پدرِ سگ کو کہو چپ ہو جاؤ۔"

"چپ ہو جاؤ۔"

کچھ لمحے خاموشی میں گزارے۔ پھر حسین بخش دھسّے کی بکل مارے باگیشوری کی دُھن

گنگناتا دہلیز پر نمودار ہوا۔ ان تینوں کو دیکھ کر وہ ٹھٹکا۔ پھر جوتی اتار کر کمرے میں داخل ہوا اور ان سے ذرا ہٹ کر چاندنی کے ایک سرے پر، جہاں سارنگی غلاف کی ہوئی رکھی ہوئی تھی، بیٹھ گیا۔

"سلام سرکار۔" حسین بخش نے کہا۔

"یہ کون ہے؟" صحبت خان نے رنگ علی سے پوچھا۔

"یہ حسین بخش ہیں۔"

"کیا کرتا ہے۔"

"یہ سارنگیئے ہیں۔"

"سارنگی بجاتے ہیں۔ سارنگی، جو ساز ہے۔"

"خو تو سازندہ کیوں نہیں کہتا۔"

"ہاں ہاں وہی۔"

"اور تم خود کیا کرتا ہے؟" جبار خان نے رنگ علی سے پوچھا۔

"میں طبلہ بجاتا ہوں۔" رنگ علی نے کہا۔

"خو تم بھی سازندہ ہے؟"

"جی ہاں۔"

لمحہ بھر خاموشی رہی۔

"جبار خان!" صحبت خان نے جبار خان سے کہا۔ "پوچھو، اِدھر کون کون رہتا ہے!"

"بائی جی، ہم دو استاد اور ایک نوکر جمن۔" رنگ علی نے جواب دیا۔

"خو نوکر کدھر ہے؟" صحبت خان نے کہا۔

"بائی جی کے ساتھ گیا ہے۔" رنگ علی نے جواب دیا۔

"ہُوں، ہُوں۔"

باہر بوندیاں کسی قدر تیزی سے پڑنے لگی تھیں۔ نیچے سڑک پر سے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد تانگے کے گھوڑے کی ٹاپ جس میں گھنٹیوں کے سُر بھی شامل ہوتے، سنائی دے جاتی۔ گیلی سڑک پر گھوڑے کا سم پڑتا تو بڑی پاٹ دار آواز نکلتی۔

"تم نے بولا نتھی جان تین پاؤ گھنٹے میں آئے گا؟" صحبت خان نے رنگ علی سے پوچھا۔

حسین بخش بیزار ہوا بیٹھا تھا، اس نے جواب دینا چاہا:

"کیا پتہ۔"

"تم مت بکو۔" صحبت خان نے درشتی سے کہا۔ پھر وہ رنگ علی کی طرف متوجہ ہوا۔ "تمہارا بائی تین پاؤ گھنٹے میں آجائے گا؟"

"آ تو جانا چاہیے۔" رنگ علی نے کہا۔

"چاہیے نہیں جانتا۔" صحبت خان نے کہا۔ ہاں کہو یا نہ۔"

"دیکھئے سرکار۔" رنگ علی نے کہا۔ "تماشہ ساڑھے بارہ بجے ختم ہوتا ہے اور اس وقت ہوئے ہیں گیارہ بج کر پچاس منٹ۔ اگر بائی جی سیدھی گھر کو آئیں۔"

"اگر مگر نہیں جانتا۔" صحبت خان نے کہا۔ "صاف بولو۔"

"آخر بات کیا ہے خان صاحب؟" حسین بخش سے چپ نہ رہا گیا۔ "کچھ ہمیں بھی تو پتہ چلے۔"

اس کے جواب میں تیسرے آدمی نے یکبارگی آگے بڑھ کر زور کا ایک مکا اس کے منہ پر مارا۔ اس ناگہانی ضرب پر حسین بخش کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا۔ آنسو اس کی آنکھوں میں جھلکنے لگے۔ اس نے سر جھکا لیا۔ تھوڑی دیر تک گم سُم بیٹھا رہا۔ پھر اُٹھ کر دہلیز کی طرف جانے لگا جہاں اس کا جوتا پڑا تھا۔

"او خنزیر۔" جبار خان نے کہا۔ "ٹھہرو کدھر جاتا ہے؟"

حسین بخش نے ایک پاؤں جوتی میں ڈال لیا تھا، وہ ٹھہر گیا۔

"اِدھر دیکھو۔" جبار خان نے ڈپٹ کر کہا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کمانی دار چاقو تھا جس کا پھل آٹھ انچ سے کم نہ تھا۔ بجلی کی روشنی میں اس سے شعاعیں سی نکل رہی تھیں۔ "اگر تم نیچے جانے کی کوشش کرے گا تو ہم تمہارا پیٹ چاک کر دے گا۔ سن لیا۔ دروازے میں کنڈی لگاؤ اور ادھر ہمارے پاس آ کر بیٹھو۔"

حسین بخش لمحہ بھر کھڑا رہا۔ پھر اس نے جوتی سے پاؤں نکال لیا اور دروازے میں کنڈی لگا کے اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔

"شاباش۔ شاباش۔" محبت خان نے کہا۔ پھر وہ تیسرے آدمی سے کہنے لگا۔ "گلباز خان یار۔ تم نے تان سین کے بیٹے کو ناراض کر دیا۔ اب وہ ہم کو گانا نہیں سنائے گا۔"

"ہم اس کو منائے گا۔" گلباز خان نے کہا۔ "ہم اس کے گدگد کرے گا۔ تان سین کا بیٹا ہنسے گا۔ تان سین کا بیٹا پھر قوالی سنائے گا۔"

"جبار خان، محبت خان نے کہا۔ "اس کو بولو ہم گانا سننے نہیں آیا۔"

"پھر کیسے آنا ہوا سرکار؟" رنگ علی نے پوچھا۔

"کیا کہتا ہے؟" محبت خان نے جبار خان سے پوچھا۔

"پوچھتا ہے ہم کیوں آیا؟" جبار خان نے کہا۔

"خو پوچھتا ہے ہم کیوں آیا؟" محبت خان نے کہا۔ "اس سے پوچھو ہم کیوں آیا؟"

"خو تم بتاؤ ہم کیوں آیا؟" جبار خان نے رنگ علی سے پوچھا۔

رنگ علی مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔

"کیا کہتا ہے؟" محبت خان نے جبار خان سے پوچھا۔

"کچھ نہیں کہتا ہے۔"

"مسکراتا ہے۔"

"مسکراتا ہے؟" محبت خان نے رنگ علی سے کہا۔ "خو تم مسکراتا ہے! مسخری کرتا

ہے!"

"خان صاحب بھی کمال کرتے ہیں۔" رنگ علی نے کہا۔ "میری کیا مجال ہے کہ میں آپ سے مسخری کروں!"

"خو تم اچھا آدمی ہے۔" صحبت خان نے کہا۔

"تان سین کا بیٹا اچھا آدمی نہیں ہے۔" گلباز خان نے کہا۔ "وہ روتا ہے تان سین کا بیٹا روتا ہے۔"

کلاک میں گھرر گھرر ہوئی اور اس نے ٹن ٹن کر کے بارہ بجانے شروع کیا۔ حسین بخش کے سوا سب کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ کلاک سے ذرا ہٹ کر دیوار پر ایک بڑا سا رنگ دار فوٹو تھا جس میں چوتھائی صدی پہلے کی کوئی اَدھیڑ عمر کی گانے والی، گلے میں اشرفیوں کا ہار ڈالے طنبورا چھیڑ رہی تھی۔ ناک پر بڑی سی لونگ تھی اور سیدھی مانگ نکال کر جوڑا باندھ رکھا تھا۔

"خو دیکھو۔" صحبت خان نے رنگ علی سے کہا۔ "ادھر قلیان ملیان بھی ہے؟"

"قلیان تو نہیں، حقہ ہے سرکار۔" رنگ علی نے کہا۔

"ہم حقہ نہیں پئے گا۔"

"پان پیش کروں؟"

"ہم پان نہیں کھاتا۔"

"سگریٹ؟"

"سگریٹ؟ خیر چرس کا سگریٹ کا مضائقہ نہیں ہے۔"

"چرس تو یہاں کوئی بھی نہیں پیتا سرکار!" رنگ علی نے کہا۔

"رنڈی منڈی نہیں۔ قلیان ملیان نہیں، چرس نہیں۔ یہ تمہارا کیسا طوائف کا مکان ہے؟" گلباز خان نے کہا۔

"اچھا! روغنِ کدو ہے؟" صحبت خان نے پوچھا۔

"اچھا روغن کدو تو نہیں۔" رنگ علی نے کہا۔ "آنولے کا تیل ہوگا۔"

"خیر وہی لاؤ۔" صحبت خان نے کہا۔

رنگ علی ایک الماری کے پاس گیا جس کے دونوں پٹوں کے چوکھٹوں میں دو لمبے لمبے آئینے جڑے ہوئے تھے اور الماری کھول کر تیل کی بوتل لے آیا۔

"دیکھو تم بہت اچھا آدمی ہے۔" صحبت خان نے کہا۔ "تھوڑا سا تیل ہمارے سر پر ملو۔ پھر ہم تم کو بتائے گا ہم کس واسطے آیا۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنی پگڑی اُتار دی۔ معلوم ہوتا تھا یہ پگڑی بہت دیر سے اس کے سر پر تھی کیونکہ کلاہ نے اس کی پیشانی پر گہرا نشان ڈال دیا تھا۔ اس کے سر پر بال صرف کنارے کنارے تھے۔ بیچ میں چاند ایسی لگ رہی تھی جیسے انگور آیا ہوا پھوڑا۔

رنگ علی نے اس کی پیٹھ کے پیچھے جاکر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑا سا تیل ہتھیلی پر ڈالا اور سر پر ملنے لگا۔

"شاباش۔ شاباش۔" صحبت خان نے کہا۔ "اب ہم تم کو بتائے گا کہ ہم کیوں آیا۔" مگر وہ کہتے کہتے رک گیا اور گلباز خان سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"گلباز خان! خو تم بتاؤ یار ہم تیل ملواتا ہے۔"

"ہم بتائے گا۔" گلباز خان نے کہا۔ "مگر پہلے تان سین کا بیٹا ہمارا ٹانگ دبائے گا۔"

"تان سین کا بیٹا۔" صحبت خان نے کہا۔ "گلباز خان کا ٹانگ دباؤ۔"

حسین بخش بدستور سر جھکائے بیٹھا رہا۔ وہ سخت کوشش کر رہا تھا کہ ان کی طرف نہ دیکھے۔

"تان سین کا بیٹا ہمارا ٹانگ نہیں دباتا!" گلباز خان نے جیسے فریاد کرتے ہوئے کہا۔

"اس کے دھپ لگاؤ۔" صحبت خان نے کہا۔

"ہم دھپ نہیں لگائے گا۔" گلباز خان نے کہا۔ "ہم اس کا کان مروڑے گا۔ تان سین کا بیٹا اپنا کان ادھر کرو۔" اس نے حسین بخش سے کہا۔

"حضور معاف کردیجئے۔" رنگ علی نے لجاجت سے کہا۔ پھر وہ حسین بخش سے مخاطب ہوا۔ "بھائی حسین بخش ضد نہ کرو۔ اٹھ بیٹھو اور خان صاحب کی ٹانگ دباد و اٹھو، اُٹھو، بچے نہ بنو، موقع محل دیکھا کرو۔"

حسین بخش سخت لاچاری کے ساتھ اُٹھا اور گلباز خان کے پاس بیٹھ کر اس کی ٹانگ دبانے لگا۔ آنسو ابھی اس کی آنکھوں میں خشک نہیں ہونے پائے تھے۔

"ہاہا" گلباز خان نے حسین بخش کی پیٹھ پر زور سے تھپکی دے کر کہا۔ "تان سین کا بیٹا اب اچھا ہو گیا ہے اب ہم بتائے گا ہم کیوں آیا۔"

چند لمحے خاموشی رہی۔

"تمہارا ننھی جان ہے نا؟" گلباز خان نے رنگ علی سے پوچھا۔

"ہاں سرکار۔" رنگ علی نے کہا۔

"اس کا نام ننھی جان ہے نا؟" گلباز خان نے رنگ علی سے پوچھا۔

"تو بس اس کا ناک کاٹنے آیا ہے!" گلباز نے کہا۔

"اس بچاری کا قصور؟" رنگ علی نے پوچھا۔ مالش کرتے کرتے اس کے ہاتھ تھم گئے تھے، چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور آواز گلے میں اٹک اٹک گئی تھی۔

"قصور مصور کچھ نہیں۔" صحبت خان نے کہا۔ "تم اپنا کام کرو۔"

"پھر کیا بات ہے سرکار؟" رنگ علی نے گلباز خان سے پوچھا۔

"ہم نے سنا اس کا ناک بہت لمبا ہے۔" گلباز خان نے کہا۔ "اچھا نہیں لگتا۔ چھوٹا ہو جانے سے خوش رُو ہو جائے گا۔"

"خدا کے واسطے خان صاحب۔" رنگ علی نے گڑگڑا کر کہا۔ "ایسا غضب نہ کیجئے گا وہ

بچاری تو بہت شریف ہے۔

"جبھی تو ہم اس کو خوش رو بنائے گا۔" گلباز خان نے کہا۔

"ہم بہت کو خوش رُو بنا چکا ہے۔" جبار خان نے کہا۔

گھڑی میں بارہ بج کر ۳۵ منٹ ہوئے تھے کہ سیڑھیوں میں کئی قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ تینوں آدمیوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

رنگ علی صحبت خان کے قدموں میں گر پڑا۔

"رسول کے واسطے خان صاحب۔" اس نے بسورتے ہوئے کہا۔ "ہم پر رحم کیجئے۔ ہم بہت ہی مسکین لوگ ہیں۔"

دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ گلباز خان نے رنگ علی کی کلائی مضبوطی سے پکڑ کر اسے اٹھایا اور دروازے کے پاس لے گیا۔ پھر اسے دروازے کے سامنے کھڑا کر کے خود اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

"پوچھو کون ہے؟" گلباز خان نے رنگ علی کے کان میں کہا۔

"کون ہے؟" رنگ علی نے پوچھا۔

"دروازہ کھولو، دروازہ کھولو۔" کئی آوازیں سنائی دیں۔

"نام پوچھو۔" گلباز خان نے رنگ علی کے کان میں کہا۔

"ارے بھئی میں ہوں سلیم اللہ۔" دروازے کے اس طرف سے آواز آئی۔ "جلدی کھولو دروازہ۔"

"پوچھو، آپ کے ساتھ کون ہے۔" گلباز خان نے رنگ علی کے کان میں کہا۔

"اچھا شیخ صاحب ہیں!" رنگ علی نے کہا۔ "آپ کے ساتھ اور کون لوگ ہیں شیخ صاحب؟"

"میرے دوست ہیں بھئی۔" دروازے کے اس طرف سے آواز آئی۔ "آخر تم دروازہ کیوں نہیں کھولتے۔"

رنگ علی نے پلٹ کر گلباز خان کی طرف دیکھا جس نے سر ہلا کر نہیں کا اشارہ کیا۔

"شیخ صاحب معاف کیجئے گا۔" رنگ علی نے کہا۔ "اس وقت دروازہ نہیں کھل سکتا۔ بائی جی مجرے گئی ہیں، صبح کو آئیں گی۔ اس وقت خان صاحب وزیر خان کے ہاں سے کچھ بہوئیں آئی ہیں، ان کی وجہ سے دروازہ نہیں کھل سکتا۔ آپ کو زحمت تو ہوئی مگر مجبوری ہے۔ آپ کل تشریف لائیے گا۔"

اس پر سیڑھیوں میں کچھ دیر کھسر پھسر ہوا کی، پھر اُترتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں جو دھیرے دھیرے دھیمی ہوتی ہوئی گم ہو گئیں۔

"شاباش۔" صحبت خان نے گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "تم بہت عقل مند آدمی ہو۔"

"عقل منداس نے بنایا۔" گلباز خان نے چاقو دکھاتے ہوئے کہا۔ "اگر پدر سگ ذرا بھی چوں کرتا تو ہم اس کا نوک اس کی پیٹھ میں اُتار دیتا۔"

ایک بج گیا مگر ننھی جان نہیں آئی۔ تینوں آدمیوں نے جمائیاں لینی شروع کر دیں۔ جبار خان نے چغے کی جیب میں سے نسوار کی ڈبیا نکالی جس میں سے چٹکی چٹکی تینوں نے لی۔

"سوا بجے صحبت خان نے رنگ علی کو گلے سے پکڑ لیا۔

"او خنزیر کا بچہ، سچ بتاؤ۔" صحبت خان نے پوچھا۔ "وہ تماشے گیا ہے یا اور جگہ گیا ہے۔"

"قسم ہے پنج تن پاک کی خان صاحب!" رنگ علی نے اپنا گلا چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "وہ تماشے ہی گیا ہے۔"

"پھر وہ آیا کیوں نہیں؟" صحبت خان نے پوچھا۔

"اللہ جانے کیوں نہیں آیا۔" رنگ علی نے کہا۔ پھر وہ لمحہ بھر خاموش رہ کر بولا۔

"میں جانوں چشتی صاحب اس کو اپنی کوٹھی لے گئے ہوں گے۔ اب تو وہ صبح ہی کو آئے گا۔"

"تم جھوٹ کہتا ہے۔" گلباز خان نے کہا۔

"نہیں میں سچ کہتا ہوں۔" رنگ علی نے کہا۔

"ہم نہیں مانتا۔" گلباز خان نے کہا۔

"آپ یہیں رہیئے، پھر جھوٹ سچ معلوم ہو جائے گا۔" رنگ علی نے کہا۔

"پہلے بھی کبھی ایسا ہوا؟" صحبت خاں نے پوچھا۔

ڈیڑھ بجے تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جمائیاں لیتے لیتے ان کے جبڑے تھک گئے تھے اور آنکھ اور ناک سے پانی بہنے لگا تھا۔ باہر بوندیاں تھم گئی تھیں تینوں میں آنکھوں آنکھوں میں کچھ اشارے ہوئے۔ پھر وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"اچھا ہم جاتا ہے۔" صحبت خان نے کہا۔

جس وقت وہ دہلیز کے پاس پہنچے تو صحبت خان نے رنگ علی سے کہا۔

"بخدا تمہارا ننھی جان کا قسمت بہت اچھا ہے۔ اچھا سلام۔"

"تان سین کے بیٹے کو بھی سلام۔" گلباز خان نے کہا اور وہ سیڑھیوں سے اُتر گئے۔

چند لمحے خاموشی رہی۔

"یا خدا یہ کیا مصیبت ہے!" رنگ علی نے کہا۔

"ایسے کام کی ایسی تیسی۔" حسین بخش نے کہا۔ "لعنت ہے ایسی کمائی پر میں تو کل ہی یہاں سے چل دوں گا۔ کسی فلم کمپنی یا ریڈیو میں نوکری کر لوں گا اور جو نوکری نہ ملی تو ٹیوشن کروں گا۔ بھیک مانگ لوں گا مگر اس کوچے کا نام نہیں لوں گا۔"

رنگ علی نے کوئی جواب نہ دیا۔

ٹھیک دو بجے مکان کے نیچے ایک موٹر آ کے رُکی اور پھر موٹر کا دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز آئی۔ ذرا سی دیر میں ننھی جان ٹھمک ٹھمک کرتی سیڑھیاں چڑھتی کمرے میں

داخل ہوئی۔اس کے پیچھے پیچھے جمن تھا جس نے ایک بقچہ اٹھا رکھا تھا۔

تھمی جان نے ساری کے اوپر لمبا کوٹ پہن رکھا تھا جس کا کالر اور کف لومڑی کی کھال کے تھے۔سرخ ساری کی مناسبت سے پاؤں میں سرخ سینڈل تھے۔آدھے سر اور کانوں کو ایک سفید باریک سلک کے مفلر سے ڈھک رکھا تھا جس میں سے صرف کانوں کی لوئیں نظر آتی تھیں۔ان لوؤں میں روپہلی ٹوپس دو ننھے ننھے پورے چاندوں کی طرح دمک رہے تھے۔اس کے رخساروں پر غازہ سرخ دھول کی طرح معلوم ہوتا تھا۔اس کے جسم اور لباس سے خوشبوئیں پھوٹ رہی تھیں۔اس کی عمر بائیس تیئس برس سے زیادہ نہ تھی۔چال ڈھال سے وہ ایک الھڑ حسینہ معلوم ہوتی تھی۔آنکھوں سے مسکرانے والی، گہرے گہرے سانس لینے والی۔

رنگ علی اور حسین بخش کی نظریں سب سے پہلے بے ساختہ اس کی ناک پر پڑیں جس میں سرخ نگینے والی ایک کیل چمک رہی تھی۔

"شکر ہے آپ خیریت سے گھر پہنچیں۔" رنگ علی نے کہا۔

"سینما کے بعد کم بخت چشتی زبردستی ہوٹل لے گیا۔" تھمی جان نے کہا۔

"بہت اچھا ہوا۔" رنگ علی نے کہا۔

"تم لوگ اتنے پریشان کیوں ہو؟" تھمی جان نے پوچھا۔

"بائی جی۔" حسین بخش نے کہا۔ "مجھے تو آپ چھٹی ہی دیجیے۔

"آخر ہوا کیا؟"

"آپ گھر پر ہوتیں تو قیامت ہی آجاتی۔" رنگ علی نے کہا۔

"کچھ کہو تو آخر ہوا کیا؟"

"آپ کے پیچھے تین پٹھان آئے تھے۔" رنگ علی نے کہا۔ "بڑے وحشی سے۔ان کے پاس لمبے لمبے چاقو تھے۔ہمیں مارا پیٹا، گالیاں دیں۔بات بات پر چاقو نکالتے تھے۔کہتے

تھے۔"

"کیا کہتے تھے؟" ننھی جان نے پوچھا۔

"کہتے تھے، ان کے منہ میں خاک، ہم ننھی جان کا ناک کاٹنے آیا ہے۔"

لمحہ بھر کے لیے ننھی جان کے چہرے کی رنگت کی ایسی کیفیت ہوئی جیسے کوئی بلب فیوز ہوتے ہوتے دوبارہ روشن ہو جائے۔ پھر اس نے نگاہیں اپنی انگلیوں کے سرخ رنگے ہوئے ناخنوں پر گاڑ دیں۔

"میں نے کہا بھی۔" رنگ علی نے کہا۔ "بائی جی رات کو واپس نہیں آئیں گی۔ پھر بھی ڈیڑھ بجے تک ہلنے کا نام نہیں لیا۔"

"میرے منہ پر اس زور کا مکا مارا کہ دو دانت ہل گئے۔" حسین بخش نے بسورتے ہوئے کہا۔

ننھی جان نے کچھ جواب نہ دیا۔

"آخر اَب کیا ہوگا؟" رنگ علی نے پوچھا۔

"جانے کیا ہوگا!" ننھی جان نے کہا۔

"تھانہ میں رپٹ نہ لکھوادیں؟"

"کچھ فائدہ نہیں، الٹی بدنامی ہوگی۔ پھر پولیس والوں کے ناز مفت کے۔"

"کہیں اور نہ چل دیں؟"

"کہاں؟"

"کسی اور شہر!"

"کچھ فائدہ نہیں۔ سب جگہ ایسا ہی حال ہے۔"

"آخر پھر کیا کریں؟"

"کیا ہو سکتا ہے؟"

"کچھ نہیں ہو سکتا؟"

"کچھ نہیں ہو سکتا!"

پَل بھر خاموشی رہی۔ اس کے بعد ننھی جان نے انگڑائی لی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک تھکی تھکی سی اداس مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"خلیفہ جی۔" اس نے رنگ علی سے کہا۔ "اس وقت تو تم لوگ آرام کرو صبح دیکھا جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ اپنی خواب گاہ میں چلی گئی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

پانچ منٹ کے بعد سب کواڑ بند کر دیئے گئے تھے اور روشنی گل کر دی گئی تھی۔

دونوں استاد اور جمن فرش پر پاس پاس بستر بچھا کے لیٹ گئے تھے۔

"یہ پٹھان ضرور کسی کے بھیجے ہوئے تھے۔" رنگ علی نے حسین بخش سے کہا۔

"مگر کس کے؟" حسین بخش نے کہا۔

لمحہ بھر خاموشی رہی۔

"ہو نہ ہو یہ چگر والے حاجی کی کارستانی ہے۔" رنگ علی نے کہا۔ "وہ بڈھا نکاح کے لیے بائی جی کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔"

"ہوں" حسین بخش نے نحیف آواز میں جواب دیا۔

پَل بھر کو خاموشی رہی۔

"یا شاید یہ نواب صاحب کی بدمعاشی ہے۔" رنگ علی نے کہا۔ "اس کو یہ چڑ تھی کہ ظفر صاحب کیوں آتے ہیں۔"

"ہوں۔" حسین بخش نے پہلے سے بھی نحیف آواز میں جواب دیا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔

"پھر خیال آتا ہے۔" رنگ علی نے کہا۔ "کہیں یہ اس فیض آباد کے کنگلے تعلقدار کی شرارت نہ ہو جس کو بائی جی نے بے عزت کر کے مکان سے اُتار دیا تھا۔"

حسین بخش نے جواب نہ دیا۔ اُس نے منہ دھسّے کے اندر کر لیا تھا اور لمبے لمبے سانس، جو ابھی خراٹے نہیں بنے تھے، لینے شروع کر دیے تھے مگر رنگ علی کی آواز برابر سنائی دے رہی تھی:

"میں جانوں یہ سب راؤ صاحب کا کیا دھرا ہے۔ وہ کانا مارواڑی جو بائی جی کو بنارس لے جانا چاہتا تھا ..."

۱۹۴۵ء

چکر

سیٹھ چھنامل کا منیم چیلارام صبح سے دو پہر کے بارہ بجے تک کوٹھی میں بہی کھاتے اور لکھنے پڑھنے کا کام کیا کرتا۔ اس کے بعد وہ رقمیں اُگاہنے چلا جاتا۔ جون کی ایک دوپہر کو وہ اپنا کپڑے کا تھیلا، جس میں وہ کاغذات وغیرہ رکھا کرتا تھا، سیٹھ کے کمرے کے سامنے سے گزرا، سیٹھ اس وقت گاؤ تکیئے سے لگے بیٹھے پیچوان پی رہے تھے۔ انھوں نے چق کے اندر سے چلّا کر کہا:

''اے منیم جی! دیکھنا مال گودام جانا نہ بھول جانا اور بنک میں روپیہ بھی سب جمع ہو جائے اور ہاں وہ رجسٹریاں بھی تو ضروری ہیں .. نسخہ اور کتابوں کی فہرست تو تم نے رکھ ہی لی ہو گی؟''

چیلارام نے کہا: ''جی ہاں۔'' اور وہ روانہ ہو گیا۔

اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ ہاتھ پیر ابھی مضبوط تھے۔ معلوم ہوتا تھا جوانی میں صحت بہت اچھی ہو گی۔ اس کا لباس گرمی، سردی، ہر موسم میں قریب قریب ایک ہی وضع کا تھا۔ کھدر کا کرتا، موٹی ململ کی دھوتی، چار خانے کے کپڑے کا کوٹ، سر پر سیاہ کرتی ٹوپی، پاؤں میں نرمی کا جوتا۔ چونکہ اسے دن بھر چلتے پھرتے رہنا پڑتا تھا۔ اس لیے یہ جوتا، بوٹ چپل وغیرہ کی نسبت، زیادہ پائیدار ثابت ہوا تھا۔ اس جوتے نے شروع شروع میں

اس کے پیروں کو بہت تکلیف پہنچائی تھی مگر جب اس نے اس کے ٹخنوں اور پیروں کی انگلیوں پر سخت سیاہ گٹے ڈال دیئے تو تکلیف رفع ہو گئی۔

علاوہ ازیں ایک پرانا چھاتا جس کی موٹھ ہاتھی دانت کی اور فیشن ایبل بنی ہوئی تھی اس کے لباس کا جزو بن گیا تھا۔ یہ چھاتا دراصل سیٹھ چھنامل کے بڑے لڑکے کا تھا جس نے بہت دن ہوئے اسے رڈی کر کے پھینک دیا تھا۔ سیٹھ کی نظر پڑ گئی۔ اپنے ہاں اس کا کوئی مصرف نہ دیکھ کر انھوں نے اپنے منیم کو دے دیا مگر چیلا رام کو اس چھاتے کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ پہلے تو شاید سخت گرمی کے دنوں میں اسے بار بار دُور دُور کے کاموں پر بھیجتے ہوئے سیٹھ کو کچھ ہچکچاہٹ ہوتی ہو گی مگر چھاتے کے دان کے بعد ان کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں رہ گیا تھا۔

اس وقت سُورج آسمان کے ٹھیک بیچ میں پہنچ گیا تھا۔ دیواروں کا سایہ گھٹتے گھٹتے اس قدر مختصر ہو گیا تھا کہ صرف ایک لکیر سی دکھائی دیتی تھی جو بیچ بیچ میں ٹوٹتی ہوئی سڑک کے کنارے کنارے دور تک چلی گئی تھی۔ دھوپ کی تیزی اور شدت کا یہ حال تھا کہ آنکھیں خود بخود بند ہوئی جاتی تھیں۔ بند ہونے پر بھی پپوٹوں کے اندر سے اپنے اردگرد ایک سرخ سرخ اندھیرا سا گھومتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ گو چیلا رام نے چھاتا تان رکھا تھا مگر دھوپ چھاتے کے بوسیدہ کپڑے میں سے چھن چھن کر اس کے چہرے کی طرف یوں لپک رہی تھی جیسے کسی سرسامی کا گرم سانس۔

چیلا رام چھاتے کو ٹیڑھا کر کے اپنے سر اور سینے کو لُو کے تھپیڑوں سے بچاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ کوٹھی سے کوئی دو سو قدم آگے نکل کر اس نے تھیلے کو چھاتے کی موٹھ میں لٹکا لیا اور کوٹ کی جیب میں سے بیڑیوں کا بنڈل اور دیا سلائی کی ڈبیا نکالی اور بیڑی سلگا کر سوچنے لگا کہ آج کے مختلف کاموں کو کس ترتیب سے انجام دوں کہ کم سے کم چلنا پڑے۔

اس روز اسے چھ اسامیوں سے رقمیں وصول کرنی تھیں۔ ان میں سے دو کے گھر

توزیادہ دور نہیں تھے البتہ باقی چار شہر کے چار مختلف سروں پر رہتی تھیں۔ جب تک ان چھوں سے روپیہ وصول نہ ہو جائے وہ بنک نہیں جاسکتا تھا اور بنک تین بجے کے بعد لین دین بند کر دیتا تھا۔ پھر بعض رجسٹریاں تھیں جن کے متعلق سیٹھ نے تاکید کر رکھی کہ انھیں آج ہی ڈاک میں بھیج دیا جائے۔ چونکہ ڈاک خانوں میں عموماً بھیڑ رہا کرتی ہے۔ اس لیے کم سے کم ایک گھنٹہ اس کے لیے چاہیے تھا۔ پھر اسے ریل کے مال گودام میں جانا تھا۔ گھنٹے سوا گھنٹے کا یہ کام تھا۔ علاوہ ازیں سیٹھانی کے لیے نسخہ بھی بنوانا تھا اور سیٹھ کے منجھلے لڑکے کے لیے جس نے چھٹی جماعت پاس کر لی تھی، کتابیں خریدنی تھیں۔

بھلا ہو چیلا رام کے نرم کے جوتے کا، اس کے بیڑیوں کے بنڈل کا اور ان پانی کی سبیلوں کا، جنھیں کمیٹی نے بازاروں میں اور بعض نیک دل دکانداروں نے اپنی اپنی دکانوں کے پاس لگوا رکھا تھا، کہ اس نے چھ بجتے بجتے سب کام نمٹا لیے۔ وہ سارے دارالسلطنت میں اس طرح گھوم گیا جس طرح کوئی دور دراز ملک کا رہنے والا منچلا سیاح تھوڑے سے وقت میں کسی مشہور تاریخی شہر کے ایک ایک بازار کو دیکھتا اور ایک ایک سڑک پر سے گزرتا اپنے پر فرض کر لیتا ہے۔ جب لُو زیادہ ستانے لگتی تو وہ دھیان بٹانے کے لیے بیڑی سلگا لیتا۔ جب بیڑی کے دھوئیں سے حلق سُوکھ جاتا تو پیاؤ سے پانی پی لیتا۔ جب جوتے میں گرد بھر جاتی یا وہ تپ اٹھتا تو کسی سائے والی جگہ میں کھڑے ہو کر جوتا جھاڑ لیتا اور اگر کوئی سرکاری نل قریب ہی ہوتا تو جوتا اُتار کر پاؤں بھگو لیتا۔ جس طرح بعض دفعہ گاڑی بان گاڑی کے پہیوں کے گرم ہو جانے پر پانی ڈال کر انھیں ٹھنڈا کر لیتے ہیں۔

جب وہ کوٹھی سے نکلا تھا تو اسے آج کے کام پہاڑ سے دکھائی دیتے تھے مگر اب اسے خود حیرانی ہو رہی تھی کہ اس نے یہ سارے کام کس طرح انجام دے لیے اور پھر یہ کام سیٹھ کے حسبِ منشاء خوش اسلوبی سے ہو گئے تھے۔ البتہ ایک آسامی نے اسے دیر تک ٹھہرائے رکھا تھا اور پھر رقم بھی نہیں دی تھی۔ اس طرح نسخہ بنوانے کے لیے بھی اسے کافی

دیر کھڑا رہنا پڑا تھا کیونکہ جس ڈسپنسری سے سیٹھ چھنامل کا حساب تھا اس کا کمپونڈر چیلارام کو پسند نہیں کرتا تھا اور اس کا نسخہ عموماً سب سے آخر میں بنایا کرتا تھا۔ ہاں ڈاک خانے میں اسے اندازے سے بہت کم ٹھیرنا پڑا۔ وجہ یہ تھی کہ اس نے ڈاک خانہ چُنا ہی ایسا تھا جس کے آس پاس آبادی نسبتاً کم تھی اور بہت سے لوگ اس کے وجود تک سے ناواقف تھے۔ مال گودام میں بھی اس کی جلدی خلاصی ہوگئی کیونکہ بلٹیاں ابھی نہیں آئی تھیں۔

جس وقت وہ سیٹھ کی کوٹھی کے قریب پہنچا تو دھوپ میں وہ پہلے جیسی حدت نہیں رہی تھی البتہ سڑکوں پر چھڑکاؤ کی وجہ سے انجرات اٹھ رہے تھے جس سے سخت حبس ہو گیا تھا۔ دور ہی سے اسے سیٹھ کے کمرے سے ہنسی ٹھٹھے کی آوازیں آتی ہوئی سنائی دیں اور وہ دروازے کے باہر چق کے پاس پہنچ کر ٹھہر گیا۔ وہ ان آوازوں کو خوب پہچانتا تھا۔ ان میں سے ایک تو سیٹھ بانکے بہاری تھے جو سیٹھ چھنامل کے پڑوس میں انہی کی طرح مگر ذرا چھوٹے پیمانے پر ساہوکارہ کرتے تھے اور سیٹھ کے دور کے رشتہ دار بھی ہوتے تھے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ ہر روز چھ بجتے ہی اپنا کاروبار بند کر دیتے اور سیٹھ چھنامل سے خوش گپیاں کرنے آموجود ہوتے۔ ان کے ساتھ عموماً ان کا ایک ٹھیکہ دار دوست بھی آیا کرتا۔ یہ شخص بڑا لطیفہ گو اور چرب زبان تھا اور اپنی انھی خوبیوں کے باعث بڑے بڑے حکام تک اس کی رسائی تھی۔

علاوہ ازیں سیٹھ چھنامل کا بہنوئی جو ایک بے پروا اور آوارہ مزاج آدمی تھا اور جو دیوالیہ ہو چکا تھا اور اب سیٹھ کے ٹکڑوں پر پڑا ہوا تھا بڑے شوق سے ان خوش گپیوں میں حصہ لیا کرتا۔ خود سیٹھ جی بھی ان کے دلدادہ تھے کیونکہ دن بھر اپنے کمرے میں اکیلے بیٹھے یا سوتے رہنے سے وہ اکتا جاتے تھے۔ چنانچہ اس وقت کی یہ مختصر سی محفل گھر بیٹھے ان کے لیے تفریح کا سامان مہیا کر دیتی تھی۔

چیلارام دو تین مرتبہ دروازے کے باہر کھڑے کھڑے کھانسا مگر سیٹھ جی اپنے دوستوں کے ساتھ باتوں میں ایسے مشغول تھے کہ اُنھوں نے آواز نہ سنی۔

اس وقت سیٹھ بانکے بہاری کا ٹھیکہ دار دوست تناسخ کے مسئلے پر گفتگو کر رہا تھا وہ کہہ رہا تھا:

''ہنسی مذاق کو چھوڑ کر آپ ذرا اس مسئلے پر بھی تو غور کیجیے، آج کل جس کو سنو، یہی کہہ رہا ہے کہ اس کلجگ کے زمانے میں پاپ بہت بڑھ گیا ہے اور اب دنیا میں صرف مہان پاپی ہی بستے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو دنیا کی آبادی روز بروز کم ہوتی جانی چاہیے تھی کیونکہ جب کوئی مہان پاپی مر جاتا ہے تو آواگون کی رُو سے وہ دوبارہ انسان کے روپ میں جنم نہیں لیتا بلکہ انسان سے گھٹیا درجے یعنی پشو پکشی کی جون دھارن کرتا ہے اور اس طرح آج دنیا میں روز بروز انسان کم اور پشو پکشی زیادہ ہونے چاہیے تھے مگر یہاں معاملہ اُلٹا ہے سیٹھ جی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج کل جو کچھ ہم کر رہے ہیں وہ پاپ نہیں مہا پن ہے اور جبھی تو ہم بار بار انسان کا رُوپ۔ ..''

اچانک ٹھیکہ دار کی نظر دروازے پر پڑی اور وہ بات کرتے کرتے رک گیا اور پھر سب کی نظریں دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ چیلا رام سے زیادہ دیر تک دروازے کے باہر کھڑا نہ رہا جا سکا تھا، وہ ایک اضطراری حرکت کے ساتھ چق اٹھا کر اندر داخل ہو گیا تھا۔

اس وقت اس کی حالت بہت ابتر ہو رہی تھی۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور صورت سے عجیب ہونق پن سا برس رہا تھا۔ اس کی کڑ بڑی مونچھیں، پلکیں اور بھوویں گرد سے اَٹی ہوئی تھیں اور آنکھیں ایسی سرخ ہو رہی تھیں گویا دُکھنے آئی ہوں۔ دن بھر دھوپ اور لُو کے تھپیڑے کھا کر اس کے چہرے کی رنگت ایسی سیاہی مائل سرخ ہو گئی تھی جیسے مرگھٹ کے اس مردے کی جس کے چہرے کے پاس لکڑیوں کی آنچ پہلے پہل پہنچنی شروع ہوئی ہو۔

اس کی کرسٹی ٹوپی کا کنارہ بھیگا ہوا تھا اور اس کی بغلوں سے اس قدر پسینہ بہا تھا کہ کوٹ کی آستینیں چھاتی سے لے کر کہنیوں تک تر تھیں، علاوہ ازیں اس کی دھوتی پر جا بجا کیچڑ کی

چمیٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ اس وقت اس قدر بے جان معلوم ہوتا تھا کہ ہر لحظہ یہ گماں ہوتا، اَب گرا کہ اَب گرا۔

یہ دیکھ کر کہ اس کے آنے سے گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے اور سب لوگ اس کی طرف دیکھ رہے ہیں، وہ کچھ گھبرا سا گیا مگر اس نے آگے بڑھ کر تھیلا فرش پر رکھ دیا اور اس میں سے کتابیں، سیٹھانی کا نسخہ، دوا کی شیشی، رجسٹری اور بنک کی رسیدیں اور دوسرے کاغذات وغیرہ نکال نکال کر سیٹھ کے سامنے رکھنے لگا۔ وہ بلٹیوں کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ سیٹھ نے ہاتھ سے اشارہ کر کے اسے روک دیا اور کسی قدر ملائمت سے کہا:

"منیم جی! اس وقت تو تم گھر جاؤ، صبح دیکھا جائے گا۔"

چیلارام کا گھر سیٹھ کی کوٹھی سے کوئی دو میل کے فاصلے پر تھا۔ جس وقت وہ گرتا پڑتا گھر پہنچا خاصی شام ہو چکی تھی۔ گھر پہنچتے ہی اس نے دھوتی کے سوا سب کپڑے اتار ڈالے اور مکان کے باہر احاطے میں نکل آیا۔ اس کے دروازے کے پاس دیوار کے سہارے ایک کھٹیا کھڑی تھی۔ اس نے کچھ نہیں دیکھا کہ یہ کس کی ہے۔ جھٹ وہی بچھا، اس پر بے سدھ ہو کر گر پڑا۔

شاید اس کی بیمار بیوی نے، جو چولہے کے پاس بیٹھی رسوئی بنا رہی تھی، اس سے کچھ کہا تھا مگر اسے کچھ معلوم نہیں ہوا کہ کیا کہا گیا۔ اس کی چھوٹی لڑکی آ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی۔ شاید اس نے اسے درشتی سے پرے ہٹا دیا تھا، یا شاید وہ خود ہی سہم کر پرے ہٹ گئی تھی۔

پندرہ منٹ تک وہ آنکھیں بند کیے کھٹیا پر بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ اس کے حواس بجا ہونے شروع ہوئے اور اس کے ساتھ ہی اسے اپنے جسم کے مختلف حصوں خصوصاً پنڈلیوں اور کمر میں اینٹھن اور میٹھا میٹھا سا درد محسوس ہونے لگا اور وہ آہستہ آہستہ کراہنے لگا۔ وہ کبھی اِس کروٹ لیٹتا اور کبھی اُس کروٹ۔ کبھی ٹانگوں کو اکڑا کر سخت

کر لیتا اور پھر آہستہ سے انھیں چھوڑ دیتا۔ کبھی شانوں کو زور سے سکیڑ کر سر کو پیچھے ڈال دیتا، کبھی پنڈلیوں کو رانوں سے ملا کر بھینچ لیتا۔ کبھی ہاتھوں کو اندر کی طرف موڑتا، کبھی پیروں کے پنجوں کو پھیلا کر سیدھا کرتا۔ ان حرکات سے جب کبھی اس کا کوئی جوڑ خود بخود چٹخ اٹھتا تو اسے بہت آرام محسوس ہوتا۔

یوں لوٹنے پوٹنے سے اس کی طبیعت اور بھی سنبھل گئی اور اسے نیند آ گئی مگر وہ زیادہ دیر نہیں سویا تھا کہ اپنے سرہانے کچھ شور سُن کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

اس کا ہمسایہ رولو دن بھر تانگا چلانے کے بعد واپس آ چکا تھا۔ تانگے میں سے گھوڑے کو کھول لیا گیا تھا اور ساز اُتار کر صرف ایک رسّی اس کے گلے میں ڈال دی گئی تھی جسے رولو نے پکڑ رکھا تھا اور ایک مالشیا کپڑے کی ایک گدی زور زور سے اس کی کمر اور پچھلی ٹانگوں پر رگڑ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا اس کام میں مالشیے کا کافی زور لگ رہا تھا کیونکہ ہر رگڑ کے ساتھ اس کے منہ سے بے ساختہ ''ہوں'' نکل جاتی تھی۔ خود رولو کے ہاتھ میں ایک کپڑا تھا اور وہ گھوڑے کی گردن، بغلوں اور پیٹ پر سے پسینہ پونچھتا جاتا تھا۔

رسی کا جو حصہ گھوڑے کے گلے میں پڑا ہوا تھا اس میں پیتل کے نکل کیے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھنگرو بندھے ہوئے تھے۔ گھوڑا بار بار پھنکارتا، اپنا سر بے چینی سے اوپر کو جھٹکتا اور ہر بار یہ گھنگرو اندھیرے میں چاندی کی سی چمک دکھلاتے ہوئے زور سے بج اٹھتے گھوڑا رہ رہ کر اپنی اگلی ٹانگوں کے سم بھی زمین پر مار رہا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ بھڑک کر زور زور سے ہنہنانے اور دولتیاں بھی جھاڑنے لگتا۔ ایسے موقع پر رولو اسے چمکارتا اور کہتا ''بس بس، میرے بیٹے، میرے لعل۔''

چیلا رام کچھ دیر تک دلچسپی سے یہ ماجرا دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اس نے کروٹ بدل لی اور آنکھیں بند کر لیں۔

اس کی بیوی نے کوٹھڑی میں سے چلا کر کہا: ''بھوجن کر لو''

چیلارام نے کچھ جواب نہ دیا۔ آنکھیں بند کیے چپ چاپ پڑا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی بیوی نے اب کے دروازے میں کھڑے ہو کر کہا:

"بھوجن کبھی کا تیار ہو چکا ہے، اَب اندر آ جاؤنا!"

چیلارام اَب بھی خاموش رہا۔

وہ کیا سوچ رہا تھا؟ کیا وہ آواگون کے مسئلے پر غور کر رہا تھا؟ کیا وہ یہ چاہ رہا تھا کہ اَب کے جب وہ مر جائے تو اس کا جنم گھوڑے کی جُون میں ہو۔۔۔۔

۱۹۴۵ء

اندھیرے میں

"مجھے چھوڑ دو... مجھے چھوڑ دو۔۔۔اب میں ایک پل بھی یہاں نہیں رہوں گا۔"

بڈھے نے اپنے کمزور اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نوجوان کی قمیص کا دامن اور بھی مضبوطی سے تھام لیا اور بڑی لجاجت سے کہا:

"بس اب غصہ تھوک بھی ڈالو بیٹے! کہہ جو دیا اب کبھی نہیں پیوں گا۔ لو میں توبہ کرتا ہوں۔"

"اونہہ توبہ!" نوجوان نے تنک کر کہا۔ "اس دن بھی تو توبہ کی تھی اور پھر اس دن! نہیں نہیں۔ یہ اب تم سے چھٹ نہیں سکتی۔ تم نے سوچا ہوگا میرا بیٹا جلسے میں گیا ہے۔ وہ رات کو کہیں بارہ بجے آئے گا، بس میدان خالی دیکھا اور وہی پرانی وحشت لگ گئی۔ ...کیا تم چاہتے ہو کہ اپنی ماں کی طرح میں بھی گھٹ گھٹ کر مر جاؤں۔"

مارے رقت کے نوجوان کا گلا بھر آیا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں ایک آنسو مچل کر اس کی آنکھ سے بہہ نکلا اور اس کی چھوٹی سی خوبصورت سیاہ ڈاڑھی میں اُلجھ کر رہ گیا۔ وہ صرف اتنا کہہ سکا:

"مجھے جانے دو۔"

"کیسے جانے دوں بیٹے! تمہارے سوا اس دنیا میں میرا..."

"بڈھا یہیں تک کہنے پایا تھا کہ اسے زور کی کھانسی اٹھی، کھوں، کھوں، کھوں کھوں، کھوں، کھوں۔ نوجوان کی قمیص کا دامن خود بخود اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے چھاتی کو پکڑ لیا۔ کھانستے کھانستے اس کی آنکھیں باہر نکل پڑیں گردن کی رگیں پھول کر رسّی کی طرح ہو گئیں۔ آخر دو تین منٹ کے بعد کھانسی ختم گئی مگر اب اس میں بات کرنے کی سکت نہ تھی، بے دَم ہو کر چارپائی پر گر پڑا۔ نوجوان اس کی گرفت سے آزاد ہو چکا تھا اور چاہتا تو کبھی کا جا سکتا تھا مگر نہ تو وہ کوٹھڑی سے باہر نکلا اور نہ باپ کی چارپائی ہی کے پاس گیا۔

کوٹھڑی میں پہلے ہی شراب کی بُو پھیلی ہوئی تھی، اس پر اس کھانسی نے بڈھے کے منہ سے پے در پے شراب میں بسا ہوا سانس خارج کر کے اس فضا کو اور بھی آلودہ کر دیا تھا۔ نوجوان اس کی بھبک کو پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر میں جب بڈھے کے حواس ذرا بجا ہوئے تو وہ چارپائی سے اُٹھا اور نوجوان کے پاس آ کر ملامت آمیز لہجہ میں کہنے لگا:

"میرا۔۔ میرا یہ حال، اور تم مجھے چھوڑ کر جانا چاہتے ہو!"

نوجوان لمحہ بھر گردن نیچی کیے خاموش کھڑا رہا اور پھر بولا:

"میں تمہارے ہی بھلے کے لیے کہتا ہوں۔ شراب نے تمہارے جگر کو چھلنی کر ڈالا ہے۔ ڈاکٹر کہہ چکا ہے کہ اب اس کا ایک قطرہ بھی تمہارے لیے زہر ہے۔ مگر تم ہو کہ۔۔ بس نہ میں یہاں رہوں گا اور نہ تمہاری یہ حالت دیکھوں گا۔" جس وقت نوجوان یہ کہہ رہا تھا تو اس کے لہجہ میں وہ پہلا سا جوش نہیں رہا تھا بلکہ اس کی جگہ ایک تاسف نے لے لی تھی۔

باپ نے خطاکارانہ نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ کچھ دیر خاموش رہا جیسے دل ہی دل میں کوئی اہم فیصلہ کر رہا ہے، پھر بولا:

آج میں سچے دِل سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب اسے کبھی منہ نہیں لگاؤں گا۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم اس سے اس درجہ نفرت کرتے لگے ہو۔ صرف ایک موقع اور دو ۔ اب کے پیئوں گا تو تمہیں اختیار ہوگا، جہاں جی چاہے چلے جانا۔"

دونوں چند لمحے تک خاموش رہے۔

"اچھا ایک بار اور سہی۔" بالآخر نوجوان نے سکوت کو توڑا۔ "مگر تمہیں وہ بوتل میرے حوالے کردینی ہوگی جو میرے اچانک آجانے پر تم نے چُھپالی تھی۔"

"برخوردار۔" بڈھے نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تم اسے لے کر کیا کروگے میں کسی اپنے دوست کے ہاتھ بیچ ڈالوں گا۔ تمہاری تنخواہ میں سے آنہ آنہ، دودو آنے بچاکر میں نے چارروپے جمع کیے تھے جس کی یہ کم بخت بوتل خریدلی۔ میں نے اس میں سے صرف دوایک پیگ ہی پئے ہیں۔ تین نہ سہی دوڈھائی روپے تو کہیں نہیں گئے جو اس تنگ دستی میں ہمارے کام آئیں گے۔"

"نہیں نہیں۔" نوجوان نے جلدی سے کہا۔ "اس کا گھر میں رہنا ٹھیک نہیں۔ لاؤ مجھے دےدو۔"

اس پر بڈھے نے ایک بے تکا سا قہقہہ لگایا۔ بیٹے کی اس دخل اندازی سے اس کے پینے کا سارا مزا کرکرا ہوگیا تھا مگر اب ہنگامے کو فرو ہوتے دیکھ کر اس کی طبعی خوش باشی اور زندہ دِلی لوٹ آئی تھی۔

"میری جان۔" اس نے کہا۔ "تم فکر نہ کرو میں اسے منہ نہیں لگاؤں گا۔ اگر پیئوں تو جو چور کی سزا سو میری سزا۔ میں صبح ہوتے ہی اسے خلیفہ کے پاس چلتا کروں گا۔" دوروپے تووہ ہنس کر دےدے گا میری بات مانو میں اسے بالکل منہ نہیں لگاؤں گا۔"

زبان سے تو وہ یہ کہہ رہا تھا مگر اس کی آنکھوں سے ایک پیاس، ایک ترساوٹ ظاہر ہورہی تھی۔

”نہیں نہیں۔“ اس کے بیٹے نے یکبارگی درشت لہجہ میں کہا۔ ”میں اسے گھر میں نہیں رہنے دوں گا۔ اگر تم مجھے رکھنا چاہتے ہو تو اسے میرے حوالے کردو۔“ پھر باپ کو کچھ پس وپیش کرتے دیکھ کر وہ بولا: ”سنو اگر تمہیں اس کے بیچنے ہی کا خیال ہے تو یہ کام میں بھی کرسکتا ہوں۔“

اور اس نے باپ کو بتایا کہ اس کے دفتر کا ایک چپراسی نوکری چھوڑ کر آج کل ایک صاحب کا بیرا بنا ہوا ہے، اس کی معرفت یقیناً اسے بیچا جاسکتا ہے۔ وہ وعدہ کرتا ہے کہ اسے ضائع نہیں کرے گا اور اگر وہ اسے بیچ نہ سکا تو واپس لے آئے گا اور پھر اس کے باپ کو اختیار ہوگا کہ وہ جس کے ہاتھ چاہے اِسے بیچ ڈالے۔

بیٹے کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر باپ نے زیادہ ٹال مٹول کرنا مناسب نہ سمجھا اور بڑی حسرت کے ساتھ صندوق کے پیچھے سے بوتل نکال کر اسے دے دی۔ یہ سنگترے کا ٹھرا تھا۔ اس کا باپ اس میں سے ابھی آٹھواں حصہ بھی نہیں پینے پایا تھا۔ نوجوان نے اس کے ارغوانی رنگ پر نفرت کی نگاہ ڈالی، پھر اسے ہاتھ میں تھام، کمبل کی بغل میں چھپالیا اور کوٹھڑی سے نکل آیا۔ صحن میں سے گزر رہا تھا کہ باپ کی آواز سنائی دی:

”دیکھنا میرے بیٹے ضائع نہ کردینا۔ تم نے وعدہ کیا ہے، دو تین روپوں میں آج کل سینکڑوں کام۔۔۔“ وہ اب اتنی دُور نکل گیا تھا کہ باپ کے باقی الفاظ نہ سن سکا۔

یہ جنوری کے وسط کی ایک سرد رات تھی۔ نو بج چکے تھے۔ بازاروں کی چہل پہل کم ہوگئی تھی۔ بہت سے دکاندار اپنی دکانیں بڑھا چکے تھے۔ نوجوان کچھ سوچے سمجھے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتا چلا جارہا تھا۔ دو ایک راہ گیروں سے وہ بھڑتے بھڑتے رہ گیا۔ ایسے موقع پر اس نے اضطراری طور پر بازوؤں کو سکیڑا اور گردن جھکا کر کمبل میں چھپی ہوئی بوتل کو اس طرح بچالیا جس طرح کوئی روگی اپنے جسم کے کسی پکے ہوئے پھوڑے کو ٹھیس لگنے سے بچاتا ہے۔

نوجوان اپنی دُھن میں محو نہ جانے کن کن بازاروں اور گلی کوچوں کو طے کرچکا تھا مگر

ابھی تک وہ فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ اسے جانا کہاں ہے۔ آخر جب اس نے اپنے کو چاوڑی بازار میں پایا تو وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ ۔ شاید اس کے دماغ کے کسی گوشے میں یہ خیال تھا کہ اگر اس جنس کے خریدار مل سکے تو بازار حسن ہی میں مل سکیں گے اور اس کے قدم آپ سے آپ اسے اس طرف لے آئے تھے، مگر کیا وہ سچ مچ اس چیز کو بیچنے کے ارادے سے نکلا تھا۔

اس خطرناک چیز کا جو شاید اس کے باپ کا آخری جام ثابت ہوتی گھر میں رہنا اسے کسی صورت منظور نہ تھا اور وہ جوش میں بھرا ہوا، کچھ سوچے سمجھے بغیر، باپ کی ہر بات ماننے کو تیار تھا بشرطیکہ وہ بوتل اس کے حوالے کر دے۔ سودا کرنا تو ایک طرف، اگر کوئی اس سے یہ کہتا: "میاں صاحبزادے میں جانتا ہوں کہ تم بہت متقی و پرہیزگار ہو اور یہ جو ذلیل کام تم نے اپنے ذمے لیا ہے، اس کا تمہیں قربانی اور شہادت کا سا اجر ملے گا تم نے اپنے کمبل میں جو شراب کی بوتل چھپا رکھی ہے اور جس میں سے تھوڑی سی خرچ بھی ہو چکی ہے، لاؤ پورے داموں میرے ہاتھ بیچ ڈالو کیونکہ ٹھیکہ بند ہو چکا ہے۔" پھر بھی شاید وہ راضی نہ ہوتا۔

وہ تیزی سے اس بازار سے گزر گیا اور چوک میں پہنچا جہاں سے نئی دلی کو راستہ جاتا تھا۔ چوک میں پل بھر کے لیے رُک کر سوچنے لگا، اب کدھر جاؤں کہ اچانک ایک آواز نے اسے چونکا دیا:

آداب عرض مولانا، کہو بھئی یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو، مناظرے میں نہیں گئے؟"

نوجوان کا دل یک لخت زور سے دھڑک اٹھا اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا۔

"والد صاحب۔ ۔ وہ یکبارگی علیل ہو گئے۔ اچھا بھئی کل دفتر میں ملیں گے، مجھے ایک ضروری کام سے نئی دلی جانا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اس کے قدم نئی دلی کی طرف اٹھ گئے۔ اگر اس کے دفتر کے اس ساتھی کو شبہہ بھی پڑ جاتا کہ جس کو اس نے "مولانا" کہہ کر خطاب کیا ہے وہ اس وقت اپنے

کمبل کے نیچے کیا چھپائے لیا جارہا ہے تو . . اس ملاقات سے اسے صورتِ حال کی نزاکت کا اچانک احساس ہو گیا۔ نئی دلّی کا نام محض دوست کو ٹالنے کے لیے اس کی زبان سے نکل گیا تھا مگر اب وہ سچ مچ نئی دلّی جارہا تھا اور کچھ نہ سہی وہاں ایسی اچانک ملاقاتوں کا امکان تو کم ہوگا اور پھر وہاں وہ کناٹ پلیس کے کسی الگ تھلگ گوشے میں بیٹھ کر اپنی حالت پر غور کر سکے گا۔

کوئی گیارہ کا عمل ہوگا کہ وہ کناٹ پلیس کے پارک میں پہنچا۔ مسلسل دو گھنٹے چلتے رہنے سے تھک گیا تھا۔ ہاتھ دُکھنے لگے تھے جن میں وہ باری باری بوتل کو اٹھاتا لایا تھا۔ ایک درخت کی نیم تاریکی میں ایک خالی بنچ دیکھ کر اس پر بیٹھ گیا۔ بوتل بنچ پر رکھ دی اور ہاتھوں کی انگلیاں چٹخانے لگا۔

اس وقت شدت کا جاڑا پڑنے لگا تھا جس میں باغ کی سیل نے اور بھی اضافہ کر دیا تھا، اس نے اپنے جسم کو اچھی طرح کمبل میں لپیٹ لیا۔ دل میں اب پہلا سا جوش اور غصہ نہیں رہا تھا بلکہ اپنی اس مہم پر رہ رہ کے ہنسی آرہی تھی۔ بھلا وہ اور شراب کا سودا یہ خیال ہی مضحکہ انگیز تھا۔ یہ سچ تھا کہ اس کے دفتر کے ایک چپراسی نے کسی صاحب کی نوکری کر لی تھی مگر اتا پتا ایک طرف وہ تو اس کے مالک کا نام بھی نہیں جانتا تھا اور پھر اگر کسی لطیفۂ غیبی سے اسے وہ بیرا مل بھی جاتا تو کیا اس کے سامنے اس چیز کا نام لینے کی بھی اسے جرأت ہوتی.....

اسے بنچ پر بیٹھے آدھ گھنٹے سے زیادہ ہو گیا مگر بوتل کو ٹھکانے لگانے کی کوئی ترکیب اس کے ذہن میں نہ آئی۔ اس وقت کناٹ پلیس خاصا اُجاڑ معلوم ہوتا تھا، البتہ بعض سینما گھروں اور بڑے بڑے انگریزی ہوٹلوں کی روشنیاں دور سے جگمگاتی ہوئی ابھی تک نظر آرہی تھیں۔ رفتہ رفتہ روشنیاں بھی گل ہونے لگیں۔ ساتھ ہی ٹاؤن ہال کے گھنٹے نے بارہ بجانے شروع کیے۔

اس نے سوچا، اس بوتل کو گھر لے چلوں اور چپکے سے اپنے صندوق میں بند کر دوں دو چار دن میں جب والد کے دماغ سے اس کا خیال نکل جائے گا تو اسے ضائع کر دوں گا، دل

ہی دل میں یہ فیصلہ کر کے وہ اٹھنے ہی کو تھا کہ اتنے میں اسے کچھ فاصلے پر دو سائے سے دکھائی دیے جو لان میں گزرتے ہوئے اسی طرف آرہے تھے۔ نوجوان نہ جانے کس جذبے کے تحت وہیں بیٹھا رہا۔ جب وہ قریب آئے تو اس نے دیکھا کہ ان میں ایک مرد ہے اور ایک عورت۔ دونوں نے اوور کوٹ پہن رکھے تھے۔ مرد سر سے ننگا تھا اور عورت نے سر پر رومال باندھ رکھا تھا۔ چاندنی میں عورت کا چہرہ موتی کی طرح دمک رہا تھا، دونوں کے قدم لڑکھڑا رہے تھے اور مرد نے عورت کی کمر میں ہاتھ ڈال اسے اپنے جسم سے بھینچ رکھا تھا۔ وہ آکر دوسری بینچ پر بیٹھ گئے جو درخت کے تنے کے اس طرف تھی۔ مرد بار بار عورت کے رُخسار و پیشانی پر بوسے دیے جا رہا تھا۔ نوجوان کچھ گھبرا سا گیا مگر وہ لوگ اپنی دُھن میں ایسے مست تھے کہ نہ تو انھوں نے نوجوان کو دیکھا اور نہ یہ معلوم ہی ہونے پایا کہ تنے کے دوسری طرف کوئی اور بھی بیٹھا ہے۔

نوجوان ان کی باتیں بخوبی سن سکتا تھا۔

"میری جان۔" مرد کہہ رہا تھا "تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ آج کی رات میری زندگی میں کس درجہ مسرت کی رات ہے۔"

"کیسی عجیب بات!" عورت کے لہجہ میں تعجب اور تاسف ملا جلا تھا۔ "اب سے چار گھنٹے پہلے ہم ایک دوسرے کو جانتے بھی نہ تھے اور اب؟"

"آہ! یہ نہ کہو۔ یہ نہ کہو۔" مرد کراہا۔ "جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے، میں ہمیشہ تخیل کے نیلگوں افق پر تمھیں دیکھا کرتا تھا۔ تم اپنے درخشاں چہرے کے ساتھ ایک چاند کی طرح ابھرتیں اور میری تیرہ زندگی جگمگا اُٹھتی۔ تم میرے لیے کبھی اجنبی نہ تھیں، میں روز و شب تمہاری تمنا کرتا تھا مجھے کامل یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن تمہیں پالوں گا اور میرا جذبہ اس قدر شدید ہو گا کہ تم اسے رد نہ کر سکو گی۔

"آج جب میں نے تمھیں کافی ہاؤس کے ایک الگ تھلگ گوشے میں کافی پیتے دیکھا تو

فوراً پہچان لیا۔ میں نے دل میں کہا، بے شک یہی ہے، میری روح، جس کے لیے میرا جسم اتنے عرصے سے بھٹکتا پھرتا تھااور میں بے جھجک تمہارے سامنے آ کھڑا ہوا۔ تم حیرانی سے میرا منہ تکنے لگیں۔ میں نے تم سے اجازت بھی طلب نہ کی اور تمہارے پاس بیٹھ گیا۔ بڑی دیر تک ہم مبہوت ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے، دیکھتے رہے۔ پھر میں نے آہستہ سے تمہاری کلائی تھام لی اور تم میرے ساتھ کافی ہاؤس سے اُٹھ آئیں .....ایں تم رو رہی ہو؟" اور یہ کہتے کہتے مرد نے عورت کی گردن پر بوسوں کی بوچھاڑ کردی۔

چند لمحے خاموشی رہی جس کے دوران عورت کی سسکیاں سنائی دیتی رہیں۔

"میں نہیں کہہ سکتی۔" آخر عورت نے سسکیوں پر قابو پاکر کہنا شروع کیا۔ "میں کیوں تمہارے ساتھ اُٹھ کر چلی گئی۔ مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا تھا میں ہوش کھو بیٹھی تھی میں خود بھی نہیں جانتی تھی کہ کیا کررہی ہوں۔ میں نے یہ بھی تو نہ سوچا کہ تم میرے متعلق کیا خیال کروگے شاید تم مجھے ان آوارہ عورتوں میں سے سمجھتے ہوگے جو شکار کرنے نکلتی ہیں لیکن مجھے پروا نہیں۔ تم جو چاہو مجھے سمجھو، یہ یقینی امر ہے کہ ہم پھر کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے میں اس اجنبی شہر میں آج ہی آئی ہوں اور شاید کل ہی چلی جاؤں۔"

جس وقت عورت یہ کہہ رہی تھی تو نوجوان کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی میٹھا اور درد بھرا نغمہ سن رہا ہے۔ جب وہ خاموش ہوئی تو نوجوان چونک سا اٹھا عورت کی سُریلی آواز ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

"آہ! یہ نہ کہو۔ یہ نہ کہو۔" ادھر مرد کہتا جاتا تھا اور ساتھ ساتھ عورت کی ایک ایک انگلی کو، پوروں کو، ناخنوں کو بھی چومتا جاتا تھا۔ آؤ ہم اپنے تئیں بھول جائیں۔ میری زندگی خوابیدہ تھی، تم ایک سُہانے خواب کی طرح آئیں اور وہ خواب حقیقت بن گیا ...ایں تم کانپ رہی ہو؟ سردی لگ رہی ہے... ؟ اے کاش کہیں سے اور وسکی مل سکتی۔ صرف چند گھونٹ تمہیں گرما دیتے ."

وسکی کا نام سن کر نوجوان اچھل پڑا۔ ان کی باتوں نے اس پر ایک نشہ طاری کر دیا تھا وہ اپنی پریشانیوں کو بھول گیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے محبت کے لفظ کو لغت کے باہر دیکھا تھا اور اس کے معنی فوراً اس کی سمجھ میں آ گئے۔ وہ اب تک ان باتوں سے بے خبر تھا۔ ایک قیدی کی سی زندگی گزار رہا تھا جس میں کسی قسم کی رنگینی یا مسرت کا شائبہ تک نہ تھا۔ ان کی اس رازو نیاز کی باتوں نے اُسے ایسا لبھایا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے تھے اور سانس تیز تیز چلنے لگا تھا۔ آج پہلی مرتبہ اسے یہ احساس ہوا کہ دفتر میں صبح سے شام تک لہو پانی ایک کرنے اور گھر میں باپ سے لڑنے جھگڑنے کے علاوہ بھی زندگی کے کچھ مقصد ہیں اور اس کے دل میں یکبارگی عجیب عجیب دلولوں نے، جنھیں وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ کیا ہیں، ایک ہیجان برپا کر دیا۔

"میری روح، میری راحت" مرد کہے جا رہا تھا۔ "تمہارے دانت بج رہے ہیں۔ افسوس نہ سب ہوٹل بند ہو چکے ہیں۔"

نوجوان نے دل میں کہا۔ اگر میں ان لوگوں کے پاس جاؤں اور بغیر ایک لفظ کہے بوتل ان کے حوالے کر کے چلا آؤں تو کیسا رہے۔ وسکی نہ سہی شراب تو ہے اور وہ لوگ کسی قدر تامّل کے بعد ضرور اسے قبول کر لیں گے ... مگر اسے جرأت نہ ہوئی۔

"میری جان مجھ سے لپٹ جاؤ، یوں سردی نہیں لگے گی۔" اور مرد نے عورت کو خود ہی لپٹا لیا۔

"بس اَب مجھے جانا چاہیے۔ میری دوست، جس کے ہاں میں ٹھہری ہوں، پریشان ہو گی۔ میں صرف آدھ گھنٹے کے لیے گھر سے نکلی تھی مگر اب پانچ گھنٹے ہو چکے ہیں۔ اُفوہ سردی واقعی بہت بڑھ گئی ہے"

اس عورت کی آواز کی نغمگی نے نوجوان کو ہمت دلائی اور وہ ان لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے جھوٹ موٹ کھانسا مگر وہ لوگ اپنی اپنی دُھن میں کچھ ایسے کھوئے

ہوئے تھے کہ انھوں نے سنا تک نہیں نوجوان نے دل کو مضبوط کیا اور ارادہ کر لیا کہ چاہے کچھ بھی ہو اُٹھ کر ان کے پاس چلا جائے اور اس مسرت کی قیمت کے طور پر جو اسے ان کی باتیں سن سن کر حاصل ہوئی تھی، یہ بوتل ان کی نذر کر دے۔ اس نے بوتل سنبھالی ہی تھی کہ عین اسی وقت وہ دونوں بنچ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کی طرف دیکھے بغیر جس طرف سے آئے تھے جھومتے جھامتے پھر اسی سمت چل دیئے۔

نوجوان ان کے جانے کے بعد دس منٹ تک بالکل گم سم بیٹھا رہا۔ اس موقع کے ہاتھ سے نکل جانے کا اسے زیادہ افسوس نہ ہوا کیونکہ اب ایک اس سے بھی زیادہ اہم معاملہ اس کے درپیش تھا۔ اس تھوڑے سے وقت میں اس نے اپنی روح کو اس کے اصلی روپ میں دیکھ لیا تھا ۔ اس روح کو جسے مذہبی، اخلاقی اور سماجی فرائض کی طنابوں نے کس رکھا تھا۔ یہ طنابیں تھوڑی دیر کے لیے ڈھیلی ہو گئی تھیں اور اس کے ساتھ ہی اس کی گھٹی ہوئی نڈھال روح سسکتی ہوئی زمین پر آ رہی تھی

اس نے اپنے ماضی پر غور کرنا شروع کیا۔ اسے اب سے پانچ برس پہلے کا زمانہ یاد آیا جب وہ اسکول میں پڑھا کرتا تھا۔ ان دنوں وہ کتنا خوش تھا۔ علم کو ایک انمول نعمت سمجھ کر اس طرح جذب کر رہا تھا جس طرح ریت پانی کو جذب کر لیتی ہے۔ سب اُستاد اس کے علمی شوق اور اس کی غور و فکر کی عادت کے معترف تھے اور کہا کرتے ۔ اگر مطالعہ جاری رکھا تو ایک دن بڑا مفکّر بن جائے گا۔ مگر اس کے انٹرنس پاس کرنے کی دیر تھی کہ وہ آزادی وہ علمی ولولے خواب و خیال ہو گئے۔ اس کے باپ کو عیاشیوں اور بے اعتدالیوں نے قبل از وقت ضعیف کر دیا تھا اور وہ وقت آ پہنچا تھا کہ اسے روزی کمانے کے لیے باپ کی جگہ لینی پڑی۔

تلاشِ معاش کی تگ و دَو میں اسے کیسے کیسے سنگدل انسانوں سے دوچار ہونا پڑا تھا، کن کن دفتروں سے ناکام اور بے عزت ہو کر نکلنا پڑا تھا۔ ذلّت کے بے شمار دن فکر اور پریشانی کی بے شمار راتیں گزارنے کے بعد آخر ایک نیم سرکاری دفتر میں اسے سر چھپانے کی جگہ مل

گئی تھی جہاں وہ صبح سے شام تک گدھے کی طرح کام کرتا تھا مگر جہاں اسے گدھے سے آدھی اُجرت بھی نہیں ملتی تھی۔

اور پھر یہ اس کا زہد واِتقا جس نے اس کی زندگی کو اور بھی خشک اور بے رنگ بنادیا تھا، اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس نے یہ پارسائی کی زندگی کیوں اختیار کی۔ اس کے باپ دادا میں کوئی شخص متقی وپرہیزگار نہیں ہوا تھا۔ اسے اپنی زندگی میں کوئی ایسا نیک سیرت رفیق یا رہنما بھی نہ ملا تھا جس کی پاک زندگی اس پر اپنا اثر توڑ دالتی۔ اس نے کچھ ایسی دینی کتابیں بھی نہ پڑھی تھیں جو اس کے خیالات کو مذہبی رنگ میں رنگ دیتیں۔ اس کے باوجود وہ پاکباز تھا اور حتی المقدور دینی فرائض ادا کرنے میں کوتاہی نہ کرتا تھا، آخر پھر وہ کیوں ایسا تھا؟ اس کی کوئی وجہ اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ اس نے بچپن میں اپنے باپ کے طفیل لہو ولعب، مے خواری وسیہ کاری کے ایسے گھناؤنے منظر دیکھے تھے کہ اس کے ننھے سے معصوم دل میں ہمیشہ کے لیے ان چیزوں کی دہشت بیٹھ گئی تھی اور اسے اپنے بچاؤ کی صرف ایک ہی صورت نظر آئی تھی مذہب!

نوجوان نے سوچنا شروع کیا۔ "اگر شراب کی یہ بوتل ان لوگوں کو مل جاتی تو وہ کس قدر خوش ہو جاتے۔ وہ زیادہ دیر تک ایک دوسرے کے پاس رہ سکتے۔ عورت کی آواز میں کتنا سوز تھا۔ اسے واقعی سردی لگ رہی تھی۔ مرد نے کہا تھا کہ صرف چند گھونٹ اسے گرما سکتے ہیں کیا شراب سے سردی دور ہو جاتی ہے۔" کمبل سرک گیا تھا۔ اس نے بکل مار کر اپنے جسم کو پھر کمبل میں اچھی طرح لپیٹ لیا۔

اچانک نوجوان کے ذہن میں ایک پرانا سوال تازہ ہو گیا جو اسے کئی بار پریشان کر چکا تھا، وہ یہ کہ آخر اس شراب میں کیا جادو ہے کہ جو ایک بار اس کو منہ لگالیتا ہے اسی کا غلام بن جاتا ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب اسے بُرا کہتے ہیں۔ بڑے بڑے حکما اور دانا اس کی مضرتوں پر ضخیم کتابیں لکھ چکے ہیں مگر اس کے باوجود کروڑوں انسان ہر روز اسے پیتے ہیں شاہ

و گدا، بوڑھے اور جوان، عورت اور مرد۔

مزدور دن بھر کڑی محنت جھیلتا ہے اور شام کو مزدوری کے چھ آنے میں سے چار آنے اس کی نذر کر دیتا ہے بعض فقیروں کو دیکھا کہ دن بھر ہزاروں صلواتیں اور جھڑکیاں سن کر انھوں نے تھوڑے سے پیسے جمع کیے اور رات کو بھوکے رہ کر سب کے سب شراب میں اُڑا دیے۔

آخر یہ کیا چیز ہے جس کو دنیا برا جانتی ہے مگر چھوڑ بھی نہیں سکتی۔ آرٹ، ادب اور فنونِ لطیفہ کوئی بھی اس کے اثر سے خالی نہیں۔ ہر ملک اور ہر زمانے کے شعراء کے دواوین اس کی مدح سرائیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ گو ان کی زبانیں مختلف ہیں مگر ان سب کی روح میں اس کی تشنگی ہے اگر ان کے کلام میں سے شراب و ساقی، ساغر و مینا کا ذکر نکال دیا جائے تو ساری دنیا کی شاعری کا خاتمہ ہو جائے۔ اس کی تعریف میں بھی لطف ہے اور مذمت میں بھی اور تو اور دینی کتابوں تک میں اس کا جابجا ذکر موجود ہے۔

اور..... اور پھر کیا خود فطرت ہر آن اس کے پینے کی ترغیب نہیں دیتی؟ اگر نہیں تو لالہ کے پھول اس وضع کے کیوں بنائے کہ وہ مے کی گلابیاں معلوم ہوں؟ پھلوں میں رس کیوں پیدا کیا؟ نرگس میں کیف اور نکہت کیوں بھر دی؟ بلبل کا نغمہ مستی بھرا کیوں ہے؟

یہ پہاڑوں کی برفیلی چوٹیاں، یہ نیلی نیلی سی ملگجی چاندنی، یہ طلوع و غروبِ آفتاب کے نظارے، آخر یہ سب چیزیں کیوں پیدا کی گئیں جنھیں دیکھ کر اسی قسم کا سرور حاصل ہوتا ہے جیسا نشہ پی کر؟

اور پھر اس کے باپ کو دیکھو، دنیا میں سب سے زیادہ جس چیز سے اسے الفت ہے، وہ یہی اس کا بیٹا ہے۔ مگر یہ شراب اسے اس سے بھی برگشتہ کیے دیتی ہے۔ ہر چند اس کا جگر خراب ہو چکا ہے اور اس کا ایک ایک قطرہ اس کے لیے سم قاتل ہے پھر بھی وہ اس کے لیے مضطرب ہے گویا اس کے مقابلے میں جان کی کچھ اصل و حقیقت نہیں۔ کیا واقعی اس میں

کوئی ایسی لذت یا کیف و سرمستی ہے جس کا مول انسان کی زندگی بھی نہیں دے سکتی۔

یکایک ہوا کا ایک تند و تیز جھونکا آیا اور نوجوان کا جسم کپکپا اٹھا۔ اس وقت آس پاس کوئی متنفس نظر نہ آتا تھا۔ بس وہ تھا اور ایک ٹھٹھرا ہوا چاند جو کناٹ پلیس کی رفیع الشان عمارتوں پر خنک چاندنی ڈال رہا ہے۔ ہوا جسم کے ننگے حصوں پر کند چھریوں کی طرح پڑ رہی تھی۔ درختوں کے پتے آپس میں اس طرح بج رہے تھے جیسے کسی سردی سے کانپتے ہوئے آدمی کے دانت۔ پَل بھر کے لیے دور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کے ساتھ کسی تانگے والے کے گانے کی آواز آئی اور پھر رفتہ رفتہ فضا میں تحلیل ہو گئی۔

چاند کی کچھ کرنیں درخت کی ٹہنیوں میں سے چھن چھن کر بنچ پر پڑ رہی تھیں۔ ان کی روشنی میں نوجوان نے بوتل کی طرف دیکھا تو اسے سرخ سرخ شے میں سے ایک لپٹ سی نکلتی ہوئی معلوم ہوئی۔ ... جس طرح انگیٹھی کے دہکتے ہوئے کوئلوں سے نکلتی ہے۔

کیا اس خطرناک چیز کو جوں کا توں گھر لے جانا ہو گا؟ کیا اسے ٹھکانے لگانے کا کوئی طریقہ نہیں ہے؟

رات کے کوئی ڈھائی بجے ہوں گے کہ نوجوان لڑکھڑاتا ہوا اپنے گھر کے دروازے پر پہنچا اور بے تحاشا کواڑ کھٹکھٹانے لگا۔ باپ انتظار کرتے کرتے سو گیا تھا۔ آواز سنتے ہی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

"کون؟"

"میں .... " ایک بھدی سی آواز میں، جو انسان سے زیادہ حیوان کی آواز سے ملتی جلتی تھی، نوجوان نے جواب دیا۔

دروازہ کھلا تو باپ کی نظر بیٹے کے خالی ہاتھوں پر پڑی۔

"بیچ آئے؟"

"اونہہ۔" اور نوجوان نے ایک بے تکا قہقہہ لگایا۔

"کیا ہوئی پھر؟"

"یہ رہی..... یہ... یہ .یہ۔"

بڈھے کا منہ کھلے کا کھلا اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

۱۹۳۹ء

سمجھوتہ

پہلے پہل جب اسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی بھاگ گئی تو وہ بھونچکا سارہ گیا۔ شادی کا پہلا ہی سال اور ایسی اَن ہونی سی بات! کسی طرح یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا، مگر جب بار بار اس کے کمرے میں جا کر اس کی چیزوں کو گم پایا۔ یہاں تک کہ اس کا بچپن کا فوٹو تک، جس میں وہ ایک کبوتر کو اپنے ننھے منے ہاتھوں میں تھامے مسکرا رہی تھی، اس کی سنگھار میز پر سے غائب تھا تو شک کی کوئی وجہ باقی نہ رہی۔

کئی دن تک وہ گم سم رہا۔ نہ کہیں گیا نہ نوکروں پر یہ بات ظاہر ہونے دی، نہ کسی رشتہ دار یا دوست سے اس کا ذکر کیا، مگر رفتہ رفتہ جب بدنامی کا خوف دل سے نکل گیا اور ادھر اس کے لوٹ آنے کی رہی سہی امید بھی جاتی رہی تو اس نے ٹھنڈے دل سے اس واقعہ پر غور کرنا شروع کیا۔ ایک خیال بار بار اسے کچوکے دینے لگا۔

"میں نے اس عورت کو سچے دل سے چاہا۔ ہر طرح اس کے ناز اُٹھائے۔ اس کی وہ کونسی خواہش تھی جسے میں نے پورا نہ کیا اور اس کا اس نے یہ صلہ دیا کہ ایک دن چپکے سے بغیر کوئی وجہ بتائے، بغیر ایک پیغام تک چھوڑے بھاگ گئی۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے آنے والے برسوں کی تنہائیوں کا تصور کیا اور اس کی روح کپکپا کر رہ گئی۔

وہ نوعمری ہی سے ان تنہائیوں سے واقف ہو چکا تھا۔ غریب ماں باپ کا بیٹا تھا جو اپنی حیثیت کے مطابق معمولی سا لکھا پڑھا کر سدھار گئے تھے۔ غربت اور بے کسی کے زمانے میں اسے کسی سے ملنے جلنے کی جرأت نہ ہوئی اور اس نے تنہائی ہی میں امان سمجھی۔ شباب کا بیشتر زمانہ فکرِ معاش کی جدوجہد کی نذر ہو گیا۔ آخر جب اس کے دن پھرے اور وہ بھی کوئی چیز سمجھا جانے لگا تو وہ اپنی گوشہ نشینی کا اس قدر عادی ہو چکا تھا کہ کسی قیمت اسے چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے رشتہ دار جو اس کی حالت سدھرتے ہی آپ سے آپ پیدا ہو گئے تھے۔ اس کی تنہائی میں مزاحم ہونے شروع ہوئے۔

"بھئی تو کیا عمر بھر کنوارے ہی رہو گے۔" وہ آئے دن آ آ کر اس سے کہا کرتے:

"تم مانو چاہے نہ مانو ہم تو چاند سی دلہن لا کے ہی رہیں گے۔"

ایک بزرگ جو رشتہ میں دُور کے ماموں ہوتے تھے، کہتے:

"اماں دور کیوں جاؤ۔ اپنے خاندان ہی میں جو ماشاءاللہ ایک سے ایک حسین جمیل لڑکی موجود ہے۔"

ہر بار اس کا انکار پہلے سے کمزور ہوتا گیا اور ایک دن برادری ہی کی ایک قبول صورت تعلیم یافتہ لڑکی کے ساتھ اس کی شادی کر دی گئی۔

طالب علمی کے زمانے میں اس کے ساتھی اکثر تعطیلات میں تین تین چار چار کی ٹولیاں بنا کر "تفریح" کی تلاش میں آس پاس کے قصبوں اور گاؤں میں نکل جایا کرتے۔ وہ ان سے دور ہی دور رہتا اور دل ہی دل میں ان سے نفرت کیا کرتا مگر اب عورت اور اس کی ہم جلیسی کی لذتوں سے واقف ہو کر اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ وہ اب تک کیسی رائیگاں اور بے معنی زندگی گزار رہا ہے۔

شادی کے بعد اس کی شوہرانہ فرض شناسی ضرب المثل بن گئی تھی۔ بیوی کی محبت نے اس پر ایسا قابو پا لیا کہ وہ باقی ہر چیز سے بے نیاز ہو گیا۔ وہ بیوی سے الگ کسی پارٹی یا دعوت

میں شریک نہ ہوتا، نہ تنہا کسی سے ملتا جلتا۔ بیوی سے جدا رہنا اس پر اتنا شاق گزرتا کہ دفتر میں وقت کاٹنا دوبھر ہو جاتا۔ باربار گھڑی پر نظر پڑتی کہ کب وقت پورا ہو تو وہ گھر کی راہ لے۔

دفتر سے آتے وقت کبھی راستے میں بچپن کا کوئی بے تکلف رنگین مزاج دوست مل جاتا اور اسے اپنے ساتھ کسی محفلِ نشاط میں لے جانا چاہتا ہو تو بڑی سرد مہری سے جواب دیتا:

"نا صاحب! مجھے تو معاف ہی رکھیے۔ میرا یہ وقت میری بیوی کا ہے جو دن بھر میری آس لگائے گھر میں تنہا بیٹھی رہی ہے۔" کبھی کہتا۔"میں کسی ایسی محفل میں شامل نہیں ہو سکتا جس میں میری بیوی نہ جا سکتی ہو۔"

"اور یہ سب اس بے وفا عورت کے لیے۔"اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنے سر کو تھامتے ہوئے کہا:"جس کی محبت محض ایک فریب تھی۔"

یک لخت اس کے دل میں اپنی بیوی کے خلاف اس قدر نفرت اور غصہ بھر گیا کہ اس کا سانس تیزی سے چلنے لگا۔ خیال ہی خیال میں اس نے دیکھا کہ اس نے اپنے مضبوط ہاتھوں میں اپنی بیوی کا گلا دبا رکھا ہے۔ اس کی دہشت زدہ آنکھیں رحم اور عفو کی ملتجی ہیں مگر اس بے وفا عورت کے لیے اس کے دل میں کوئی رحم نہیں، وہ اس کا گلا دبا رہا ہے زور سے، اور زور سے، یہاں تک کہ اس کا سرخ و سفید کتابی چہرہ سیاہ پڑ گیا اور اس کی بڑی بڑی حسین آنکھیں خون کے دو گھناؤنے لوتھڑے بن کر باہر نکل آئیں . اور اس نے اس کے بے جان جسم کو زمین پر پٹخ دیا۔

لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے انتقام کا یہ تند و تیز جذبہ، یہ جنونی خروش دھیما پڑتا اور ایک استہزا کی شکل اختیار کرتا گیا۔ یہاں تک کہ اسے اپنا عشق، ایثار و خلوص، بیوی کی بے وفائی اور اس پر اپنا غیظ و غضب، یہ سب باتیں مضحکہ خیز معلوم ہونے لگیں اور ایک دن اسے اپنی حالت پر خود ہی ہنسی آ گئی۔ اس نے کہا:

"میں بھی کیسا بیوقوف ہوں کہ ایک عورت کو اس قدر اہمیت دیتا رہا۔ عورت کے

معاملے پر سنجیدگی سے غور کرنا ہی حماقت ہے۔ اس کی مثال بالکل بچے کی سی ہے جب تک اسے کھلونوں سے بہلایا جا سکتا ہے بہلانا چاہیے مگر جب وہ نہ مانے اور رونا اور مچلنا شروع کر دے تو بہتر یہی ہے کہ اسے کسی دوسرے کے سپرد کر دیا جائے۔ رہا عشق اور وفا کا معاملہ تو یہ سراسر ڈھکوسلا ہے۔"

ایک دن وہ دفتر سے آ رہا تھا تو بچپن کا وہی رنگین مزاج دوست جو اسے عیش و نشاط کی ترغیبیں دیا کرتا تھا سامنے آتا دکھائی دیا۔ قصد کیا کہ کترا کے نکل جائے مگر دوست کی نظر پڑ چکی تھی، ناچار رُکنا پڑا۔ دوست کو اس کی بیوی کے بھاگ جانے کا علم نہ تھا حسبِ عادت مسکرا کر کہنے لگا: "آج تو بھائی جان چاہے جو کہیں میں تمھیں ساتھ لیے بغیر نہ چھوڑوں گا۔"

وہ خاصی دیر تک خاموش کھڑا اس کا منہ تکتا رہا۔ پھر ایک لطیف سی مسکراہٹ نے اس کی سنجیدگی کو توڑ دیا اور وہ کہہ اٹھا:

"اچھا چلو۔ کہاں چلنا ہے؟"

دوست بھونچکا رہ گیا۔

جب تک رات کا اندھیرا اچھی طرح نہ پھیل گیا۔ دونوں وقت گزارنے کے لیے اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ اس کے بعد دوست اسے لے کر ایک حُسن فروش کے کوٹھے پر پہنچا۔ زندگی میں اس قسم کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ کچھ خوف، کچھ جھجک، کچھ ندامت، کچھ یہ خلش دل میں تھی کہ جو زندگی ابھی تک اس قسم کی آلودگیوں سے پاک و صاف تھی اَب اس پر سیاہ کاری کے دھبے پڑ جائیں گے اور یہ محض اس بے وفا عورت کی بدولت۔ مگر یہ ذہنی الجھن زیادہ دیر نہ رہی۔ شراب کا دَور چلنا تھا کہ یک لخت سارے حجاب جیسے اُٹھ سے گئے ... وہ ہنس ہنس کر گانے والی کو داد دینے اور فقرے کسنے لگا اور گھنٹے ہی بھر میں پورا تماش بین بن گیا۔

اس کے بعد اس کی زندگی کا ایک نیا دَور شروع ہوا۔ پہلے پہل اسے اس کوچے میں جانے کے لیے دوستوں کی رہنمائی کی ضرورت محسوس ہوتی تھی مگر چند ہی روز بعد دوست

اسے اپنی راہ میں حائل ہوتے ہوئے معلوم ہونے لگے، چنانچہ وہ اکیلا ہی شب گردی کے لیے نکلنے لگا۔ پہلے گھوم پھر کر ساری منڈی کا جائزہ لیتا، مال کو پرکھتا اور پھر اپنا پسند کیا ہوا نہ ایک شوقین مزاج رئیس زادے کی طرح منہ مانگی قیمت پر خرید لیتا۔ رفتہ رفتہ اسے عیش پرستی کا ایسا چسکا پڑ گیا کہ دفتر سے اٹھ کر شاذ ہی کبھی گھر پہنچتا۔ آج اِس کوٹھے پر ہے تو کل اُس بالاخانے پر، جھوٹی محبتیں جتاتا اور خود بھی جھوٹی محبتوں سے لطف اٹھاتا۔ اگلے روز یہ باتیں خواب کی طرح معلوم ہوتیں۔ نئی رات آتی تو نئے سرے سے حُسن و عشق کی دنیا بسانے کی دُھن پھر سوار ہو جاتی۔ اس نے اپنا یہ اصول بنا لیا تھا کہ عورت سے تعلق محض وقتی اور کاروباری ہونا چاہیے اور دوسرے سودوں کی طرح اس میں بھی ہر طرح کا دروغ جائز ہے۔

اسے دفتر سے جو مشاہرہ ملتا تھا وہ اتنا تھا کہ اس میں ایک کنبہ دار شخص آسودگی اور عزت کے ساتھ بسر کر سکے، مگر نہ اتنا کہ اس میں کسی مستقل اندھا دھند فضول خرچی کی گنجائش ہو۔ شادی سے پہلے جب اس کے اخراجات برائے نام تھے، اس نے اچھی خاصی پونجی جمع کر لی تھی۔ شادی کے بعد بیوی کے لیے گراں قدر تحائف خریدنے پر بھی اس رقم میں کچھ زیادہ کمی نہ ہوئی تھی مگر اب جبکہ روز روز بڑی بڑی رقموں کے چیک کاٹے جانے لگے تو چند ہی ہفتوں میں دیوالہ نکلتا نظر آنے لگا۔ کچھ تو اس ڈر سے کہ کہیں بالکل ہی مفلس نہ ہو جائے اور پھر اس کوچے میں جانے کے لیے ترسے اور کچھ مسلسل راتوں کے جاگنے سے صحت کے گر جانے کے باعث اس کی اوباشیوں میں جلد ہی کمی ہو گئی۔ یعنی جہاں پہلے مہینے میں مشکل سے دو چار ناغے ہوتے تھے وہاں اب ہفتے میں تین تین چار چار ناغے ہونے لگے۔

ایک دن صبح کو جب وہ دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا تو کسی نے آہستہ سے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

"کون؟"

کوئی جواب نہ پا کر اٹھا۔ دروازہ کھولا اور ٹھٹک کر رہ گیا..... اس کی مغرور بیوی، سودائیوں کا سا حال بنائے، سر جھکائے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے کپڑے میلے چکٹ ہو رہے تھے، بال الجھے ہوئے تھے، چہرہ زرد اور آنکھوں میں گڑھے۔ اسے اس حال میں دیکھ کر اسے ایسا گمان ہوا جیسے کوئی کتیا کیچڑ میں دوسرے کتوں کے ساتھ لوٹ لگا کر آئی ہو۔

وہ کچھ دیر تو خاموش کھڑی رہی پھر اچانک اس کے قدموں میں گر پڑی اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس نے اپنی ٹانگوں کو چھڑانے کی کوشش نہ کی۔ چپ چاپ کھڑا رہا۔

"مجھے بخش دو۔ مجھے بخش دو۔" اس کی بیوی نے سسکیاں لے لے کر کہنا شروع کیا۔ "میں جانتی ہوں اب تم مجھ سے سخت نفرت کرتے ہوگے۔ میری صورت دیکھنے کے بھی روادار نہ ہوگے۔ مگر میں تم سے محبت نہیں مانگتی، نہ اس کی توقع کر سکتی ہوں۔ آہ! میں اس لائق ہی نہیں ہوں۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ مجھ پر رحم کرو۔ مجھے صرف اپنے گھر میں پناہ دو۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتی۔ آہ! میں اندھی ہوگئی تھی مجھے بخش دو۔ مجھ سے سخت فریب کیا گیا۔"

اس کے خلاف غیظ و غضب کی جو آگ شروع شروع میں اس کے دل میں بھڑکی تھی کچھ تو وقت نے اور کچھ اس کے نئے مشاغل نے اسے ٹھنڈا کر دیا تھا اور اگر کچھ رہا سہا غصہ تھا بھی تو وہ اَب اس کی مصیبت زدہ یہ حالت دیکھ کر جاتا رہا تھا۔ اسے اس کی حالت پر رحم نہیں آیا بلکہ کراہت سی محسوس ہوئی۔

جب سے وہ بھاگی تھی اس کے دل میں رہ رہ کے یہ جاننے کی خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کون سا خوش نصیب تھا جس کی محبت پر اسے بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ ممکن ہے وہ اس کے دوستوں میں سے ہو یا ممکن ہے کوئی اجنبی ہو مگر اب اسے اس حال میں دیکھ کر اس کے دل میں اس قسم کا کوئی تجسس پیدا نہیں ہوا۔ وہ اس سارے معاملے سے اس قدر بیزار ہو گیا تھا

کہ چاہتا تھا جلد سے جلد اس عورت سے اپنا پیچھا چھڑا لے۔

وہ کہے جا رہی تھی:

"تمہاری شرافت اور نیک دلی پر پورا یقین ہے کہ تم مجھے گھر سے نہیں نکالو گے دنیا میں اس گھر کے سوا میرا کہیں ٹھکانا نہیں۔ اس گھر سے نکل کر میں نے بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ تم بے شک مجھ سے نوکرانیوں کا سا برتاؤ کرنا، آہ! میں اسی قابل ہوں۔"

"اس قدر زور سے نہ چلاؤ۔ نوکر سُن رہے ہوں گے۔"

دفتر جانے میں دیر ہو رہی تھی۔ اس نے اصرار کے ساتھ مگر بغیر کسی درشتی کے اپنے پاؤں چُھڑا لیے۔ ٹوپی ہاتھ میں تھامی اور گھر سے نکل گیا۔

دفتر میں رہ رہ کے بیوی کی یہ حالتِ زار اس کی نظروں میں پھرتی رہی۔ اسے تعجب ہو رہا تھا کہ کیا یہ وہی کم سن الھڑ حسینہ تھی جس کا وہ چھ مہینے پہلے شیدائی تھا۔ کیا یہ وہی نازنین تھی جسے خوشبوؤں سے عشق تھا۔ جو اپنے جسم پر گرد کا ایک ذرّہ بھی نہ سہہ سکتی تھی اور جس کے ساتھ باغ کی کسی روش پر ٹہلتے ہوئے اس کا سر فخر سے اونچا ہو جاتا تھا۔

"اگر وہ میرے ہاں رہنے ہی پر مُصر ہے۔" اس نے دل میں کہا۔ "تو یوں ہی سہی میں اتنا کم ظرف نہیں ہوں کہ اسے روٹی کپڑے سے بھی جواب دے دوں گا۔ مگر یہ بات یقینی ہے کہ میں اس سے اب کوئی سروکار نہیں رکھوں گا۔ گمان غالب یہی ہے کہ وہ میری بے اعتنائیوں سے کُڑھ کُڑھ کر یا ضمیر کی ملامتیں سہہ سہہ کر جلد ہی پھر بھاگ جائے گی۔

اس کی بیوی کو واپس آئے دو ہفتے گزر چکے تھے۔ اس عرصے میں نہ تو اس نے اس کی طرف نظر بھر کے دیکھا تھا اور نہ کوئی بات ہی کی تھی۔ جیسے وہ گھر میں تھی ہی نہیں، ادھر اس کی بیوی بھی اس کے سامنے آنے سے کتراتی رہی تھی، البتہ اس کی موجودگی مختلف صورتوں میں اپنی یاد دلاتی رہی۔

جب وہ سو کر اُٹھتا تو اس کی نظر اپنے سرہانے کے پاس تپائی پر رکھے ہوئے گلدان پر پڑتی جس میں تازہ اور خوبصورت پھول سلیقے اور ہنرمندی سے سجے ہوتے۔ ابھی وہ بستر پر لیٹا اخبار ہی پڑھ رہا ہوتا کہ چھوکرا چائے لے کر آجاتا۔ ٹوسٹ نفاست سے کٹے اور سکے ہوئے، خوش ذائقہ چائے، جیسی شادی کے ابتدائی دنوں میں اسے ملا کرتی تھی۔ وہ غسل خانے سے نکل کر ڈریسنگ روم میں جاتا تو اسے نیا جوڑا کیل کانٹے سے لیس ملتا، قمیص یا سوٹ کی مناسبت سے نکٹائی اور رومال، کفوں میں اسٹڈ لگے ہوئے، بوٹ پر پالش کیا ہوا، دوپہر کو چپڑاسی گھر سے کھانا لے کر جاتا تو اس کی من بھاتی سبزیاں ایسے مزے کی پکی ہوتیں کہ زبان چٹخارے لیتی رہ جاتی۔

ایسے موقعوں پر اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ نمودار ہوتی اور وہ دل میں کہتا: "یہ ساری خاطرداریاں مجھے دوبارہ رام کرنے کے لیے کی جارہی ہیں لیکن بندہ اَب ان چکموں میں نہیں آئے گا۔" وہ اکثر سرِ شام گھر سے نکل جاتا اور رات کے .. ..ایک دو بجے سے پہلے شاذ ہی لوٹتا کبھی ساری رات ہی غائب رہتا، مگر اس سے کوئی بازپرس نہ کی جاتی، نہ اس کی آسائشوں میں کوئی کمی آنے پاتی۔

دھیرے دھیرے اسی طرح تین مہینے گزر گئے۔

ایک دن برسات میں جب ابر چھایا ہوا تھا اور ٹھنڈی متوالی ہوائیں چل رہی تھیں اس نے دفتر میں ایک بڑی رقم کا چیک کاٹ کر چپراسی کو دیا اور بیتابی کے ساتھ وقت کے گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔ پچھلے آٹھ دنوں میں وہ کسی رات بھی گھر سے باہر نہیں گیا تھا۔ کچھ تو دفتر میں شام کو دیر دیر تک بیٹھا رہنا پڑا تھا کچھ تکان، کچھ سستی، کچھ ایسے ہی دل نہ چاہا تھا۔ مگر آج ارادہ تھا کہ ان سب دنوں کی کسر ایک ہی بار نکال دے۔

تھوڑی دیر میں چپراسی خالی ہاتھ لوٹ آیا۔ اس کا چیک لوٹا دیا گیا تھا کیونکہ اس کے حساب میں چند روپے اور آنے پائی کے سوا کچھ نہیں بچا تھا۔

وہ اس انجام سے بے خبر نہ تھا مگر اس کا تو اسے گمان بھی نہ تھا کہ یہ دن اس قدر جلد آجائے گا۔ اس نے سوچا کہیں سے قرض لینا چاہیے۔ چنانچہ جھجکتے جھجکتے ٹیلی فون پر دو ایک بے تکلف دوستوں سے اپنی غرض بیان کی مگر مہینہ ختم ہونے کو تھا، ان دنوں اتنا روپیہ کس کے پاس ہوتا۔

اچانک اسے یاد آیا کہ اس کے بکس میں ایک سونے کی انگوٹھی پڑی ہے جس میں ایک بیش قیمت نگینہ جڑا ہوا ہے۔ یہ انگوٹھی اس کی بیوی نے اچھے خاصے داموں اس کے لیے لی تھی۔ جب اس عورت سے اس کا قلبی رشتہ ہی ٹوٹ چکا ہے تو پھر وہ اس کی یادگار کو اپنے پاس کیوں رکھے۔

شوق کی آگ جو چند لمحے پہلے دھیمی پڑگئی تھی یک لخت پھر سلگ اٹھی۔ اس نے سوچا مجھے انگوٹھی لے کر شام سے پہلے جوہریوں کے ہاں پہنچ جانا چاہیے۔

تیسرے پہر جس وقت وہ بکس سے انگوٹھی نکال کر گھر کے صحن میں سے گزر رہا تھا تو ایک خاتون بنفشی ساری میں ملبوس فضاؤں کو مہکاتی ہوئی اچانک اس کے پاس سے گزر گئی۔ خاتون نے اس کی طرف نہیں دیکھا مگر اس نے اس کی ایک جھلک دیکھ لی، جو ہر چند بہت مختصر تھی مگر اس کو مبہوت کر دینے کے لیے کافی تھی۔

یہ خاتون اس کی وہی مفرور بیوی تھی جس کے متعلق تین مہینے پہلے اسے گمان ہوا تھا کہ قبر میں سے نکل کے آئی ہے۔ دونوں وقت عمدہ عمدہ غذائیں کھانے، بڑھیا بڑھیا صابن، کریم اور غازے استعمال کرنے سے اس کا رنگ روپ پھر نکل آیا تھا، گال پھر بھرے بھرے سے ہو گئے تھے اور آنکھیں زندگی کے نور سے چمکنے لگی تھیں۔ اس کے حسن و شباب کا وہی عالم تھا جس کی جھلک اس نے شادی کی پہلی رات دیکھی تھی۔ فرق تھا تو صرف اس قدر کہ پہلے اس کے چہرے پر معصومیت برستی تھی مگر اب اس کی جگہ ایک لطیف متانت، ایک دلآویز پشیمانی جھلکنے لگی تھی۔

ابھی دن ہی تھا کہ وہ شہر کے اس حصے میں پہنچ گیا جہاں جوہریوں کی دکانیں تھیں اس وقت وہاں لین دین کا بازار خوب گرم تھا۔ کوئی دکان ایسی نہ تھی جس میں گاہکوں کا جمگھٹ نہ ہو۔ اسے پہلے کبھی کوئی چیز بیچنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ وہ دکاندار کے پاس جاتے ہی سے ہچکچا رہا تھا۔ یہ بھیڑ دیکھی تو اور بھی گھبرا گیا۔ اتنے آدمیوں کی موجودگی میں بھلا انگوٹھی کی بات چیت کیسے کی جا سکتی ہے۔ وہ لوگ نہ جانے کیا خیال کریں گے۔

وہ کوئی گھنٹہ بھر تک اس بازار میں گھومتا رہا۔ اگر کسی دکان سے دو ایک خریدار چلے جاتے تو دو چار نئے آ جاتے اور بھیڑ جوں کی توں رہتی۔ آخر ایک جوہری کی دکان میں اسے نسبتاً کم آدمی دکھائی دیئے اور وہ جرأت کر کے اس میں گھس گیا۔

"فرمایئے آپ کیا چاہتے ہیں؟" جوہری نے پوچھا۔

"میں میں ذرا بُندے دیکھنا چاہتا ہوں۔" اُس نے ماتھے پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

ذرا سی دیر میں جوہری نے بُندوں کے ڈبوں کے ڈھیر لگا دیئے۔

"اس جوڑی کی کیا قیمت ہے؟" آخر اس نے ایک جوڑی کو پسند کرتے ہوئے پوچھا:

"پینسٹھ روپے!"

"بس یہ ٹھیک ہے لیکن معاف کیجئے! میں روپیہ ساتھ لانا بھول گیا۔ آپ انھیں علیحدہ رکھ دیجئے میں کل لے جاؤں گا۔"

"کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں۔" جوہری نے بندوں کے ڈبوں کو سمیٹتے ہوئے سرد مہری سے کہا۔ دکان سے نکل کر اس نے اطمینان کا لمبا سانس لیا۔

اس وقت اچھی خاصی رات ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا آج تو اس پروگرام کو منسوخ ہی کر دینا چاہیے، کل میں کسی ملازم کو انگوٹھی دے کر بھیجوں گا، یا ممکن ہے کل اس کی نوبت ہی نہ آئے اور کہیں سے روپے کا انتظام ہو جائے۔

ہر چند اسے اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی تھی اور وہ چلتے چلتے تھک بھی گیا تھا مگر وہ افسردہ خاطر نہیں تھا بلکہ اس کی طبیعت میں ایک خاص قسم کی چونچالی تھی۔ یہاں سے بازارِ حسن قریب ہی تھا۔ گھر لوٹتے وقت جی میں آئی، لگے ہاتھوں اس کوچے کی سیر بھی کرتے چلیں۔ پاس سے نہیں تو دور ہی سے ذرا رنگ ڈھنگ دیکھ آئیں۔

وہ بازار حسبِ معمول آج بھی خوب جگمگا رہا تھا۔ بیسوائیں بڑے ٹھسے سے اپنے اپنے بالاخانے کے برآمدے میں ٹہل رہی تھیں اور لوگ تھے کہ پروانوں کی طرح روشنیوں کی طرف امنڈے پڑتے تھے۔ بعض کمروں کے دریچوں سے ہلکی ہلکی نیلی خنک روشنی نکل رہی تھی۔ بعض گھروں سے شوروغل اور قہقہے، جن کے بیچ بیچ میں سارنگی کے تار ہلکے ہلکے جھنجھنا اُٹھتے تھے۔ وہ سڑک پر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا، ایک ایک مکان کے سامنے سے گزرتا اور مکان والی کا جائزہ لیتا ہوا جا رہا تھا۔ ان میں سے بعض بیسواؤں کو وہ جانتا تھا اور بعض کے ہاں اس کا آنا جانا بھی تھا مگر آج نہ جانے کیا بات تھی کہ اس کے قدم بار بار تیز تیز اٹھنے لگتے تھے۔

جب وہ اس بازار کے خاتمے پر پہنچا تو اچانک اسے اپنی بیوی کی یاد آئی اور اس کی بنفشی ساڑی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ ذہن غیر ارادی طور پر اس کا ان عورتوں سے موازنہ کرنے لگا۔

اب تک اس نے جتنی عورتوں کو دیکھا تھا ان کی کیفیت ناٹک کی ہیروئنوں کی سی تھی کہ انھیں جتنی دور سے دیکھا جائے وہ اتنی ہی زیادہ دلفریب معلوم ہوتی ہیں مگر اس کے برعکس اس کی بیوی کا حُسن بُعد و قرب کی تفریق سے بے نیاز تھا۔ نہ ان کے خط وخال میں اس کی سی دل کشی تھی اور نہ عادات واطوار میں وہ نفاست جو ایک متمدن اور تعلیم یافتہ خاتون میں پائی جاتی ہے۔ پھر ان میں سے بعض کو تو سنگھار کرنا بھی نہ آتا تھا۔ کسی نے چہرے پر پوڈر لیپ رکھا تھا تو کسی نے ترچھی مانگ نکال کر رکھی تھی بالوں میں درجنوں ہیر پنیں اور کلپ لگے ہوئے تھے جیسے کسی کل میں بہت سے پُرزے لگے ہوں۔ یہ سچ تھا کہ بعض صورتیں اچھی

بھی تھیں مگر نہ تو انھیں لباس کا کوئی سلیقہ تھا اور نہ انھوں نے رنگوں کے انتخاب میں کوئی توازن ملحوظ رکھا تھا۔ بس بھڑک ہی بھڑک تھی یا رنگوں کی گھما گھمی، بعض تو بالکل گنوارنوں کی طرح زیوروں سے لدی پھندی تھیں۔ سادگی، جو آرائش کی جان ہے، اس سے وہ کوسوں دور تھیں۔

وہ گھر کی طرف چلا تو بیوی کی تصویر بدستور اس کے ذہن میں قائم تھی۔ خیال ہی خیال میں شادی کا ابتدائی زمانہ اس کی نظروں میں پھرنے لگا۔ وہ بھی کیسا وقت تھا جب متاہل زندگی کی مسرتیں پہلی مرتبہ اس پر عیاں ہوئی تھیں اور اس کی روح انتہائے لذت سے کانپ اٹھی تھی۔ وہ راتوں کی طویل گھڑیوں کا آنکھوں ہی آنکھوں میں گزار دینا وہ عیش و سرخوشی کے دن، وہ کیف و سرمستی کی راتیں، پھر لطف یہ کہ یہ بے حساب عنایات قریب قریب بن داموں تھیں۔ جوں جوں گھر قریب آتا گیا، اس کے قدم آپ ہی آپ تیز سے تیز تر ہوتے چلے گئے۔ آخر جب وہ گھر کے سامنے پہنچا تو ایک استہزا آمیز تبسم اس کے ہونٹوں پر جھلکنے لگا، اس نے اپنے دل میں کہا:

"یہ سچ سہی کہ میری بیوی باعصمت نہیں لیکن آخر وہ عورتیں بھی کون سی عفیفہ ہیں جن کے پیچھے میں قلاش ہو گیا اور جن سے ملنے کے لیے میں آج بھی تڑپتا رہا ہوں۔"

وہ اوپر کی منزل میں تن تنہا کھلے آسمان کے نیچے چھپرکٹ پر خوشبوؤں میں بسی کچھ سو رہی، کچھ جاگ رہی تھی کہ اچانک کھڑکا سن کر چونک اُٹھی۔ کان آہٹ پر لگا دیے اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی سیڑھیوں پر سہج سہج قدم دھرتا اس کے پاس آ رہا ہو۔

۱۹۴۳ء

سیاہ و سفید

جی اے۔ وی۔ مڈل اسکول کی استانی میمونہ بیگم آئینے کے سامنے کھڑی اپنے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ سوچ رہی تھی کہ پچھلے کئی برس میں اپنی قلیل تنخواہ میں سے دو دو تین تین روپے بچا کر جو سو روپیہ جمع کر لیا ہے اس کا کون سا زیور بناؤں کہ اچانک اسے اپنی بائیں پیشانی کے قریب ایک لٹ میں ایک سفید بال نظر آیا اور اس کے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

اس نے جلد ہی آئینے کی مدد سے اس بال کو لٹ سے الگ کیا اور کھینچ کر نکال ڈالا۔ اسے یاد نہیں رہا تھا کہ اب تک وہ ایسے کتنے سفید بالوں کو یوں ہی کھینچ کھینچ کر نکال چکی ہے، البتہ اس احساس نے کہ وہ روز بروز بوڑھی ہوتی جا رہی ہے پہلے سے زیادہ شدت سے اس کی روح کو جھنجھوڑ دیا۔

اس کا باپ ایک غریب مدرس تھا جس نے مرنے سے پہلے اپنی بے ماں کی بیٹیوں کو گھر ہی پر پڑھا لکھا کر اس قابل کر دیا تھا کہ اگر ضرورت پڑے تو وہ نوشت و خواند کے ذریعے اپنا پیٹ پال سکیں۔ بڑی پیٹ بیٹی ساجدہ کو جو نسبتاً قبول صورت تھی زیادہ تکلیف نہ اٹھانی پڑی ۔اس کے باپ کے ایک دُور کے رشتہ دار نے جو دار السلطنت کے ایک دفتر میں عہدہ دار تھا کچھ تو رشتہ داری کے خیال سے، کچھ نیکی کا کام سمجھ کر، اور کچھ یہ کہ اس نے لڑکی کی خوش جمالی

کی تعریف سن رکھی تھی اپنے بیٹے کی شادی اس سے کردی بڑی بیٹی کی طرف سے مطمئن ہو کر بوڑھے مدرس کو چھوٹی بیٹی کی فکر ہوئی مگر اس کی شادی کا بندوبست ہونے سے پہلے ہی وہ چل بسا۔ غنیمت یہ ہوا کہ مرنے سے تھوڑے ہی دن پہلے اس کی پرانی خدمات اور اثر ورسوخ کے طفیل میمونہ کو پینتیس روپے ماہوار پر لاہور کے ایک قصبے کے زنانہ اسکول میں استانی کی جگہ مل گئی۔

باپ کے مرنے کے بعد میمونہ اسی اسکول کے بورڈنگ ہاؤس اُٹھ آئی۔ وہ دن بھر اسکول میں لڑکیوں کو پڑھاتی اور جب چُھٹی ہوتی تو بورڈنگ ہاؤس میں آجاتی۔ شروع شروع میں اسے یہ کام مشکل بھی معلوم ہوا اور دلچسپ بھی مگر دو ہی سال میں اس سے بیزار ہو گئی۔ دن بھر نا سمجھ اور چنچل لڑکیوں کے ساتھ مغزمارنے کے سوا اور اس میں رکھا ہی کیا تھا۔

کبھی کبھی شام کو وہ دوسری استانیوں کے ساتھ اسکول سے باہر چہل قدمی کرنے بھی جاتی مگر اس سے اسے کوئی لطف حاصل نہ ہوتا بھلا قصبے میں اس کی دلچسپی کی کیا چیز ہو سکتی تھی۔ مرد اکھڑ اور اَن پڑھ۔ عورتیں میلی کچیلی اور زبان دراز۔ سڑکیں کچی اور گرد آلود اور مکان مٹی کے بنے ہوئے بے ڈھنگے۔ بعض دفعہ کسی امیر زمیندار کی ماں اسے اور دوسری استانیوں کو کھانے پر بُلا لیتی یا کبھی کبھی دو چار استانیاں مل کر کپڑا وغیرہ خریدنے شہر چلی جاتیں۔ اس کے سوا اس کُھلے بندی خانے سے نکلنے کی اور کوئی صورت نہ تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنی اس بے رنگ زندگی سے سخت دل برداشتہ ہو جاتی مگر پھر سوچتی، ابھی عمر پڑی ہے۔ کیا پتہ کوئی بہتری کی صورت نکل آئے ۔ اسی طرح دس سال بیت گئے۔

صبح کے واقعہ نے میمونہ کے دماغ کو دن بھر پریشان رکھا۔ اسکول میں وہ لڑکیوں کو بات بات پر جھڑکتی رہی۔ کئی لفظوں کے معنی بھی وہ ٹھیک طور پر نہ سمجھا سکی۔ بورڈنگ ہاؤس میں آکر بھی اس کا جی کسی کام میں نہ لگا۔ وہ سرِ شام ہی سے آکر بستر پر لیٹ گئی اور اپنی حالت پر غور کرنے لگی۔ سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اس کی جوانی کے ڈھلنے کی یہ

وجہ ہے کہ اسے اپنی زندگی سے کوئی خوشی حاصل نہیں ہوئی۔ اس کی تفریح کا کوئی سامان نہیں۔ اسے کسی سے اُنس نہیں، لگاؤ نہیں۔ دن بھر وہ تھی اور لڑکیوں کا شور جس سے وہ سخت نفرت کرتی تھی کیونکہ اس سے اکثر اس کے سر میں درد ہونے لگتا تھا۔

بڑے دنوں کی چھٹیوں سے کوئی آٹھ روز پہلے اسے ساجدہ کا خط ملا۔ یہ خط کئی سال کے بعد آیا تھا اور وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی بہن آج کل کہاں ہے۔ ساجدہ نے لکھا تھا کہ اس کے میاں کا تبادلہ دہلی ہو گیا ہے، وہ نئی دہلی کے ایک سرکاری کوارٹر میں رہتے ہیں۔ اس نے دہلی کی قدیم و جدید عمارتوں، سیر گاہوں، نئی دہلی کے کھیل تماشوں، پُرفضا پارکوں، سرکاری بینڈ، دکانوں اور ہوٹلوں کی گہما گہمی اور دوسری دلچسپیوں کا حال ایسی خوبی سے لکھا تھا کہ ناول کا سماں باندھ دیا تھا۔ آخر میں لکھا تھا۔ ''کیوں نہ تم کرسمس کی چھٹیوں میں آ کر مجھ سے مل جاؤ اور سارے شہروں کی رانی، ہند کی راجدھانی، دلّی کی سیر بھی کر جاؤ۔''

میمونہ کا دل للچا اٹھا۔ کیا عجب وہاں اسے وہ تفریح، وہ خوشی میسّر آ جائے، جس کی آرزو وہ عرصے سے دل میں دبائے ہوئے تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس سفر سے اس کی زندگی میں کوئی اچنبھا، کوئی خوش گوار تغیر پیدا ہو جائے ....''

لمحہ ہی بھر میں اس نے دہلی جانے کا ارادہ کر لیا۔ سفر کے خرچ کے لیے اس کے پاس روپیہ موجود تھا ہی۔ نہ کسی رشتہ دار سے اجازت لینے کی ضرورت تھی نہ کوئی پابندی، اسی دن ساجدہ کو لکھ بھیجا کہ فلاں تاریخ فلاں گاڑی سے روانہ ہو جاؤں گی۔

چلنے سے ایک روز پہلے اس نے شہر جا کر کئی چیزیں خریدلیں۔ رومال، جُرابیں، ریشمی مفلر، اونچی ایڑی کا بُوٹ، جڑاؤ کلپ جس پر تتلی بنی ہوئی تھی، نیل پالش، لپ اسٹک وغیرہ، علاوہ ازیں اس نے بہن کے لیے ملتان کے بنے ہوئے چاندی کے بندوں کی ایک جوڑی بھی خریدلی۔ ۲۳؍ دسمبر کی شام کو اس نے اپنا سوٹ کیس، اٹیچی کیس اور بستر تانگے میں رکھوایا۔ اسکول کے بوڑھے چوکیدار کو ساتھ لیا کہ اسٹیشن تک پہنچا آئے اور وہ روانہ ہو گئی۔

وہ گاڑی کے چلنے سے کافی پہلے آگئی تھی اس لیے اسے زنانہ درجے میں حسبِ منشا کھڑکی کے پاس جگہ مل گئی، وہ اکیلی تھی اور یہ اس کا پہلا ریل کا سفر تھا۔ اس پر بھی اس کے چہرے پر گھبراہٹ یا پریشانی کے کوئی آثار نہ تھے۔ اسے اس سفر سے ایسی ہی خوشی ہو رہی تھی جیسی بچوں کو ہوتی ہے۔

جب تک گاڑی روانہ نہ ہوئی وہ کھڑکی سے برابر پلیٹ فارم کی سیر دیکھتی رہی۔ مسافروں کا گٹھڑیاں اٹھائے بھاگنا، دوڑنا، عورتوں کا پیچھے پیچھے گھسٹتے آنا، قلیوں کی لڑائیاں، پلیٹ فارم کے نل پر مسافروں کا جمگھٹا، خوانچہ والوں کی صدائیں، متحرک دکانیں، یورپینوں کا سب سے الگ تھلگ ایسی بے فکری کی شان سے پھرنا گویا کوٹھی کے برآمدے میں ٹہل رہے ہیں اور ان سب کے پس منظر میں انجن کا رہ رہ کے بھانت بھانت کی آوازیں نکالتے رہنا۔ یہ سارا سماں میمونہ کے لیے انتہائی دلچسپی لیے ہوئے تھا۔ علاوہ ازیں ایک اُدھیڑ عمر کا ٹھنگنے قد کا موٹا سا گارڈ جس کی آنکھیں کوئلے کے ریزے پڑ پڑ کر دائمی طور پر سرخ ہو گئی تھیں اور پپوٹے سُوجے ہوئے تھے، سیاہ وردی پہنے سگار کے کش لگاتا، دھواں اُڑاتا ایک چھوٹے سے انجن کی طرح بار بار اس کے ڈبے کے سامنے سے گزرتا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے سیدھا میمونہ کی کھڑکی کا رُخ کیا مگر وہ رکا نہیں۔ بس اسے گھورتے ہوئے پاس سے نکل گیا۔ میمونہ اس کی حرکات دیکھ دیکھ کر عجیب طفلانہ شوخی سے مسکراتی رہی۔

گاڑی چلتے چلتے وہ ڈبا عورتوں سے کھچا کھچ بھر گیا۔ راستے میں کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہ آیا سوائے اس کے کہ اس کے ڈبے میں تین چار لڑکیاں بہت شوخ تھیں جنھوں نے گھنٹے ڈیڑھ تک خوب اودھم مچائے رکھا اور پھر تھک کر سو گئیں۔

اگلے روز وہ نئی دہلی میں اپنی بہن کے ہاں مقیم تھی۔ ساجدہ کی شادی کے بعد ان دونوں بہنوں کی یہ پہلی ملاقات تھی مگر اسے ساجدہ کی تیزیٔ گفتار کا کمال کہیے کہ اس نے دو ہی گھنٹوں میں اپنی بہن کو پچھلے بارہ برس کے واقعات سے، ضروری اور غیر ضروری تفاصیل

کے ساتھ واقف کر دیا تھا۔ اس کی تین لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ بڑی لڑکی کی عمر دس برس تھی منجھلی کی سات برس اور چھوٹی بچی ابھی دودھ پیتی تھی۔ لڑکوں میں ایک کی عمر نو برس کی تھی وہ چوتھی میں پڑھتا تھا اور چھوٹا بیٹا چار سال کا تھا۔ اس نے شرماتے ہوئے بتایا کہ چند ہفتوں میں وہ پھر ماں بننے والی ہے۔

اس کے بعد اس نے ہر ایک بچے کی پیدائش، اس موقع کے درد و کرب، ہسپتال کی نرسوں کی دوستی وغیرہ کا حال سنایا۔ ہر ایک بچے کی عادتیں، خصلتیں، ذہانت، شرارتیں، بیماریاں، جس جس شہر میں اس کے صاحب کو ملازمت کے سلسلے میں رہنا پڑا تھا، وہاں کی خصوصیات اور صاحب کی دفتری مصروفیتوں کا حال سنایا۔ آخر میں اس نے اداس لہجہ میں روپے کی قلت اور اپنی تنگ دستی کا ذکر کیا۔ اس کا میاں سو روپے پاتا تھا جو نئی دہلی کی رہائش، کھیل تماشوں، بچوں کی تعلیم وغیرہ کے اخراجات میں ہفتہ ہی بھر میں اٹھ جاتے تھے اور باقی سارا مہینہ حساب پر کٹتا تھا۔ اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا:

"فکر نہ کرو۔ انھوں نے کسی دوست کو روپے قرض دے رکھے ہیں جو آج ہی کل میں ملنے والے ہیں۔ بس روپے ملتے ہی ہم ٹیکسی لیں گے اور تمھیں دلّی کی سیر کروائیں گے۔"

جب دو دن گزر گئے اور ساجدہ کا میاں اپنے دوست سے روپے وصول کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا تو میمونہ نے بہن کے روکنے کے باوجود اپنے خرچ سے ٹیکسی منگوائی اور اس میں دونوں بہنیں، میمونہ کا بہنوئی اور پانچوں بچے لد کے دہلی کے قابلِ دید مقامات دیکھنے گئے، مگر بچوں کے غل غپاڑے اور ان کی دیکھ بھال میں میمونہ کو سیر کا کچھ لطف نہ آیا اور وہ نہایت بددل ہو کر واپس آئی۔

اگلے روز شام کو اسے اداس دیکھ کر ساجدہ نے اپنے صاحب سے کہا:

"تم جانتے ہو، میں تو پیدل چل نہیں سکتی، تم جا کے ذرا میمونہ کو کناٹ پیلس کی سیر تو کرا لاؤ۔"

اس نے بادلِ نخواستہ حامی بھرلی۔ وہ پینتیس چھتیس برس کا دُبلا پتلا نوجوان تھا۔ایک بے چین روح، اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ہر وقت ایک تشنگی اور وحشت سی جھلکتی رہتی تھی۔ وہ خاصا خوش شکل تھا لیکن اپنی ناداری کی وجہ سے اپنی سالی کے سامنے کچھ جھینپا جھینپا سا رہتا تھا۔ایک دو دفعہ اس نے تنہائی میں اپنی بیوی کی ملامت بھی کی تھی کہ ایسی تنگدستی کی حالت میں تم نے اسے بلوایا ہی کیوں۔ جس وقت وہ روانہ ہونے لگے تو ساجدہ نے احتیاط کے طور پر اپنی بڑی بیٹی قمرالنساء کو بھی ان کے ہمراہ کر دیا۔

سردی خاصی پڑنے لگی تھی۔ میمونہ نے ساری کے اوپر کوٹ پہن رکھا تھا۔ذرا سی دیر میں وہ چہل قدمی کرتے ہوئے کناٹ پلیس پہنچ گئے۔ یہاں کی رفیع الشان عمارتیں، فلیٹوں میں رہنے والی مخلوق، دکانوں کی سج دھج اور ان کی جھلملاتی ہوئی رنگا رنگ روشنیاں، مشرقی اور مغربی آرٹ کے نمونے، سینما گھروں کی گہما گہمی، ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں بلند ہونے والے قہقہے، پارکوں میں کہیں اُجالا کہیں اندھیرا اور کہیں نور اور سایہ باہم گتھے ہوئے، اور سب سے بڑھ کر یہاں کے خوش پوش نوجوان اور رنگ برنگی ساریوں والی لڑکیوں کے جھرمٹ، جدھر سے یہ جھرمٹ گزر جاتے فضا جوانی کے نشے سے مہک اٹھتی، میمونہ ان سب چیزوں کو ایک محویت کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔ دہلی آنے پر اب تک اسے جو کوفت ہوئی تھی اس کا خیال ایک دم نکل گیا تھا۔ لڑکیوں کو کسی مرد کی سرپرستی کے بغیر آزادانہ اور دلیری سے پھرتے دیکھ کر اسے تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی۔

کچھ دیر اِدھر اُدھر گھما پھرا کر اس کا بہنوئی اسے ایک جگمگاتے ہوئے قہوہ خانے میں لے گیا جس کی بڑی صفت یہ تھی کہ وہاں چیزوں کے دام بہت کم لیے جاتے تھے۔ یہ قہوہ خانہ اعلیٰ درجہ کے فرنیچر سے مزین تھا اور اتنا فراخ کہ پچاس ساٹھ آدمی بیک وقت اس میں سما سکیں۔ جس وقت وہ اپنی سالی اور بیٹی کو لے کر اندر پہنچا تو یہ قہوہ خانہ گاہکوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ایک کونے میں ایک میز کو خالی دیکھ کر وہ لپک کر اس کی طرف بڑھا اور اس پر قبضہ

جمالیا۔

تھوڑی ہی دیر میں قہوہ آگیا۔ میمونہ نے اس کی چسکیاں لینا اور اپنے اردگرد دیکھنا شروع کیا، ہندوستانی، اینگلوانڈین اور یورپین مرد وزن بڑھیا سے بڑھیا لباس پہنے مزے مزے سے قہوہ پی رہے تھے اور خوش گپیاں کر رہے تھے۔ وہ جوں جوں انھیں دیکھتی گئی اس کی دلچسپی بڑھتی چلی گئی۔ جب وہ قہوہ پی چکے تو اس کا بہنوئی ایک دوست کو ٹیلی فون کا بہانہ کر کے کاؤنٹر کے پاس گیا اور چپکے سے بل بھی ادا کر آیا۔ چونکہ انھیں گھر سے نکلے دو گھنٹے ہو چکے تھے اس لیے یہاں سے نکل کر انھوں نے سیدھا گھر کا رخ کیا۔

جب وہ گھر پہنچے تو ساجدہ نے بہن سے پوچھا:

''کیوں پسند آیا کناٹ پیلس ؟''

''ہاں۔'' میمونہ نے اپنے جوش کو دباتے ہوئے کہا۔ ''بہت دلچسپ مقام ہے۔''

دوسرے دن شام کو ساجدہ کے میاں کو کوئی کام تھا اور وہ سر شام ہی سے گھر سے نکل گیا۔ ادھر میمونہ بناؤ سنگھار کر کے اور نئی ساری پہن کے تیار ہو گئی۔ ساجدہ نے پوچھا:

''کہاں کی تیاری ہے ؟''

''ذرا گھومنے جاؤں گی۔''

''ایں اکیلی ؟''

''اور کیا اکیلی کو کوئی پکڑ لے گا؟''

قبل اس کے کہ ساجدہ آج پھر اپنی بڑی بیٹی یا بیٹے کو ہمراہ لے جانے کی ہدایت کرتی وہ کوارٹر سے باہر تھی۔

کناٹ پیلس پہنچ کر اس نے پارک کا رخ کیا جس کے بیچوں بیچ ایک گول چبوترے پر پولیس کا بینڈ بج رہا تھا اور سینکڑوں مرد عورتیں اور بچے اس کے گرد جمع تھے۔ تھوڑی دیر وہاں کی چہل پہل دیکھنے کے بعد جب وہ دکانوں کی طرف لوٹ رہی تھی تو اس نے محسوس کیا جیسے

کوئی شخص اس کے بالکل پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو یہ ایک پچیس چھبیس سال کا نوجوان تھا جس نے سبز فیلٹ ہیٹ اور فاختئی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ لمبا قد، گوراچٹا رنگ، پتلی پتلی ترشی ہوئی مونچھیں، لمبی لمبی قلمیں، آنکھوں سے علم کا نور اور چال سے شائستگی ٹپکتی تھی۔ وہ نوجوان تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کی طرف دیکھے بغیر اس کے پاس سے گزر گیا مگر تھوڑی ہی دور چل کے اس نے ایک دم اپنی رفتار سست کر دی اور اب کے میمونہ کو اس کے پاس سے گزرنا پڑا۔

اب وہ اس چوراہے میں پہنچ گئی تھی جہاں سے دکانوں کی قطاریں داہنے بائیں ایک دائرے کی صورت میں گئی تھیں۔ میمونہ ایک قطار کی طرف زیادہ روشنی دیکھ کر چل دی۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ نوجوان بھی اسی سمت آتا دکھائی دیا۔ اب کے اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں میمونہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ نوجوان کچھ دور تک تو اس کے پیچھے پیچھے رہا اور پھر تیزی سے اس کے پاس سے گزر گیا۔ اب کے اس نے اپنی نظریں میمونہ کے چہرے پر گاڑ رکھی تھیں۔ چند قدم چل کر وہ ایک بک اسٹال پر ٹھہر گیا اور اخباروں کی سُرخیاں پڑھنے لگا۔ میمونہ کو پھر اس کے پاس سے گزرنا پڑا۔

یہ ماجرا کئی بار پیش آیا کہ کبھی تو وہ نوجوان اس کے آگے آگے چلنے لگتا اور کبھی میمونہ کو اس کے آگے آگے چلنا پڑتا۔ اس نے سوچا ذرا دیکھوں تو یہ نوجوان سچ مچ میرا پیچھا کر رہا ہے یا یہ میرا وہم ہی وہم ہے۔

وہ ایک چینی آرٹ کی دکان میں داخل ہو گئی اور وقت گزارنے کے لیے چینیوں کی بنائی ہوئی تصویریں، کھلونے، ظروف اور کپڑے وغیرہ دیکھنے لگی۔ پانچ منٹ کے بعد جب وہ دکان سے نکلی تو وہ نوجوان باہر اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ دونوں کی نگاہیں ملتی تھیں کہ اس نوجوان نے ہیٹ کے کنارے کو چھُو کر سر کی ایک خفیف سی جنبش کے ساتھ سلام کیا۔

یہ حرکت اس سے ایسی غیر متوقع طور پر سرزد ہوئی کہ میمونہ بے ساختہ مسکرا دی۔

اس کے بعد اس نے کناٹ پلیس کے دو تین چکر اور لگائے اور پھر گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس دوران میں وہ نوجوان بدستور اس کا پیچھا کرتا رہا۔ جب اس کے بہنوئی کا کوارٹر چند قدم کے فاصلے پر رہ گیا تو اس نے اچانک پلٹ کر نوجوان کی طرف دیکھا اور ایک اندازِ شوخی سے بھاگ کر کوارٹر میں چلی گئی۔

ساجدہ اس کی راہ تک رہی تھی، اسے دیکھ کر بولی:

"شکر ہے تم آگئیں۔ مجھے بڑا فکر ہو رہا تھا، کہو کہاں کہاں گھوم آئیں؟"

"یہیں کناٹ پلیس تک گئی تھی۔"

"عورت ذات، پھر تنہا، پھر ناواقف، فکر کی بات ہی تھی.... تم ہنس کیوں رہی ہو۔"

"نہیں تو۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اس رات اس نے خوشی خوشی سب کے ساتھ مل کر کھانا کھایا۔ وہ دیر تک بچوں سے باتیں کرتی رہی۔ آج بچے اسے یکایک دلچسپ معلوم ہونے لگے تھے۔ اس نے چھوٹی بچی کو گود میں لیا، پیار کیا، پھر آہستہ آہستہ اسے ہوا میں اچھالنے لگی۔ کمرہ قلقاریوں سے گونج اٹھا۔

اگلے روز سہ پہر ہی سے اس نے بناؤ سنگار شروع کر دیا۔ اپنی سب سے بڑھیا ساری نکالی جو اس کی ایک امیر شاگرد کی ماں نے اپنی بیٹی کے پاس ہونے کی خوشی میں اسے تحفے میں دی تھی۔

کوارٹر سے نکل کر وہ سیدھی اس سیلون میں پہنچی جہاں بجلی کے ذریعے بالوں میں لہریں پیدا کی جاتی تھیں۔ یہ انگریزی دکان اس نے کل کے گشت میں دیکھ لی تھی۔ جب اس کے گھنے بالوں میں لہریں پڑ چکیں اور تازہ ترین مغربی فیشن کے مطابق اس کی آرائش ہو چکی تو وہ آئینے میں پہلے پہل اپنی صورت پہچان نہ سکی۔ وہ زیادہ سے زیادہ بیس برس کی معلوم ہوتی تھی، اصلی عمر سے آٹھ سال کم۔ اس کے پیچھے اس سیلون کی بوڑھی مشاطہ جو ایک فرانسیسی

خاتون تھی اسے ایسی شفقت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے ماں اپنی دلہن بیٹی کو سنگار کے بعد دیکھتی ہے۔

شام کے جھٹپٹے میں میمونہ اپنی خوشی کو دبائے، جھینپتی ہوئی، سیلون سے نکلی اور کناٹ پیلس کے پارک کی طرف ہولی۔ وہ کوئی گھنٹہ بھر تک پارک کے مختلف حصوں میں پھرتی رہی پھر اس نے دکانوں کا گشت لگانا شروع کیا مگر وہ کل والا نوجوان اسے کہیں نظر نہ آیا۔ وہ اس قہوہ خانے کے پاس پہنچی، جہاں وہ پہلے روز اپنے بہنوئی کے ساتھ گئی تھی۔ قہوہ خانہ آج بھی کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اسے اندر جاتے کچھ جھجک سی معلوم ہوئی مگر اس نے دل کو مضبوط کیا اور کسی کی طرف دیکھے بغیر اندر جا کر ایک خالی میز کے پاس بیٹھ گئی اور ملازم سے قہوہ منگوایا۔

رفتہ رفتہ اس نے کنکھیوں سے اپنے آس پاس کے لوگوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ہر طرف چھوٹی چھوٹی محفلیں منعقد تھیں۔ کہیں اہم ملکی معاملات پر گرما گرم بحث ہو رہی تھی تو کہیں بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی۔ ایک کونے میں دو بنگالی لڑکیاں جن کی چوٹیوں کے سروں میں سرخ سرخ ربن بندھے ہوئے تھے، سر سے سر جوڑ کر چپکے چپکے باتیں کر رہی تھیں۔ ان کے قریب ہی دوسری میز پر ایک نوجوان بظاہر اخبار میں منہمک معلوم ہوتا تھا مگر دراصل وہ ان لڑکیوں کو گھور رہا تھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر وہ سبز فلیٹ ہیٹ اور فاختی رنگ کے سوٹ والا نوجوان کہیں نہ تھا۔

آدھ گھنٹے کے بعد وہ قہوہ خانے سے نکل آئی۔ اس وقت رات خاصی ہو چکی تھی۔ ٹھنڈی اور تیز ہوا چل رہی تھی۔ اس نے مفلر کو اپنے گلے کے گرد لپیٹ کر اوورکوٹ کے بٹن بند کر لیے اور پھر دکانوں کی طرف چل دی۔

جیسے ہی وہ چوراہے کے پاس پہنچی، اس نے دیکھا کہ ایک سڑک کے درمیان، جہاں موٹریں وغیرہ ٹھہرائی جاتی ہیں، ایک سیاہ سیلون کار کھڑی ہے۔ اس میں دو تین نوجوان،

انگریزی سوٹ پہنے بیٹھے ہیں اور دو تین باہر کھڑے ان سے باتیں کر رہے ہیں۔ جب وہ ذرا قریب پہنچی تو اس جتھے میں اسے وہ کل والا نوجوان نظر آ گیا۔ آج اس نے چیسٹر پہن رکھا تھا اور سر سے ننگا تھا، وہ موٹر کے دروازے کے پاس کھڑا اپنے ساتھیوں سے کچھ کہہ رہا تھا جسے وہ سر جوڑے غور سے سُن رہے تھے۔ جیسے ہی اس نوجوان کی نظر میمونہ پر پڑی وہ گھبرا گیا اور اپنے ایک ساتھی کو جو چشمہ لگائے پاس ہی کھڑا تھا، کہنی سے ٹھوکا دینے لگا، یک بارگی سب کے چہرے اشتیاق سے چمک اٹھے۔ مگر بظاہر انھوں نے میمونہ کی طرف توجہ نہ کی اور ایک بے پروائی کا سا انداز اختیار کیے آپس ہی میں باتیں کرتے رہے۔

میمونہ نے ان کی یہ سب حرکات بھانپ لی تھیں۔ اس کا چہرہ یک لخت تمتما اٹھا۔ اس کی پیشانی پر پسینہ آ گیا اور وہ منہ ہی منہ میں حقارت سے کہہ اٹھی:

"اوہ یہ بات تھی!"

جب وہ ذرا دُور نکل گئی تو وہ نوجوان اپنے ساتھیوں سے جدا ہوا اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا دکانوں کی اس قطار کے اس سرے کی طرف چل دیا جس طرف میمونہ جا رہی تھی۔ سرے پر پہنچ کر وہ ٹھہر گیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔

میمونہ نے اسے دور ہی سے دیکھ لیا تھا۔ آج اس کا انداز کل سے بالکل بدلا ہوا تھا۔ کل وہ بہت خوفزدہ اور اداس معلوم ہوتا تھا مگر آج اس کی آنکھوں میں شوخی اور بے باکی تھی۔ میمونہ کا گزشتہ شب اپنے کوارٹر کے سامنے پلٹ کر اس کی طرف دیکھنا، مسکرانا اور بھاگ جانا اسے دلیر بنانے کے لیے کافی تھا اور پھر آج کا یہ سنگار، بالوں میں لہریں، زلفوں میں یہ پیچ و خم ․

میمونہ کو آج اس نوجوان کے چہرے میں کوئی خاص بات نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ ایسا ہی تھا جیسے اس کے اور لفنگے ساتھیوں کے چہرے جن پر ایک جیسی عیاری، ہوس کاری، پاجی پن اور بے وقوفی برس رہی تھی۔ وہ حیران تھی کہ کل وہ اسے کیوں بھا گیا تھا۔

اسے یقین تھا کہ جب وہ اس کے پاس سے گزرے گی تو وہ ضرور کوئی حرکت کرے گا کچھ نہیں تو کوئی فقرہ ہی کسے گا مگر اس نے اس کا موقع ہی نہ دیا۔ جب اس کے اور نوجوان کے درمیان کوئی بیس قدم کا فاصلہ رہ گیا تو وہ ایک دکان کے شوکیس میں جھوٹ موٹ لیسوں اور فیتوں کے نمونے دیکھنے ٹھہر گئی اور پل بھر کے بعد وہ جس طرف سے آئی تھی اسی طرف لوٹ گئی۔ چند ہی قدم چلی تھی کہ اسے سامنے سے سڑک پر وہی سیاہ سیلون کار آتی دکھائی دی۔ اس میں اس وقت چار آدمی سوار تھے۔ انھوں نے ایسی نظروں سے اسے گھورا کہ وہ ایک دم گھبرا گئی۔ بلاشبہ کار ہلکی رفتار سے ساتھ ساتھ سڑک پر اس کا پیچھا کر رہی تھی۔

طرح طرح کے وحشت ناک خیال اس کے دل میں آنے لگے جو اسے سہائے دیتے تھے وہ رہ رہ کے اپنی کل کی حرکتوں پر اپنے کو ملامت کر رہی تھی۔ پردیس کا معاملہ تھا۔ عزت کا خدا ہی نگہبان تھا۔

سامنے سے ایک انگریز انسپکٹر کو موٹر سائیکل پر آتے دیکھ کر اس کی ڈھارس بندھی اس نے دل کو مضبوط کیا اور یہ سوچ کر تسلی دی کہ جب تک میں خود موقع نہ دوں گی ان کتوں کی مجال نہیں کہ میرے قریب بھی پھٹکنے پائیں۔

جب تک وہ دکانوں کی آگے کے لمبے محراب دار برآمدے میں گزرتی رہی نوجوان نے بہتیری کوشش کی کہ کسی طرح وہ اسے اپنی طرف متوجہ کریں۔ وہ اس کے کبھی آگے آگے، کبھی پیچھے پیچھے، کبھی ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ مگر میمونہ نے ایک بار بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔ ایک جگہ کونے میں دو بڑے بڑے گول ستونوں کے درمیان ایک تنگ موڑ تھا جس میں سے ایک وقت میں صرف دو ایک آدمی ہی گزر سکتے ہیں۔ جب وہ ان ستونوں میں سے گزرنے لگی تو دیکھا کہ نوجوان اس کا راستہ روکے کھڑا ہے۔ اس وقت اتفاق سے اور کوئی آدمی آس پاس نہیں تھا۔ میمونہ لمحہ بھر کے لیے رک گئی اور منتظر رہی کہ وہ ہٹے تو گزروں

مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ اس پر یکبارگی وہی کیفیت طاری ہو گئی جیسی اسکول میں کسی ضدی اور سرکش دیہاتی لڑکی کی ہٹ دھری پر ہو جایا کرتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے انتہائی غیظ برسنے لگا اور اس نے حقارت سے تحکمانہ لہجے میں کہا:

"ہٹو راستہ چھوڑو۔ بے وقوف آدمی۔"

وہ نوجوان دبک کر ایک طرف ہو گیا۔

اس وقت آٹھ بج چکے تھے اور کناٹ پلیس کے چکر سے نکل کر اس بڑی سڑک پر پہنچ گئی تھی جو سیدھی اس کے بہنوئی کے کوارٹر کو جاتی تھی۔ ادھر شکار کو ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر اس نوجوان نے زیادہ سرگرمی سے اس کا پیچھا کرنا شروع کر دیا تھا۔ جب آس پاس کوئی نہ ہوتا تو وہ زور زور سے آہیں بھرنے لگتا۔ دو ایک دفعہ اس نے عاشقانہ اشعار بھی گنگنائے مگر میمونہ نے رسید تک نہ دی۔ اس پر وہ کھلم کھلا اسے بازاری خطابوں سے پکارنے لگا۔ میمونہ نے اپنی رفتار تیز کر دی۔

جب وہ ایک چوک میں سے گزر رہی تھی تو وہ سیاہ رنگ موٹر فراٹے بھرتی ہوئی بالکل اس کے قریب سے ہو کر گزر گئی۔ اگر وہ جلدی سے ایک طرف نہ ہٹ جاتی تو عجب نہ تھا کہ ٹانگ موٹر کے پہیے کے نیچے آجاتی۔ ادھر وہ ہٹی، ادھر موٹر میں سے آواز آئی:

"اوہ، ویری سوری!"

میمونہ نے اب سنبھل کر سڑک کے بالکل کنارے ہو کر پھر تیز رفتار سے چلنا شروع کر دیا تھا۔ ادھر وہ نوجوان بھی اس کے ساتھ ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتا عاشقانہ فقرے کستا اور آہیں بھرتا چلا آرہا تھا۔ تھوڑی دیر میں موٹر چکر کاٹ کر پھر اس کے پاس سے گزر گئی۔ اب کے اس کے کان کے پاس اس زور کا ہارن بجا کہ وہ ڈر کر اُچھل پڑی۔

موٹر میں سے آواز آئی:

"پیدل کب تک چلئے گا، موٹر میں تشریف لے آیئے نا سرکار!"

میمونہ کا کوارٹر اب صرف ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ جوں جوں اس کا گھر قریب آتا جاتا تھا، نوجوان کی آہ و فغاں میں زیادہ جوش و خروش پیدا ہوتا جاتا تھا۔ میمونہ نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی۔ اور بھی تیز، یہاں تک کہ وہ قریب قریب دوڑنے لگی۔ اس کے پیچھے لگاتار ایک شور سنائی دیتا رہا مگر اس نے بالکل دھیان نہ دیا، نہ پلٹ کر دیکھا۔ وہ ہانپ رہی تھی۔ پھر بھی اس نے اپنی رفتار میں کمی نہ آنے دی۔ آخر کار وہ اپنے کوارٹر میں پہنچ ہی گئی۔

ساجدہ نے اسے لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے دیکھا تو پوچھا:

"تم گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟ دم کیوں چڑھا ہوا ہے؟"

"نہیں تو۔" میمونہ نے مری ہوئی آواز میں کہا اور اپنے جسم کو ایک آرام کرسی پر گرا دیا۔

اس رات خاصی دیر تک رہ رہ کے اس کے کوارٹر کے سامنے ہارن بجتا رہا مگر میمونہ نے اپنی کسی حرکت سے یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ اس کا اس سے کوئی تعلق ہے۔

۳۱ دسمبر کی شام کو وہ دہلی کے اسٹیشن پر ریل کے زنانہ درجے میں بیٹھی واپس جا رہی تھی۔ اس کے منی بیگ میں صرف چند روپے اور کچھ ریزگاری رہ گئی تھی۔ سو روپے کے یوں بیکار میں مصرف اٹھ جانے پر اس کا دل بھر بھر آتا تھا۔ کیا یہ اچھا نہ ہوتا کہ وہ اس کا کوئی زیور بنا لیتی جو آڑے وقت میں اس کے کام بھی آتا....

وہ کھڑکی سے لگی بیٹھی ہر چیز کو بڑی بے توجہی سے دیکھ رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ پانچ برس اور بوڑھی ہو گئی ہو۔

۱۹۴۰ء

آنندی

بلدیہ کا اجلاس زوروں پر تھا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور خلافِ معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہ تھا۔ بلدیہ کے زیرِ بحث مسئلہ یہ تھا کہ زنانِ بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے کیونکہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

بلدیہ کے ایک بھاری بھرکم رکن جو ملک و قوم کے سچے خیر خواہ اور درد مند سمجھے جاتے تھے نہایت فصاحت و بلاغت سے تقریر کر رہے تھے۔

......اور پھر حضرات! آپ یہ بھی خیال فرمایئے کہ ان کا قیام شہر کے ایک ایسے حصے میں ہے جو نہ صرف شہر کے بیچوں بیچ عام گزرگاہ ہے بلکہ شہر کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بھی ہے، چنانچہ ہر شریف آدمی کو چار و ناچار اس بازار سے گزرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں شرفاء کی پاک دامن بہو بیٹیاں اس بازار کی تجارتی اہمیت کی وجہ سے یہاں آنے اور خرید و فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔ صاحبان! جب یہ شریف زادیاں ان آبرو باختہ، نیم عریاں بیسواؤں کے بناؤ سنگار کو دیکھتی ہیں تو قدرتی طور پر ان کے دل میں بھی آرائش و دلربائی کی نئی نئی امنگیں اور ولولے پیدا ہوتے ہیں اور وہ اپنے غریب شوہروں سے طرح طرح کے غازوں، لونڈروں، زرق برق ساریوں اور قیمتی زیوروں کی فرمائشیں کرنے لگتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا پُر مسرت گھر، ان کا راحت کدہ ہمیشہ کے لیے جہنم کا نمونہ بن جاتا ہے۔

اور صاحبان! پھر آپ یہ بھی تو خیال فرمایئے کہ نہالانِ قوم، جو درس گاہوں میں تعلیم پا رہے ہیں اور جن کی آئندہ ترقیوں سے قوم کی امیدیں وابستہ ہیں اور قیاس چاہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن قوم کی کشتی کو بھنور سے نکالنے کا سہرا ان ہی کے سر بندھے گا، انھیں بھی صبح وشام اسی بازار سے ہو کر آنا جانا پڑتا ہے۔ یہ قحبائیں جو ہر وقت بارہ بھرن! سولہ سنگار کئے ہر راہرو پر بے حجابانہ نگاہ و مژہ کے تیر وسناں برساتی اور اسے دعوتِ حسن پرستی دیتی ہیں کیا انھیں دیکھ کر ہمارے بھولے بھالے ناتجربہ کار، جوانی کے نشے میں سرشار، سود و زیاں سے بے پروا نونہالانِ قوم اپنے جذبات وخیالات اور اپنی اعلیٰ سیرت کو معصیت کے مسموم اثرات سے محفوظ رکھ سکتے ہیں؟ صاحبان! کیا ان کا حسنِ زاہد فریب ہمارے نونہالانِ قوم کو جادۂ مستقیم سے بھٹکا کر ان کے دل میں گناہ کی پُر اسرار لذتوں کی تشنگی پیدا کر کے ایک بے کلی، ایک اضطراب، ایک ہیجان برپا کر دیتا ہو گا . .''

اس موقع پر ایک رکن بلدیہ جو کسی زمانہ میں مدرس رہ چکے تھے، اور اعداد وشمار سے خاص شغف رکھتے تھے، بول اٹھے:

''صاحبان! واضح رہے کہ امتحانوں میں ناکام رہنے والے طلبہ کا تناسب پچھلے پانچ سال کی نسبت ڈیوڑھا ہو گیا ہے۔''

ایک رکن نے جو چشمہ لگائے تھے اور ایک ہفتہ وار اخبار کے مدیرِ اعزازی تھے، تقریر کرتے ہوئے کہا: ''حضرات ہمارے شہر سے روز بروز غیرت، شرافت، مردانگی، نکوکاری و پرہیزگاری اُٹھتی جا رہی ہے اور اس کے بجائے بے غیرتی، نامردی، بزدلی، بد معاشی، چوری اور جعل سازی کا دَور دورہ ہوتا جا رہا ہے۔ منشیات کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے۔ قتل و غارت، خودکشی اور دیوالہ نکلنے کی وارداتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس کا سبب محض ان زنانِ بازاری کا ناپاک وجود ہے کیونکہ ہمارے بھولے بھالے شہری ان کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو کر ہوش و خرد کھو بیٹھتے ہیں اور ان کی بارگاہ تک رسائی کی زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرنے کے لئے

ہر جائز و ناجائز طریق سے زر حاصل کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اس سعی و کوشش میں جامہ انسانیت سے باہر ہو جاتے ہیں اور نہایت قبیح افعال کا ارتکاب کر بیٹھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ جان عزیز ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور یا جیل خانوں میں پڑے سڑتے ہیں۔"

ایک پنشن یافتہ معمر رکن، جو ایک وسیع خاندان کے سرپرست تھے اور دنیا کا سرد و گرم دیکھ چکے تھے اور اب کش مکشِ حیات سے تھک کر باقی ماندہ عمر ستانے اور اپنے اہل و عیال کو اپنے سائے میں پنپتا ہوا دیکھنے کے متمنی تھے، تقریر کرنے اٹھے۔ ان کی آواز لرزتی ہوئی تھی۔ اور لہجہ فریاد کا انداز لیے ہوئے تھا بولے: "صاحبان! رات رات بھر ان لوگوں کے طبلے کی تھاپ ان کی گلے بازیاں، ان کے عشاق کی دھینگا مشتی، گالی گلوچ، شور و غل، ہاہاہا ہو ہو ہو سن کر آس پاس کے رہنے والے شرفاء کے کان پک گئے ہیں۔ ضیق میں جان آ گئی ہے۔ رات کی نیند حرام ہے تو دن کا چین مفقود۔ علاوہ ازیں ان کے قرب سے ہماری بہو بیٹیوں کے اخلاق پر جو برا اثر پڑتا ہے ان کا اندازہ ہر صاحبِ اولاد خود کر سکتا ہے ....."

آخری فقرہ کہتے کہتے ان کی آواز بھرّا گئی اور وہ اس سے زیادہ کچھ کہہ نہ سکے۔ سب اراکین بلدیہ کو ان سے ہمدردی تھی کیونکہ بدقسمتی سے ان کا قدیمی مکان اس بازارِ حسن کے عین وسط میں واقع تھا۔

ان کے بعد ایک رکن بلدیہ نے، جو پرانی تہذیب کے علمبردار تھے اور آثار قدیمہ کو اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، تقریر کرتے ہوئے کہا:

"حضرات! باہر سے جو سیاح اور ہمارے احباب اس مشہور اور تاریخی شہر کو دیکھنے آتے ہیں جب وہ اس بازار سے گزرتے ہیں اور اس کے متعلق استفسار کرتے ہیں تو یقین کیجئے کہ ہم پر گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے۔

اب صدر بلدیہ تقریر کرنے اٹھے۔ گو قد ٹھنگنا اور ہاتھ پاؤں چھوٹے چھوٹے تھے مگر سر بڑا تھا جس کی وجہ سے بردبار آدمی معلوم ہوتے تھے، لہجہ میں حد درجہ متانت تھی

بولے:

"حضرات میں اس امر میں قطعی طور پر آپ سے متفق ہوں کہ اس طبقہ کا وجود ہمارے شہر اور ہمارے تہذیب و تمدن کے لیے باعثِ صد عار ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کا تدارک کس طرح کیا جائے۔ اگر ان لوگوں کو مجبور کیا جائے کہ یہ اپنا ذلیل پیشہ چھوڑ دیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ کھائیں گے کہاں سے؟"

ایک صاحب بول اٹھے۔ "یہ عورتیں شادی کیوں نہیں کر لیتیں۔"

اس پر ایک طویل فرمائشی قہقہہ پڑا اور ہال کی ماتمی فضا میں یکبارگی شگفتگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ جب اجلاس میں خاموشی ہوئی تو صاحبِ صدر بولے۔ "حضرات یہ تجویز بارہا ان لوگوں کے سامنے پیش کی جاچکی ہے۔ اس کا ان کی طرف سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ آسودہ اور عزت دار لوگ خاندانی حرمت و ناموس کے خیال سے انھیں اپنے گھروں میں نہ گھسنے دیں گے اور مفلس اور ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کو جو محض ان کی دولت کے لیے ان سے شادی کرنے پر آمادہ ہوں گے۔ یہ عورتیں خود منہ نہیں لگائیں گی۔"

اس پر ایک صاحب بولے: "بلدیہ کو ان کے نجی معاملوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں بلدیہ کے سامنے تو یہ مسئلہ ہے کہ یہ لوگ چاہے جہنم میں جائیں مگر اس شہر کو خالی کر دیں۔"

صدر نے کہا: "صاحبان یہ بھی آسان کام نہیں۔ ان کی تعداد دس بیس نہیں، سینکڑوں تک پہنچتی ہے اور پھر ان میں سے بہت سی عورتوں کے ذاتی مکانات ہیں۔"

یہ مسئلہ کوئی مہینہ بھر تک بلدیہ کے زیرِ بحث رہا اور بالآخر تمام اراکین کی اتفاق رائے سے یہ امر قرار پایا کہ زنانِ بازاری کے مملوکہ مکانوں کو خرید لینا چاہیئے اور انھیں رہنے کے لیے شہر سے کافی دور کوئی الگ تھلگ علاقہ دے دینا چاہیے۔ ان عورتوں نے بلدیہ کے اس فیصلہ کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ بعض نے نافرمانی کر کے بھاری جرمانے اور قیدیں تک

بھگتیں مگر بلدیہ کی مرضی کے آگے ان کی کوئی پیش نہ چل سکی اور وہ ناچار صبر کر کے گئیں۔

اس کے بعد ایک عرصہ تک ان زنانِ بازاری کے مملوکہ مکانوں کی فہرستیں اور نقشے تیار ہوتے اور مکانوں کے گاہک پیدا کیے جاتے رہے۔ بیشتر مکانوں کو بذریعہ نیلام فروخت کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان عورتوں کو چھ مہینے تک شہر میں اپنے پرانے ہی مکانوں میں رہنے کی اجازت دے دی گئی تاکہ اس عرصے میں وہ نئے علاقہ میں مکان وغیرہ بنوا سکیں۔

ان عورتوں کے لیے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے چھ کوس دور تھا۔ پانچ کوس تک پکی سڑک جاتی تھی اور اس کے آگے کوس بھر کچا راستہ تھا۔ کسی زمانے میں وہاں کوئی بستی ہوگی مگر اب تو کھنڈروں کے سوا کچھ نہ رہا تھا جن میں سانپوں اور چمگادڑوں کے مسکن تھے اور دن دہاڑے آلو بولتا تھا۔ اس علاقے کے نواح میں کچے گھروندوں والے کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے مگر کسی کا فاصلہ بھی یہاں سے دو ڈھائی میل سے کم نہ تھا ان گاؤں کے بسنے والے کسان دن کے وقت کھیتی باڑی کرتے یونہی پھرتے پھراتے ادھر نکل آتے تو نکل آتے ورنہ عام طور پر اس شہر خموشاں میں آدم زاد کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ بعض اوقات روزِ روشن ہی میں گیدڑ اس علاقے میں پھرتے دیکھے گئے تھے۔

پانسو سے کچھ اوپر بیسواؤں میں سے صرف چودہ ایسی تھیں جو اپنے عشاق کی وابستگی یا خود اپنی دل بستگی یا کسی اور وجہ سے شہر کے قریب آزادانہ رہنے پر مجبور تھیں اور اپنے دولت مند چاہنے والوں کی مستقل مالی سرپرستی کے بھروسے باولِ ناخواستہ اس علاقے میں رہنے پر آمادہ ہو گئی تھیں ورنہ باقی عورتوں نے سوچ رکھا تھا کہ وہ یا تو اسی شہر کے ہوٹلوں کو اپنا مسکن بنائیں گی یا بظاہر پارسائی کا جامہ پہن کر شہر کے شریف محلوں کے کونوں کھدروں میں جا چھپیں گی یا پھر اس شہر ہی کو چھوڑ، کہیں اور نکل جائیں گی۔

یہ چودہ بیسوائیں اچھی خاصی مالدار تھیں۔ اس پر شہر میں ان کے جو مملوکہ مکان

تھے ان کے دام انھیں اچھے وصول ہو گئے تھے اور اس علاقہ میں زمین کی قیمت برائے نام تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے ملنے والے دل و جان سے ان کی مالی امداد کرنے کو تیار تھے، چنانچہ انھوں نے اس علاقے میں جی کھول کر بڑے عالی شان مکان بنوانے کی ٹھان لی ایک اونچی اور ہموار جگہ، جو ٹوٹی پھوٹی قبروں سے ہٹ کر تھی، منتخب کی گئی۔ زمین کے قطعے صاف کرائے اور چابکدست نقشہ نویسوں سے مکانوں کے نقشے بنوائے گئے اور چند ہی روز میں تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔

دن بھر اینٹ، مٹی، چونا، شہتر، گارٹر اور دوسرا عمارتی سامان، لاریوں، چھکڑوں، خچروں، گدھوں اور انسانوں پر لاد کر اس بستی میں آتا اور منشی حساب کتاب کی کاپیاں بغلوں میں دبائے انھیں گنواتے اور کاپیوں میں درج کرتے۔ میر عمارت معماروں کو کام کے متعلق ہدایات دیتے، معمار مزدوروں کو ڈانٹتے ڈپٹتے، مزدور ادھر اُدھر دوڑتے پھرتے، مزدورنیوں کو چلا چلا کر پکارتے اور اپنے ساتھ کام کرنے کے لیے بلاتے۔ غرض سارا دن ایک شور، ایک ہنگامہ رہتا۔ سارا دن آس پاس کے گاؤں کے دیہاتی اپنے کھیتوں میں اور دیہاتنیں اپنے گھروں میں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ دور سے آتی ہوئی کھٹ کھٹ کی دھیمی آوازیں سنتی رہتیں۔

اس بستی کے کھنڈروں میں ایک جگہ مسجد کے آثار تھے اور اس کے پاس ہی ایک کنواں تھا جو بند پڑا تھا۔ راج مزدوروں نے کچھ تو پانی حاصل کرنے اور بیٹھ کر ستانے کی غرض سے اور کچھ ثواب کمانے اور اپنے نمازی بھائیوں کی عبادت گزاری کے خیال سے سب سے پہلے اس کی مرمت کی۔ چونکہ یہ فائدہ بخش اور ثواب کا کام تھا۔ اس لیے کسی نے کچھ اعتراض نہ کیا، چنانچہ دو تین روز میں مسجد تیار ہو گئی۔

دن کے بارہ بجے جیسے ہی کھانا کھانے کی چھٹی ہوتی دو ڈھائی سو راج، مزدور، میر عمارت، منشی اور ان بیسواؤں کے رشتہ دار یا کارندے جو تعمیر کی نگرانی پر مامور تھے اس مسجد کے آس پاس جمع ہو جاتے اور اچھا خاصا میلہ سا لگ جاتا۔

ایک دن ایک دیہاتی بُڑھیا جو پاس کے کسی گاؤں میں رہتی تھی اس بستی کی خبر سن کر آگئی اس کے ساتھ ایک خورد سال لڑکا تھا۔ دونوں نے مسجد کے قریب ایک درخت کے نیچے گھٹیا سگریٹ، بیڑی، پتے اور گڑ کی بنی ہوئی مٹھائیوں کا خوانچہ لگادیا۔ بُڑھیا کو آئے ابھی دو دن بھی نہ گزرے تھے کہ ایک بوڑھا کسان کہیں سے ایک مٹکا اٹھالایا اور کنویں کے پاس اینٹوں کا ایک چھوٹا سا چبوترا بنا پیسے کے دو دو شکر کے شربت کے گلاس بیچنے لگا۔ ایک کنجڑے کو خبر ہوئی، وہ ایک ٹوکرے میں خربوزے بھر کر لے آیا اور خوانچہ والی بُڑھیا کے پاس بیٹھ کر لے لو خربوزے شہد سے میٹھے خربوزے، کی صدا لگانے لگا۔ ایک شخص نے کیا کیا، گھر سے سری پائے پکا، دیگچی میں رکھ، خوانچہ میں لگا، تھوڑی سی روٹیاں، مٹی کے دو تین پیالے اور ٹین کا ایک گلاس لے آموجود ہوا اور بستی کے کارکنوں کو جنگل میں گھر کی ہنڈیا کا مزا چکھانے لگا۔

ظہر اور عصر کے وقت میر عمارت، معمار دوسرے لوگ مزدوروں سے کنویں سے پانی نکلوا نکلوا کر وضو کرتے نظر آتے۔ ایک شخص مسجد میں جا کر اذان دیتا۔ پھر ایک کو امام بنایا جاتا اور دوسرے لوگ اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھتے۔ کسی گاؤں کے ملا کے کان میں جو یہ بھنک پڑی کہ فلاں مسجد میں امام کی ضرورت ہے وہ دوسرے ہی دن علی الصباح ایک سبز جزدان میں قرآن شریف، پنج سورہ، رحل اور مسئلے مسائل کے چند چھوٹے چھوٹے رسالے رکھ آموجود ہوا اور اس مسجد کی امامت باقاعدہ طور پر اسے سونپ دی گئی۔

ہر روز تیسرے پہر گاؤں کا ایک کبابی سر پر اپنے سامان کا ٹوکرا اٹھائے آجاتا اور خوانچہ والی بُڑھیا کے پاس زمین پر چولہا بنا کباب، کلیجی، دل گردے سیخوں پر چڑھا بستی والوں کے ہاتھ بیچتا۔ ایک بھٹیاری نے جو یہ حال دیکھا تو اپنے میاں کو ساتھ لے مسجد کے سامنے میدان میں دھوپ سے بچنے کے لیے پھونس کا ایک چھپر ڈال تنور گرم کرنے لگی۔ کبھی کبھی ایک نوجوان دیہاتی نائی پھٹی پرانی کسبت گلے میں ڈالے جوتی کی ٹھوکروں سے راستے کے

روڑوں کو لڑھکاتا اِدھر اُدھر گشت کرتا دیکھنے میں آ جاتا۔

ان بیسواؤں کے مکانوں کی تعمیر کی نگرانی ان کے رشتہ دار یا کارندے تو کرتے ہی تھے، کسی کسی دن وہ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر اپنے عشاق کے ہمراہ خود بھی اپنے اپنے مکانوں کو بنتا دیکھنے آ جاتیں اور غروبِ آفتاب سے پہلے یہاں سے نہ جاتیں۔ اس موقع پر فقیروں اور فقیرنیوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں نہ جانے کہاں سے آ جاتیں اور جب تک خیرات نہ لے لیتیں اپنی صداؤں سے برابر شور مچاتی رہتیں اور انھیں بات نہ کرنے دیتیں۔ کبھی کبھی شہر کے لفنگے اوباش، بے کار مباش کچھ کیا کرو، کے مصداق شہر سے پیدل چل کر، بیسواؤں کی اس نئی بستی کی سُن گُن لینے آ جاتے اور اگر اس دن بیسوائیں بھی آئی ہوتیں تو ان کی عید ہو جاتی۔ وہ ان سے ذرا ہٹ کر ان کے گرداگرد چکر لگاتے رہتے، فقرے کستے، بے تکے قہقہے لگاتے، عجیب عجیب شکلیں بناتے اور مجنونانہ حرکتیں کرتے۔ اس روز کبابی کی خوب بکری ہوتی۔

اس علاقے میں جہاں تھوڑے ہی دن پہلے ہُو کا عالم تھا اب ہر طرف گہما گہمی اور چہل پہل نظر آنے لگی۔ شروع شروع میں اس علاقے کی ویرانی سے ان بیسواؤں کو یہاں آ کر رہنے کے خیال سے جو وحشت ہوتی تھی وہ بڑی حد تک جاتی رہی تھی اور اب ہر مرتبہ خوش خوش اپنے مکانوں کی آرائش اور اپنے مرغوب رنگوں کے متعلق معماروں کو تاکیدیں کر جاتی تھیں۔

بستی میں ایک جگہ ایک ٹوٹا پھوٹا مزار تھا جو قرائن سے کسی بزرگ کا معلوم ہوتا تھا جب یہ مکان نصف سے زیادہ تعمیر ہو چکے تو ایک دن صبح کو بستی کے راج، مزدوروں نے کیا دیکھا کہ مزار کے پاس سے دھواں اُٹھ رہا ہے اور ایک سرخ سرخ آنکھوں والا لمبا تڑنگا مست فقیر لنگوٹ باندھے چار ابرو کا صفایا کرائے اس مزار کے ارد گرد پھر رہا اور کنکر پتھر اُٹھا اُٹھا کر پرے پھینک رہا ہے۔ دوپہر کو وہ ایک ایک گھڑا لے کر کنویں پر آیا اور پانی بھر بھر کر

مزار پر لے جانے اور اسے دھونے لگا۔ ایک دفعہ جو آیا تو کنویں پر دو تین راج مزدور کھڑے تھے۔ وہ نیم دیوانگی اور نیم فرزانگی کے عالم میں ان سے کہنے لگا: "جانتے ہو وہ کس کا مزار ہے؟ کڑک شاہ پیر کا! میرے باپ دادا ان کے مجاور تھے۔" اس کے بعد اس نے ہنس ہنس کر اور آنکھوں میں آنسو بھر بھر کر پیر کڑک شاہ کی کچھ جلالی کراماتیں بھی ان راج مزدوروں سے بیان کیں۔

شام کو یہ فقیر کہیں سے مانگ تانگ کر مٹی کے دو دیے اور سرسوں کا تیل لے آیا، اور پیر کڑک شاہ کی قبر کے سرہانے اور پائنتی چراغ روشن کر دیے، رات کو پچھلے پہر کبھی کبھی اس مزار سے اللہ ہو کا مست نعرہ سنائی دے جاتا۔

چھ مہینے گزرنے نہ پائے تھے کہ یہ چودہ مکان بن کر تیار ہو گئے۔ یہ سب کے سب دو منزلہ اور قریب قریب ایک ہی وضع کے تھے۔ سات ایک طرف اور سات دوسری طرف۔ بیچ میں چوڑی چکلی سڑک تھی۔ ہر ایک مکان کے نیچے چار چار دکانیں تھیں، مکان کی بالائی منزل میں سڑک کے رخ وسیع برآمدہ تھا۔ اس کے آگے بیٹھنے کے لیے کشتی نما شہ نشیں بنائی گئی تھی جس کے دونوں سروں پر یا تو سنگِ مرمر کے مور رقص کرتے ہوئے دکھائے گئے تھے اور یا جل پریوں کے مجسمے تراشے گئے تھے جن کا آدھا دھڑ مچھلی کا اور آدھا انسان کا تھا۔ برآمدے کے پیچھے جو بڑا کمرہ بیٹھنے کے لیے تھا اس میں سنگِ مرمر کے نازک نازک ستون بنائے گئے تھے۔ دیواروں پر خوش نما پچی کاری کی گئی تھی۔ فرش سبز چمکدار پتھر کا بنایا گیا تھا۔ جب سنگ مرمر کے ستونوں کے عکس اس فرش زمردیں پر پڑتے تو ایسا معلوم ہوتا گویا سفید براق پروں والے راج ہنسوں نے اپنی لمبی لمبی گردنیں جھیل میں ڈبو دی ہیں۔

بدھ کا شبھ دن اس بستی میں آنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ اس روز اس بستی کی سب بیسواؤں نے مل کر بہت بھاری نیاز دلوائی۔ بستی کے کھلے میدان میں زمین صاف کرا کر

شامیانے نصب کر دیئے گئے۔ دیگیں کھڑکنے کی آواز گوشت کی گھی کی خوشبو بیس بیس کوس سے فقیروں اور کتوں کو کھینچ لائی۔ دوپہر ہوتے ہوتے پیر کڑک شاہ کے مزار کے پاس۔ جہاں لنگر تقسیم کیا جاتا تھا، اس قدر فقیر جمع ہو گئے کہ عید کے روز کسی بڑے شہر کی جامع مسجد کے پاس بھی نہ ہوئے ہوں گے۔ پیر کڑک شاہ کے مزار کو خوب صاف کروایا اور دھلوایا گیا اور اس پر پھولوں کی چادر چڑھائی گئی، اور اس مست فقیر کو نیا جوڑا سلوا کر پہنایا گیا جسے اس نے پہنتے ہی پھاڑ ڈالا۔

شام کو شامیانے کے نیچے دودھ سی اُجلی چاندنی کا فرش کر دیا گیا۔ گاؤ تکیے لگا دیئے گئے پاندان، پیک دان، پیچدان اور گلاب پاش رکھ دیئے گئے اور راگ رنگ کی محفل سجائی گئی، دور دور سے بہت سی بیسواؤں کو بلوایا گیا جو اُن کی سہیلیاں یا برادری کی تھیں، ان کے ساتھ ان کے بہت سے ملنے والے بھی آئے جن کے لیے ایک الگ شامیانے میں کرسیوں کا انتظام کیا گیا اور ان کے سامنے کے رخ چقیں ڈال دی گئیں۔ بیشمار گیسوں کی روشنی سے یہ جگہ بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ ان بیسواؤں کے توندل سیاہ فام سازندے زربفت اور کمخواب کی شیروانیاں پہنے عطر میں بسے ہوئے پھوئے کانوں میں رکھے اِدھر اُدھر مونچھوں کو تاؤ دیتے پھرتے اور زرق برق لباسوں اور تتلی کے پر سے بھی باریک ساریوں میں ملبوس، غازوں اور خوشبوؤں میں بسی نازنینیں اٹکھیلیوں سے چلتیں۔ رات بھر رقص و سرود کا ہنگامہ برپا رہا اور جنگل میں منگل ہو گیا۔

دو تین دن کے بعد جب اس جشن کی تھکاوٹ اتر گئی تو یہ بیسوائیں ساز و سامان کی فراہمی اور مکانوں کی آرائش میں مصروف ہوئیں۔ جھاڑ، فانوس، ظروف بلوری، قدِ آدم آئینے، نواڑی پلنگ، تصویریں اور قطعات سنہری چوکٹھوں میں جڑے ہوئے لائے گئے اور قرینے سے کمروں میں لگائے گئے اور کوئی آٹھ روز میں جا کر یہ مکان کیل کانٹے سے لیس ہوئے۔ یہ عورتیں دن کا بیشتر حصہ تو استادوں سے رقص و سرود کی تعلیم لینے، غزلیں یاد

کرنے، دُھنیں بٹھانے، سبق پڑھنے، تختی لکھنے، سینے پرونے، کاڑھنے، گراموفون سننے، استادوں سے تاش اور کیرم کھیلنے، ضلع جگت، نوک جھونک سے جی بہلانے یا سونے میں گزار دیتیں اور تیسرے پہر غسل خانوں میں نہانے جاتیں جہاں ان کے ملازموں نے دستی پمپوں سے پانی نکال کر ٹب بھر رکھے ہوتے۔ اس کے بعد وہ بناؤ سنگار میں مصروف ہو جاتیں۔

جیسے ہی رات کا اندھیرا پھیلتا۔ یہ مکان گیسوں کی روشنی میں جگمگا اٹھتے جو جا بجا سنگ مرمر کے آدھے کھلے ہوئے کنولوں میں نہایت صفائی سے چھپائے گئے تھے اور ان مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں کے کواڑوں کے شیشے جو پھول پتیوں کی وضع کے کاٹ کر جڑے گئے تھے، ان کی قوسِ قزح کے رنگوں کی سی روشنیاں دور سے جھل مل کرتی نہایت بھلی معلوم ہوتیں یہ بیسوائیں بناؤ سنگار کئے برآمدوں میں ٹہلتیں، آس پاس والیوں سے باتیں کرتیں، ہنستیں، کھلکھلاتیں۔ جب کھڑے کھڑے تھک جاتیں تو اندر کمرے میں چاندنی کے فرش پر گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتیں۔ ان کے سازندے ساز ملاتے رہتے اور یہ چھالیا کترتی رہتیں، جب رات بھیگ جاتی تو انکے ملنے والے ٹوکروں میں شراب کی بوتلیں اور پھل پھلاری لیے اپنے دوستوں کے ساتھ موٹروں یا تانگوں میں بیٹھ کر آتے۔ اس بستی میں ان کے قدم رکھتے ہی ایک خاص گہما گہمی اور چہل پہل ہونے لگتی۔ نغمہ و سرود، ساز کے سر، رقص کرتی ہوئی نازنینوں کے گھنگروؤں کی آوازیں، قلقلِ مینا میں مل کر ایک عجیب سرور کی سی کیفیت پیدا کر دیتی۔ عیش و مستی کے ان ہنگاموں میں معلوم بھی نہ ہوتا اور رات بیت جاتی۔

ان بیسواؤں کو اس بستی میں آئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ دکانوں کے کرایہ دار پیدا ہو گئے جن کا کرایہ اس بستی کو آباد کرنے کے خیال سے بہت ہی کم رکھا گیا تھا۔ سب سے پہلے جو دکاندار آیا وہ وہی بڑھیا تھی جس نے سب سے پہلے مسجد کے سامنے درخت کے نیچے

خوانچہ لگایا تھا۔ دکان کو پُر کرنے کے لیے بُڑھیا اور اس کا لڑکا سگریٹوں کے بہت سے خالی ڈبے اٹھا لائے اور اسے منبر کے طاقوں میں سجا کر رکھ دیا۔ بوتلوں میں رنگ دار پانی بھر دیا گیا تاکہ معلوم ہو شربت کی بوتلیں ہیں۔

بُڑھیا نے اپنی بساط کے مطابق کاغذی پھولوں اور سگریٹ کی خالی ڈبیوں سے بنائی ہوئی بیلوں سے دکان کی کچھ آرائش بھی کی۔ بعض ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تصویریں بھی پرانے فلمی رسالوں سے نکال کر لئی سے دیواروں پر چپکا دیں، دکان کا اصل مال دو تین قسم کے سگریٹ کے تین تین چار چار پیکٹوں، بیڑی کے آٹھ دس بنڈلوں، دیا سلائی کی نصف درجن ڈبیوں، پانوں کی ایک ڈھولی، پینے کے تمباکو کی تین چار ٹکیوں اور موم بتی کے نصف بنڈل سے زیادہ نہ تھا۔

دوسری دکان میں ایک بنیا، تیسری میں حلوائی اور شیر فروش، چوتھی میں قصائی، پانچویں میں کبابی اور چھٹی میں ایک کنجڑا آ بسے۔ کنجڑا آس پاس کے دیہات سے سستے داموں چار پانچ قسم کی سبزیاں لے آتا اور یہاں خاصے منافع پر بیچ دیتا۔ ایک آدھ ٹوکرا پھلوں کا بھی رکھ لیتا۔ چونکہ دکان خاصی کھلی تھی، ایک پھول والا اس کا ساجھی بن گیا۔ وہ دن بھر پھولوں کے ہار، گجرے اور طرح طرح کے گہنے بناتا رہتا اور شام کو انھیں چنگیر میں ڈال کر ایک ایک مکان پر لے جاتا اور نہ صرف پھول ہی بیچ آتا بلکہ ہر جگہ ایک ایک دو دو گھڑی بیٹھ کے سازندوں سے گپ شپ بھی ہانک لیتا اور حقے کے دَم بھی لگا آتا۔ جس دن تماش بینوں کی کوئی ٹولی اس کی موجودگی ہی میں کوٹھے پر چڑھ آتی اور گانا بجانا شروع ہو جاتا تو وہ سازندوں کے ناک بھوں چڑھانے کے باوجود گھنٹوں اٹھنے کا نام نہ لیتا، مزے سے گانے پر سر دُھنتا اور بیوقوفوں کی طرح ایک ایک کی صورت تکتا رہتا۔ جس دن رات زیادہ گزر جاتی اور کوئی ہار بچ رہتا تو اسے اپنے گلے میں ڈال لیتا اور بستی کے باہر گلا پھاڑ پھاڑ کر گاتا پھرتا۔

ایک دکان میں ایک بیسوا کا باپ اور بھائی جو درزیوں کا کام جانتے تھے۔ سینے کی ایک

مشین رکھ کر بیٹھ گئے۔ ہوتے ہوتے ایک حجام بھی آ گیا اور اپنے ساتھ ایک رنگریز کو بھی لیتا آیا۔ اس کی دکان کے باہر الگنی پر لٹکے ہوئے طرح طرح کے رنگوں کے لہریا دوپٹے ہَوا میں لہراتے ہوئے آنکھوں کو بہت بھلے معلوم ہونے لگے۔

چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک ٹٹ پونجیے بساطی نے جس کی دکان شہر میں چلتی نہ تھی بلکہ اسے دکان کا کرایہ نکالنا بھی مشکل ہو جاتا تھا، شہر کو خیر باد کہہ کر اس بستی کا رخ کیا۔ یہاں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کے طرح طرح کے لونڈر، قسم قسم کے پاؤڈر، صابن، کنگھیاں، بٹن، سوئی، دھاگا، لیس، فیتے، خوشبودار تیل، رومال، منجن، وغیرہ کی خوب بکری ہونے لگی۔

اس بستی کے رہنے والوں کی سرپرستی اور ان کے مربیانہ سلوک کی وجہ سے اسی طرح دوسرے تیسرے روز کوئی نہ کوئی ٹٹ پونجیا دکاندار، کوئی بزاز، کوئی پنساری، کوئی نیچہ بند، کوئی نانبائی مندے کی وجہ سے یا شہر کے بڑھے ہوئے کرائے سے گھبرا کر اس بستی میں آ پناہ لیتا۔

ایک بڑے میاں عطار جو حکمت میں بھی کسی قدر دخل رکھتے تھے ان کا جی شہر کی گنجان آبادی اور حکیموں اور دواخانوں کی افراط سے جو گھبرایا تو وہ اپنے شاگردوں کو ساتھ لے شہر سے اٹھ آئے اور اس بستی میں ایک دکان کرایہ پر لے لی۔ سارا دن بڑے میاں اور ان کے شاگرد دواؤں کے ڈبوں، شربت کی بوتلوں اور مربے، چٹنی اچار کے بویاموں کو الماریوں اور طاقوں میں اپنے اپنے ٹھکانے پر رکھتے رہے۔ ایک طاق میں طبِ اکبر، قرابادین قادری اور دوسری طبّی کتابیں جما کر رکھ دیں۔ کواڑوں کی اندرونی جانب اور دیواروں میں جو جگہ خالی بچی وہاں انھوں نے اپنے خاص الخاص مجربات کے اشتہار سیاہ روشنائی سے جلی لکھ کر اور دفتیوں پر چپکا کر آویزاں کر دیے۔ ہر روز صبح کو بیسواؤں کے ملازم گلاس لے لے آ موجود ہوتے اور شربت بزوری، شربت بنفشہ، شربت انار اور ایسے ہی نزہت بخش، روح افزا شربت و عرق، خمیرہ گاؤزبان اور تقویت پہنچانے والے مربے مع ورق ہائے نقرہ لے جاتے۔

جو دکانیں بچ رہیں، ان میں بیسواؤں کے بھائی بندوں اور سازندوں نے اپنی چار پائیاں ڈال دیں۔ دن بھر یہ لوگ ان دکانوں میں تاش، چوسر اور شطرنج کھیلتے، بدن پر تیل ملواتے، سبزی گھوٹتے، بٹیروں کی پالیاں کراتے، تیتروں سے سبحان تیری قدرت کی رَٹ لگواتے اور گھڑا بجا بجا کر گاتے۔

ایک بیسوا کے سازندے نے ایک دکان خالی کرا اپنے بھائی کو جو ساز بنانا جانتا تھا، اس میں لا بٹھایا۔ دکان کی دیواروں کے ساتھ ساتھ کیلیں ٹھونک کر ٹوٹی پھوٹی مرمت طلب سارنگیاں، ستار، طنبورے، دلربا وغیرہ ٹانگ دیئے گئے۔ یہ شخص ستار بجانے میں بھی کمال رکھتا تھا۔ شام کو وہ اپنی دکان میں ستار بجاتا جس کی میٹھی آواز سن کر آس پاس کے دکاندار اپنی دکانوں سے اُٹھ اُٹھ کر آجاتے اور دیر تک بُت بنے ستار سنتے رہتے۔ اس ستار نواز کا ایک شاگرد تھا جو ریلوے کے دفتر میں کلرک تھا۔ اسے ستار سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جیسے ہی دفتر سے چُھٹی ہوتی سیدھا سائیکل اڑاتا ہوا اس بستی کا رخ کرتا اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دکان ہی میں بیٹھ کر مشق کیا کرتا۔ غرض اس ستار نواز کے دَم سے بستی میں خاصی رونق رہنے لگی۔

مسجد کے ملاجی، جب تک تو یہ بستی زیر تعمیر رہی، رات کو دیہات میں اپنے گھر چلے جاتے رہے۔ مگر اب جب انھیں دونوں وقت مرغن کھانا بافراط پہنچنے لگا تو وہ رات کو بھی یہیں رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ بعض بیسواؤں کے گھروں سے بچے بھی مسجد میں آنے لگے جس سے ملاجی کو روپے پیسے کی آمدنی بھی ہونے لگی۔

ایک شہر شہر گھومنے والی گھٹیا درجہ کی تھیٹریکل کمپنی کو جب زمین کے چڑھے ہوئے کرائے اور اپنی بے مائگی کے باعث شہر میں کہیں جگہ نہ ملی تو اس نے اس بستی کا رخ کیا اور ان بیسواؤں کے مکانوں سے کچھ فاصلہ پر میدان میں تنبو کھڑے کر کے ڈیرے ڈال دیئے۔ اس کے ایکٹر اداکاری کے فن سے محض نابلد تھے۔ ان کے ڈریس پھٹے پرانے تھے جن کے بہت سے ستارے جھڑ چکے تھے اور یہ لوگ تماشے بھی بہت دقیانوسی دکھاتے تھے مگر اس کے باوجود

یہ کمپنی چل نکلی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹکٹ کے دام بہت کم تھے۔ شہر کے مزدوری پیشہ لوگ، کارخانوں میں کام کرنے والے اور غریب غربا جو دن بھر کی کڑی محنت ومشقت کی کسر شور وغل، خرمستیوں اور ادنیٰ عیاشیوں سے نکالنا چاہتے تھے۔ پانچ پانچ چھ چھ کی ٹولیاں بنا کر، گلے میں پھولوں کا ہار ڈالے، ہنستے بولتے، بانسریاں اور الغوزے بجاتے، راہ چلتوں پر آوازے کستے، گالی گلوچ کرتے، شہر سے پیدل چل کر تھیٹر دیکھنے آتے اور لگے ہاتھوں بازارِ حسن کی سیر بھی کر جاتے۔ جب تک ناٹک شروع نہ ہوتا تھیٹر کا ایک مسخرہ تنبو کے باہر ایک اسٹول پر کبھی کولہا ہلاتا، کبھی منہ پھلاتا، کبھی آنکھیں مٹکاتا، عجیب عجیب حیاسوز حرکتیں کرتا جنھیں دیکھ کر یہ لوگ زور زور سے قہقہے لگاتے اور گالیوں کی صورت میں داد دیتے۔

رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی اس بستی میں آنے شروع ہوئے۔ چنانچہ شہر کے بڑے بڑے چوکوں میں تانگے والے صدائیں لگانے لگے: "آؤ کوئی نئی بستی کو۔" شہر سے پانچ کوس تک جو پکی سڑک جاتی تھی اس پر پہنچ کر تانگے والے سواریوں سے انعام حاصل کرنے کے لالچ میں یا ان کی فرمائش پر تانگوں کی دوڑیں کراتے، منہ سے ہارن بجاتے، اور جب کوئی تانگہ آگے نکل جاتا تو اس کی سواریاں نعروں سے آسمان سر پر اُٹھا لیتیں۔ اس دوڑ میں غریب گھوڑوں کا بُرا حال ہو جاتا اور ان کے گلے میں پڑے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے بجائے خوشبو کے پسینے کی بُو آنے لگتی۔

رکشا والے تانگے والوں سے کیوں پیچھے رہتے۔ وہ ان سے کم دام پر سواریاں بٹھا، طرارے بھرتے اور گھنگرو بجاتے اس بستی کو جانے لگے۔ علاوہ ازیں ہر ہفتے کی شام کو اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ ایک ایک سائیکل پر دو دو لدے، جوق جوق اس پُر اسرار بازار کی سیر دیکھنے آتے جس سے ان کے خیال کے مطابق ان کے بڑوں نے خواہ مخواہ انھیں محروم کر دیا تھا۔

رفتہ رفتہ اس بستی کی شہرت چاروں طرف پھیلنے اور مکانوں اور دکانوں کی مانگ

ہونے لگی۔ وہ بیسوائیں جو پہلے اس بستی میں آنے کو تیار نہ ہوتی تھیں اب اس کی یہ دن دونی رات چوگنی ترقی دیکھ کر اپنی بیوقوفی پر افسوس کرنے لگیں۔ کئی عورتوں نے تو جھٹ زمینیں خرید ان بیسواؤں کے ساتھ اسی وضع قطع کے مکان بنوانے شروع کر دیئے۔ علاوہ ازیں شہر کے بعض مہاجنوں نے بھی اس بستی کے آس پاس سستے داموں زمینیں خرید خرید کر کرایہ پر اُٹھانے کے لیے چھوٹے چھوٹے کئی مکان بنواڈالے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فاحشہ عورتیں جو ہوٹلوں اور شریف محلّوں میں روپوش تھیں، مور و ملخ کی طرح اپنے نہاں خانوں سے باہر نکل آئیں اور ان مکانوں میں آباد ہو گئیں بعض چھوٹے چھوٹے مکانوں میں اس بستی کے وہ دکاندار آبسے جو عیال دار تھے اور رات کو دکانوں میں سو نہ سکتے تھے۔

اس بستی میں آبادی تو خاصی ہو گئی تھی مگر ابھی تک بجلی کی روشنی کا انتظام نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ ان بیسواؤں اور بستی کے تمام رہنے والوں کی طرف سے سرکار کے پاس بجلی کے لیے درخواست بھیجی گئی جو تھوڑے دنوں بعد منظور کر لی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ڈاک خانہ بھی کھلوادیا گیا۔ ایک بڑے میاں ڈاک خانے کے باہر ایک صندوقچے میں لفافے، کارڈ، قلم، دوات رکھ بستی کے لوگوں کے خط پتر لکھنے لگے۔

ایک دفعہ بستی میں شرابیوں کی دو ٹولیوں میں فساد ہو گیا جس میں سوڈاواٹر کی بوتلوں، چاقوؤں اور اینٹوں کا آزادانہ استعمال کیا گیا اور کئی لوگ سخت مجروح ہوئے۔ اس پر سرکار کو خیال آیا کہ اس بستی میں ایک تھانہ بھی کھول دینا چاہیے۔

تھیٹریکل کمپنی دو مہینے تک رہی اور اپنی بساط کے مطابق خاصا کما لے گئی، اس پر شہر کے ایک سینما کے مالک نے سوچا کہ کیوں نہ اس بستی میں بھی ایک سینما کھول دیا جائے۔ یہ خیال آنے کی دیر تھی کہ اس نے جھٹ ایک موقع کی جگہ چُن کر خرید لی اور جلد جلد تعمیر کا کام شروع کرادیا۔ چند ہی مہینوں میں سینما ہال تیار ہو گیا۔ اس کے اندر ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی لگوایا گیا تاکہ تماشائی اگر بائیسکوپ شروع ہونے سے پہلے آجائیں تو آرام سے باغیچہ میں بیٹھ

سکیں۔ ان کے ساتھ بستی کے لوگ یونہی ستانے یا سیر دیکھنے کی غرض سے آ آ کر بیٹھنے لگے۔ یہ باغیچہ خاصی سیرگاہ بن گیا۔ رفتہ رفتہ سقے کٹورا بجاتے اس باغیچے میں آنے اور پیاسوں کی پیاس بجھانے لگے۔ سر کی تیل مالش والے نہایت گھٹیا قسم کے تیز خوشبو والے تیل کی شیشیاں واسکٹ کی جیبوں میں ٹھونسے، کاندھوں پر میلا کچیلا تولیا ڈالے، دل پسند دل بہار مالش کی صدا لگاتے دردِ سر کے مریضوں کو اپنی خدمات پیش کرنے لگے۔

سینما کے مالک نے سینما ہال کی عمارت کی بیرونی جانب دو ایک مکان اور کئی دکانیں بھی بنوائیں۔ مکان میں تو ہوٹل کھل گیا جس میں رات کو قیام کرنے کے لیے کمرے بھی مل سکتے تھے اور دکانوں میں ایک سوڈا واٹر کی فیکٹری والا، ایک فوٹو گرافر، ایک سائیکل کی مرمت والا، ایک لانڈری والا، دو پنواڑی، ایک بوٹ شاپ والا اور ایک ڈاکٹر مع اپنے دواخانہ کے آ رہے۔ ہوتے ہوتے پاس ہی ایک دکان میں کلال خانہ کھلنے کی اجازت مل گئی۔ فوٹو گرافر کی دکان کے باہر ایک کونے میں ایک گھڑی ساز نے آ ڈیرا جمایا اور ہر وقت محدب شیشہ آنکھ پر چڑھائے گھڑیوں کے کل پُرزوں میں غلطاں و پیچاں رہنے لگا۔

اس کے کچھ ہی دن بعد بستی میں نل، روشنی اور صفائی کے باقاعدہ انتظام کی طرف توجہ کی جانے لگی۔ سرکاری کارندے سرخ جھنڈیاں، جریبیں اور اونچ نیچ دیکھنے والے آلے لے کر آ پہنچے اور ناپ ناپ کر سڑکوں اور گلی کوچوں کی داغ بیل ڈالنے لگے اور بستی کی کچی سڑکوں پر سڑک کوٹنے والا انجن چلنے لگا......

اس واقعے کو بیس برس گزر چکے ہیں۔ یہ بستی اب ایک بھلا پُرا شہر بن گئی ہے جس کا اپنا ریلوے اسٹیشن بھی ہے اور ٹاؤن ہال بھی، کچہری بھی اور جیل خانہ بھی۔ آبادی ڈھائی لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ شہر میں ایک کالج، دو ہائی اسکول، ایک لڑکوں کے لیے، ایک لڑکیوں کے لیے اور آٹھ پرائمری اسکول ہیں جن میں میونسپلٹی کی طرف سے مفت تعلیم دی جاتی ہے چھ سینما ہیں اور چار بنک جن میں سے دو دنیا کے بڑے بڑے بنکوں کی شاخیں ہیں۔

شہر سے دو روزنامہ، تین ہفتہ وار اور دس ماہانہ رسائل و جرائد شائع ہوتے ہیں ان میں چار ادبی و معاشرتی و مذہبی، ایک صنعتی، ایک طبّی، ایک زنانہ اور ایک بچوں کا رسالہ ہے۔ شہر کے مختلف حصوں میں بیس مسجدیں، پندرہ مندر اور دھرم شالے، چھ یتیم خانے، پانچ اناتھ آشرم اور تین بڑے سرکاری ہسپتال ہیں جن میں ایک صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہے۔

شروع شروع میں کئی سال تک یہ شہر اپنے رہنے والوں کی مُناسبت سے ''حُسن آباد'' کے نام سے موسوم کیا جاتا رہا، مگر بعد میں اسے نامناسب سمجھ کر اس میں تھوڑی سی ترمیم کر دی گئی یعنی بجائے ''حُسن آباد'' ''حَسن آباد'' کہلانے لگا مگر یہ نام چل نہ سکا، کیونکہ عوام حَسن اور حُسن میں کچھ امتیاز نہ کرتے۔ آخر بڑی بڑی بوسیدہ کتابوں کی ورق گردانی اور پرانے نوشتوں کی چھان بین کے بعد اس کا اصلی نام دریافت کیا گیا جس سے یہ بستی آج سے سینکڑوں برس قبل اجڑنے سے پہلے موسوم تھی اور وہ نام ہے ''آنندی!''

یوں تو سارا شہر بھرا پُرا، صاف ستھرا اور خوشنما ہے مگر سب سے خوبصورت، سب سے بارونق اور تجارت کا سب سے بڑا مرکز وہی بازار ہے جس میں زنانِ بازاری رہتی ہیں۔

اوور کوٹ

جنوری کی ایک شام کو ایک خوش پوش نوجوان ڈیوس روڈ سے گزر کر مال روڈ پر پہنچا اور چیرنگ کراس کا رخ کر کے خراماں خراماں پٹری پر چلنے لگا۔ یہ نوجوان اپنی تراش خراش سے خاصا فیشن ایبل معلوم ہوتا تھا۔ لمبی لمبی قلمیں، چمکتے ہوئے بال، باریک باریک مونچھیں گویا سُرمے کی سلائی سے بنائی گئی ہوں۔ بادامی رنگ کا گرم اوور کوٹ پہنے ہوئے جس کے کاج میں شربتی رنگ کے گلاب کا اَدھ کھِلا پھول اٹکا ہوا۔ سر پر سبز فیلٹ ہیٹ ایک خاص انداز سے ٹیڑھی رکھی ہوئی، سفید سلک کا گلوبند گلے کے گرد لپٹا ہوا، ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں دوسرے میں بید کی ایک چھوٹی چھڑی پکڑے ہوئے جسے کبھی کبھی وہ مزے میں آ کے گھمانے لگتا تھا۔

یہ ہفتے کی شام تھی۔ بھرپور جاڑے کا زمانہ۔ سرد اور تند ہوا کسی تیز دھات کی طرح جسم پر آآ کے لگتی تھی مگر اس نوجوان پر اس کا کچھ اثر نہیں معلوم ہوتا تھا، اور لوگ تو خود کو گرم کرنے کے لیے تیز تیز قدم اٹھا رہے تھے مگر اسے اس کی ضرورت نہ تھی جیسے اس کڑکڑاتے جاڑے میں اسے ٹہلنے میں بڑا مزہ آ رہا ہو۔

اس کی چال ڈھال سے ایسا بانکپن ٹپکتا تھا کہ تانگے والے دور ہی سے دیکھ کر سرپٹ گھوڑا دوڑاتے ہوئے اس کی طرف لپکتے مگر وہ چھڑی کے اشارے سے نہیں کر دیتا۔ ایک

خالی ٹیکسی بھی اسے دیکھ کر رکی مگر اس نے ”نو تھینک یو“ کہہ کر اسے بھی ٹال دیا۔

جیسے جیسے وہ مال کے زیادہ بارونق حصے کی طرف پہنچتا جاتا تھا، اس کی چونچالی بڑھتی ہی جاتی تھی۔ وہ منہ سے سیٹی بجا کر رقص کی ایک انگریزی دُھن نکالنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے پاؤں بھی تھرکتے ہوئے اٹھنے لگے، ایک دفعہ جب آس پاس کوئی نہیں تھا تو یکبارگی کچھ ایسا جوش آیا کہ اس نے دوڑ کر جھوٹ موٹ بال دینے کی کوشش کی، گویا کرکٹ کا کھیل ہو رہا ہو۔

راستے میں وہ سڑک آئی جو لارنس گارڈن کی طرف جاتی تھی، مگر اس وقت شام کے دُھندلکے اور سخت کہرے میں اس باغ پر کچھ ایسی اداسی برس رہی تھی کہ اس نے ادھر کا رخ نہ کیا اور سیدھا چیئرنگ کراس کی طرف چلتا رہا۔

ملکہ کے بت کے قریب پہنچ کر اس کی حرکات و سکنات میں کسی قدر متانت پیدا ہو گئی۔ اس نے اپنا رومال نکالا، جسے جیب میں رکھنے کے بجائے اس نے کوٹ کی بائیں آستین میں اڑس رکھا تھا اور ہلکے ہلکے چہرے پر پھیرا، تاکہ کچھ گرد جم گئی ہو تو اتر جائے۔ بت کے آس پاس لان کے ایک گوشے میں کچھ انگریز بچے ایک بڑی سی گیند سے کھیل رہے تھے، وہ رک گیا اور بڑی دلچسپی سے ان کا کھیل دیکھنے لگا۔ بچے کچھ دیر تو اس کی نظروں سے بے پروا کھیل میں مصروف رہے۔ مگر جب وہ تکے ہی چلا گیا تو وہ رفتہ رفتہ شرمانے سے لگے اور پھر گیند سنبھال ہنستے ہوئے اور ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے دہ گھاس کے اس ٹکڑے ہی سے چلے گئے۔

نوجوان کی نظر سیمنٹ کی ایک خالی بنچ پر پڑی اور وہ اس پر آ کے بیٹھ گیا۔ اس وقت شام کے اندھیرے کے ساتھ ساتھ سردی اور بھی بڑھتی جا رہی تھی، اس کی یہ شدت ناخوشگوار نہ تھی بلکہ لذت پرستی کی ترغیب دیتی تھی۔ شہر کے عیش پسند طبقے کا تو کہنا ہی کیا، وہ تو اس بہانے کچھ زیادہ ہی کھل کھیلتا ہے۔ تنہائی میں بسر کرنے والے بھی اس سے

ور غلائے جاتے ہیں اور وہ اپنے اپنے کونوں کھدروں سے نکل محفلوں اور مجمعوں میں جانے کی سوچنے لگتے ہیں تاکہ جسموں کے قُرب سے گرمی حاصل ہو۔ حصولِ لذت کی یہی جستجو لوگوں کو مال پر کھینچ لائی تھی اور وہ حسبِ توفیق ریستورانوں، کافی ہاؤسوں، رقص گاہوں، سینماؤں اور تفریح کے دوسرے مقاموں پر محظوظ ہو رہے تھے۔

مال روڈ پر موٹروں، تانگوں اور بائیسکلوں کا تانتا بندھا ہوا تو تھا ہی، پٹری پر چلنے والوں کی بھی کثرت تھی، علاوہ ازیں سڑک کی دو رَویہ دکانوں میں خرید و فروخت کا بازار بھی گرم تھا۔ جن کم نصیبوں کو نہ تفریحِ طبع کی استطاعت تھی نہ خرید و فروخت کی، وہ دور ہی سے کھڑے کھڑے ان تفریح گاہوں اور دکانوں کی رنگارنگ روشنیوں سے جی بہلا رہے تھے۔

نوجوان سیمنٹ کی بینچ پر بیٹھا اپنے سامنے سے گزرتے ہوئے زن و مرد کو غور سے دیکھ رہا تھا، اس کی نظر اُن کے چہروں سے کہیں زیادہ ان کے لباس پر پڑتی تھی، ان میں ہر وضع اور ہر قماش کے لوگ تھے، بڑے بڑے تاجر، سرکاری افسر، لیڈر، فنکار، کالجوں کے طلبا اور طالبات، نرسیں، اخباروں کے نمائندے، دفتروں کے بابو، زیادہ تر لوگ اوورکوٹ پہنے ہوئے تھے، ہر قسم کے اوورکوٹ، قراقلی کے بیش قیمت اوورکوٹ سے لے کر خاکی پٹی کے پرانے فوجی اوورکوٹ تک جسے نیلام میں خریدا گیا تھا۔

نوجوان کا اپنا کوٹ تھا تو خاصا پرانا مگر اس کا کپڑا خوب بڑھیا تھا، پھر وہ سلا ہوا بھی کسی ماہر درزی کا تھا۔ اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی بہت دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ کالر خوب جما ہوا تھا۔ باہوں کی کریز بڑی نمایاں، سلوٹ کہیں نام کو نہیں۔ بٹن سینگ کے بڑے بڑے چمکتے ہوئے۔ نوجوان اس میں بہت مگن معلوم ہوتا تھا۔

ایک لڑکا پان بیڑی سگریٹ کا صندوقچہ گلے میں ڈالے سامنے سے گزرا۔ نوجوان نے آواز دی۔

"پان والا!"

"جناب!"

"وس کا چینج ہے؟"

"ہے تو نہیں۔ لادوں گا۔ کیا لیں گے آپ؟"

"نوٹ لے کے بھاگ گیا تو؟"

"اجی واہ۔ کوئی چور اُچکا ہوں جو بھاگ جاؤں گا۔ اعتبار نہ ہو تو میرے ساتھ چلیے۔ لیں گے کیا آپ؟"

"نہیں نہیں۔ ہم خود چینج لائے گا۔ لو یہ اکنی نکل آئی۔ ایک سگریٹ دے دو اور چلے جاؤ۔"

لڑکے کے جانے کے بعد مزے مزے سے سگریٹ کے کش لگانے لگا۔ وہ ویسے ہی بہت خوش نظر آتا تھا۔ سگریٹ کے دھوئیں نے اس پر سُرور کی کیفیت طاری کر دی۔

ایک چھوٹی سی سفید رنگ بلی سردی میں ٹھٹھری ہوئی بنچ کے نیچے اس کے قدموں کے پاس آ کر میاؤں میاؤں کرنے لگی۔ اس نے پچکارا تو اچھل کر بینچ پر آ چڑھی۔ اس نے پیار سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور کہا!

"پور لٹل سول!"

اس کے بعد وہ بنچ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور سڑک کو پار کر کے اس طرف چلا جدھر سینما کی رنگ برنگی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ تماشا شروع ہو چکا تھا۔ برآمدے میں بھیڑ نہ تھی، صرف چند لوگ تھے جو آنے والی فلموں کی تصویروں کا جائزہ لے رہے تھے۔ یہ تصویریں چھوٹے بڑے کئی بورڈوں پر چسپاں تھیں۔ ان میں کہانی کے چیدہ چیدہ مناظر دکھائے گئے تھے۔

تین نوجوان اینگلو انڈین لڑکیاں ان تصویروں کو ذوق و شوق سے دیکھ رہی تھیں ایک خاص شان استغناء کے ساتھ مگر صنفِ نازک کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے وہ بھی ان کے ساتھ ساتھ مگر مناسب فاصلے سے ان تصویریوں کو دیکھتا رہا۔ لڑکیاں آپس میں ہنسی

مذاق کی باتیں بھی کرتی جاتی تھیں اور فلم پر رائے زنی بھی، اتنے میں ایک لڑکی نے، جو اپنی ساتھ والیوں سے زیادہ حسین بھی تھی اور شوخ بھی ہو دوسری لڑکی کے کان میں کچھ کہا، جسے سن کر اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ اور پھر وہ تینوں ہنستی ہوئی باہر نکل گئیں۔ نوجوان نے اس کا کچھ اثر قبول نہ کیا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ خود بھی سینما کی عمارت سے باہر نکل آیا۔

اب سات بج چکے تھے اور وہ مال کی پٹری پر پھر پہلے کی طرح مٹر گشت کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ایک ریستوران میں آرکسٹرا بج رہا تھا۔ اندر سے کہیں زیادہ باہر لوگوں کا ہجوم تھا ان میں زیادہ تر موٹروں کے ڈرائیور، کوچوان، پھل بیچنے والے، جو اپنا مال بیچ کے خالی ٹوکرے لیے کھڑے تھے۔ کچھ راہ گیر جو چلتے چلتے ٹھہر گئے تھے۔ کچھ مزدوری پیشہ لوگ تھے اور کچھ گداگر۔ یہ اندر والوں سے کہیں زیادہ گانے کے رسیا معلوم ہوتے تھے کیونکہ وہ غل غپاڑہ نہیں مچا رہے تھے بلکہ خاموشی سے نغمہ سن رہے تھے حالانکہ دُھن اور ساز اجنبی تھے۔ نوجوان پل بھر کے لیے رکا اور پھر آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی دور چل کے اسے انگریزی موسیقی کی ایک بڑی سی دکان نظر آئی اور وہ بلا تکلف اندر چلا گیا۔ ہر طرف شیشے کی الماریوں میں طرح طرح کے انگریزی ساز رکھے ہوئے تھے۔ ایک لمبی میز پر مغربی موسیقی کی دو ورقی کتابیں چنی تھیں۔ یہ نئے چلنتر گانے تھے۔ سرورق خوبصورت رنگدار مگر دُھنیں گھٹیا۔ ایک جھلکتی ہوئی نظر ان پر ڈالی، پھر وہاں سے ہٹ آیا اور سازوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ایک ہسپانوی گٹار پر جو ایک کھونٹی سے ٹنگی ہوئی تھی، ناقدانہ نظر ڈالی اور اس کے ساتھ قیمت کا جو ٹکٹ لٹک رہا تھا اسے پڑھا۔ اس سے ذرا ہٹ کر ایک بڑا جرمن پیانو رکھا ہوا تھا، اس کا کور اٹھا کے انگلیوں سے بعض پردوں کو ٹٹولا اور پھر کور بند کر دیا۔

پیانو کی آواز سن کر دکان کا ایک کارندہ اس کی طرف بڑھا۔

"گڈ ایوننگ سر۔ کوئی خدمت؟"

"نہیں شکریہ۔ہاں گراموفون ریکارڈوں کی فہرست دے دو اس مہینے کی۔"

فہرست لے کے اودرکوٹ کی جیب میں ڈالی۔ دکان سے باہر نکل آیا، اور پھر چلنا شروع کردیا۔راستے میں ایک چھوٹا سا بک اسٹال آیا۔نوجوان یہاں بھی رکا۔ کئی تازہ رسالوں کے ورق الٹے۔ رسالہ جہاں سے اٹھاتا بڑی احتیاط سے وہیں رکھ دیتا۔ اور آگے بڑھا تو قالینوں کی ایک دکان نے اس کی توجہ کو جذب کیا۔مالک دکان نے جو ایک لمبا سا چغہ پہنے اور سر پر کلاہ رکھے تھا، گرم جوشی سے اس کی آؤ بھگت کی۔

"ذرا یہ ایرانی قالین دیکھنا چاہتا ہوں۔ اتاریئے نہیں، یہیں دیکھ لوں گا۔ کیا قیمت ہے اس کی؟"

"چودہ سو بتیس روپے!"

نوجوان نے اپنی بھنوؤں کو سکیڑا جس کا مطلب تھا"اوہو اتنی!"

دکاندار نے کہا"آپ پسند کرلیجئے۔ہم جتنی بھی رعایت کرسکتے ہیں کردیں گے۔"

"شکریہ!لیکن اس وقت تو میں صرف ایک نظر دیکھنے آیا ہوں۔"

"شوق سے دیکھئے، آپ ہی کی دکان ہے۔"

دو تین منٹ کے بعد اس دکان سے بھی نکل آیا۔اس کے اوورکوٹ کے کاج میں شربتی رنگ کے گلاب کا جو ادھ کھلا پھول اٹکا ہوا تھا۔وہ اس وقت کاج سے کچھ زیادہ باہر نکل آیا تھا۔ جب وہ اس کو ٹھیک کررہا تھا تو اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف اور پُر اسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے پھر اپنی مٹرگشت شروع کردی۔

اب وہ ہائی کورٹ کی عمارتوں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔اتنا کچھ چل لینے کے بعد بھی اس کی فطری چونچالی میں کوئی فرق نہیں آیا، نہ تکان محسوس ہوئی تھی نہ اکتاہٹ۔ یہاں پٹڑی پر چلنے والوں کی ٹولیاں کچھ چھٹ سی گئیں تھیں اور ان میں کافی فصل رہنے لگا تھا۔اس نے اپنی بید کی چھڑی کو ایک انگلی پر گھمانے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی اور چھڑی زمین

پر گر پڑی "او سوری" کہہ کر زمین پر جھکا اور چھڑی کو اٹھالیا۔

اس اثنا میں ایک نوجوان جوڑا جو اس کے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا اس کے پاس سے گزر کر آگے نکل آیا۔ لڑکا دراز قامت تھا اور سیاہ کوڈرائے کی پتلون اور زِپ والی چمڑے کی جیکٹ پہنے تھا اور لڑکی سفید ساٹن کی گھیر دار شلوار اور سبز رنگ کا کوٹ۔ وہ بھاری بھر کم سی تھی۔ اس کے بالوں میں ایک لمبا سا سیاہ چٹلا گندھا ہوا تھا، جو اس کی کمر سے بھی نیچا تھا۔ لڑکی کے چلنے سے اس چٹلے کا پھندنا اُچھلتا کودتا پے در پے اس کے فربہ جسم سے ٹکراتا تھا۔ نوجوان کے لیے جو اَب ان کے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ یہ نظارہ خاصا جاذبِ نظر تھا۔ وہ جوڑا کچھ دیر تک تو خاموش چلتا رہا۔ اس کے بعد لڑکے نے کچھ کہا۔ جس کے جواب میں لڑکی اچانک چمک کر بولی:

"ہر گز نہیں۔ ہر گز نہیں۔ ہر گز نہیں۔"

"سنو میرا کہنا مانو۔" لڑکے نے نصیحت کے انداز میں کہا۔ "ڈاکٹر میرا دوست ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔"

"نہیں، نہیں، نہیں۔"

"میں کہتا ہوں تمہیں ذرا تکلیف نہ ہو گی۔"

لڑکی نے کچھ جواب نہ دیا۔

"تمہارے ماں باپ کو کتنا رنج ہو گا۔ ذرا ان کی عزت کا بھی تو خیال کرو۔"

"چپ رہو ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔"

نوجوان نے شام سے اب تک اپنی مٹرگشت کے دوران میں جتنی انسانی شکلیں دیکھی تھیں، ان میں سے کسی نے بھی اس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف نہیں کیا تھا، فی الحقیقت ان میں کوئی جاذبیت تھی ہی نہیں یا پھر وہ اپنے حال میں ایسا مست تھا کہ کسی دوسرے سے اسے سروکار ہی نہ تھا۔ مگر اس دلچسپ جوڑے نے، جس میں کسی افسانے کے کرداروں کی سی ادا

تھی، جیسے یکبارگی اس کے دل کو موہ لیا تھا اور اسے حد درجہ مشتاق بنادیا کہ وہ ان کی اور بھی باتیں سنے اور ہو سکے تو قریب سے ان کی شکلیں بھی دیکھ لے۔

اس وقت وہ تینوں بڑے ڈاک خانے کے چوراہے کے پاس پہنچ گئے تھے۔ لڑکا اور لڑکی پَل بھر کو رُکے اور پھر سڑک پار کر کے میکلوڈ روڈ پر چل پڑے۔ نوجوان، مال روڈ پر ہی ٹھہر ارہا۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ فی الفوران کے پیچھے گیا تو ممکن ہے انہیں شبہ ہو جائے کہ ان کا تعاقب کیا جارہا ہے، اس لیے اسے کچھ لمحے رک جانا چاہیے۔

جب وہ لوگ کوئی سو گز آگے نکل گئے تو اس نے لپک کر ان کا پیچھا کرنا چاہا مگر ابھی اس نے آدھی سڑک ہی پار کی ہوگی کہ اینٹوں سے بھری ہوئی ایک لاری پیچھے سے بگولے کی طرح آئی اور اسے کچلتی ہوئی میکلوڈ روڈ کی طرف نکل گئی۔ لاری کے ڈرائیور نے نوجوان کی چیخ سن کر پَل بھر کے لیے گاڑی کی رفتار کم کی۔ پھر وہ سمجھ گیا کہ کوئی لاری کی لپیٹ میں آگیا اور وہ رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لاری کو لے بھاگا دو تین راہ گیر جو اس حادثے کو دیکھ رہے تھے شور مچانے لگے کہ نمبر دیکھو نمبر دیکھو مگر لاری ہوا ہو چکی تھی۔

اتنے میں کئی اور لوگ جمع ہو گئے۔ ٹریفک کا انسپکٹر جو موٹر سائیکل پر جارہا تھا رک گیا، نوجوان کی دونوں ٹانگیں بالکل کچلی گئی تھیں۔ بہت سا خون نکل چکا تھا اور وہ سسک رہا تھا۔

فوراً ایک کار کو روکا گیا اور اسے جیسے تیسے اس میں ڈال کے بڑے ہسپتال روانہ کر دیا گیا۔ جس وقت وہ ہسپتال پہنچا تو اس میں ابھی رمق بھر جان باقی تھی۔

اس ہسپتال کے شعبۂ حادثات میں اسسٹنٹ سرجن مسٹر خان اور دو نوعمر نرسیں مس شہناز اور مس گل ڈیوٹی پر تھیں۔ جس وقت اسے اسٹریچر پر ڈال کے آپریشن روم میں لے جایا جارہا تھا تو ان نرسوں کی نظر اس پر پڑی۔ اس کا بادامی رنگ کا اوورکوٹ ابھی تک اس کے جسم پر تھا اور سفید سلک کا مفلر گلے میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کے کپڑوں پر جا بجا خون کے بڑے

بڑے دھبے تھے۔ کسی نے ازراہِ دردمندی اس کی سبز فیلٹ ہیٹ اٹھا کے اس کے سینہ پر رکھ دی تھی تاکہ کوئی اُڑا نہ لے جائے۔

شہناز نے گل سے کہا:

"کسی بھلے گھر کا معلوم ہوتا ہے بے چارہ۔"

گل دبی آواز میں بولی:

"خوب بن ٹھن کے نکلا تھا بے چارہ، ہفتے کی شام منانے۔"

"ڈرائیور پکڑا گیا یا نہیں؟"

"نہیں، بھاگ گیا۔"

"کتنے افسوس کی بات ہے۔"

آپریشن روم میں اسسٹنٹ سرجن اور نرسیں چہروں پر جراحی کے نقاب چڑھائے جنہوں نے ان کی آنکھوں سے نیچے کا سارا حصہ چھپا رکھا تھا، اس کی دیکھ بھال میں مصروف تھے، اسے سنگ مرمر کی میز پر لٹا دیا گیا۔ اس نے سر میں جو تیز خوشبودار تیل ڈال رکھا تھا اس کی کچھ کچھ مہک ابھی تک باقی تھی، پٹیاں ابھی تک جمی ہوئی تھیں، حادثے سے اس کی دونوں ٹانگیں تو ٹوٹ چکی تھیں مگر سر کی مانگ نہیں بگڑنے پائی تھی۔

اب اس کے کپڑے اُتارے جا رہے تھے۔ سب سے پہلے سفید سلک کا گلوبند اس کے گلے سے اُتارا گیا۔ اچانک نرس شہناز اور نرس گل نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا سکتی تھیں، چہرے جو دلی کیفیات کا آئینہ ہوتے ہیں، جراحی کے نقاب تلے چھپے ہوئے تھے اور زبانیں بند۔

نوجوان کے گلوبند کے نیچے نکٹائی اور کالر کیا سرے سے قمیص ہی نہیں تھی۔

اوورکوٹ اتارا گیا تو نیچے سے ایک بہت بوسیدہ اونی سویٹر نکلا جس میں جا بجا بڑے بڑے سوراخ تھے۔ ان سوراخوں سے سویٹر سے بھی زیادہ بوسیدہ اور میلا کچیلا ایک بنیان نظر

آرہا تھا۔ نوجوان سلک کے گلوبند کو کچھ اس ڈھب سے گلے سے لپیٹے رکھتا تھا کہ اس کا سارا سینہ چھپا رہتا تھا۔ اس کے جسم پر میل کی تہیں بھی خوب چڑھی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کم سے کم پچھلے دو مہینے سے نہیں نہایا، البتہ گردن خوب صاف تھی اور اس پر ہلکا ہلکا پوڈر ہوا تھا، سوئٹر اور بنیان کے بعد پتلون کی باری آئی اور شہناز اور گل کی نظریں پھر بیک وقت اُٹھیں۔

پتلون کو پیٹی کے بجائے ایک پرانی وجّی سے جو شاید کبھی نکٹائی رہی ہوگی، خوب کس کے باندھا گیا تھا۔ بٹن اور بکسوئے غائب تھے، دونوں گھٹنوں پر سے کپڑا مسک گیا تھا اور کئی جگہ کھونچیں لگی تھیں، مگر چونکہ یہ حصے اوورکوٹ کے نیچے رہتے تھے اس لیے لوگوں کی ان پر نظر نہیں پڑتی تھی۔

اب بوٹ اور جرابوں کی باری آئی اور ایک مرتبہ پھر مس شہناز اور مس گل کی آنکھیں چار ہوئیں۔

بوٹ تو پرانے ہونے کے باوجود خوب چمک رہے تھے، مگر ایک پاؤں کی جراب دوسرے پاؤں کی جراب سے بالکل مختلف تھی۔ پھر دونوں جرابیں پھٹی ہوئی بھی تھیں اس قدر کہ ان میں سے نوجوان کی میلی میلی ایڑیاں نظر آرہی تھیں۔

بلا شبہ اس وقت تک وہ دَم توڑ چکا تھا۔ اس کا جسم سنگ مرمر کی میز پر بے جان پڑا تھا۔ اس کا چہرہ جو پہلے چھت کی سمت تھا، کپڑے اتارنے میں دیوار کی طرف مڑ گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جسم اور اس کے ساتھ روح کی اس برہنگی نے اسے خجل کردیا ہے۔ اور وہ اپنے ہم جنسوں سے آنکھیں چرا رہا تھا۔

اس کے اوورکوٹ کی مختلف جیبوں سے جو چیزیں برآمد ہوئیں، وہ یہ تھیں:

ایک چھوٹی سی سیاہ کنگھی۔ ایک رومال۔ ساڑھے چھ آنے، ایک بجھا ہوا آدھا سگریٹ، ایک چھوٹی سی ڈائری جس میں لوگوں کے نام اور پتے لکھے تھے، نئے گراموفون

ریکارڈروں کی ایک ماہانہ فہرست اور کچھ اشتہار جو سیر گشت کے دوران اشتہار بانٹنے والوں نے اس کے ہاتھ میں تھما دیے تھے اور اس نے انہیں اوورکوٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا۔

افسوس کہ اس کی بید کی چھڑی جو حادثے کے دوران میں کہیں کھو گئی تھی، اس فہرست میں شامل نہ تھی۔

اس کی بیوی

وہ دونوں تیسری منزل کے ایک کمرے میں تھے۔ یہ چھوٹا سا کمرہ اپنی ہلکی نیلی روشنی کے ساتھ باہر سے یوں دکھائی دیتا گویا ٹرین کا کوئی ٹھنڈا ڈبہ ہے جس طرح ریلوے والے گرمی کے موسم میں ”فردوسِ سیمیں“ یا ”خواب سیمیں“ وغیرہ شاعرانہ نام رکھ کر بعض خاص گاڑیوں میں جوڑ دیتے ہیں۔

بارشوں کا زمانہ قریب قریب ختم ہو چکا تھا۔ مکانوں میں بسنے والی مخلوق نے پسینے بدبو اور گھٹن سے نجات پائی تھی۔ فضا میں خصوصاً رات کے وقت خنکی ہونے لگی تھی۔ ہاں جب کوئی بڑا سا کالے رنگ کا پتنگا اپنی تیز بھنبھناہٹ کے ساتھ اندھا دھند کسی برقی قمقمے کے چکر کاٹنے لگتا تو ظاہر ہو جاتا کہ برکھا رت ابھی گئی نہیں۔

”نجمہ بھی ٹھیک اسی طرح سیدھی مانگ نکالا کرتی۔“ نوجوان نے کہا۔ ”مگر کبھی کبھی وہ گدی تک مانگ لے جاتی...... یہ طریقہ اس نے ایک بنگالن سے سیکھا تھا۔“

نسرین چپ رہی۔ نظریں فرشی سنگھار میز کے آئینے پر جمائے جس میں اسے اپنا دھندلا دھندلا نیلگوں عکس دکھائی دے رہا تھا، وہ بالوں میں کنگھی کرتی رہی جیسا کہ سونے سے پہلے بعض عورتوں کی عادت ہوتی ہے۔

نوجوان اس کے پاس ہی چاندنی پر کہنیوں کے بل اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ یوں لیٹنے سے اس

کی سفید سلک کی قمیص اور خاکی زین کی پتلون میں جا بجا سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔ اس نے چند لمحے جواب کا انتظار کیا اور پھر کہنا شروع کیا..... ”کبھی کبھی نجمی اپنے دہنے کان کے پاس سے اپنے بھورے بالوں کی ایک لٹ نکال کر لام (ل) سا بنا لیا کرتی تھی جو اس کے سرخ و سفید بھرے بھرے گال پر بہت بھلا لگتا۔“

نسرین کے چہرے پر خفیف سی اضمحلال کی کیفیت پیدا ہوئی مگر زبان سے اب بھی اس نے کچھ نہ کہا۔ وہ سوچ رہی تھی یہ کیسا مرد ہے جس کے پاس بات کرنے کو بیوی کے سوا اور کوئی موضوع ہی نہیں۔ وہ دو گھنٹے سے برابر اسی عورت کا ذکر سنے جا رہی تھی جو اَب دنیا میں موجود نہ تھی۔ ان دو گھنٹوں میں وہ اس نوجوان کی متاہل زندگی کے تمام اہم واقعات اور اس کی مرحوم بیوی کی بہت سی عادتوں اور خصلتوں سے واقف ہو چکی تھی۔ یہ کہ اسے بچپن ہی سے اپنی بیوی سے عشق تھا، یہ کہ نجمہ کا باپ ان کی شادی کے خلاف تھا مگر ماموں اور چچا حق میں تھے، یہ کہ نجمہ لمبے قد کی تھی، اسے گانا سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جب وہ ہنستی تو اس کے بائیں گال میں گڑھا پڑ جاتا۔ اسے حنا کا عطر بہت مرغوب تھا..... وہ کروشیے سے مور بہت اچھا بنایا کرتی۔

شروع شروع میں نسرین کو اس ذکر سے کچھ یوں ہی سی دلچسپی ہوئی تھی جیسا کہ ابتدا میں عموماً ایک عورت کو دوسری عورت کے ذکر سے ہوا کرتی ہے مگر جلد ہی وہ اس سے بیزار ہو گئی تھی اور آخر جب اس کی جمائیاں اور انگڑائیاں بھی اس موضوع سے اس کا پیچھا نہ چھڑا سکیں تو ذچ ہو کر اس نے چپ سادھ لی تھی۔

وہ اب چوٹی کر کے جوڑا باندھ چکی تھی اور ان ہیر پنوں اور کلپوں کو جن سے وہ اپنے بالوں کی آرائش میں مدد لیا کرتی، فرش سے اُٹھا اُٹھا کر سنگھار میز کے خانے میں ڈال رہی تھی۔ اس اثنا میں نوجوان کی نظریں اس کی گوری گوری انگلیوں کی خفیف ترین حرکات کا بھی تعاقب کرتی رہی تھیں۔

دو منٹ خاموشی میں گزر گئے۔

کئی دن ہوئے اس نوجوان نے نسرین کو دیکھا تھا، اسے دیکھتے ہی اسے اپنی مرحوم بیوی کی یاد بے طرح ستانے لگی تھی اور وہ اس سے ملنے کی تدبیریں کرنے لگا تھا اور آخر جب اس نے اس قدر روپیہ جمع کر لیا کہ دو راتوں کے لیے اس عورت کو خرید سکے تو اس نے سیدھا اس کے گھر کا رخ کیا۔

"میری بیوی ......"

"تو گویا بہت محبت تھی آپ کو بیگم صاحب سے۔" بالآخر نسرین نے بات کاٹ کر کہا۔ جب ایک آدمی بولے ہی چلا جائے تو دوسرا کب تک چپ رہ سکتا ہے۔

"بے حد۔" بے ساختہ نوجوان کے منہ سے نکلا وہ اس کے طعن کو نہیں سمجھ سکا تھا۔

"مگر صاحب آپ کی باتیں بھی عجیب ہیں۔" ایک انتقامی جذبہ اس میں بیدار ہو رہا تھا۔ "سمجھ میں نہیں آتا وہ کیسی محبت تھی جو اس کے مرنے کے تین ہی مہینے میں رفو چکر ہو گئی، اور اب......"

فقرہ مکمل نہ کر سکی۔ شاید اس کی ضرورت بھی نہ تھی، کیونکہ نوجوان اس کا مطلب بخوبی سمجھ گیا تھا۔ وہ کچھ دیر گم سم رہا۔ پھر اس نے اپنی صاف اور روشن آنکھیں اُٹھا کر، جن میں مجرمانہ گھبراہٹ یا گناہگارانہ ندامت کی کوئی علامت نہ تھی، نسرین کے چہرے کی طرف دیکھا۔ پھر وہ آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا کہ شاید لیٹے رہنے سے وہ اپنی مدافعت پورے طور پر نہ کر سکے۔ اس کے ہونٹ پل بھر کو لرزے، مگر زبان کچھ نہ کہہ سکی۔

چند لمحوں تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ اس کے بعد نسرین انگڑائی لیتی ہوئی اور بغیر کچھ کہے کمرے سے نکل گئی۔

کوئی پاؤ گھنٹے بعد وہ واپس آئی۔ زیور وغیرہ اس نے اتار دیے تھے۔ اور شب خوابی کے لیے ایک سادہ سی اُجلی دھوتی باندھ لی تھی۔ وہ اس قدر آہستہ سے داخل ہوئی کہ نوجوان

نے اس کے قدموں کی چاپ تک نہیں سنی۔ وہ چاندنی پر پیٹ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ اس کی عمر چوبیس پچیس برس سے کم نہ ہوگی، مگر اس وقت برقی لیمپ کی مدھم نیلی روشنی میں وہ اپنی چھوٹی چھوٹی سیاہ مونچھوں، گھنے ابروؤں اور چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کالج کی کسی ابتدائی جماعت کا طالب علم معلوم ہوتا تھا۔ اس کے سامنے چاندنی پر مٹر کے دانے کے برابر ایک سیاہ پتنگا چت پڑا تھا، جو شاید برقی قمقمے سے ٹکرا کر نیچے آرہا تھا۔ پتنگا اپنی ننھی ننھی بال سی ٹانگیں ہوا میں ہلا ہلا کر اور سر کو فرش پر رگڑ رگڑ کر سیدھا ہونے کی کوشش کرتا، مگر جہاں اسے ذرا کامیابی ہوتی، نوجوان ایک بجھی ہوئی دیا سلائی کے سرے سے اسے پھر اوندھا کر دیتا۔

جب نسرین بالکل اس کے سر پر آ کھڑی ہوئی تو وہ چونک پڑا۔

"اوہ، آپ ہیں۔" اور اس نے کچھ شرمندہ سا ہو کر پتنگے کو دیا سلائی سے پرے اچھال دیا۔

"بیگم صاحب کے مرنے کا رنج تو بہت ہوا ہوگا آپ کو؟" یہ سوال کر کے وہ خود حیران ہوگئی۔

نوجوان نے لحہ بھر تامل کیا اور پھر سنجیدہ لہجے میں کہنا شروع کیا:

"نہیں، شروع شروع میں کچھ ایسا غم نہیں ہوا تھا۔ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ایسا ہوگیا ہے مگر میں زیادہ دن اس کے فریب میں نہ رہ سکا۔ بیمار پڑ گیا۔ مہینہ بھر چارپائی پر پڑا رہا۔ جب میری حالت بہت خراب ہو جاتی تو ای جان اور زہری، یہ میری چھوٹی بہن کا نام ہے، میرے سرہانے آ کر کھڑی ہو جاتی اور ایسی چپ چاپ سہمی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھتیں کہ میں جلدی سے آنکھیں بند کر لیتا اور چاہتا کہ نہ مروں .... بس پھر میں رفتہ رفتہ تندرست ہوتا گیا۔

اس کے لہجے نے نسرین کو متاثر نہ کیا۔

دو تین لمحے پھر دونوں چپ رہے۔

''آپ نے کہا تھا۔'' اچانک نسرین کے لہجے میں شوخی جھلکنے لگی۔ ''میری شکل بیگم صاحب سے ملتی جلتی ہے، بھلا کیا چیز ملتی ہے؟''

نوجوان نے پَل بھر غور کیا۔

''سب سے زیادہ تمہاری آنکھیں نجمی سے ملتی ہیں۔'' یہ کہتے وقت اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی تھی مگر لہجے سے افسردگی کا اثر دور نہیں ہوا تھا۔ ''ویسی ہی سیاہ اور گہری۔ دوسرے نمبر پر ٹھوڑی، ویسی ہی پتلی اور تیسرے نمبر پر .... ''

''چسلیے بیٹے بنائے نہیں۔''

''تمہارے بال، تمہاری گردن ..... ''

نوجوان کی فطری چونچالی تیزی سے بحال ہو رہی تھی اور نسرین خود کو روکے ہوئے تھی کہ اس سلسلے میں کوئی اور سوال نہ کر بیٹھے۔

آدھ گھنٹے بعد روشنی گل کر دی گئی تھی اور وہ دونوں کھڑکی کے پاس پلنگ پر دراز ہوگئے۔ نوجوان جو رات کو جلد ہی سو جانے کا عادی تھا زیادہ دیر تک نہ جاگا مگر نسرین آنکھیں کھولے دیر تک کھڑکی میں سے آسمان کو دیکھتی رہی۔

یہ قمری مہینے کی آخری راتوں کی ایک رات تھی۔ آسمان صاف مگر تاریک سا تھا۔ ستارے اس قدر تیزی سے چمک رہے تھے کہ معلوم ہوتا تھا زمین کے قریب سرک آئے ہیں نسرین ستاروں کو ہمیشہ دلچسپی سے دیکھا کرتی تھی۔ سب سے پہلے جب وہ ستاروں سے آشنا ہوئی تھی، اس کی عمر چار برس کی تھی۔ ماں مر چکی تھی مگر باپ زندہ تھا۔ اس نے باپ کے ساتھ ریل گاڑی میں ایک لمبا سفر کیا تھا۔ آدھی رات کو وہ دونوں ایک چھوٹے سے دیہاتی اسٹیشن پر اُترے تھے۔ اسی اسٹیشن پر لال ٹین کی مدھم روشنی میں ایک موٹے تنگ دھڑنگ فقیر نے اسے ایسی لال لال ڈراؤنی آنکھوں سے گھورا تھا کہ اس کی چیخ نکل گئی تھی

اور وہ بے اختیار باپ کی ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی۔ کچھ دیر دونوں اسٹیشن پر ہی ٹھہرے رہے مگر کوئی سواری نہ ملی۔ آخر باپ نے اسے گود میں لے لیا۔ گٹھڑی بغل میں ماری اور اندھیرے گھپ میں پیدل چلنا شروع کر دیا۔

یہ سفر بھی بہت لمبا تھا، مگر اس کی سہمی ہوئی نظروں نے جلد ہی ستاروں کو ڈھونڈ نکالا تھا۔ ان کو دیکھ کر اس کا ڈر کم ہونے لگا تھا۔ یہاں تک کہ وہ باپ کے کندھے سے لگ کر سو گئی، آنکھ کھلی تو خود کو اجنبی عورت کے گھر پایا۔ وہ کئی دن تک روتی بلکتی رہی مگر باپ کی صورت دیکھنا اسے پھر کبھی نصیب نہ ہوا......

صبح کو نسرین کی آنکھ کھلی تو سورج خاصا نکل آیا تھا۔ اٹھتے ہی سب سے پہلے اسے جو احساس ہوا یہ تھا کہ نوجوان اس کے بستر پر موجود نہیں، اس نے سوچا غسل خانے میں ہوگا اور وہ کھلے کھلے بستر پر کروٹیں بدلنے لگی۔

جب پاؤ گھنٹہ گزر گیا اور نوجوان کہیں نظر نہ آیا تو اسے الجھن ہونے لگی، شمن جھاڑو لئے کمرے میں آیا تو اس سے پوچھا:

"وہ رات والے بابو کہاں ہیں؟"

"چلے گئے۔"

"چلے گئے؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"جی ہاں صبح ہی صبح۔ ہم سو رہے تھے۔ دروازہ بھی تو کھلا ہی چھوڑ گئے۔"

"ویسے تو سب خیریت ہے نا؟" بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا۔

"جی سب خیریت ہے۔" شمن اس کا مطلب فوراً سمجھ گیا تھا۔ "میں نے اٹھتے ہی سب دیکھ بھال لیا تھا۔"

اپنے شبہے کے گھٹیاپن پر اسے شرم آگئی مگر دوسرے ہی لمحہ اس خیال نے اس پر تسلط

جمالیا کہ وہ نوجوان چلا کیوں گیا۔ اس نے سوچا، رات اسے میرا طعنہ برا لگا۔ وہ بڑا حساس تھا۔ اوپر اوپر سے ہنستا بولتا رہا۔ صبح ہوتے ہی چل دیا۔

منہ ہاتھ دھو کر نیچے پھوپھی کے پاس جانے کو تھی کہ اچانک کسی کے جلد جلد سیڑھیاں چڑھنے کی آواز سنائی دی، نوجوان گیا نہیں تھا۔ وہ رومال میں کچھ باندھے لئے آرہا تھا۔

"معاف کرنا۔" اس نے اپنے پھولے ہوئے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں بتائے بغیر ہی چلا گیا۔ میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ یہ لو" یہ کہتے ہوئے اس نے رومال نسرین کے ہاتھ میں دے دیا۔

"کیا ہے؟" نسرین نے پوچھا۔

"گوشت ترکاری۔" یہ کہہ کر وہ مسکرانے لگا، جیسے اس نے کوئی شرارت کی ہو۔

"گوشت ترکاری؟ کس نے کہا تھا لانے کو؟"

خفا کیوں ہوتی ہو، بات یوں ہے، جب نجمی زندہ تھی، میں یونہی منہ اندھیرے اسے بتائے بغیر گھر سے نکل جاتا۔ ہواخوری کی ہواخوری ہو جاتی اور گھر کا سودا بھی لے آتا۔ ہمیں نوکر رکھنے کی توفیق نہیں تھی بس یونہی مل بانٹ کے کام کیا کرتے۔ وہ گھر کا اور میں باہر کا ..... ذرا دیکھو تو گوشت کیا عمدہ اور تازہ ہے، آدھا دست کا اور آدھا پشت کا اور گردا ڑو تکے میں۔ نوکر کا باپ بھی ایسا گوشت نہیں لا سکتا، اور پھر ذرا کپتال تو دیکھو آج ہی شہر میں آئی ہے۔ پھر پیاز بھی ہے، ہری مرچیں بھی اور ادرک بھی اور دھنیا بھی۔

نوجوان ڈاڑھی بھی منڈواتا آیا تھا۔ تھوڑا سا صابن اس کے کانوں کی لوؤں پر ابھی تک لگا رہ گیا تھا۔ نسرین کا جی چاہا دوپٹہ کے دامن سے صابن کو پونچھ دے مگر وہ ایسا نہ کر سکی۔

"آپ نے ناحق تکلیف کی۔" نسرین نے کہا۔ "خیر اب لے آئے تو میں شمن کو بلواتی ہوں۔"

"نہیں۔ نہیں اسے مت بلواؤ۔"

"یہ کیوں؟"

"میں خود کھانا پکاؤں گا۔ جب نجمی زندہ تھی تو کبھی کبھی میں ہنڈیا پکاتا۔ وہ سامنے موڑھے پر بیٹھی مجھے بتاتی رہتی......"

"ہمارا شمن بھی بہت ہوشیار ہے۔" نسرین نے کہا۔ "ایسا کھانا پکاتا ہے کہ زبان چٹخارے لیتی رہ جاتی ہے۔"

"نہیں صاحب۔" نوجوان نے قطعی فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ "نجمی کچنال ایک خاص ترکیب سے پکایا کرتی تھی۔ وہ ترکیب یا تو وہ جانتی تھی یا میں جانتا ہوں۔ مہربانی کر کے آپ انگیٹھی، کوئلے اور چاقو منگوا دیجیے۔"

نسرین نے اس سلسلے میں کچھ اور کہنا مناسب نہ سمجھا اور خاموش سیڑھیوں سے اُتر گئی۔

'آؤ بیٹا۔" نسرین کی پھوپھی نے اسے دیکھ کر اگالدان میں پیک تھوکتے ہوئے کہا "میں ابھی ابھی شمن سے کہہ رہی تھی کہ تمہارا اور اس کا ناشتہ اوپر لے جائے۔"

"میں ناشتہ نہیں کروں گی، اس کے لیے اوپر بھیج دو۔"

"تم چپ چپ کیوں ہو؟"

"نہیں تو ....!"

"شکل سے بڑا کم زبان معلوم ہوتا ہے۔"

نسرین نے کچھ جواب نہ دیا۔

"کیا کر رہا ہے، اس وقت؟" پھوپھی نے پوچھا،

"ہنڈیا کا سودا خرید کر لایا ہے، خود ہی پکانے بیٹھا ہے۔"

نسرین کی پھوپھی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"سچ!"

"ہاں، ہاں"

"بڑا ہی سیدھا سادا ہے۔"

"خبطی ہے پورا، رات بھر اپنی مری ہوئی بیوی کی باتیں کر کے دماغ چاٹ گیا۔ شمن کو اس کے پاس بھیج دینا، ہاتھ بٹاتا رہے گا۔ میں ذرا نوبہار کے ہاں جاتی ہوں۔"

نسرین کا خیال تھا کہ وہ کم سے کم ایک گھنٹہ نوبہار کے ہاں ضرور ٹھہرے گی، مگر پاؤ گھنٹہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ اُٹھ آئی۔ سیدھی اوپر کی منزل میں پہنچی۔ دیکھا کہ کمرے کے باہر والان میں انگیٹھی دہک رہی ہے اور نوجوان اس کے پاس ہی ایک چھوٹی سی دری پر آلتی پالتی مارے بیٹھا پیاز کتر رہا ہے۔ آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ پانی بہہ رہا ہے۔ اس سے ذرا ہٹ کر شمن بیٹھا مزے سے یہ تماشا دیکھ رہا ہے۔

"شمن!" نسرین نے کسی قدر سختی سے کہا "تم بیٹھے منہ کیا تک رہے ہو۔ صاحب سے پیاز لے کر کیوں نہیں کترتے؟"

"میں تو کئی دفعہ عرض کر چکا ہوں۔" شمن نے منہ بنا کر کہا۔ "پر صاحب مانتے ہی نہیں۔ مجھ سے آگ جلانے کو کہا۔ میں نے آگ جلا دی۔"

"اچھا تم نیچے جاؤ۔"

جب شمن چلا گیا تو نسرین نے کہا:

"حضرت یہ اس عمر میں ہنڈیا کلھیا پکانے کی کیا سوجھی ہے۔ لایئے پیاز مجھے دیجئے اور جا کر آنکھوں پر چھینٹے دیجئے۔" اور اس نے ہاتھ بڑھا کر نوجوان کی گود سے پیاز کی رکابی خود ہی اٹھا لی۔ نوجوان نے مزاحمت نہ کی۔

دو گھنٹے کے بعد جب وہ دونوں دستر خوان پر کھانا کھانے بیٹھے تو نوجوان نے کہا:

"معاف کرنا، میری وجہ سے تم کو اتنی تکلیف اٹھانی پڑی۔ بات یہ ہے کہ نجمی!"

"باتیں چھوڑیئے اور کھانا کھایئے۔"

"واہ کیا مزے کا کھانا پکایا ہے۔" نوجوان نے پہلا نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"نجمی کے ہاتھ کا مزہ یاد آ گیا۔"

"چسلیے زیادہ بنایئے نہیں۔ چپاتیاں تو دیکھئے کیسی ٹیڑھی بینگی ہیں۔"

"چپاتیاں نجمی کو بھی نہیں پکانی آتی تھیں اور میں زیادہ تر تنور ہی سے روٹیاں لگوا کر لایا کرتا تھا۔"

"مجھے تنور کی روٹی زہر لگتی ہے۔"

"ہم کبھی کبھی کوئی سستا سا خانساماں بھی رکھ لیا کرتے مگر وہ پندرہ بیس روز سے زیادہ نہ ٹکتا چپکے چپکے کسی اچھے گھر کی ٹوہ میں رہتا اور پھر کھسک جاتا۔"

کھانے سے فارغ ہو کر دونوں کمرے میں فرش پر آ بیٹھے۔

"آپ نے کہا تھا۔" نسرین نے کہا۔ "آج کل آپ کسی دوست کے ہاں رہتے ہیں۔"

"ہاں نجمی کے مرنے کے بعد میں نے امی جان اور زہری کو تو گاؤں بھیج دیا تھا اور خود ایک دوست کے ہاں اُٹھ آیا تھا۔ یہ دوست بھی میری طرح اکیلا ہے۔ ہم دونوں مکان کے کرائے، کھانے پینے کے خرچ اور نوکر کی تنخواہ میں ساجھی ہیں۔"

"اور آدھی تنخواہ آپ امی جان کو بھیج دیتے ہیں؟"

"ہاں! مگر وہ ہمیشہ کسی نہ کسی بہانے کچھ نہ کچھ کوتاتی ہی رہتی ہیں۔ کبھی گرم پتلون سلوانے کے لیے کبھی نیا بوٹ خریدنے کے لیے۔"

نسرین نے محسوس کیا کہ اس کی ماں اسے بہت چاہتی ہو گی۔

"اپنی ہمشیرہ کی کیا عمر بتائی تھی آپ نے؟"

"دس برس، بڑی پیاری بچی ہے۔"

"اسکول جاتی ہے۔"

"نہیں۔ گھر پر مولوی صاحب سے پڑھتی ہے۔ سینا پرونا اسے دادی سکھاتی ہے۔"

اس نے ایک بکری پالی ہے۔ دودھ سی سفید، ایک بھی کالا بال نہیں۔ زہرہ اس کی بڑی دیکھ بھال کرتی ہے۔ کھیت سے بوٹنٹ توڑ لاتی ہے۔ اپنے ہاتھ سے کھلاتی ہے۔ ہمارے گاؤں کے پاس ہی چھوٹی سی ندی بہتی ہے وہ اسے وہاں پانی پلانے لے جاتی ہے، ایک دن کیا ہوا کہ وہ بکری پانی پی رہی تھی کہ ایک بڑا سا کتا آیا وہ جو زور سے بھونکا تو بکری ڈر کر ندی میں گر پڑی۔ پانی کا بہاؤ تیز تھا، وہ اس کے ساتھ بہہ چلی۔ اس پر زہرہ نے چیخ چیخ کر بُرا حال کر لیا۔ اتفاق سے ایک کسان ادھر سے گزرا، شور سن کر دوڑا ہوا آیا۔ بڑی مشکل سے بکری کو نکالا تب زہرہ کی جان میں جان آئی۔"

نسرین یہ سادہ سا بے رنگ واقعہ بڑی دلچسپی سے سنتی رہی۔

اب نوجوان پر کچھ کچھ غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ وہ گاؤ تکیے کے سہارے لیٹ گیا۔ رفتہ رفتہ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ سو گیا۔

نسرین اٹھی۔ الماری کے خانے سے سفید ململ کا دوپٹہ اور گوٹا اٹھا لائی اور نوجوان کے قریب ہی فرش پر بیٹھ کر دوپٹہ میں گوٹا ٹانکنے لگی۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں اس کا جی اکتا گیا اور وہ بھی پلنگ پر جا کر لیٹ گئی۔

تیسرے پہر ایک رکشا منگوایا گیا اور وہ دونوں بازار جانے کی تیاری کرنے لگے۔ نوجوان نے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اسے کوئی تحفہ خرید کر دینا چاہتا ہے۔ اس نے بغیر کسی شرم و حجاب کے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ نسرین بیس روپے تک کی جو چیز چاہے خرید سکتی ہے اس سے زیادہ کی اسے توفیق نہیں۔

"یہ سچ ہے۔" اس نے کہا: "کہ اتنے کم داموں کی کوئی چیز تمہارے لائق نہیں ہو سکتی مگر میرا جی چاہتا ہے کہ میری کوئی چیز خواہ وہ کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو، تمہارے پاس بطور یادگار رہے۔"

اور وہ اس کے ساتھ چلنے پر رضامند ہو گئی تھی۔ پھوپھی کو اجازت دینے میں تامل

ہوا تھا۔ مگر ایک تو نسرین خود جانے پر مُصر تھی۔ دوسرے نوجوان کے چہرے سے ایسی معصومیت برس رہی تھی کہ کسی برے ارادے کا گمان تک نہ ہوتا تھا اور وہ خاموش رہ گئی۔

اور اب نسرین نیلے رنگ کا برقعہ اوڑھے نوجوان کے پہلو میں رکھشا میں بیٹھی تھی۔ شہر کی کھلی سڑکوں پر ہزاروں عورتوں، مردوں کے بہتے ہوئے ہجوم میں یہ جوڑا بھی تھا۔ اسے دیکھ کر کسی کو یہ سوچنے تک کی پرواہ نہ تھی کہ ان کا رشتہ زن و شوہر کے سوا اور بھی کچھ ہو سکتا ہے۔

وہ رکھشا سے اتر کر کئی بازاروں میں سے گزرے، کئی دکانوں میں گئے۔ جب وہ سڑک پر چلتی تو وہ اس کے آگے پیچھے راستہ صاف کرتا، اسے آنے جانے والی گاڑیوں موٹروں اور ہجوم کی دھکا پیل سے بچاتا یوں اپنی حفاظت میں لے جاتا، گویا وہ کوئی بہت مقدس چیز ہے جس کا دامن تک کسی سے چُھونا اسے گوارا نہیں۔ جب وہ کسی دکان میں داخل ہوتے تو اس کی فرمائش کی چیزیں دکاندار سے منگوا منگوا کر ایسی تکریم سے پیش کرتا کہ دیکھنے والے یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکتے کہ یہ کوئی نیا جوڑا ہے اور یہ کہ شوہر بیوی سے کمال عشق رکھتا ہے۔

نسرین نے بڑی قیمت کی کوئی ایک چیز نہیں خریدی بلکہ روزمرہ کے استعمال کی کئی چھوٹی چھوٹی چیزیں خریدیں جن میں سے بعض کی واقعی اسے ضرورت تھی۔ مثلاً ایک تو چٹلا خریدا۔ ایک ریشمی ازاربند، کچھ چھوٹی بڑی سوئیاں، دو تین مختلف رنگوں کے تاگے کی ریلیں، کچھ کروشیا کی سلائیاں، ایک فریم، دو تین مختلف غازے اور بس، ان سب چیزوں پر بیس روپے سے کچھ کم ہی خرچ ہوئے، ہر ایک چیز خریدنے کے بعد وہ بڑی ادا کے ساتھ پوچھتی "باقی کیا بچا؟"

واپسی پر نوجوان اسے ایک ریسٹورنٹ میں لے گیا اور ٹھنڈی اور گرم کئی قسم کی چیزیں منگوائیں اور نسرین کو اپنی مرضی کے خلاف کئی چیزیں کھانی پڑیں جس وقت وہ گھر پہنچے اچھا خاصا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ نسرین کی پھوپھی بڑے اضطراب سے اس کی راہ دیکھ رہی

تھی جب وہ صحیح سلامت گھر پہنچ گئے تو اس کی جان میں جان آئی۔

ثمن سے کہہ دیا گیا تھا کہ وہ کھانا نہیں کھائیں گے۔ چنانچہ شام سے اوپر کی سیڑھیوں کا دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔ نسرین نے پچھلی رات کی طرح پھر کمرے کی ہلکی نیلی روشنی میں کنگھی کرنی شروع کی۔ نوجوان پھر اس کے پاس ہی چاندنی پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر دونوں خاموش رہے، پھر نوجوان نے کہا۔

"نسرین میں نے تمہیں نجمی کی بہت سی باتیں بتائیں مگر ایک بات نہیں بتائی۔"

نوجوان نے یہ بات ایسے گمبیر لہجے میں کہی تھی کہ نسرین بے ساختہ کہہ اٹھی:

"وہ کیا؟"

نوجوان کچھ لمحے خاموش رہا اور پھر بولا:

"وہ یہ کہ وہ۔۔ باوفا نہیں تھی۔"

"کیا مطلب؟" نسرین نے اور بھی متعجب ہو کر پوچھا۔

"مطلب یہ کہ۔۔۔۔وہ کسی اور کو چاہتی تھی۔"

"جھوٹ ہے۔"

"نہیں سچ کہہ رہا ہوں۔"

"اس کا کوئی ثبوت بھی تھا۔"

"تھا۔"

"وہ کیا؟"

نوجوان لمحہ بھر خاموش رہا۔ پھر بولا:

"اس کے خط۔ میں نے غلطی سے اس کے نام کا ایک خط کھول لیا تھا۔"

یہ کہتے کہتے نوجوان ایک دم افسردہ ہو گیا اور اس نے گردن جھکالی۔

"اور تم پھر بھی اسے چاہتے رہے؟"

"ہاں......" بھرائی ہوئی آواز میں نوجوان کے منہ سے نکلا۔ "اس کے سوا چارہ ہی نہ تھا۔"

کئی لمحے خاموشی رہی جسے توڑنے کی کسی میں خواہش پیدا نہ ہوئی۔

"کیا وہ جانتی تھی کہ تم اس کے راز سے واقف ہو؟" بالآخر نسرین نے پوچھا۔

"نہیں، میں نے آخری دم تک اس پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا اس کی موت سے چند منٹ پہلے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ سخت نزع میں ہے اور مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے مگر میں اس سے آنکھ نہ ملاتا تھا۔ البتہ دلداری اور تشفی کے کلمے برابر میرے منہ سے نکلتے رہے۔ یہاں تک کہ اس نے آخری ہچکی لی اور رخصت ہو گئی۔"

کچھ لمحے پھر خاموشی رہی جس کو خود نوجوان ہی نے توڑا:

"آخر اس پر یہ ظاہر کرنے کا فائدہ بھی کیا تھا!"

اس رات پچھلی شب کی بہ نسبت جلد ہی روشنی گل کر دی گئی۔ نوجوان پھر جلد ہی سو گیا۔ مگر نسرین برابر ستاروں کو جھلملاتے دیکھتی رہی۔

پچھلے پہر اچانک نوجوان نے سوتے میں سسکی لی اور پھر تیز تیز سانس لینے شروع کر دیے۔ نسرین نے سر اٹھا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا، کچھ دیر سوچتی رہی، پھر جس طرح کوئی بچّہ سوتے سوتے ڈر جائے تو ماں اسے چھاتی سے چمٹا لیتی ہے، نسرین نے بھی اسی طرح اس کا سر اپنے بازو میں لے کر اسے اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔

بھنور

اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جن کے لیے صوم و صلوٰۃ کا پابند ہونا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے مذہبی ولولے کی تسکین کے لیے اس سے کہیں سوا چاہتے ہیں۔ ان کی تمنا ہوتی ہے کہ جس نور سے ان کا سینہ روشن ہے، اس کی کرن دوسروں تک بھی پہنچے۔ گمراہوں کی ہدایت کے لیے خطرناک جگہوں پر بھی جانے سے نہیں گھبراتے۔ انھیں نہ جان کا خوف ہوتا ہے نہ جگ ہنسائی کا۔ بلکہ وہ اس کام کو فریضہ سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔

حاجی شفاعت احمد خاں ایسے ہی دینداروں میں سے تھے۔ پچاس کے لگ بھگ سن۔ بھاری بھرکم جسم مگر خوب گٹھا ہوا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جوانی میں کبھی کسرت سے شوق رہا ہوگا۔ سرخ و سفید رنگ، چوڑا چہرہ، کڑ بڑی ڈاڑھی مگر خوب بھری ہوئی۔ آنکھیں بڑی بڑی شربتی رنگ کی، جن میں ہر وقت سرخی جھلکتی رہتی۔ چہرے پر ایک جلالی کیفیت۔ لباس ان کا عموماً یہ ہوتا۔ خاکی رنگ کی شلوار، خاکی رنگ کی قمیص... چارخانے کپڑے کا کوٹ، پاؤں میں ترکی کا جوتا جو ہمیشہ گرد سے اَٹا رہتا۔ سر پر سفید صافہ کلاہ پر بندھا ہوا۔ ہاتھ میں موٹے بید کی چھڑی، غرض لباس اور شکل و صورت سے وہ اچھے خاصے مردِ مجاہد معلوم ہوتے تھے۔

حاجی صاحب صبح کو شہر کے ایک سرے سے جو گشت شروع کرتے تو شام ہوتے ہوتے پورے شہر کو جیسے کھنگال ڈالتے۔ ان کے جاننے والوں کا کوئی شمار نہ تھا۔ قدم قدم پر

علیک سلیک ہوتی رہتی۔ کبھی پاؤ پاؤ گھنٹے سڑک کے کنارے ہی تلقین و ہدایت کا سلسلہ جاری رہتا۔ کبھی کوئی جان پہچان والا کسی ضرورت سے ساتھ لے جاتا مگر گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ پھر گشت میں مصروف دکھائی دینے لگتے۔

وہ اپنی دین داری اور بزرگی کی وجہ سے بڑے ہر دل عزیز تھے۔ یہاں تک کہ شہر کے حکام بھی ان کی عزت کرتے تھے۔ کبھی محلے کا کوئی آوارہ مزاج لڑکا جواء کھیلنے یا کسی اور فعل شنیعہ کے الزام میں پکڑا جاتا تو اس کا باپ حاجی صاحب ہی کی پناہ لیتا:

"حضور! اس نالائق کے ہاتھوں سخت عاجز آ گیا ہوں۔ میں نے تو کبھی کا عاق کر دیا ہوتا مگر اس کی بدنصیب ماں کچھ کرنے نہیں دیتی۔ جب سے سُنا ہے کہ حوالات میں بند ہے سر پیٹ پیٹ کر بُرا حال کر لیا ہے۔ ...."

اور حاجی صاحب کی سفارش پر تھانے دار معمولی سی تنبیہہ کے بعد لڑکے کو رہا کر دیتا۔

ان کے رسُوخ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کسی زمانے میں وہ خود بھی شہر کے اہل کاروں میں سے تھے۔ شروع ہی سے وہ نیک دل اور منکسرالمزاج تھے۔ سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے ہر مہینے تھوڑی تھوڑی رقم پس انداز کر کے ایک چھوٹا سا گھر بنا لیا تھا۔ جب انہیں نوکری کرتے بیس برس ہو گئے تو حج کا شوق ہوا۔ اس فریضہ سے فراغت پا کر ہنسی خوشی وطن لوٹے تھے کہ اچانک ایک المناک حادثہ ان پر گزرا۔ ان کا اکلوتا بیٹا جس کی عمر اٹھارہ برس کی تھی، ہیضے کا شکار ہو کر چوبیس گھنٹے کے اندر اندر چل بسا اور پھر اس کے دو ہی دن بعد اس کی ماں بھی جسے بیٹے کی تیمار داری میں چھوت لگ گئی تھی، اس کے پاس پہنچ گئی اس واقعہ کا ان کے دل پر ایسا گہرا اثر ہوا کہ انہوں نے علائق دنیوی سے منہ پھیر لیا اور باقی عمر ہدایت اور تبلیغ کے لیے وقف کر دی۔

اسی زمانے میں ان کے سر میں یہ دُھن سمائی کہ رنڈیوں کی اصلاح کی جائے بھلا قحبہ خانوں سے بڑھ کر معصیت کے اڈّے اور کون سے ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کا دستور تھا کہ ہر

جمعرات کی شام وہ قرآن مجید سبز جزدان میں رکھ، سینے سے لگا رنڈیوں کے بازار کا رُخ کرتے اور انہیں گناہوں سے توبہ کرنے اور نیک راہ پر چلنے کی ہدایت کرتے۔ رفتہ رفتہ ان عورتوں کے گھروں میں ان کی آمد ورفت ایک معمول بن گئی۔ ان کی صورت دیکھتے ہی گانا بجانا بند کر دیا جاتا اور ان کے پند و نصائح کو خاموشی سے سنا جاتا۔ اس کے بعد گھر کی کوئی بڑی بوڑھی یا نائکہ ایسے لہجہ میں جو بہ ظاہر تو نرم مگر طعن سے خالی نہ ہوتا، کہتی:

"حضرت اپنے شوق سے تو ہم یہ گناہ کرتے نہیں۔ یہ دوزخ جو لگا ہے اس کو بھی تو بھرنا ہے۔ آپ ہماری گزر بسر کا انتظام کر دیجئے۔ ہم آج ہی اس پیشے کو چھوڑ دیتے ہیں، مگر انتظام معقول ہونا چاہیے۔ ماما گیری تو ہم کرنے سے رہے۔" اور یوں انہیں وقتی طور پر ٹال دیا جاتا۔

مگر کبھی کبھی ان گھروں میں حاجی صاحب کی تحقیر بھی خوب ہوتی اور انہیں گناہ اور بے حیائی کے ایسے ایسے منظر دیکھنے پڑتے کہ شرم سے نظریں جھکا لینی پڑتیں ایک دفعہ ایک کوٹھے پر کسی ضیافت کا اہتمام تھا۔ بدقسمتی سے حاجی صاحب وہاں پہنچ گئے۔ ان کو دیکھنا تھا کہ قحبہ نے جس کے منہ سے شراب کے نشے میں رال ٹپک رہی تھی، لپک کر ان کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور ان کی لمبی ڈاڑھی کے پے در پے بوسے لینے شروع کر دیئے، پھر وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولی:

"اے میرے مجازی خدا مجھے اپنے ساتھ لے چل۔ میں تیرے پاؤں دابوں گی۔ تیرے سر میں تیل ڈالوں گی تیری ڈاڑھی میں کنگھی کروں گی۔"....

اور جتنی قحبائیں اور ان کے آشنا اس کوٹھے پر جمع تھے، یہ منظر دیکھ مارے ہنسی کے لوٹ لوٹ گئے۔

ایسے موقعوں پر وہ پیغمبروں اور ولیوں کے قصے یاد کرتے کہ کیسی کیسی ذلتیں، اور ایذائیں انہیں راہِ حق میں اٹھانی پڑیں اور اس طرح اپنے دل کو تقویت دے کر وہ پہلے سے

زیادہ مستعدی کے ساتھ تبلیغ کا کام جاری رکھتے۔

رفتہ رفتہ وہ اس محلے میں خاصے بدنام ہو گئے۔ بعض دفعہ آوارہ لڑکوں اور اوباش لفنگوں کی ٹولی ان کے پیچھے ہو لیتی۔ یہ لوگ بالاخانوں میں بیٹھی ہوئی بیسواؤں کی طرف ہاتھوں سے طرح طرح کے اشارے کرتے، فحش آوازے کستے اور حاجی صاحب کو اپنا لیڈر بنا کر مضحک نعرے لگاتے۔ ان ہی باتوں سے اکثر لوگ حاجی صاحب کو مجذوب یا سودائی سمجھنے لگے تھے۔ وہ اس کی توضیح بھی کرتے کہ اکلوتے جوان بیٹے کی موت سے ان کے دماغ میں خلل آ گیا ہے۔

ایک دن حاجی صاحب کے پاس ایک شخص خبر لایا کہ بازار میں دو نئی رنڈیاں آئی ہیں۔ ایک کا نام گل ہے اور دوسری کا بہار۔ دونوں بہنیں ہیں ایک ناچتی ہے دوسری گاتی ہے، دونوں اپنے اپنے فن میں ماہر ہیں۔ حسن بھی دونوں کا قیامت کا ہے، چند ہی روز میں سارے شہر میں ان کا چرچا ہو گیا ہے۔ لوگ پروانوں کی طرح گر رہے ہیں۔ سنا ہے بنک کا ایک ملازم ان کو رام کرنے کے لیے بنک سے بہت سا روپیہ اڑا لایا مگر پولیس موقع پر ان بیسواؤں کے گھر پہنچ گئی اور اس شخص کو نوٹوں کی گڈیوں سمیت پکڑ لیا گیا۔ ایک نوابزادے نے جو قلاش ہو گیا تھا، اپنی محرومی پر ان کے مکان کی سیڑھیوں میں پستول سے خودکشی کر لی۔ غرض وہ وہ ہنگامے ہوئے کہ ایک مدت سے سننے میں نہیں آئے تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ دوسری زہرہ اور مشتری ہیں جن کے سحرِ حسن سے انسان تو کیا فرشتے بھی محفوظ نہیں۔

حاجی صاحب نے مصلحتاً کچھ دنوں سے اس بازار میں جانا چھوڑ رکھا تھا، مگر اس نئے فتنے کا حال سنا تو فوراً ان کے دل میں ایک نیا جوش پیدا ہوا۔ انھوں نے دل میں کہا کہ ان عورتوں کو جلد سے جلد راہِ راست پر لانا چاہیے، ورنہ خدا معلوم یہ کتنے گھروں کو تباہ اور کتنے لوگوں کے ایمان کو غارت کر دیں گی۔

انہوں نے ظہر کی نماز پڑھی، قرآن شریف سینے سے لگایا اور پتہ پوچھتے گل اور بہار

کے بالاخانے پر پہنچ گئے۔ وہ دونوں رات بھر جاگنے کے بعد صبح کو جو سوئی تھیں تو اب سہ پہر کے قریب جا کر بیدار ہوئی تھیں۔ اتفاق سے اس وقت ایک بوڑھی خادمہ کے سوا گھر میں کوئی اور نہ تھا۔ انہوں نے اپنے سامنے سرخ سرخ آنکھوں والے ایک مجذوب پٹھان کو جو دیکھا تو ڈر کے مارے ان کی گھگھی بندھ گئی۔

حاجی صاحب چند لمحوں تک حیرت سے ان کے حُسن و جمال کو دیکھتے رہے۔ پھر وہ پُر شفقت لہجہ میں ان سے مخاطب ہوئے:

"میری بیٹیو! مجھ سے ڈرو نہیں۔ میں کسی بری نیت سے نہیں آیا۔ میں تو تمہیں صرف یہ بتانے آیا ہوں کہ تمہاری عیش و عشرت کی یہ زندگی ایک دھوکا ہے، اور یہ دھوکا صرف اسی وقت تک قائم ہے۔ جب تک تمہارے گالوں میں خون کی یہ چند بوندیں ہیں۔ ان کی تر و تازگی آخر کب تک باقی رہے گی۔ پانچ سال، سات سال، حد سے حد دس سال۔ اس کے بعد تم ایک قابلِ نفرت چیز بن جاؤ گی۔ اپنے عشاق کی نظروں ہی میں نہیں، اپنے عزیز ترین رشتہ داروں کی نظروں میں بھی۔ یہاں تک کہ تمہاری اولاد کو بھی تم سے گھن آئے گی۔ اس لیے کہ تمہارا وجود اُن کے لیے انتہائی شرمندگی کا باعث ہوگا۔

میری بچیو! ذرا غور کرو۔ تمہاری زندگی کیسی ہنگاموں سے بھری ہوئی ہے دن رات تمہارے چاہنے والوں کی دھینگا مشتی۔ قدم قدم پر جان کا خوف، ہر وقت پولیس کا دھڑکا، عدالت میں پیشیاں، یہ جینا بھی کوئی جینا ہے۔ میری بیٹیو! تمہاری جگہ یہ بالاخانہ نہیں ہے بلکہ کسی شریف گھر کی چار دیواری ہے جہاں تم ملکہ بن کر رہو، جہاں تمہارا شوہر نگہبان اور محافظ ہو، تمہارے ناز اٹھائے اور تمہارے پسینے کی جگہ خون بہائے اور جہاں تمہاری اولاد کے لیے تمہارے قدموں کے نیچے جنت ہو۔" یہ کہتے کہتے حاجی صاحب کی آواز رقت سے بھر آئی اور وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکے۔

دونوں بہنوں پر سے خوف و ہراس تو دُور ہو گیا تھا مگر ان باتوں کو سن کر وہ گم سُم رہ

گئی تھیں۔ آخر بڑی بہن گُل نے کہا:

"حضرت ہمارے ماں باپ نے ہمیں یہی پیشہ سکھایا ہے اس میں ہمارا کیا قصور"؟

حاجی صاحب نے اس دن ان سے کچھ اور کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ انہوں نے ایک کاغذ کے پُرزے پر اپنے گھر کا پتہ لکھ کر ان کو دیا اور یہ کہہ کر چلے آئے کہ مجھے اپنا باپ سمجھو اور جب کبھی کوئی مشکل پڑے یا میری ضرورت ہو تو اس پتہ پر مجھے خبر کر دو۔

اس واقعہ کو آٹھ روز بھی نہیں گزرنے پائے تھے کہ ایک دن صبح ہی صبح ایک تانگہ ان کے مکان کے سامنے آ کر رُکا۔ اس میں ایک عورت بیٹھی تھی جس نے سیاہ برقع اوڑھ رکھا تھا۔ تانگے میں دو ایک ٹرنک اور کچھ چھوٹی چھوٹی بقچیاں بھی تھیں۔ حاجی صاحب اس عورت کو اپنے مکان میں لے گئے اور اس کا سامان اندر پہنچا دیا گیا۔

یہ بہار تھی جو سچ مچ تائب ہو کر آ گئی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں معلوم ہوتا تھا کئی دن سے وہ روتی رہی ہے اور اب بھی اس کے آنسو تھمنے میں نہ آتے تھے۔

"جس دن آپ آئے۔" اُس نے حاجی صاحب کو بتلایا۔ "اُسی دن سے ہم دونوں بہنوں میں جھگڑا شروع ہو گیا تھا کیونکہ اب میں پَل بھر کے لیے بھی بازار میں بیٹھنا نہیں چاہتی تھی۔ آخر آج صبح میں اس سے علیحدہ ہو گئی ہوں۔"

اپنی اس کامیابی پر جو بازاری عورتوں کے اصلاحی کام کے سلسلے میں ان کی پہلی فتح تھی۔ حاجی صاحب کو اس قدر خوشی ہوئی کہ شاید بیٹے کے جی اٹھنے پر بھی نہ ہوتی۔ انہوں نے فوراً کپڑے بدلے اور سودا سلف لینے بازار چلے گئے۔ ان کے پیچھے بہار نے جھاڑو لے کر سارے گھر کی صفائی کی۔ چولہا ... ت سے راکھ سے بھرا تھا، اس کو صاف کیا باورچی خانے کے فرش کو دھویا پونچھا اور اپنے سگھڑپن سے ظاہر کر دیا کہ حُسن و جمال، علم اور شستہ لب و لہجے کے ساتھ ساتھ وہ امورِ خانہ داری سے بھی ناواقف نہیں۔

چند ہی دنوں میں بہار نے جس کا نام حاجی صاحب نے بدل کر بلقیس بیگم رکھ دیا تھا

اپنی خدمت گزاریوں سے ان کو یقین دلا دیا کہ وہ سچے دل سے توبہ کر کے آئی ہے اور اگر کوئی شریف قدر دان مل گیا تو ساری زندگی اس کے ساتھ نباہ دے گی۔ حاجی صاحب کو اس سے سچ مچ اُلفت ہو گئی جیسی باپ کو بیٹی سے ہوتی ہے ادھر بلقیس بھی ان کا دل سے احترام کرتی اور ان کے سامنے شریف گھرانوں کی لڑکیوں کی طرح ہمیشہ اپنی نظریں نیچی رکھتی۔ اب حاجی صاحب کو بلقیس کے لیے کسی اچھے رشتے کی فکر ہوئی کیونکہ وہ یہ خوب سمجھتے کہ لڑکی کا اصلی گھر اس کے شوہر ہی کا ہوتا ہے۔

سرکاری ملازمت کے دوران میں حاجی صاحب کا ایک رفیقِ کار رحمت علی ہوا کرتا تھا۔ وہ حاجی صاحب کی بڑی عزت کرتا تھا۔ یہ بھی اس سے بھائیوں کی طرح پیش آتے تھے۔ وہ تو مدت ہوئی مر چکا تھا مگر اس کے لڑکے انور نے حال ہی میں انجینئر کا امتحان پاس کیا تھا اور اسے ایک معقول سرکاری ملازمت مل گئی تھی انور حاجی صاحب کو تایا ابا کہا کرتا اور اکثر ان سے ملنے آیا کرتا تھا۔ ابھی چند روز ہوئے کہ وہ اپنی اس کامیابی کی اطلاع دینے آیا تھا، ابھی تک اس نے شادی نہیں کی تھی۔ بلقیس کے رشتے کے سلسلے میں ان کا خیال فوراً اس کی طرف گیا۔ وہ اس کے دفتر پہنچے اور اس کو شام کے کھانے پر بلایا۔ ادھر گھر آ کر انہوں نے بلقیس سے کہا:

"بیٹی! آج شام ایک مہمان آ رہا ہے۔ وہ میرے ایک نہایت عزیز دوست کی نشانی ہے۔ تم یہ میلے کپڑے اُتار کر کوئی اچھا سا لباس پہن لینا، وہ میرے بیٹوں کی طرح ہے۔ اس سے پردہ نہیں کرنا ہو گا۔"

شام کو انور کھانے پر آیا تو بلقیس کے حُسن اس کی شائستگی اور حیا کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ حاجی صاحب نے اس کو بلقیس کی پیتانائی اور اس سے کوئی بات چھپانہ رکھی دوسرے دن وہ پھر آیا، پھر تیسرے دن۔ پھر دن میں دو دو مرتبہ آنے لگا اور آخر مہینہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ ان دونوں کی شادی ہو گئی۔

انور اور بلقیس کی خوب گزر ہونے لگی۔ وہ دونوں اکثر حاجی صاحب سے ملنے آیا کرتے۔ انور اپنی بیوی کو فریفتگی کی حد تک چاہتا تھا، ادھر بلقیس بھی دل و جان سے اس پر فدا تھی اس کے ساتھ ہی وہ حاجی صاحب سے بھی ایسی اُلفت کرنے لگی گویا وہ سچ مچ باپ ہیں اور پھر یہی تو تھے جن کے طفیل وہ گمراہی کے گڑھے سے نکلی تھی۔

جب ایک سال گزر گیا تو انور کی تبدیلی کسی اور شہر ہو گئی۔ حاجی صاحب ان میاں بیوی کو اسٹیشن پر رخصت کرنے آئے تو جدائی کے خیال سے روتے روتے بلقیس کی ہچکی بندھ گئی۔ حاجی صاحب نے بڑی تسلیاں دے کر اسے رخصت کیا۔

وہ باقاعدگی سے ہر مہینے حاجی صاحب کو خط لکھتی جس میں اس کی اور انور کی خیریت اور گھر کے حالات تفصیل سے لکھے ہوتے۔ اس کے ان خطوں میں ایک بلبل کی سی چہچہاہٹ تھی۔ ان خطوں کا سلسلہ کوئی دو برس تک جاری رہا۔ اس کے بعد جو خطوط آئے ان کا لہجہ اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ حاجی صاحب نے اس تبدیلی کو بلقیس کی بڑھتی ہوئی عمر کے تقاضے پر محمول کیا۔ آخر تیسرے سال ایک خط آیا جسے پڑھ کر وہ بھونچکا رہ گئے۔ لکھا تھا:

ابا جان! تسلیم۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ خط پڑھ کر آپ کو صدمہ پہنچے گا۔ میں نے عرصے تک اس معاملے کو آپ سے چھپائے رکھا تاکہ آپ کو دکھ نہ ہو لیکن اب بات اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ اس کا چھپانا ممکن نہیں اور میں سمجھتی ہوں کہ اس میں میرے شوہر انور کا کچھ قصور نہیں اس کی تمام ذمہ داری ان کے رشتہ داروں پر ہے جو ہر روز آ آ کر ان کے کان بھرتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کو کسی نہ کسی طرح میری پچھلی زندگی کا حال معلوم ہو گیا ہے اور وہ مجھ سے سخت نفرت کرنے لگے ہیں اور برملا طعنے دیتے ہیں۔ چونکہ بدقسمتی سے اس عرصے میں میرے کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی جو شاید انور کو مجھ سے قریب تر کر دیتی، اس لیے یہ لوگ اب اس کوشش میں ہیں کہ انور میاں سے مجھے

طلاق دلوادیں۔ میں نے اس لڑکی کو بھی دیکھا ہے جس کو وہ ان کے پلّے باندھنا چاہتے ہیں۔ اچھی شریف لڑکی ہے، بے چاری شکل کی بھی بُری نہیں اب میری آپ سے التجا ہے کہ اس سے پہلے کہ یہ لوگ مجھے دھکّے دے کر نکال دیں آپ خود آئیں اور مجھے طلاق دلوا کر لے جائیں۔

آپ کی پیاری بیٹی
بلقیس

اس خط کی عبارت نے حاجی صاحب کو سخت بے چین کر دیا۔ وہ رات بھر بستر پر کروٹیں بدلتے رہے۔ صبح ہوئی تو وہ اسٹیشن پہنچے اور پہلی گاڑی سے اس شہر کو روانہ ہو گئے جہاں انور ملازم تھا۔ رات بھر وہ غم و غصّے سے کھولتے رہے ان کا جی چاہتا کہ وہ جاتے ہی انور کا منہ نوچ لیں۔ راستے بھر وہ قرآنی آیات پڑھ پڑھ کر اپنا غصہ ٹھنڈا کرتے رہے۔

مصالحت کا سوال ہی نہیں تھا کیونکہ جب دلوں میں فرق پڑ جائے تو زندگی کا لطف جاتا رہتا ہے۔ اب ان کی کوشش یہ تھی کہ وہ انور سے حق مہر حاصل کریں اور وہ تمام زیورات اور کپڑے بھی جو انور نے اب تک بلقیس کو بنوا کر دیئے تھے۔

انور اور اس کے رشتہ داروں نے زیادہ مزاحمت نہ کی۔ انور کو توقع نہ تھی کہ اس قدر جلد بلقیس سے اس کا پیچھا چھوٹ جائے گا، اور اسے کسی قدر رنج بھی ہوا کیونکہ ابھی تک اس کے دل میں بلقیس کی کچھ کچھ محبّت باقی تھی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ حاجی صاحب بلقیس کو ساتھ لے دو تانگوں میں اسباب لدوا اسی رات اسٹیشن پہنچے اور دوسرے دن گھر آگئے۔

بلقیس اب پھر حاجی صاحب کے پاس رہنے لگی۔ حاجی صاحب کو اب پھر اس کے رشتے کی فکر ہوئی اور ابھی تین مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ انہوں نے اس کے لیے ایک شوہر تلاش کر لیا۔ اب کے جو آدمی چنا گیا وہ انور کی طرح نہ تو کم عمر تھا اور نہ زیادہ تعلیم یافتہ اور نہ اس کا تعلق کسی اونچے گھرانے سے تھا۔ وہ میوے کا کاروبار کرتا تھا۔ آئے دن دساور سے

بھری ہوئی لاریاں اس کے یہاں آتی رہتی تھیں۔ شہر کے میوہ فروشوں میں اس کی بڑی ساکھ تھی۔

یہ میوہ فرش جس کا نام ربانی تھا رنڈوا تھا اور کسی نیک بیوہ سے عقد کرنا چاہتا تھا۔ حاجی صاحب نے حق مہر کے طور پر پانچ ہزار روپیہ نقد اور ایک مکان بلقیس کے نام لکھوانے کی شرط پیش کی جسے اس نے بلا حیل وحجت منظور کر لیا۔ دراصل یہ میوہ فروش بہار کے پُرانے مگر ناکام عشاق میں سے تھا۔ جب بہار بازار سے غائب ہوئی تھی تو وہ سخت پریشان ہوا تھا۔ پھر کچھ دن بعد جب اس نے سنا کہ حاجی صاحب نے اسے کسی انجینئر سے بیاہ دیا تو اس کے دل میں پھر بہار کی آرزو تازہ ہو گئی اور اس نے جلد ہی منت خوشامد سے حاجی صاحب کو اس رشتے پر آمادہ کر لیا مگر حاجی صاحب نے جب تک پورا حقِ مہر وصول نہ کر لیا میوہ فروش کو بلقیس کی شکل تک نہ دیکھنے دی۔

بلقیس نے ایک اطاعت مند بیٹی کی طرح حاجی صاحب کے تجویز کیے ہوئے رشتے کو صبر و شکر سے قبول کر لیا اور دونوں کی خاصی گذر ہونے لگی، یہاں تک کہ ایک سال ہنسی خوشی میں گذر گیا، مگر یہ میوہ فرش طبعاً عیاش واقع ہوا تھا، شادی کے بعد کچھ عرصہ تو وہ اس سے بڑی عزت کے ساتھ پیش آتا رہا، مگر جلدی ہی اس کے رویے میں تبدیلی آ گئی اور وہ اس سے ایسا سلوک کرنے لگا گویا وہ اس کی داشتہ ہو۔ وہ مُصر تھا کہ بلقیس رات رات بھر اس کے ساتھ جاگے اور شراب نوشی میں شریک ہو۔ پھر وہ اس کا بھی متمنی تھا کہ آئے دن دوستوں کی دعوتیں ہوں اور بلقیس ساقی گری کی خدمت انجام دے اور وہ دوستوں سے فخریہ یہ کہہ سکے:

"یہی تھا وہ لعل بے بہا جس کی ایک جھلک دیکھنے کو دنیا ترستی تھی اور اب میں تنہا اس کی قسمت کا مالک ہوں۔"

مگر بلقیس نے اس کی ان خواہشوں کو سختی کے ساتھ رد کر دیا، وہ اس کے دوستوں کی

ضیافتوں اور ان کے بے خواری سے تو تعرض نہ کرتی مگر خود کبھی ان کے سامنے نہ آتی۔

رفتہ رفتہ میوہ فروش کا دل گھر سے اُچاٹ رہنے لگا اور یہ محفلیں اب اوروں کے یہاں منعقد ہونے لگیں۔ میاں بیوی کے تعلقات کشیدہ رہنے لگے۔ کئی مرتبہ گالی گلوچ تک نوبت پہنچ گئی۔ آخر ایک دن میوہ فروش نے شراب کے نشے میں بلقیس کو اس قدر پیٹا کہ وہ کئی دن تک بستر سے نہ اٹھ سکی۔

حاجی صاحب کو میاں بیوی کی ناچاقی کا علم تھا مگر جب انہیں اس مار پیٹ کی خبر ہوئی تو ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا۔ وہ اسی وقت میوہ فروش کے گھر پہنچے اور بلقیس کو اپنے ہمراہ لے آئے۔ میوہ فروش نے معافی مانگی، منت سماجت کی مگر حاجی صاحب پر کچھ اثر نہ ہوا۔ انہوں نے کہا:

"اگر تم نے فوراً طلاق نہ دی تو میں تمہارے خلاف چارہ جوئی کروں گا۔"

میوہ فروش حاجی صاحب کے اثر و رسوخ کو بخوبی جانتا تھا، مقدمہ بازی سے خائف ہو کر ناچار طلاق دینے پر آمادہ ہو گیا۔

اب بلقیس سال بھر تک حاجی صاحب کے گھر پر رہی۔ جب کبھی حاجی صاحب اس کے رشتے کا سوال اٹھاتے تو وہ تنگ کر کہتی:

"ابا جان آپ کو میری کیوں فکر رہتی ہے۔ میں آپ پر بھاری ہوں کیا؟"

مگر ایک دُور اندیش باپ کی طرح حاجی صاحب نہیں چاہتے تھے کہ بلقیس زیادہ عرصے گھر میں بیٹھی رہے۔ علاوہ ازیں اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ اپنے اصلاحی کام میں ناکام رہے۔ ان کا منصوبہ ناقابلِ عمل ثابت ہوا مگر ایک مرتبہ فتح حاصل کر کے اب وہ کسی طرح اس شکست کے لیے تیار نہ تھے، چنانچہ انہیں پھر اس کی شادی کی فکر دامنگیر ہوئی اور بلقیس کچھ تو حاجی صاحب کے اصرار سے اور کچھ اپنے مستقبل کے خیال سے تیسری مرتبہ پھر شادی پر رضامند ہو گئی۔

اب حاجی صاحب نے شوہر کے انتخاب میں انتہائی حزم و احتیاط سے کام لیا اور مہینوں اس کے مزاج اور چال چلن کے بارے میں تفتیش کرتے رہے۔

یہ ایک نوعمر شخص تھا جو کسی دفتر میں معمولی کلرک تھا۔ حد درجہ کم سخن، بھولا بھالا، ناک نقشہ بھی اچھا تھا، البتہ ہاتھ پاؤں کا ذرا دبلا تھا۔ سارا دفتر اس کی سادگی، مزاج اور اطاعت گزاری کا معترف تھا۔ ایسے داماد کو پا کر حاجی صاحب مطمئن ہو گئے۔ ادھر بلقیس نے بھی خوشی خوشی اسے قبول کر لیا، البتہ اس بات کی ذرا خلش تھی کہ وہ عمر میں اس سے پانچ سال بڑی تھی۔

اس دفعہ حاجی صاحب نے اونچے خاندان اور روپے پیسے کا لالچ نہیں کیا تھا، بلکہ مصلحتاً غریب شوہر چنا تھا اور پھر روپے کی ضرورت بھی کیا تھی کیونکہ پچھلے مہروں کی رقمیں گھر کا سامان، زیور، کپڑا، لتا پہلے ہی وافر تھا۔ اس کلرک کا نام منیر تھا۔ اس کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ کم عمری ہی میں ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ کچھ دور کے رشتہ دار تھے مگر وہ اس کے خرچ کا بوجھ اٹھانے کو تیار نہ تھے اور اس نے یتیم خانے میں پرورش پائی تھی۔

بلقیس اور منیر خوش حالی اور فارغ البالی سے زندگی بسر کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ محبت کے بندھنوں نے ایک دوسرے کو جکڑ لیا۔ بلقیس کو ایسا محسوس ہوا کہ جو خوشی انور سے علیحدگی کے بعد اس سے چھن گئی تھی وہ اسے پھر مل گئی ہے۔ ادھر منیر بھی آٹھوں پہر اسی کا دَم بھرتا تھا۔ وہ ایسا صالح نوجوان تھا کہ کسی قسم کا نشہ یا لت اس کو نہ تھی۔ دفتر سے چھٹی ملتے ہی سیدھا گھر کا رخ کرتا اور پھر بیوی کی قربت میں ایسا کھو جاتا کہ دوسرے دن دفتر جانے کے وقت ہی گھر سے نکلتا۔

دن پر دن گزرتے گئے، ہفتے، مہینے اور پھر سال۔ دونوں کی محبت بڑھتی ہی چلی گئی۔ اب حاجی صاحب بھی بہت ضعیف ہو گئے تھے۔ تبلیغ اور ہدایت کا وہ پہلا سا جوش و خروش ان میں نہیں رہا تھا۔ گھر سے کم ہی باہر نکلتے۔ مگر ان کو اطمینان تھا کہ بالآخر ان کی محنت ٹھکانے لگ گئی۔

اسی طرح پانچ سال گزر گئے۔ اس دوران میں منیر کو نوکری کے سلسلے میں کئی جگہ تبدیل ہو کر جانا پڑا مگر وہ جہاں کہیں بھی جاتے بلقیس حاجی صاحب کو اپنی خیر و عافیت کی اطلاع دیتی رہتی۔

ایک دن حاجی صاحب کو ایک خط ملا جسے پڑھ کر اچانک ایک مرتبہ پھر دُنیا ان کی آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ بات یہ تھی کہ منیر کی صحت پچھلے سال سے دھیرے دھیرے گرنی شروع ہو گئی تھی۔ منیر کا ہر وقت گھر میں پڑے رہنا، کھیل، تفریح میں حصہ نہ لینا اس کی تندرستی کے لیے ضرر رساں ثابت ہوا۔ اسے ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا تھا اور کبھی کبھی کھانسی بھی اٹھنے لگی تھی۔ ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ یہ ابتدائی دِق کے آثار ہیں اور انہوں نے مشورہ دیا تھا کہ دفتر سے طویل رخصت لے لی جائے اور اسے کسی صحت افزا پہاڑی مقام پر رکھا جائے۔ خط کی آخری سطور یہ تھیں:

لیکن میرے پیارے ابا جان! آپ اس خبر سے زیادہ پریشان نہ ہوں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ منیر میاں سال بھر باقاعدہ علاج کرانے سے تندرست ہو جائیں گے۔ میں خود ان کی تیمارداری کروں گی اور جس صحت افزا مقام پر وہ رہیں گے میں ان کے ساتھ رہوں گی، شفا تو اللہ نے چاہا انہیں ضرور ہو جائے گی مگر اس میں تین چار سو روپیہ ماہوار اٹھے گا، سو اس کی آپ فکر نہ کریں۔ وہ جو میرے نام مکان ہے اسے فروخت کر دیں۔ آخر جائداد اِسی قسم کی ضرورتوں ہی کے لیے تو ہوتی ہے، جان ہے تو جہان ہے۔ امید ہے کہ آپ ان تمام باتوں کا جواب مفصّل لکھیں گے یا خود تشریف لائیں گے۔

آپ کے دیدار کی طالب
بلقیس

اس خط کو پڑھ کر حاجی صاحب گم سم رہ گئے۔ اچانک دل میں ایسا ضعف محسوس ہوا، گویا ان کا آخری وقت آپہنچا ہو۔ دو دن تک وہ گھر سے باہر نہ نکلے۔ تیسرے دن جب طبیعت

سنبھلی تو وہ لاٹھی ٹیکتے ہوئے اٹھے اور جائداد کی فروخت کے سلسلے میں کسی دلال کی تلاش میں نکلے۔ قدم گھر سے باہر رکھا ہی تھا کہ ایک تانگا ان کے دروازے کے سامنے آ کر رکا۔ اس میں ایک برقعہ پوش خاتون بیٹھی تھی ساتھ کچھ سامان تھا، دو تین ٹرنک، ایک اٹیچی کیس۔

حاجی صاحب ٹھہر گئے۔ ان کی صورت دیکھ کر اس خاتون نے چہرے سے نقاب اُٹھا دی۔ اس کا سن تیس پینتیس برس سے کسی طرح نہ کم ہو گا مگر اس کے حُسن میں ابھی تک غضب کی شادابی تھی۔

میں بہار کی بہن گُل ہوں۔" اس نے بڑی لجاجت سے کہنا شروع کیا۔

"دس سال ہوئے جیسے حضور نے میری بہن کو دین اور آخرت کی راہ دکھائی تھی ویسے ہی مجھ پر بھی کرم کی نظر ہو جائے ....."

بابے والا

یہ علاقہ سرکاری فائلوں میں تو محض "گورنمنٹ کوارٹرز ۳۵۵/ سی، کہلاتا تھا مگر یہاں کے ساکنوں نے بڑی جدوجہد کے بعد ایک ضمنی نام بھی سرکار سے منظور کرالیا تھا اور وہ تھا "گلستاں کالونی۔" یہ لوگ خود تو اپنے خطوں کی پیشانی پر خوش خطی سے "گلستاں کالونی" لکھتے ہی تھے۔ رشتہ داروں اور دوستوں کو تاکید تھی کہ بھی خط لکھتے یہی پتہ تحریر کریں، پھر بھی کبھی کبھی کوئی تانگہ والا شرارت یا انجان پن سے اس علاقے کو "بابو کالونی" کے نام سے پکار بیٹھتا تو اس کی جہالت پر یہ لوگ جھنجلا کر ہی رہ جاتے۔

"گلستاں کالونی" میں صرف ان ہی سرکاری ملازموں کو کوارٹر دیئے جاتے تھے جن کی تنخواہ ڈھائی سو سے ساڑھے چار سو تک ہوتی۔ اس گریڈ میں عموماً دفتروں کے سپرنٹنڈنٹ اسسٹنٹ انچارج، اکاؤنٹنٹ، آڈیٹر، سینئر اسٹینوگرافر، اوورسیئر اور اسی قبیل کے دوسرے ملازمین آتے تھے۔ تھے تو یہ بھی کلرک ہی مگر ذرا نفیس قسم کے، جیسے کلرکی کو دوآتشہ سہ آتشہ کردیا گیا ہو۔ ان کی حالت عام کلرکوں سے کہیں بہتر تھی اور وہ اپنی نسبتاً آسودہ حالی اور اپنے منصب کے باعث اپنے ہم چشموں میں خاصی عزت اور وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

اس علاقے کا نقشہ کچھ اس قسم کا تھا کہ کوئی نصف میل کے پھیلاؤ میں چار پانچ

سڑکیں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر شرقاً غرباً ایک دوسرے کے متوازی چلتی تھیں اور چار پانچ سڑکیں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر شمالاً غرباً چل کر انہیں کاٹتی تھیں، سب کوارٹر یک منزلہ اور ایک ہی وضع کے تھے، نہ چھوٹے نہ بڑے آگے ننھا سا باغیچہ اس کے بعد دو تین سیڑھیاں، پھر برآمدہ، برآمدے کے ساتھ ملے ہوئے دو کمرے، پیچھے آنگن، باورچی خانہ، توشہ خانہ وغیرہ۔ یہ کوارٹر ایک دوسرے کے عین سامنے تھے، بیچ میں صرف بیس فٹ کی سڑک تھی، چنانچہ اگر گھر کی مالکہ اپنی آزاد خیالی کی وجہ سے حجاب کی زیادہ قائل نہ ہوتی یا اپنے پھوہڑپن کی وجہ سے ذرا بھی غفلت برتتی تو اس کے سامنے والی بی ہمسائی بڑے مزے سے اس کے ہر قسم کے اعمال وافعال کا مشاہدہ کر سکتی تھی۔

گلستاں کالونی کسی ایک فرقے کے لیے مخصوص نہ تھی بلکہ اس میں ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی، سب ہی رہتے تھے، پھر زبانیں بھی یہاں بھانت بھانت کی بولی جاتی تھیں جن میں اردو، انگریزی، بنگالی، مدراسی اور پنجابی کو زیادہ دخل تھا البتہ ایک بات اس کالونی کے سب رہنے والوں میں مشترک تھی اور وہ تھی آرٹ اور فنونِ لطیفہ کی سرپرستی۔ ریڈیو سے تو کوئی گھر خالی ہی نہ تھا، چنانچہ دن کے بارہ بجے جب فرمائشی پروگرام چل رہا ہوتا، ایسے میں اگر کوئی یہاں آتا تو وہ ایک پورا فلمی گانا بغیر تسلسل ٹوٹے پھر کر سن سکتا ہے۔ اس کالونی کے باشندے متمدن سمجھے جانے کے بہت متمنی تھے۔ تنگی ترشی میں گزر کرتے، مگر ظاہری ٹھاٹھ میں فرق نہ آنے دیتے۔ ہر گھر میں صبح کو پابندی کے ساتھ ڈبل روٹی، مکھن اور اخبار آتا۔ اخبار کا صاحبِ خانہ بے چینی سے منتظر رہتا۔ جب باری باری اور سب لوگ دیکھ چکتے تو آخر میں گھر کے بڑے بوڑھے کوارٹر کے باہر کرسی یا مونڈھا ڈال بیٹھ جاتے اور اخبار کو عینک کے قریب لا لا کر گھنٹوں اس کے مطالعے میں غرق رہتے۔

یوں تو اس کالونی میں مصوّری اور بت تراشی کا بھی خاصا چرچا تھا، مگر لوگ سب سے زیادہ گانے بجانے کے رسیا تھے۔ ریڈیو پر موسیقی کے پروگرام تو ذوق شوق سے سنتے ہی

جاتے تھے۔ کبھی کبھی ان کوارٹروں میں میوزک پارٹیاں بھی منعقد ہوتیں جن میں شہر کے مشہور مشہور گانے والوں کو بلوایا جاتا۔ اس طرح ایک تو موسیقی کی سرپرستی ہوتی، دوسرے مقامی جوہر کو ان کا کمالِ فن دیکھنے اور سیکھنے کا موقع ملتا۔ کئی گھروں میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے میوزک ماسٹر رکھے گئے تھے صبح کو جیسے ہی مرد ناشتہ سے فارغ ہو کر دفتروں کی راہ لیتے، ان کے گھروں سے گھنگھروؤں کی جھنک کے ساتھ ساتھ بوڑھے کتھک کی گمبھیر آواز "تا تھئی تھئی۔ تا تھئی تھئی" سنائی دینے لگتی۔

اس علاقے کی چہل پہل خاص طور پر شام کو دیکھنے کے قابل ہوتی جب مرد دفتروں سے آچکے ہوتے اور برآمدے میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ بیٹھ کر چائے پینے یا کسی مہمان کی تواضع میں مصروف نظر آتے جس کی پرانی، عموماً کالے رنگ کی، چھوٹی موٹر گھر کے دروازے کے عین سامنے کھڑی ہوتی یا جب یہاں کی نوخیز لڑکیاں اور جوان عورتیں نئے نئے سنگار کیے نئی نئی تراش کے لباس پہنے اس نواح کی سڑکوں پر جھرمٹوں کی صورت مصروفِ خرام ہوتیں۔ ایسے میں اگر کوئی ناواقف آدمی ادھر آنکلتا تو وہ ان لڑکیوں کو تکتا کا تکتا ہی رہ جاتا۔

گلستاں کالونی کی ان سرگرمیوں کو عام طور پر استحسان کی نظروں سے دیکھا جاتا اور خود وہاں کے باشندے بھی اپنی روشن خیالی اور آزادہ روی پر مسرور معلوم ہوتے تھے، البتہ اس علاقے کا ایک طبقہ ایسا تھا جس کو کالونی والوں کی ان تمدنی ترقیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ وہ چپکے چپکے ان باتوں پر سخت تنقید کرتا تھا، یہ اس علاقے کے وہ بڑے بوڑھے تھے جو نوکری اور ہر قسم کے کام کاج سے سبکدوش ہو کر اپنا آخری وقت اپنے بیٹوں کی کمائی کے سہارے گزار رہے تھے۔ گھر کے معاملات میں ان کا کوئی دخل نہیں رہا تھا۔ اگر وہ کوئی بات معاشرے کی اس نئی روش کی برائی میں کہتے تو گھر کے سب چھوٹے بڑے اسے دقیانوسی کہہ کر مذاق اُڑا دیتے اور ان کے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہتا کہ جب تک گھر پر رہیں، اپنی آنکھیں اور

کان بند رکھیں اور کھانے پینے یا اخبار پڑھنے کے علاوہ کسی کام سے سروکار نہ رکھیں۔

گھر پر تو ان بڈھوں کا بس نہ چلتا، البتہ ہر روز تیسرے پہر وہ کالونی کے ایک چوک میں بڑی شان سے اپنی منڈلی جمایا کرتے، گرمیوں میں اس جگہ چھڑکاؤ کر کے آٹھ دس مونڈھے بچھا دیے جاتے جن پر یہ بوڑھے بیٹھ کر دو تین گھنٹے تک خوب خوب دل کی بھڑاس نکالتے۔ زمانے کی نئی روشنی کے خلاف عورتوں کی بڑھتی ہوئی آزادی کے خلاف، اپنے بیٹوں کی بے راہ روی کے خلاف، بے پردگی کے خلاف، فنون لطیفہ کی آڑ میں جن بے حیائیوں کو روا رکھا جاتا ہے ان کے خلاف، زن و مرد کے بے محابا اختلاط کے خلاف، ناچ گانے اور خصوصاً فلمی گانوں کے خلاف۔ لطف یہ کہ جب اس طرح وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر کے گھر پہنچتے تو ان میں سے کسی کی پیاری پوتی جس کی عمر سات سال ہوتی اپنے ماں باپ اور ان کے احباب کی پُرشفقت اور پُرتحسین نظروں کے سامنے کولھے مٹکا مٹکا کر گا رہی ہوتی "ناچو ناچو پیارے من کے مور" اور یہ بڑے میاں چپکے سے اپنے کمرے میں جا کر اندر سے دروازہ بند کر لیتے۔

گلستاں کالونی کی چہل پہل میں اضافہ کرنے میں ایک اور ہستی کا بھی بڑا دخل تھا اور یہ تھا باجے والا۔ باجے والا بیس بائیس برس کا ایک نوجوان تھا۔ گندمی رنگ، ناک نقشہ برا نہیں تھا۔ اسے دیکھ کر یہ بتانا مشکل تھا کہ وہ کس صوبے کا رہنے والا ہے۔ وہ خود کو بمبئی کا باشندہ بتلاتا تھا مگر اس کے شین قاف کی درستی کہے دیتی تھی کہ اس کا تعلق ملک کے جنوبی حصے سے نہیں بلکہ شمالی حصے سے ہے۔ اپنے وضع قطع اور لباس سے وہ سرکس کے مسخروں سے ملتا جلتا تھا۔ کبھی سیاہ ٹیل کوٹ اور سیاہ ٹاپ ہیٹ، کبھی شب خوابی کا رنگ دار دھاریوں والا پاجامہ اور سر پر تنکوں کی بنی ہوئی انگریزی ٹوپی، کبھی بنگالی فلم ایکٹروں کی تتبع میں کھدر کا لمبا کرتہ اور لہراتی ہوئی دھوتی کبھی شکاریوں کی طرح برجس ڈالے ہوئے۔ کبھی کبھی ٹاپ ہیٹ کی جگہ سرخ ترکی ٹوپی لے لیتی۔ چہرے پر ایکٹروں کی طرح گاڑھا گاڑھا میک اپ کیا ہوا۔ آنکھوں

میں کاجل، ہونٹوں پر لپ اسٹک، اس کے ساتھ باریک باریک مونچھیں، وہ جو لباس بھی پہنتا ایسا بے ہنگم ہوتا کہ دیکھ کر بے اختیار ہنسی آجاتی۔ اس نے اپنی سائیکل کا حلیہ بھی بگاڑ رکھا تھا اور اس کے ہینڈل اور مڈگارڈوں پر رنگ دار کاغذ کی بنی ہوئی جھنجھیریاں لگا رکھی تھیں جو ہوا سے آپ ہی آپ گھومتی رہتیں۔ گلے میں ایک چھوٹا سا بکس ڈال رکھا تھا جس میں طرح طرح کی ٹافیاں، چوسنے والی گولیاں، رنگترے کی پھانکیں اور میٹھی سونف کی پڑیاں ہوتیں۔ علاوہ ازیں وہ فلمی ایکٹروں کے فوٹو اور فلمی گانے کی کتابیں بھی بیچا کرتا تھا ایک ہاتھ ہینڈل پر، دوسرے ہاتھ میں ایک بڑا سا کالے رنگ کا بھونپو۔ اس کو منہ سے لگا کر جس وقت وہ ''باجے والا، باجے والا'' کی آواز لگاتا، تو گھروں میں ہلچل سی مچ جاتی۔ بچے پیسوں کے لیے مچلنا شروع کر دیتے اور وہ تیر کی طرح باجے والا کے پاس پہنچ جاتے۔

''باجے والا'' کے الفاظ وہ لہک لہک کر ادا کرتا کہ وہ ایک نغمے کی طرح معلوم ہوتے جس میں کئی اترے ہوئے سر لگتے۔ اس کا یہ گانا اس کی آمد کا اعلان ہوتا۔

دل کا نیک تھا۔ بچوں کو ان کے دام سے کچھ زیادہ ہی مٹھائیاں دے دیا کرتا۔ کبھی کسی بچے کے پاس پیسہ نہ ہوتا تو مفت ہی ایک آدھ چوسنے والی گولی دے دیتا۔ وہ ''باجے والا'' کی الاپ کے علاوہ اور بھی بہت سے گانے گایا کرتا۔ یہ فلموں کے چلتر گانے ہوتے جن میں پریم اور پریمی، بھونرے اور پپیہے کا ذکر ایسے پُر سوز طریقے پر ہوتا کہ انہیں سن کر بلوغت کو پہنچنے والی لڑکیوں کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی اور وہ اپنے چھوٹے بھائیوں یا بہنوں کو آنہ یا ٹکا دے کر میٹھی سونف منگوایا کرتیں۔

اس کی آواز ایسی مدھر تھی کہ جب وہ کوئی فلمی گانا گاتا تو لوگ اس کے مسخرے پن کو بھول کر گانے پر جھوم اٹھتے۔ اس کی یہ آواز اس کے کاروبار کی کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ تھی۔ عورتوں کو گھورنا یا ان پر آوازے کسنا اس کی عادت نہ تھی یہ اور بات ہے کہ آواز گانے کے پردے میں بہت کچھ کہہ جاتی۔

وہ اس کالونی میں ہفتے میں ایک آدھ بار ہی آیا کرتا، یہی وجہ ہے کہ اس کے آتے ہی بچے بڑے جوش و خروش سے اس کے خیر مقدم کے لیے دوڑتے، بچے جس قدر اس سے خوش تھے، ان کے ماں باپ اتنا ہی اس سے بیزار، کیونکہ اس کے آنے پر انھیں بچوں کی ضد پوری کرنی پڑتی تھی خواہ جیب میں پیسہ ہو یا نہ ہو اور ان بڑے بوڑھوں کی ناراضگی کا تو پوچھنا ہی کیا۔ انھیں اس کے مسخروں کے سے لباس اور عاشقانہ گیتوں سے سخت چڑ تھی، کیونکہ ان کے خیال کے مطابق ان گانوں سے شر[illegible] کی بہو بیٹیوں کا اخلاق بگڑ تا تھا۔ اگر ان بڈھوں کا بس چلتا تو وہ اسے پولیس کے حوالے کر کے حوالات میں بند کرا دیتے مگر جب تک اس سے کوئی مجرمانہ حرکت سرزد نہ ہو ایسا ممکن نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان بڑے بوڑھوں کو گھر کی طرح اس معاملے میں بھی صبر ہی سے کام لینا پڑتا تھا۔

آخر ایک دن ایسا آیا جب ان کے صبر کا پیمانہ سچ مچ لبریز ہو گیا، اور ادھر وہ لوگ جو عورتوں کی آزادی کے بڑے حامی تھے سوچ میں پڑ گئے کہ کہیں ہمیں تو غلطی پر نہیں ہیں۔

ہوا یہ کہ اس کالونی میں ایک بنگالی بابو رہتا تھا۔ بڑا خوش خلق اور شریف طبع۔ کالونی میں اس کا بڑا مان تھا۔ وہ کسی دفتر میں سپرنٹنڈنٹ تھا۔ اس کی دو بیٹیاں تھیں۔ میرا اور سیتا۔ میرا کی عمر تیرہ برس اور سیتا کی عمر چودہ برس۔ وہ کاٹھیاواڑ کے ایک کتھک سے ناچ سیکھا کرتی تھیں۔ اس کتھک کی عمر کوئی تیس بتیس سال کی تھی۔ حد درجہ کا چرب زباں۔ اس جواں عمری ہی میں گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا تھا۔ ایک دن دوپہر کو وہ کسی تماشے کے پاس لے کر آیا اور لڑکیوں کو تماشہ دیکھنے پر اکسایا۔ بنگالی بابو دفتر میں تھا۔ لڑکیوں نے ماں سے اصرار کر کے اجازت لے لی۔ اس کے بعد دونوں لڑکیاں اور کاٹھیاواڑی کتھک ایسے غائب ہوئے کہ نہ جانے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔

بعض لوگ کہتے کہ دونوں بہنیں ایکٹرس بننے کے شوق میں بمبئی بھاگ گئیں۔ بعض کہتے یہیں اسی شہر کے ایک سیٹھ کے قبضے میں ہیں جس نے انھیں تالوں میں بند کر رکھا ہے۔

یہ کتھک بھی اسی سیٹھ کا سکھایا پڑھایا تھا۔ غرض جتنے منہ اتنی ہی باتیں، تھانے میں رپٹ لکھوادی گئی تھی مگر ابھی تک کسی کا کھوج نہیں ملا تھا۔

جس دن یہ واقعہ پیش آیا کالونی میں ایک تہلکہ سا مچ گیا۔ کالونی والوں کے چہرے اُتر سے گئے جیسے کوئی موت واقع ہو گئی ہو۔ ریڈیو پر فلمی گانے سننے بند کر دیے گئے۔ اور ایک سوگ کا ساسماں بندھ گیا۔ کالونی کے ایک کایستھ کی بیٹی ایک ستاریے سے ستار سیکھا کرتی تھی۔ کایستھ نے اسی دن اسے برطرف کر دیا۔ یہ واقعہ تھا تو بہت افسوس ناک مگر ان بڑے بوڑھوں کے حق میں تائید غیبی ثابت ہوا۔ کالونی میں یک لخت ان کا وقار بڑھ گیا۔ یہ بڈھے جو پہلے سر ڈالے سائے کی طرح چپکے سے گلی کوچوں سے گزر جاتے تھے اب انہیں راستوں پر کھنکارتے زور زور سے لاٹھی ٹیکتے، سر اٹھا اٹھا کر چلنے لگے۔ وہ اپنے بیٹوں کو کھری کھری سناتے اور اس نئی تہذیب کی خوب خوب دھجیاں اڑاتے۔ برسوں سے اس کے خلاف دلوں میں جو نفرت کا طوفان امنڈ رہا تھا وہ ایک دم پھوٹ پڑا۔ اب ان کے خود سر بیٹوں کے لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ خاموشی سے سنتے رہیں اور سر جھکالیں۔

جس دن یہ واقعہ پیش آیا تھا اس دن بڈھوں کی اس منڈلی میں بڑا جوش و خروش نظر آنے لگا تھا۔ یہ لوگ بلند آواز سے اس پر حاشیہ آرائی کرتے اور جلے دل کے پھپھولے پھوڑتے، ان کے لیے یہ ماجرا روز کا ایک مستقل موضوع بن گیا تھا۔

"دید جی" مونڈھے پر بیٹھے ہوئے ایک بڑے میاں نے اپنے ساتھ والے بڈھے سے خطاب کیا۔ "اگر ایسا ہی ایک واقعہ اور ہو جائے تو میں مسلمان لڑکیوں کی طرح اپنی پوتیوں کو برقع پہنانا شروع کر دوں۔"

اس پر منڈلی میں ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔

"گپتا جی بھی کمال کرتے ہیں۔" ایک سفید ریش مقطع صورت بزرگ گویا ہوئے "شرافت کوئی برقع میں تھوڑی ہے یہ تو دل میں ہونی چاہیے۔"

"سچ کہتے ہو خان صاحب۔" ایک اور پیر مرد نے تائید کی اور خان صاحب نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ان بزرگ کا شکریہ ادا کیا۔ خان صاحب کی بہو پردہ نہیں کرتی تھی اور جوان بیٹیاں بھی بے نقاب ہی کالج جاتی تھیں۔

منڈلی میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اچانک "باجے والا" کی آواز سنائی دی کالونی کی اس اداس اور سوگ بھری خاموشی میں یہ آواز ایسی معلوم ہوئی جیسے قبرستان میں کوئی بدمست شرابی آگھسے اور بنکارنا شروع کردے۔

بڈھوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر بخشی جی، جو تھے تو ساٹھ کے پیٹے میں مگر جوانوں کا سا دم خم رکھتے تھے مونڈھے سے اٹھے اور باجے والا کو اپنے طرف آنے کا اشارہ کیا۔

"کیا بیچتے ہو تم؟" بخشی جی نے غصہ بھری آواز میں پوچھا۔

باجے والا متعجب سا ہو کر مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔

"میں پوچھتا ہوں کیا بیچتے ہو تم؟" بخشی جی نے پہلے سے زیادہ غصہ میں کہا۔

"ٹافی چوسنے والی گولیاں، میٹھی سونف" باجے والا نے بدستور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"لاؤ دکھاؤ۔"

اس نے بائیسکل کو اسٹینڈ پر کھڑا کر دیا اور گلے میں پڑا ہوا بکس کھول کر سب چیزوں کا ایک ایک نمونہ دکھانے لگا۔

"بے ایمان کہیں کا۔" بخشی جی اچانک ہی برس پڑے۔ "یہ ٹافی تو گڑ کی ہے، بچوں کو ٹھگنے کے لیے یہ چار سو بیس!"

"باجے والا کچھ پریشان سا نظر آیا مگر مسکراتے ہوئے ادب سے بولا:

"حضور، اوّل تو یہ درست نہیں کہ یہ ٹافی گڑ کی ہے، دوسرے یہ چیزیں میں خود

تھوڑا ہی بناتا ہوں۔ یہ تو کمپنی کا مال ہے۔ میں بنا بنایا مال لاتا ہوں۔"

اس اثنا میں تین چار بوڑھے اور منڈلی سے اٹھ کر باجے والا کے پاس پہنچ گئے اور اس کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔

"کیا ٹرٹر لگائی ہے۔" یہ کہتے ہی گپتا جی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ زور کا ایک چانٹا باجے والے کے منہ پر جڑ دیا۔ "ایک تو چور اوپر سے کمپنی کا رعب جماتا ہے، لے اور لے۔"

گپتا جی پہل کر چکے تھے۔ چاروں طرف سے باجے والا پر بے بھاؤ کی پڑنے لگیں ادھر اس کا یہ حال کہ ہر تھپڑ یا چانٹے پر وہ پہلے سے زیادہ ہکابکا ہو کر اپنے مارنے والے کا منہ تکنے لگتا۔

اس کی ناپ ہیٹ اچھل کر زمین پر آ رہی تھی۔ اس کے گالوں پر انگلیوں کے نشان پڑ گئے تھے۔ گالوں اور ہونٹوں کی سرخی میں کاجل کی سیاہی مل گئی تھی۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ ایک بزرگ نے اس کے ٹیل کوٹ کی ٹیل تو چ ڈالی تھی، اس کا مٹھائیوں والا بکس کھل گیا تھا اور ٹافیاں، چاکلیٹ، رنگترے کی پھانکیں، میٹھی سونف کی پڑیاں زمین پر آ رہی تھیں۔ فلمی ایکٹروں کی تصویریں، گانوں کی کتابیں، فلمی پریوں کی داستانیں زمین پر بکھری پڑی تھیں۔

"حرام زادہ۔ سور کا بچہ بڑا ایکٹر بنا پھرتا ہے۔ بدمعاش . . جا اب تو چھوڑ دیا پھر کبھی اِدھر رخ نہ کی جیو۔" اور بڑے بوڑھوں نے خود ہی تھک کر اس کا پیچھا چھوڑ دیا اور ہانپتے ہوئے آ کر پھر اپنی منڈلی میں آ براجے۔

باجے والا مظلومی کی تصویر بنا دیر تک زمین پر بیٹھا مٹھائیاں، تصویریں اور کتابیں اٹھاتا اور جھاڑ جھاڑ کر اپنے بکس میں رکھتا رہا۔ کبھی کبھی وہ ان بوڑھے بابوؤں پر بھی ایک نظر ڈال لیتا۔ آخر وہ زمین سے اٹھا، گلے میں مٹھائیوں کا بکس ڈالا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اس طرف گیا جہاں سائیکل کھڑی تھی۔ پھر سائیکل پر بیٹھ خاموشی سے اس نواح سے رخصت ہو گیا۔

اس مار پیٹ سے اس کا جسم درد کرتا تھا۔ اسے بے عزتی کا بھی بہت غم تھا مگر اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ کس جرم کی پاداش میں یہ سزا دی گئی۔

اس کے بعد گلستاں کالونی میں باجے والا کی آواز پھر کبھی نہ سنائی دی۔

سایہ

دن بھر جیسے جیسے سائے گھٹتے بڑھتے اور زاویے بدلتے رہتے۔ سبحان کی دکان بھی جگہیں بدلتی رہتی۔ صبح کو سورج نکلنے سے پہلے ہی وہ اپنا ٹھیلہ وکیل صاحب کے مکان کے سامنے سڑک کے اس کنارے پر لا کھڑا کرتا۔ اس طرف کوئی عمارت نہ تھی۔ زمین بھوبھل کی طرح تھی اور تھوڑی سی ڈھلوان کے بعد ایک میدان آتا تھا جس پر پیپل کا ایک پرانا پیڑ تھا۔ جب سورج وکیل صاحب کے چومنزلے مکان کے پیچھے سے ابھرتا اور دھوپ دھیرے دھیرے پیپل کی چوٹی سے اترنی شروع ہوتی اور کوئی دو ڈھائی گھنٹے میں مکان کا احاطہ کرتی، ڈھلوان پر چڑھتی ہوئی سڑک کے کنارے تک پہنچ جاتی تو وہ اپنا ٹھیلہ سڑک کے اس کنارے وکیل صاحب کے مکان کے زینے کے ساتھ ملا کر کھڑا کر دیتا اور یوں اس اونچے مکان کا سایہ دو تین گھنٹے تک اور اسے دھوپ سے بچائے رکھتا۔

لیکن جب سورج عین سر پر آجاتا اور سایہ مختصر ہوتے ہوتے ایک لکیر سی بن کے رہ جاتا تو اسے ناچار اپنا ٹھیلہ ڈھلوان پر سے دھکیل کر میدان میں پیپل تلے لے جانا پڑتا جہاں وہ دو تین بجے تک ڈیرا جمائے رہتا۔ اس کے بعد سورج ڈھلنا شروع ہوتا تو پیپل کے سائے کے ساتھ ساتھ اس کی دکان بھی آگے سرکنی شروع ہو جاتی۔ یہاں تک کہ شام ہوتے ہوتے وہ پھر وکیل صاحب کے مکان کے سامنے سڑک کے اسی کنارے پر پہنچ جاتا جہاں

زمین بھوبھل کی طرح تھی اور جہاں اس نے علی الصباح ٹھیلہ کھڑا کیا تھا۔ خاص طور پر گرمیوں میں اس کی دکان یوں ہی جگہیں بدلتی رہتی تھی۔

وکیل صاحب کا مکان سبحان کو دھوپ ہی سے پناہ نہ دیتا تھا بلکہ اس کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ بھی تھا۔ وکیل صاحب ایک وسیع کنبے کے سرپرست تھے۔ ان کا شمار شہر کے مشہور وکیلوں میں ہوتا تھا۔ بڑے بااخلاق، ملنسار اور مہماں نواز، جب تک گھر پر رہتے، ملنے والوں کا تانتا لگا رہتا، کچہری جاتے تو پیچھے بیگم صاحب ان کی ہردلعزیزی کو برقرار رکھتیں۔ ان کی اپنی ملنے والیاں بھی کچھ کم نہ تھیں۔ اس پر وکیل صاحب کے موکلوں کی بیویوں کی مدارات کرنا بھی ان کے فرائض میں داخل تھا۔ چنانچہ سبحان کے ٹھیلے سے سوڈالیمن کی بوتلوں، برف، پان، سگریٹ وغیرہ کی تھاک بندھی رہتی۔

یہ علاقہ شہر کے سرے پر تھا جہاں شہر کی حد ختم ہو جاتی اور کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ اس جگہ مکان خال خال ہی تھے اور کوئی دکان قریب نہ تھی۔ بھلا دو ایک گھروں کے آسرے کون ایک مستقل دکان کا متحمل ہو سکتا۔ رہا سبحان، اس کی بات دوسری تھی۔ اوّل تو اس کے ٹھیلے کا خرچ ہی کیا تھا۔ کرایہ دینا پڑتا تھا نہ بجلی پانی کا بل۔ پھر دنیا میں کوئی رشتہ دار تھا نہ عزیز گھر تھا نہ در۔ اس کی ضروریاتِ زندگی اس قدر مختصر تھیں کہ صرف وکیل صاحب کے مکان کی آمدنی ہی سے پوری ہو جاتی تھیں، اور وہ شہر کے چوکوں کے ٹھیلے والوں اور دوسرے دکانداروں کی باہمی چشمکوں سے الگ تھلگ اس سنسان مگر عافیت کی جگہ میں خوش تھا۔

وکیل صاحب نے جب نئی نئی وکالت شروع کی تھی تو انہیں مجبوراً شہر کے ایک بارونق بازار میں رہنا پڑا تھا۔ چھوٹا سا مکان، کرایہ حد سے بڑھا ہوا۔ مگر رفتہ رفتہ جب کام چل نکلا اور لوگ ان کو جاننے لگے تو انہوں نے اس نواح میں ایک موکل کی زمین سستے داموں خرید لی۔ یہ زمین ایک عرصے تک یونہی پڑی رہی۔ رفتہ رفتہ جب انہوں نے تعمیر کے لیے روپیہ جمع کر لیا اور اپنے حسبِ منشا مکان بنوا لیا تو وہ اپنے وسیع کنبے کو لے کر اس میں اٹھ

آئے۔ ان کے دم قدم سے تھوڑے ہی دنوں میں اس علاقے میں زندگی کے آثار نظر آنے شروع ہو گئے۔ دور دور سے تانگے والے ان کے موکلوں کو لے کر یہاں پہنچنے لگے۔ چونکہ وکیل صاحب خود بھی تانگے ہی میں بیٹھ کر کچہری جایا کرتے تھے، اس لیے دو ایک تانگے صبح شام ان کے مکان کے آس پاس کھڑے نظر آنے لگے۔ کبھی کبھی کوئی موٹر بھی تھوڑی دیر کے لیے ان کے مکان کے نیچے رک کر اس نواح کی رونق بڑھا جاتی۔

وکیل صاحب کے گھر کے علاوہ سبحان کی آمدنی کا ذریعہ یوں تو وہ اکا دکا راہ گیر بھی تھے جو شہر سے دیہات یا دیہات سے شہر جاتے ہوئے اس سے ایک دو پیسے کی ..... بیڑیاں، گڑ کی ریوڑیاں یا بھنے ہوئے چنے خریدنے ٹھہر جاتے مگر ان سے یافت کم اور کوفت زیادہ ہوتی خصوصاً اس وقت جب دیہاتنیں سر اور تھوڑی پر دوپٹے کے بل دیے ناک اور منہ چھپائے اپنی پھٹی جوتیاں گھسیٹ گھسیٹ کر چلتیں تو سڑک پر گرد و غبار کا ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوتا اور سبحان کو سوڈے کی بوتلوں سے گرد دور کرنے کے لیے پانی کا ایک اور چھینٹا دینا پڑتا۔

ان راہ گیروں سے بھی زیادہ اس کی بکری تانگے والوں سے ہوتی تھی جو یوں تو کمر کے نیچے سے پھٹا ہوا خاکی پاجامہ پہنے ہوتے مگر قینچی سے کم درجے کا سگریٹ پینا ان کی طبع کو پسند نہ تھا اور جب پیاس لگتی تو پانی کے بجائے برف میں لگے ہوئے لیمن کے اَدّھے سے ان کی تسکین ہوتی تھی۔

کبھی کبھار ایسا ہوتا کہ جب سبحان دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں لاوارث سانڈوں، کتوں، بھک منگے لڑکوں کے ساتھ پیپل کے سائے تلے پناہ لے رہا ہوتا اور بکری سے بے نیاز اسٹول پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگتا تو ایسے میں کوئی دیہاتی برات دولہا دلہن سمیت، پسینے میں شرابور، گلے ماتھے اور کلائیوں پر سستے ریشمی کپڑوں کا رنگ لگا ہوا، پیاس سے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی اس پیپل تلے ستانے اور پڑاؤ کرنے پر مجبور ہو جاتی اور سبحان کی کئی دنوں کی کسر ایک دن میں نکل جاتی۔

سبحان کو اس علاقے میں ٹھیلہ لگاتے پانچ برس ہو چکے تھے۔ یہی ایک ایسا کام تھا جو اس نے ایک جگہ جم کر اتنے عرصے تک کیا تھا ورنہ اس کی ساری عمر گھومنے پھرنے میں گزر گئی تھی۔ ابھی وہ دس برس کا بھی نہ ہوا تھا کہ فکرِ معاش نے اسے گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے بچپن اور جوانی میں بیسیوں دھندے کئے تھے۔ آج اِس شہر میں تو کل اُس شہر میں۔ کبھی کسی گھر میں اوپر کے کام پر ملازم ہے تو کبھی کسی دفتر میں چپراسی ہے، کبھی ریلوے شاپ میں، تو کبھی چھاپے خانے میں۔ کچھ عرصہ فوج میں بھی رہا۔ جب تک ہاتھ پاؤں میں سکت رہی۔ آزاد مزدوری ہی کو ہر کام پر ترجیح دی، مگر جب جوانی گزر گئی اور بڑھاپے کے آثار نمودار ہونے شروع ہو گئے تو طبیعت محنت مشقت سے خود بخود بھاگنے لگی، آخر اس نے اتنی رقم جمع کر لی کہ ایک ٹھیلہ خرید لے پہلے پہل اس نے پھل اور سبزیاں ٹھیلے پر رکھ کر شہر کا چکر لگانا شروع کیا مگر تھوڑے ہی دنوں میں اس کام سے بددل ہو گیا۔ اوّل تو منڈی کے بھاؤ کو سمجھنا اور مول تول کرنا اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ مال کو پرکھنے میں بہت جلد دھوکا کھا جاتا، پھر مال نہ بکے تو گل سڑ کر یا باسی ہو کر خراب ہو جاتا اور پھر یہ کہ دوسرے ٹھیلے والوں سے خواہ مخواہ کے جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ دن بھر پولیس والوں کی گھڑکیاں اور جھڑکیاں سہنی پڑتی تھیں چنانچہ اس نے زیادہ منافع کے خیال کو چھوڑ کر پان سگرٹ کی دکان پر اکتفا کی اور شہر کا ایک ایسا الگ تھلگ گوشہ تلاش کر لیا جہاں کسی قدر چین سے زندگی کے دن پورے کر سکے۔

ادھر وکیل صاحب یہ دیکھ کر کہ یہ دکان محض ان کے گھر کے آسرے ہی پر لگائی گئی ہے اس کی سرپرستی کرنا اپنا فرض سمجھنے لگے تھے۔ چنانچہ ماما اور نوکروں کو تاکید تھی کہ سب اسی سے سودا خریدیں اور اگر کچھ شکایت ہو یا چیزیں مہنگی معلوم ہوں تو ان کو اطلاع دیں مگر سبحان کسی قسم کی شکایت کا موقع ہی نہ آنے دیتا۔ وہ نوکروں سے ہنسی مذاق کی باتیں کر کے اور ایک آدھ پان یا بیڑی مفت کھلا پلا کے ہمیشہ انھیں خوش رکھنے کی کوشش کیا کرتا۔

یوں بھی وہ ہنس مکھ اور طبیعت کا نیک تھا۔ لگائی بجھائی کی عادت نہ تھی اس لئے سب سے خوب بنتی تھی۔ ٹہلیہ لگانے کے ساتھ اس نے ڈاڑھی رکھ لی تھی...... کتروانے لگا تھا۔ خشخشی ڈاڑھی، تنکوں کی بنی ہوئی مخروطی وضع کی ایک ہلکی پھلکی ٹوپی ہر وقت سر پر رہا کرتی۔ چار خانہ تہمد، گاڑھے کا کرتا۔ اس پر خاکی زین کا کوٹ اپنی اسی وضع سے وہ خاصا دین دار معلوم ہوتا تھا۔ حالانکہ صوم وصلوٰۃ سے اسے کوئی واسطہ نہ تھا۔

ان پانچ برس میں جو اس نے وکیل صاحب کے مکان کے سائے میں گزارے تھے وہ ان کے خاندان کے بہت سے حالات سے آگاہ ہو گیا تھا۔ اسے ایک ایک فرد کے عادات و اطوار کا علم تھا۔ یہاں تک کہ پردے میں رہنے والی عورتوں کا ناک نقشہ، ان کی سیرت اور سبھاؤ بھی اس سے چھپا ہوا نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بیگم صاحبہ کے سارے بچے ایک ہی چھاتی کا دودھ پی کر پلے ہیں، کیونکہ دوسری چھاتی میں دودھ نہیں اترتا۔ جانتا تھا کہ منجھلی صاحبزادی سب بہن بھائیوں سے زیادہ غصیلی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ وکیل صاحب کے والد ماجد میر صاحب بڑ قصاب تھے مگر بیٹے کے کہنے پر انہوں نے وہ پیشہ چھوڑ دیا تھا۔ غرض کئی اور ایسی باتیں جن کا وکیل صاحب کے بہت سے ملنے والوں کو سان گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔

اسی طرح اسے مکان کے ایک ایک حصے اور اس کی آرائش کا حال بھی معلوم تھا، حالانکہ گھر تو گھر اس نے کبھی سیڑھیوں میں بھی قدم نہ رکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کس کمرے میں کون رہتا ہے۔ وکیل صاحب کا دیوان خانہ کہاں ہے۔ بیگم صاحب ملنے والیوں سے کہاں ملاقات کرتی ہیں۔ بڑی صاحبزادیاں اور صاحبزادے رات کو کہاں سوتے ہیں، ہارمونیم کون بجاتا ہے۔ وہ پرانا بڑا کلاک جس کا گھنٹہ رات کو پچھلے پہر کے سناٹے میں سنائی دیا کرتا ہے، کس کمرے میں ہے۔ باورچی خانہ کس منزل پر ہے اور بوڑھے میر صاحب اور نوکر چاکر کس طرح رہتے سہتے ہیں۔

یہ باتیں اسے کچھ تو بچوں کے بھولے پن سے، کچھ نوکروں کی بے احتیاطی سے اور

کچھ خود اپنی ٹوہ لگانے کی عادت سے معلوم ہو گئی تھیں لیکن انھیں معلوم کرنے میں کسی بری نیت کو دخل نہ تھا۔ بس اسے انسانی ہمدردی کہہ لیجئے یا دل بہلاوے کی ایک صورت۔ آخر زندگی میں کچھ لگاؤ تو ہونا ہی چاہیے تھا ورنہ اس ویرانے میں ایک ایسے شخص کا جس کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو، دن گزارنا اجیرن ہو جاتا۔

اس پانچ سال کے عرصے میں سبحان کے سامنے وکیل صاحب کے خاندان میں دو نئے رکنوں کا اضافہ ہوا تھا۔ ایک صاحبزادہ، ایک صاحبزادی اس سے پہلے جو صاحبزادے گئی گودوں میں رہتے تھے وہ اب بہن کی انگلی پکڑے سبحان کی دکان سے اپنے لیے مٹھائی کی گولیاں لینے خود آنے لگے تھے۔ ان کے لیے ابھی پاجامہ پہننا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا۔

ان بہن بھائیوں سے دو بڑے صاحبزادے علی الصباح سب سے پہلے مکان سے نکلتے۔ ایک کی عمر نو برس، دوسرے کی گیارہ برس، ایک ہی طرح کے کوٹ، ایک ہی طرح کی ٹوپیاں ایک ہی طرح کے بستے، اسکول روانہ ہونے سے پہلے وہ سبحان سے دو دو پیسے کی چوسنے والی سنگترے کی پھانکیں خریدتے۔ سبحان سب سے پہلی ان ہی کی بوہنی کیا کرتا جس دن انھیں آنے میں دیر ہو جاتی، وہ سمجھ جاتا کہ آج اسکول میں چھٹی ہے۔ وہ ان کے لیے ہمیشہ بڑھیا سے بڑھیا سنگترے کی پھانکیں اور دوسری انگریزی مٹھائیاں لایا کرتا اور نفع کا خیال کیے بغیر ہمیشہ گنتی سے زیادہ دیا کرتا۔

کبھی کبھی وہ چھوٹے بھائی سے کہتا:

"فضل میاں اسکول سے دیر ہو گئی ہے نا، دیکھنا آج کیسے کان اینٹھیں گے، ماسٹر صاحب!"

اور افضل میاں اس کے سانولے رنگ کو گھور کر کہتے:

"چپ رہو تم کالا آدمی۔ ہم تم سے بات کرنا نہیں مانگتا۔" اور وہ دونوں ہنستے ہوئے وہاں سے چل دیتے۔

ایک صبح کو بڑا بھائی آیا لیکن چھوٹا نہ آیا۔ جب اس نے پھانکیں خریدنے کے لیے جیب سے پیسے نکالے تو سبحان نے پوچھا:

"افضل میاں کہاں ہیں؟"

"وہ ماموں کے ساتھ گاؤں گیا ہے۔" لڑکے نے جواب دیا اور وہ اکیلا ہی اسکول روانہ ہو گیا۔

جب چار پانچ روز تک سبحان نے افضل کی صورت نہ دیکھی تو اسے بے چینی سی ہونے لگی۔ آخر چھٹے روز جب دونوں بھائی پہلے کی طرح اسکول جاتے ہوئے اس کی دکان پر آئے تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز مل گئی۔

ان لڑکوں کے جانے کے کوئی گھنٹہ بھر بعد ایک خالی تانگہ مکان کے نیچے آ کر رُکتا اور کوچوان گھنٹی بجاتا۔ سبحان سمجھ جاتا کہ اب صاحبزادیوں کے اسکول جانے کی باری ہے۔ جب انہیں آنے میں کچھ دیر ہو جاتی تو کوچوان بے صبری سے پے در پے گھنٹی بجانا شروع کر دیتا۔ اس پر پہلی منزل کے بخارچے میں سے بوڑھی ماما چق کو سرکا کر اپنا سر باہر نکالتی اور تانگے والے سے کہتی:

"دَم لو میاں آتے ہیں، ابھی آتے ہیں۔"

یہ سن کر تانگے والا بڑبڑاتا ہوا تانگے سے اتر کر سبحان کے ٹھیلے کے پاس جاتا اور اس سے قینچی کے دو سگریٹ خریدتا اور سونف ملیٹھی والا پان بنوا کر کھاتا۔ آخر وکیل صاحب کی تینوں بڑی صاحبزادیاں ماما کے ہمراہ سیڑھیوں سے اترتیں۔ بڑی کی عمر اٹھارہ، منجھلی کی سولہ اور چھوٹی کی تیرہ برس۔ تینوں کے مصری وضع کے برقعے ایک کتھئی رنگ کا، ایک سیاہ رنگ کا اور ایک سلیٹی رنگ کا۔ تینوں کے پاؤں میں سینڈل دو بڑی بہنیں تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھتیں اور چھوٹی بہن اور ماما اگلی سیٹ پر اور تانگے والا ایک بڑی سی سفید چادر تانگے کے آگے پیچھے تان دیتا۔ ماما سیر بھر برف کا چُورا کر کے تھرمس بوتل میں بھروا لیتی۔ وہ اپنے لیے سبحان سے

ایک برابر کا پان بھی بنواتی جس میں وہ بہت سا کالا تمبا کو ڈلوایا کرتی۔ کبھی کبھی منجھلی صاحبزادی کو بدہضمی کی شکایت ہوتی تو وہ سوڈے کا ایک اڈھا ماما سے منگوا کر پیا کرتی اور تانگہ چل دیتا۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد مختار اور شمشاد، وکیل صاحب کے بڑے صاحبزادے موسم گرما کے ہلکے پھلکے کپڑے پہنے، اپنی اپنی سائیکل کندھے پر اٹھائے سیڑھیوں سے اترتے دکھائی دیتے۔ وہ سڑک کو پار کر کے سبحان کے ٹھیلے کے پاس آ کھڑے ہوتے سبحان انہیں سلام کرتا۔ جس کا وہ خندہ پیشانی سے جواب دیتے مگر وہ دونوں ہر وقت ایسی گرما گرم بحث میں الجھے رہتے کہ سبحان باوجود کوشش کے ان سے کوئی بات نہ کر پاتا۔ پھر ان کی باتیں بھی عموماً ایسی ہوتیں کہ سبحان کے کچھ بھی پلے نہ پڑتا۔ ان کے جوش و خروش، تیز لہجے اور آنکھوں کی چمک کو دیکھ کر معلوم ہوتا کہ وہ کسی بہت ہی دقیق مسئلے پر بحث کر رہے ہیں۔ گفتگو کا جتنا حصہ سبحان کی سمجھ میں آتا وہ کچھ اس قسم کا ہوتا:

"شمی تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے، بھلا افلاطون......"

"لیکن بھائی جان آپ بھی تو ذرا غور فرمائیے کہ ارسطو. ...."

"شمی میں کہتا ہوں کہ تم کیسی بچوں کی سی باتیں کر رہے ہو۔ مانا کہ. ..."

"وہ تو صحیح ہے لیکن بھائی جان ان دلائل کی روشنی میں......"

"یہ سراسر ہٹ ہے تمہاری شمی"

"بھائی جان لیکن پروفیسر صاحب... ."

"شمی. ...."

"بھائی جان. ...."

"شمی ... "

"بھائی جان ....."

غرض کالج کو جاتے، کالج سے آتے، ہاکی کھیلنے جاتے، ہاکی کھیل کر آتے، جب بھی دونوں بھائی ساتھ ساتھ ہوتے یہ بحث یوں ہی جاری رہتی۔ کبھی کبھی وہ انگریزی میں بھی گفتگو کرنے لگتے۔ پھر تو ان کا جوش و خروش اور بھی بڑھ جاتا۔ ایسے موقعوں پر سبحان نیچی نظریں کر کے مسکرایا کرتا۔

مختار بائیس سالہ نوجوان تھا۔ صحت و توانائی کا مجسمہ، بھرا بھرا جسم، سرخ و سفید چہرہ، شربتی رنگ کی آنکھیں، بھورے گھنگھریالے بال، شمشاد اس سے دو سال چھوٹا تھا مگر اس کے باوجود اس کا قد بڑے بھائی سے نکلتا ہوا تھا۔ ظاہری جمال میں وہ مختار کے برابر نہ تھا۔ البتہ اپنی آنکھوں کی غیر معمولی چمک سے وہ اس سے کہیں زیادہ ذہین معلوم ہوتا تھا اور سبحان نے بارہا یہ محسوس کیا کہ مختار بحث میں اپنے بڑے ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھا کر خواہ مخواہ چھوٹے بھائی کو ڈانٹا ڈپٹتا ہے اور یہ شمشاد کی سعادت مندی ہے کہ وہ ہمیشہ بڑے بھائی کا احترام ملحوظ رکھتا ہے۔

سبحان اس کے لیے حسبِ معمول دو کرارے ویسی پان چن کر نکالتا اور ان پر چونا کم اور کتھا زیادہ لگا کے رَچنے کے لیے رکھ دیتا۔ وہ اپنی بحث کے دوران میں اس سے جھاڑن مانگتے اور بائیسکلوں کو بھی جھاڑتے پونچھتے جاتے اور ساتھ ساتھ بحث بھی کرتے رہتے۔ کبھی پہیے میں ہَوا کم ہوتی تو وہیں سے ملازم لڑکے شبیر کو آواز دے کر پمپ منگوایا جاتا اور پہیے میں ہَوا بھری جاتی مگر اب بھی کیا مجال کہ بحث لحہ بھر کے لیے بھی رکنے پائے۔ سبحان پانوں کے علاوہ سگریٹ کی دو ڈبیوں میں قینچی کے پانچ پانچ سگرٹ پہلے ہی سے ڈال رکھتا اور وہ اپنا اپنا پان منہ میں رکھ، سگرٹ سلگا، بائیسکلوں پر سوار ہو تیز تیز پیر مارتے ہوئے کالج روانہ ہو جاتے مگر بحث بدستور جاری رہتی۔

کوئی دس بجے کے قریب ایک اور خالی تانگہ مکان کے نیچے آ کر رکتا اور سبحان کو معلوم ہو جاتا کہ وکیل صاحب کے کچہری جانے کا وقت ہو گیا۔ اس وقت اس کا ٹھیلہ وکیل

صاحب کے مکان کی سیڑھیوں کے برابر کھڑا ہوتا۔ وہ پہلے ہی سے ایک اچھا سا پان چھانٹ کر لگا رکھتا۔ آخر سیڑھیوں میں بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دیتی اور وکیل صاحب سیاہ شیروانی پہنے، سر پر مشہدی پگڑی باندھے، چھڑی ٹیکتے ہوئے سیڑھیوں سے اترتے۔ ان کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ تھی۔ بھاری بھرکم آدمی تھے مگر...... چاق و چوبند، فرانسیسی تراش کی ڈاڑھی جس میں اب کچھ دنوں سے سفید بال زیادہ نظر آنے لگے تھے، چہرے سے قناعت اور بُردباری ٹپکتی تھی۔ کثرتِ اولاد کی وجہ سے ہر ایک کو شفقت کی نظروں سے دیکھنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ سبحان کے سلام کے جواب میں وہ اس سے ایک آدھ بات کر لیتا، خواہ وہ بے معنی ہی کیوں نہ ہو، اپنا اخلاقی فرض سمجھتے تھے۔

"بھئی سبحان آج کل خربوزے بڑے پھیکے آ رہے ہیں۔"

"آم بھی تو کھٹے ہیں سرکار۔"

"سچ کہتے ہو۔" یہ کہہ کر تانگے میں بیٹھ جاتے اور سبحان معمول کے مطابق پان، قینچی کی ڈبیا، دیا سلائی کا بکس اور کاغذ کے ایک ٹکڑے پر تھوڑا سا چونا رکھ کر کہ وہ زیادہ چونا کھانے کے عادی تھے، تانگے کے پاس جا یہ چیزیں انہیں دے دیتا۔ کبھی کبھی ان کا مختار بھی کلیں لیے ان کے ہمراہ ہوتا اور سبحان کو اس کے لیے پان میں بہت سی سونف ڈالنی پڑتی۔

وہ وکیل صاحب اور ان کی بیگم کے بہت سے ملنے والوں کو بھی جاننے لگا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ بدھ کے روز تیسرے پہر حاجی صاحب کے ہاں سے زنانہ سواریاں آیا کرتی ہیں۔ چنانچہ جیسے ہی ان کا تانگہ آ کے رکتا وہ لائم جوس، رس بھری وغیرہ کی بوتلیں پہلے ہی سے دھو دھا کر نکال رکھتا۔ ان سواریوں کے ساتھ جو بچے آتے ان کی دل پسند مٹھائیوں کا بھی اسے پتہ تھا۔

اتوار کے روز عموماً ڈاکٹر علیم الدین یا خیر اللہ چائنا والے کے خاندان آیا کرتے، موخرالذکر وکیل صاحب کے دور کے قرابت داروں میں سے تھے اور ان ہی کی طرح

کثیر الاولاد۔ قریب کے رشتہ داروں میں جو کبھی کبھی ملنے آجاتے اور جن کو سبحان اچھی طرح جانتا تھا ایک تو بیگم صاحبہ کا چھوٹا بھائی تھا جس کی بزازی کی دکان تھی، جب کبھی وہ آتا کپڑے کا ایک آدھ تھان اس کی بغل میں ہوتا۔ یہ تھان کبھی تو وکیل صاحب کے ہاں ہی رہ جاتا اور کبھی وہ اپنے ساتھ واپس لے جاتا اور دوسرے وکیل صاحب کے تایا جو بے حد ضعیف تھے اور اپنے بیٹے کے ساتھ شہر کے دوسرے سرے پر رہا کرتے تھے۔ جب کبھی یہ باپ بیٹے ملنے آتے تو دن بھر ان کے گھر ہی پر رہتے اور رات کو بڑی دیر میں کھانا کھا کر جاتے۔

وہ مختار اور شمشاد کے بعض دوستوں کو بھی جانتا تھا جو اُن سے ملنے آیا کرتے تھے۔ خصوصاً ریاض کو۔ شام کو جب وہ ہاکی کھیل کر واپس آتے تو اکثر ریاض بھی سائیکل پر ان کے ہمراہ ہوتا۔ وہ شمشاد کا ہم عمر اور کالج میں اس کا ہم سبق تھا۔ مختار سے اس کی زیادہ بے تکلفی نہ تھی۔ وہ چونکہ شمشاد کا بڑا بھائی تھا اس لیے ریاض بھی اس کا ادب کیا کرتا تھا۔ ریاض ان دونوں بھائیوں سے قد میں چھوٹا تھا اور رنگت بھی ان جیسی سرخ و سفید نہ تھی، تاہم اس کی ملاحت میں ایک خاص بانکپن تھا۔ متبسم چہرہ، زندگی کی مسرتوں سے بھرپور اور فکروں سے آزاد۔ شمشاد کو اس سے اور اس کو شمشاد سے گہری وابستگی تھی۔

سبحان کے ٹھیلے کے قریب جو اس وقت وکیل صاحب کے مکان کے عین مقابل سڑک کے کنارے کنارے ہوتا۔ یہ تینوں نوجوان اپنی اپنی بائیسکل تھامے رخصت سے پہلے کچھ باتیں ضرور کرتے۔ جب کبھی ریاض ان بھائیوں کی بحث میں شامل ہو جاتا۔ پھر تو بحث طول ہی کھینچتی چلی جاتی۔ سبحان سے بار بار پان اور سگریٹ لئے جاتے۔ ریاض بار بار خدا حافظ کہتا مگر رخصت نہ ہونے پاتا۔ غرض گھنٹہ گھنٹہ ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹہ یوں ہی باتوں میں گزر جاتا۔ اس دوران میں وکیل صاحب کے مکان کی دوسری منزل میں جہاں بڑی صاحبزادی کا کمرہ تھا، بار بار ایک رنگین سایہ چقوں کے پیچھے حرکت کرتا رہتا، جسے سبحان کی کن انکھیوں کے

سوا کوئی اور آنکھ نہ دیکھ سکتی۔

وکیل صاحب کے صاحبزادوں اور صاحبزادیوں سے رشتے کے سلسلے میں جو لوگ آیا کرتے سبحان ان کو بھی خوب پہچانتا تھا، ایسے موقعوں پر اس کی بکری ایک دَم بڑھ جاتی اور گھر کے ملازموں اور بوڑھی ماما کے ساتھ ساتھ وکیل صاحب کے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں بھی دوڑ دوڑ کر سبحان کی دکان پر سودا لینے آیا کرتے۔ ان لوگوں کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد سبحان ٹوہ لگاتا کہ کہیں بات پکی ہوئی یا نہیں، وہ شبیر سے ہنس کر کہتا:

"پانچوں گھی میں ہوں گی اور سر کڑھائی میں۔"

شبیر حیران ہو کر پوچھتا:

"کیا کہا تم نے؟"

"زیادہ بنو نہیں ہم سے، سب خبر ہے ہمیں۔"

شبیر اب بھی لاعلمی ظاہر کرتا تو وہ سمجھ جاتا کہ اس کو واقعی خبر نہیں، اور پھر وہ ماما کی طرف رجوع کرتا جس سے اکثر باتیں معلوم ہو جایا کرتی تھیں۔ بڑی بی وکیل صاحب کی سب سے پرانی ملازمہ تھیں۔ ان کے سارے بچے ان ہی کی گود میں پلے بڑھے تھے۔ ان کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی نہ کوئی رشتہ دار تھا۔ ان بچوں سے انہیں دلی محبت تھی اور اس کی بنا پر وہ ان کے مستقبل کے بارے میں رائے زنی کرنا اپنا حق سمجھتی تھیں، چنانچہ محبت اور سادگی میں ان کی زبان سے بے ساختہ نکل جاتا:

"تو ج جو ان لوگوں میں رشتہ ہو۔ مجھے تو یہ ایک آنکھ نہیں بھاتے۔" پھر ذرا تامل کر کے کہتیں۔ "گھبراؤ نہیں وہ دن بھی آجائے گا۔ چاند سی بیٹیاں ہیں میری۔"

اور سبحان سمجھ جاتا کہ ان لوگوں سے بات نہیں ٹھہری۔ یوں ہی کسی موقع پر افضل میاں سے کہتا:

"شہ بالا بنے گا میرا میاں۔ ہم کو بھی گھوڑی پر چڑھاؤ گے نا؟"

اگر اس قسم کی کوئی بات گھر میں ہوئی ہوتی تو افضل میاں شرما کر چل دیتے یا معلوم نہ ہوتا تو کہتے:

"چپ رہو تم کالا آدمی۔ ہم تم سے بات کرنا نہیں مانگتا۔"

ایک دن ایسے ہی موقع پر کچھ عورتیں آئی ہوئی تھیں، بڑی بی پان لینے آئیں ان کا سانس پھولا ہوا تھا۔ مگر وہ بہت خوش معلوم ہوتی تھیں۔ سبحان نے ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا ہی تھا کہ وہ پھوٹ پڑیں۔

"کسی سے ذکر دکر نہ کیجو خبر دار۔ بڑی صاحبزادی کی بات ٹھہر گئی۔"

"کب؟"

"ابھی ابھی۔"

"کون لوگ ہیں؟"

"شہر کے مشہور ڈاکٹر ہیں۔ لڑکا بی اے میں پڑھتا ہے۔ پر خبردار کسی سے ذکر نہ کر بیٹھیو، سو دشمن ہیں، سو دوست۔ میں نے گھر کا آدمی سمجھ کر تم سے کہہ دیا ہے، تم کسی سے نہ کہنا، بچوں سے بھی نہیں، نوکروں سے بھی نہیں۔ ۔ ۔"

اس کے دو تین ہی دن بعد سبحان نے کئی اور ذریعوں سے بڑی بی کی بات کی تصدیق کر لی۔ سمدھیوں میں میل جول بڑھنے لگا۔ عورتیں تو آتی جاتی ہی رہتی ہیں۔ ایک بار لڑکے کے والد ڈاکٹر صاحب بھی اپنی موٹر میں بیٹھ کر وکیل صاحب سے ملنے آئے اور دیر تک ان سے باتیں کرتے رہے۔ دوسری مرتبہ ضیافت پر آئے۔ اس موقع پر ان کا بیٹا بھی ان کے ہمراہ تھا۔ وہ خاصا قبول صورت تھا مگر کسی قدر لاغر معلوم ہوتا تھا۔ بڑی بی نے کہا:

"امتحان کی فکر ہے بیچارے کو۔" سبحان کو اس کا نام بھی معلوم ہو گیا صغیر احمد، قرار یہ پایا کہ جب لڑکا امتحان دے لے گا تو اس کی شادی کر دی جائے گی۔

بڑی صاحبزادی کے جہیز کے لیے جلدی جلدی جو زیورات و ملبوسات تیار کرائے

جارہے تھے۔ سبحان ان کی پوری تفصیل جانتا تھا۔ اس دوران میں شمشاد میاں کے دوست ریاض بھی کئی مرتبہ ہاکی کے بعد ان دونوں بھائیوں کو ان کے گھر تک پہنچانے آئے اور سبحان نے دیکھا کہ دوسری منزل میں چقوں کے پیچھے وہ رنگین سایہ اب بھی حرکت کرتا ہے۔

اور ایک دن اچانک سبحان کے ذہن میں ایک بات آئی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ صاحبزادی کو یہ رشتہ منظور نہ ہو! یہ بات اسے کسی نے نہیں بجھائی تھی، اور سمجھاتا بھی تو کون؟ کیونکہ وکیل صاحب یا گھر کے کسی اور آدمی کو اس کا گمان تک نہ تھا۔ اس نے مختلف ذریعوں سے اس کے متعلق معلومات حاصل کر کے خود ہی یہ نتیجہ نکالا تھا۔ آخر اس نے بھی ایک عمر گزاری تھی۔ زمانے کا سرد و گرم دیکھا تھا۔ دو تین مرتبہ بڑی بی اور بچوں سے اسے معلوم ہوا تھا کہ صاحبزادی کی طبیعت ناساز ہے۔ ایک دن دیکھا کہ تانگے میں سوار ہوتے وقت وہ بڑی بے دلی سے قدم اٹھا رہی ہے۔ ایک دن وہ اپنی بہنوں کے ساتھ اسکول بھی نہیں گئی بلکہ دردسر کی وجہ سے گھر ہی میں رہی مگر اسی شام کو جب مختار اور شمشاد کے ساتھ ریاض میاں سبحان کی دکان پر آئے اور سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے تو اس نے دوسری منزل میں چقوں کے پیچھے اس رنگین سائے کو پہلے سے بھی زیادہ بے چین دیکھا۔

ایسے معاملوں میں دل پر جو گزرتی ہے سبحان اس سے بخوبی واقف تھا۔ مدت ہوئی جوانی میں وہ ایک پہاڑی مقام پر رکھشا چلایا کرتا تھا تو اسے ایک عورت سے محبت ہو گئی تھی۔ دن بھر جو کچھ کماتا لا کر اس کے حوالے کر دیتا۔ مگر اس عورت کے کچھ اور آشنا بھی تھے جن سے وہ چھپ چھپ کر ملا کرتی۔ ایک دن سبحان نے موقع پر جا لیا۔ چٹیا پکڑ کھینچتا ہوا اپنی کوٹھڑی میں لے آیا اور شراب کے نشے میں کچھ زیادہ ہی مرمت کر ڈالی۔ صبح کو آنکھ کھلی تو کوٹھڑی خالی تھی اور باہر آنگن میں اس کا رکھشا جلا پڑا تھا۔ سبحان مدتوں اس عورت کو ڈھونڈا کیا مگر اس کی صورت پھر کبھی نظر نہ آئی اور نہ اس کی یاد دل سے مٹی۔

شادی کی تیاریاں اب اور بھی زور شور سے ہونے لگی تھیں۔ وکیل صاحب کے گھر میں ہر وقت ایک شور و غل مچا رہتا۔ طرح طرح کی اجناس تھیلوں میں لدلد کے آ رہی تھیں۔ قسم قسم کا فرنیچر، سنگھار میز، پلنگ، کرسیاں، تپائیاں، تانبے، اور پیتل کے برتن جنہیں قلعی گر نے چاندی کا سا بنا دیا تھا۔ مہمانوں کی وہ ریل پیل تھی کہ سبحان کو دکانداری سے لمحہ بھر کی فرصت نہ ملتی تھی مگر پھر بھی وہ خوش نہ تھا۔ جوں جوں شادی کا دن قریب آتا جاتا اس کی افسردگی بڑھتی جاتی تھی اور اسے ایک نامعلوم ہول سا ہونے لگا تھا۔ وکیل صاحب اس سے اور بھی زیادہ لطف و مہربانی سے پیش آنے لگے تھے۔ ایک دن وہ اس سے کہنے لگے:

"سبحان ہم تمہارے لیے بھی ایک جوڑا سلوائیں گے، برات کے روز پہننا دیکھنا انکار نہ کرنا۔ ہمسائے کا رشتہ عزیزوں سے کم نہیں ہوتا۔

سبحان نے وکیل صاحب کے بچوں کو دعائیں دیں۔ مگر یہ مژدہ بھی اس کی افسردگی کو دور نہ کر سکا۔

ایک دن علی الصباح سبحان نے ابھی ٹھیلہ سڑک کے کنارے لا کر کھڑا کیا ہی تھا کہ دیکھا شمشاد کندھے پر بائیسکل اٹھائے جلد جلد سیڑھیوں سے اتر رہا ہے اس نے صرف بنیان اور نیکر پہن رکھا تھا اور ابھی ڈاڑھی بھی نہیں مونڈی تھی۔

"کہیے شمشاد میاں صبح صبح کدھر کی تیاری ہے؟" سبحان نے پوچھا۔

"کہیں نہیں، ذرا ڈاکٹر کو بلانے جا رہا ہوں" شمشاد نے جواب دیا۔

"خیر تو ہے؟" سبحان نے فکرمندی سے پوچھا۔

"ہاں خیر ہی ہے۔" یہ کہہ کر شمشاد بائیسکل پر تیز تیز پاؤں مارتا ہوا چل دیا۔

سبحان کا ماتھا ٹھنکا اور وہ بے تابی کے ساتھ گھر کے اور لوگوں کی راہ دیکھنے لگا تا کہ معلوم کرے کون بیمار ہے۔ جب وکیل صاحب کے دونوں چھوٹے صاحبزادے اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلے تو ان سے معلوم ہوا کہ رات بڑی باجی کی طبیعت اچانک خراب

ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد ایک موٹر وکیل صاحب کے مکان کے نیچے رکی اور ڈاکٹر ہاتھ میں بیگ لیے اوپر گیا۔ کوئی دس منٹ کے بعد وہ نیچے اترا۔ سبحان اپنا ٹھیلہ چھوڑ کر اس کے پاس آگیا، مگر اس سے پوچھنے کی جرأت نہ ہو سکی اور وہ اور بھی زیادہ بے تابی کے ساتھ بڑی بی یا شبیر کا انتظار کرنے لگا۔

اس کے کچھ ہی دیر بعد وہ تانگہ آ گیا جس میں بیٹھ کر لڑکیاں اسکول جایا کرتی تھیں مگر بڑی بی نے اسے اوپر ہی سے "آج نہیں چاہیے" کہہ کر لوٹا دیا۔ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد شبیر برف لینے آیا تو اس سے معلوم ہوا کہ بڑی صاحبزادی کو سرسام ہو گیا ہے، مگر زیادہ فکر کی بات نہیں، ڈاکٹر دو گھنٹے بعد پھر آئے گا۔

دو گھنٹے بعد ڈاکٹر پھر آیا، اور جب وہ جانے لگا تو سبحان پھر اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ اس کے لب ہلے مگر سوال کرنے کی اب کے بھی اسے جرأت نہ ہوئی۔ اس دفعہ بڑی بی پان لینے آئیں تو ان سے معلوم ہوا کہ حالت میں کچھ فرق نہیں ہے۔ ڈاکٹر شام کو پھر آنے کا کہہ گیا ہے۔

اس روز وکیل صاحب کچہری نہیں گئے۔ تیسرے پہر لڑکی کا ہونے والا سسر جو خود بھی ڈاکٹر تھا، اسے دیکھنے آیا اور ایک گھنٹہ تک اس کے پاس رہا، اور جو لوگ اس کی خبر کو آئے انہیں جلد ہی رخصت کر دیا گیا۔ دن بھر مکان پر ایک مقبرے کی سی خاموشی طاری رہی۔

شمشاد اور مختار کالج سے جلد واپس آ گئے تھے۔ شام کو وہ ہاکی کھیلنے نہیں گئے۔ ریاض شمشاد سے ملنے آیا۔ سبحان کے ٹھیلے کے قریب جب شمشاد اس سے اپنی بہن کا حال بیان کر رہا تھا تو سبحان نے سنا کہ اس کے مرض میں ابھی افاقہ نہیں ہوا۔ دونوں ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اگر آج کی رات خیریت سے گزر گئی تو پھر کوئی اندیشہ نہیں۔

جس وقت وہ باتیں کر رہے تھے تو سبحان کی نظر بے اختیار دوسری منزل پر چقوں کی

طرف اٹھ گئی۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی مگر وہ سایہ نظر نہیں آیا۔

تھوڑی دیر میں ریاض رخصت ہو گیا۔

شمشاد نے گھر جاتے ہوئے سبحان سے کہا۔ "برف اور لار کھنا۔ شاید رات کو ضرورت پڑ جائے۔"

"فکر نہ کیجئے۔ میں نے من بھر برف پہلے ہی منگوا رکھی ہے۔"

سبحان رات کو عموماً نو بجے دکان بڑھایا کرتا تھا مگر اس رات اس نے گیارہ بجے تک جمائے رکھی۔ اس دوران میں وہ ملازموں سے برابر بچی کی خیریت معلوم کرتا رہا۔ اس کی حالت اگر سدھری نہیں تو زیادہ بری بھی نہیں ہونے پائی تھی۔

آدھی رات کے قریب وہ ٹھیلے کو بند کر کے حسبِ معمول اس کے قریب ہی سڑک کے کنارے چارپائی ڈال لیٹ رہا مگر آنکھوں میں نیند غائب تھی۔ کان وکیل صاحب کے مکان کی طرف لگے ہوئے تھے۔ صبح کو تین بجے کے قریب جب وہ ذرا اونگھنے لگا تو اچانک ایک طرف سے کتے کے بھونکنے کی آواز آئی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور وکیل صاحب کے مکان کی طرف کی سیڑھیوں کی طرف بھاگا مگر گھر میں بدستور خاموشی تھی۔

اس نے پتھر مار کر کتے کو بھگا دیا۔

سرخ جلوس

یہ ان دنوں کا قصہ ہے جب میں نے "نو بہار" کے چیف ایڈیٹر سے ایک معمولی سا اختلاف ہو جانے پر جوانی کے جوش میں استعفا دے دیا تھا اور پھر رفتہ رفتہ فکرِ معاش نے مجھے "ستارۂ مشرق" میں ملازمت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"ستارۂ مشرق" کسی رسالہ یا اخبار کا نام نہیں بلکہ یہ ایک ہوٹل تھا، جس میں زیادہ تر مغربی ممالک کے سیّاح آ کر ٹھہرتے تھے۔ اس کا مالک بمبئی کا ایک سیٹھ تھا۔ جس نے اس کا انتظام ایک انگریز منیجر کو سونپ رکھا تھا۔ میں ملازم تو ایک کلرک کی حیثیت سے ہوا تھا مگر میرا کام اور استعداد دیکھ کر سیٹھ نے جلد ہی مجھے ہوٹل کا اسسٹنٹ منیجر بنا دیا۔ میری ترقی کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ سیٹھ کو انگریز منیجر پر اعتماد نہیں تھا اور وہ چاہتا تھا کہ کوئی سمجھدار ہندوستانی اس کے کام پر نظر رکھے۔

میرے ذمّہ یہ خدمت تھی کہ میں ہوٹل میں ٹھہرنے والوں کا خیال رکھوں نیز غیر ملکوں سے جو لوگ ہندوستان کی سیاحت کے لیے آتے ہیں ان کو اس ملک کے بارے میں علمی و ثقافتی معلومات بہم پہنچاؤں۔ یہ ہوٹل اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے غیر ملکی سیاحوں میں بہت مقبول تھا۔ کوئی دن نہ جاتا تھا کہ دس پانچ نئے مہمان بیرونی ممالک سے آ کر یہاں نہ ٹھہرتے ہوں۔ ہفتوں پہلے سے ان کے لیے کمرے ریزرو کر لئے جاتے تھے۔ یہ ہوٹل بمبئی کے بڑے

ہوٹلوں میں شمار ہوتا تھا۔ اور اس میں ایک وقت میں دو ڈھائی سو مسافر بخوبی رہ سکتے تھے۔

ایک دفعہ امریکہ کی ایک خاتون ہمارے ہوٹل میں آ کر مقیم ہوئی۔ مس گلبرٹ اس کا نام تھا۔ وہ امریکہ کے ایک متمول تاجر کی بیٹی تھی۔ ممالکِ مشرق اور بالخصوص ہندوستان کی سیاحت کا اسے بڑا شوق تھا۔ ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی سے بھی گہری دلچسپی تھی اور خاص کر یہاں کی ستیہ گرہ کی تحریک، بھوک ہڑتال، جلسوں اور جلوسوں کو وہ بچشم خود دیکھنے کی بڑی تمنا رکھتی تھی مگر بدقسمتی سے وہ ایسے وقت یہاں پہنچی کہ تحریکِ آزادی ختم ہو چکی تھی کیونکہ برطانیہ نے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر کے آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔ اب یہاں نہ عدم تعاون کی تحریک باقی رہی تھی، نہ ستیہ گرہ اور ہڑتالیں ہوتی تھیں، نہ جلوس نکلتے تھے۔ بس یہ کیفیت تھی کہ انگریز تو اسباب باندھنے میں مصروف تھے اور اہلِ ملک ان کی جگہ سنبھالنے کے لیے پرپُرزوں سے درست ہو رہے تھے۔

مس گلبرٹ سادہ طبیعت اور نیک دل تھی، اس کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ انسانی تفریق کی خواہ وہ رنگ اور نسل کی ہو یا روپیہ پیسہ کی، قائل نہیں ہے مگر انسان دوستی کا وسیع جذبہ اپنے دل میں لئے ہوئے ہے۔ اس کی عمر تیس کے لگ بھگ تھی۔ لمبا قد، چوڑا چکلا چہرہ، انتہائی سادہ خدوخال، کلوں پر ہلکی ہلکی زردی کھنڈی ہوئی، سنہرے بال۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جو خوبصورت تو ہرگز نہیں ہوتیں مگر انہیں بدصورت بھی نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ ان میں ایک خاص طرح کی جاذبیت پائی جاتی ہے۔

سہ پہر کے چائے کے وقت جب وہ ستارۂ مشرق کے وسیع اور خوش قطع لان میں چھوٹے چھوٹے یوروپین خاندانوں اور بچوں کے غل غپاڑے سے الگ تھلگ اپنی میز پر اکیلی بیٹھی ہوتی تو مجھے اس پر ترس سا آیا کرتا۔ وہ طبعاً آدمیوں سے متنفر نہیں تھی البتہ یہاں آ کے اسے جو مایوسی ہوئی تھی اس نے اسے مغموم بنا رکھا تھا۔ بھلا ایسی عورت کے پاس بیٹھ کر کون اپنا وقت ضائع کرتا، ہاں جب کبھی وہ میرے پاس کچھ دریافت کرنے آتی تو میں

انتہائی توجہ سے اس کی بات سنتا اور خندہ پیشانی سے جواب دیتا اور چاہتا کہ وہ زیادہ تر وقت میرے پاس گزارے، یوں بھی اس کے پاس جاکر پوچھ لیتا کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔

میں بمبئی کی سیر گاہوں اور اہم قابلِ دید مقامات کا حال تفصیل سے بیان کرتا مگر وہ دھیان نہ دیتی۔ اسے یہاں کی تفریح گاہوں اور تاریخی مقامات سے دلچسپی نہ تھی۔ اس کے لیے وہ کئی مرتبہ یورپ کا چکر لگا چکی تھی۔ جو باتیں وہ مجھ سے پوچھتی ان کا جواب دینے سے میں کتراتا کیونکہ منیجر کی طرف سے ہمیں سخت تاکید تھی کہ ہم ملکی معاملات کے بارے میں مہمانوں سے کسی قسم کی گفتگو نہ کریں۔ ادھر تحریکِ آزادی کے ختم ہوتے ہی اخباروں کی ہنگامہ آرائی بھی ختم ہو گئی تھی۔ اب ان میں قتل، ڈاکہ زنی اور اغوا کی خبریں زیادہ چھپنے لگی تھیں جن کے پڑھنے سے دل پر افسردگی سی طاری ہوتی تھی۔

ایک دن وہ حسبِ معمول لان میں اکیلی بیٹھی بے دلی سے اخبارات کے ورق الٹ رہی تھی۔ یہ اواخرِ سرما کی ایک سہانی سہ پہر تھی۔ دھوپ نرم اور حدت آمیز تھی بہار کا سماں تھا، مگر آج وہ پہلے سے بھی زیادہ افسردہ معلوم ہوتی تھی۔ میں اسی خیال میں کھویا ہوا تھا کہ اتنے میں میرا پرانا دوست ریاض میرے کمرے میں آدھمکا۔ جس زمانے میں مَیں "نوبہار" کے عملۂ ادارت کا ایک رکن تھا، ریاض ہمارا چیف رپورٹر تھا۔ اخبار سے میرا تعلق ختم ہوتے ہی وہ بھی وہاں سے چلا گیا تھا اور کسی فلمی یونٹ سے منسلک ہو گیا تھا۔ وہ ان نوجوانوں میں سے تھا جو غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں اور ہر کام خواہ وہ کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو، بڑی آسانی سے کر لیتے ہیں۔ فلم کے لیے کہانیاں اس نے لکھیں، موسیقی کی دھنیں اس نے بنائیں۔ گھوڑدوڑ میں جاکی کا کام اس نے کیا، کئی مشہور فلم ایکٹرسوں کے پرائیویٹ سیکریٹری کی خدمات اس نے انجام دیں۔

اس وقت اسے دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ ہم ایک مدت کے بعد ملے تھے مجھے معلوم نہ تھا کہ آج کل وہ کیا کرتا تھا۔ نہ جانے میرے جی میں کیا آئی کہ میں نے مس گلبرٹ

کا حال اسے بتادیا اور دفتر کی کھڑکی میں سے دور ہی سے اس کی صورت بھی دکھادی۔

"بُری نہیں۔" وہ کہنے لگا۔ "اور یہ جو تم جلسے جلوسوں کی بات کہہ رہے ہو، یہ کون مشکل کام ہے بھیّا! جس ملک میں سگرٹ بیڑی کے جلوس نکل سکتے ہوں، بوٹ پالش کے جلوس نکل سکتے ہوں، نئی فلموں، کشتیوں اور دنگلوں کے جلوس نکل سکتے ہوں، وہاں سیاسی جلوس نکالنا کیا مشکل بات ہے۔ جلوس تو تماشائیوں سے بنتا ہے تماشائیوں سے۔ اصل جلوس والے تو پانچ فیصدی بھی نہیں ہوتے۔ بس ایسے لوازم جمع کردو جو تماشائیوں کو اپنی طرف کھینچ لیں تو سو کا جلوس دس ہزار کا معلوم ہونے لگے گا۔"

کچھ دیر ہم دونوں خاموش رہے۔ سائے اب طویل ہونے شروع ہو گئے تھے۔ فضا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ لان میں بیٹھے ہوئے لوگ اب اٹھنے شروع ہو گئے تھے۔ مس گلبرٹ نے اخبارات کو اکٹھا کیا اور ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ ریاض نے کہا۔ "سنو! اگر تم سو پچاس کا انتظام کر سکو تو میں تمہاری میم صاحب کی آرزو پوری کر سکتا ہوں۔"

میں نے کہا۔

"اتنی رقم تو وہ چندے کے طور پر بھی دے سکتی ہے۔ وہ بہت امیر عورت ہے۔ امریکہ والوں کو تو تم جانتے ہی ہو۔"

"تو بس اسی ہفتہ میں اس کا انتظام کر دوں گا۔ اچھی خاصی دل لگی رہے گی۔"

"لیکن ریاض!" میں نے لمحہ بھر غور کر کے کہا۔ "کسی شریف عورت کو یوں دھوکا دینا۔"

"دھوکا!" اس نے میری بات کاٹ کر کہا:

"آج کل ہر چیز دھوکا ہے۔ خود زندگی ایک دھوکا ہے اور پھر تم خیال تو کرو کہ وہ اس ملک سے کس قدر مایوس ہو کر جائے گی۔ ہماری ذرا سی کوشش اسے بامراد بنا سکتی ہے۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ معاملہ ایسا تھا کہ میری نوکری کے لیے مخدوش ہو سکتا تھا مگر یہ تجویز میرے منچلے دوست کو بھا گئی تھی۔ وہ ہمیشہ نئے نئے تجربوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ اس نے مجھے زیادہ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا اور یہ کہتا ہوا کہ "تو بس پھر طے ہے" ایک دم کمرے سے چلا گیا۔

تیسرے دن اس نے مجھے ٹیلیفون پر بتایا کہ سب معاملہ ٹھیک ہے، میں چار بجے آؤں گا، تم میم صاحب کو تیار رکھنا اور وہاں میرا ان سے تعارف بھی کرا دینا، پھر اگر تمہیں فرصت ہو تو تم بھی ساتھ چلے چلنا ورنہ میں خود ہی سنبھال لوں گا۔

لنچ کے وقت میں ڈرتے ڈرتے مس گلبرٹ کے پاس پہنچا اور ادھر اُدھر کی باتیں کر کے اس سے کہا:

"آج ایک جلوس نکلنے والا ہے۔ اگر تمہیں دلچسپی ہو تو سہ پہر کو اسے دیکھنے چل سکتی ہو۔"

وہ سنتے ہی اچھل پڑی۔

"سچ!" اس نے کہا "ضرور چلوں گی۔ مگر کہاں اور یہ کن کا جلوس ہے؟"

میں نے کہا۔

"ٹھیک طور پر میں خود بھی نہیں جانتا مگر سہ پہر کو میرا ایک دوست آ رہا ہے، اس جلوس کی تفصیل اس سے معلوم ہو جائے گی۔"

اس نے بڑی گرمجوشی سے میرا شکریہ ادا کیا اور میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔

ریاض ٹھیک چار بجے ہوٹل میں پہنچ گیا۔ ہم پہلے ہی سے اس کے منتظر تھے۔ غائبانہ تعارف میں کرا ہی چکا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ میں اگر چاہتا تو کام کا بہانہ کر کے ہوٹل ہی میں رہ سکتا تھا۔ لیکن سچ پوچھیے تو میرے دل میں خود گدگدی ہو رہی تھی کہ دیکھوں میرا دوست کیا تماشا دکھانے والا ہے۔ میں نے منیجر سے دو گھنٹہ کی چھٹی لی اور پھر ہم تینوں ٹیکسی میں بیٹھ کر چل دیے۔ ریاض نے ٹیکسی والے کو بمبئی

کے ایک غیر معروف علاقے کی طرف چلنے کی ہدایت کردی تھی۔

وہ مس گلبرٹ سے بہت بے تکلف ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی یہ کیفیت ہو گئی جیسے وہ گلبرٹ کا بہت پرانا جاننے والا ہو۔ اس نے کہا:

"ہر چند ملک کو آزادی مل چکی ہے، مگر یہاں کا مزدور طبقہ ابھی اپنی حالت سے مطمئن نہیں ہے۔ کئی دن سے اس کے ایک فرقہ میں اندر اندر ہی مواد پک رہا تھا جو آج پھوٹ پڑا۔ یہ فرقہ سائس کہلاتا ہے۔ ان کا کام بگھی چلانا اور گھوڑوں کی دیکھ بھال ہوتا ہے، چنانچہ آج اس فرقے کے لوگ اپنے مالکوں کی زیادتیوں کے خلاف آواز اٹھا رہے ہیں، آج ان کا ایک جلوس نکل رہا ہے۔ میں نے اس جلوس کو دیکھنے کے لیے ایک فلیٹ کی بالکنی میں انتظام کیا ہے۔"

مس گلبرٹ نے ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے ایک مرتبہ پھر گرمجوشی سے ہمارا شکریہ ادا کیا۔

کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد ریاض نے ٹیکسی کو ایک ایسے مقام پر ٹھہرایا جو خود میرے لیے بھی اجنبی تھا۔ ہم ایک اونچی عمارت کی پہلی منزل کے فلیٹوں میں سے ہوتے ہوئے ایک بالکنی میں پہنچے، اس میں تین کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ مس گلبرٹ اپنے ساتھ کیمرہ، دوربین، تھرمس کی دو بوتلیں اور کچھ سینڈوچ ایک ٹوکری میں رکھ کر لائی تھی۔

ریاض نے کہا: جلوس کے آنے میں ابھی پانچ منٹ کی دیر ہے۔"

مس گلبرٹ بولی: "اچھی بات ہے، ہم اتنے میں کافی پیتے ہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے ٹوکری میں سے تین چھوٹی چھوٹی پیالیاں نکالیں اور ایک تھرمس کا منہ کھول کر ان میں گرم گرم کافی انڈیلنے لگی۔

ابھی ہم نے کافی ختم نہیں کی تھی کہ ایک طرف سے نقاروں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ریاض نے کہا۔ "لو جلوس آ گیا۔"

مس گلبرٹ نے جلدی سے اپنی دوربین سنبھالی اور اس طرف دیکھنے لگی جدھر ریاض

نے اشارہ کیا تھا۔ ہم جس سڑک پر تھے وہ ایک طرف سے خم کھاتی ہوئی دوسری طرف مڑ جاتی تھی۔ میں خوب سمجھتا تھا کہ ریاض نے کس مصلحت سے اس مقام کو چنا ہے ہماری نظر کے سامنے سڑک کا صرف سو سوا سو گز کا ٹکڑا تھا چنانچہ نقاروں کی آواز سے یہ تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ جلوس بہت قریب پہنچ چکا ہے مگر موڑ کی وجہ سے جلوس کا اگلا حصہ ابھی ہماری نظروں سے پوشیدہ تھا۔

اس وقت مس گلبرٹ کا جوش و خروش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے بے رنگ گالوں پر ہلکی ہلکی سرخی جھلکنے لگی تھی۔ اس نے دوربین اپنی آنکھوں سے نہیں ہٹائی تھی۔ اس سے اس کی بے تابی کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ آخر چند لمحوں کے بعد جلوس نے اپنی جھلک دکھائی پہلے ایک اونٹ آیا جس کو بہت گہرے سرخ رنگ میں رنگا گیا تھا۔ اس کے دونوں طرف دو بڑے بڑے نقارے بندھے ہوئے تھے، ان کا رنگ بھی سرخ تھا۔ اس پر دو لڑکے لال ہی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے زور زور سے نقاروں کو پیٹ رہے تھے۔ مس گلبرٹ نے جلدی سے دوربین ہٹا کر کیمرہ سنبھالا اور دور کا ایک شاٹ لیا۔ اونٹ کے پیچھے پانچ چھ خالی بگھیاں تھیں۔ جن کے آگے گھوڑوں کے بجائے آدمی جتے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے ایک مست فقیر تھا جس کے تن پر سوائے لنگوٹی کے اور کوئی کپڑا نہ تھا۔ اس نے منہ پر سیندور مَل رکھا تھا۔ پاؤں میں گھنگھرو تھے۔ ہاتھ میں ایک بڑا سا سونٹا جس کے سرے پر طرح طرح کے رنگین کپڑوں کی دھجیاں بندھی ہوئی تھیں اور وہ چک پھیریاں لے لے کر ناچ رہا تھا۔

ریاض نے مس گلبرٹ کے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھ کر فوراً کہا:

"یہ ان سائیسوں کا روحانی پیشوا ہے۔ اس نے عہد کر رکھا ہے کہ جب تک میرے فرقے کے لوگوں کے مطالبات پورے نہیں کیے جائیں گے میں اپنا ناچ جاری رکھوں گا۔"

جیسا کہ ہمیں توقع تھی اس عجیب و غریب جلوس کو دیکھنے کے لیے سچ مچ خلقت ٹوٹ پڑی تھی۔ آس پاس کے مکانوں میں کوئی کھڑکی، کوئی دروازہ، کوئی بالکنی ایسی نہ تھی جو

عورتوں اور بچوں سے بھری ہوئی نہ ہو۔ ادھر جلوس کے دونوں طرف تماشائیوں کا وہ ہجوم تھا کہ سچ مچ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ میں نے دل میں کہا۔ تماشائی شاید سمجھ رہے ہیں کہ یہ سین کسی فلم کے لیے تیار کیا جا رہا ہے اور بمبئی ایسے شہر میں یہ کوئی نئی بات بھی نہ تھی۔

جلوس کے ساتھ سرخ رنگ کے کئی پرچم بھی تھے۔ کپڑوں پر مختلف رنگوں میں "انقلاب زندہ باد" اور طرح طرح کے الفاظ اور جملے تحریر تھے جن میں سائیسوں کی برادری کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا گیا تھا اور دھنوان سیٹھوں کو تنبیہہ کی گئی تھی، انہی میں ایک پرچم پر یہ الفاظ بھی لکھے تھے۔

"سائیسی علم دریاؤ"

"آخر ان لوگوں کے مطالبات کیا ہیں؟" مس گلبرٹ نے پوچھا۔

ریاض نے جواب دیا:

"تنخواہ میں اضافہ، کام کے اوقات کا تعین، بس ایسی باتیں ہوں گی۔ میں پوری تفصیل سے واقف نہیں۔"

اب سائیسوں کی ایک ٹولی آئی، جنہوں نے سر اور ماتھے پر سیندور ڈال رکھا تھا۔ وہ بڑے جوش و خروش کے ساتھ پوربی زبان میں ایک انقلابی گیت گاتے چلے آ رہے تھے۔

ہیا

بولو ہیا ہیا

رکت چوس لیو ہمرو سارو

تیل بنا چلے کا ہے پہیا

ہیا

بولو ہیا ہیا

بھوکن پیٹین پرت پکھونا ہیں

چو بن ناچت تھیا تھیا

ہیا

بولو سیا ہیا

ریاض نے اس انقلابی گیت کا ترجمہ مس گلبرٹ کو سنایا تو وہ بہت خوش ہوئی اور فوراً اپنی نوٹ بک میں لکھ لیا۔ ریاض کا کمال یہ تھا کہ وہ غیر متعلقہ آدمیوں کو بھی جلوس ہی کا ایک حصہ ظاہر کر رہا تھا، مثلاً دو تین لڑکے آگے پیچھے بیڑی کے اشتہار کے بورڈ لٹکائے خواہ مخواہ جلوس میں آ شامل ہوئے تھے وہ آوازیں لگا رہے تھے۔ ''چرخہ مارکہ بیڑی پیا کرو۔''

''یہ کون لوگ ہیں؟'' مس گلبرٹ نے پوچھا۔

ریاض نے جھٹ جواب دیا۔ ''یہ بیڑی بیچنے والوں کے نمائندے ہیں، وہ کہہ رہے ہیں، ہماری ہمدردی سائیسوں کے ساتھ ہے۔''

اب سونٹے والا مست فقیر مس گلبرٹ کی بالکنی کے بالکل نیچے پہنچ گیا تھا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر زور سے اللہ ہو کا نعرہ لگایا۔ ساتھ ہی مس گلبرٹ کے چہرے پر بھی نظر پڑی اور اس نے پہلے سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ رقص کرنا شروع کر دیا۔ مس گلبرٹ نے خاص طور پر اس فقیر کے کئی شاٹ لیے۔

پانچ سات منٹ کے بعد یہ جلوس دوسرے موڑ پر پہنچ کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ہم نے چائے کی پیالیاں اور دوسرا سامان ٹوکری میں ڈالا اور بالکنی سے اتر کر ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ مس گلبرٹ راستہ بھر میرا اور ریاض کا شکریہ ادا کرتی رہی اس نے کہا:

''میں اس جلوس کا حال اپنی مماپپ کو آج ہی لکھ کر بھیجوں گی۔''

ٹیکسی ہوٹل کے پاس پہنچی تو میری جان میں جان آئی۔ ریاض کا چہرہ کامرانی سے چمک رہا تھا اور میں آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی ذہانت کی داد دے رہا تھا۔ مس گلبرٹ کے رخصت ہونے سے پہلے ریاض نے پیش بندی کے طور پر اس کو بتا دیا تھا کہ آج کل چوں کہ

حکومت اور رعایا میں مفاہمت ہو چکی ہے اس لیے ہمارے لیڈروں نے تمام اخبارات کو ہدایت کر رکھی ہے کہ کوئی ایسی تصویر یا خبر نہ چھاپی جائے جس سے دونوں کے تعلقات میں بدمزگی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ میرا خیال ہے کہ شاید ہی کوئی اخبار اس جلوس کی خبر یا تصویر چھاپے۔

مس گلبرٹ کے بشرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس نکتہ کو بخوبی سمجھ گئی ہے۔ اپنے کمرے میں جانے سے پہلے اس نے ایک معقول رقم کا چیک کاٹ کر ریاض کو دیا اور کہا "جہاں آپ نے میرے لیے اتنی زحمت اٹھائی ہے وہاں اتنی تکلیف اور کیجیے گا کہ یہ حقیری رقم میری طرف سے ان غریب سائیسوں کو دے دیجیے گا۔"

چیک لے کر ریاض جلد ہی رخصت ہو گیا۔

اس سوانگ کے یوں خیر وخوبی سرانجام پا جانے پر میں نے خدا کا شکر ادا کیا گیا مگر پھر بھی دو تین دن تک میں نے مس گلبرٹ سے بات کرنے سے پہلو تہی کی۔ بس مزاج پرسی کر لیتا اور یوں ظاہر کرتا جیسے میں سخت مصروف ہوں۔ جب ایک ہفتہ یوں ہی گزر گیا اور کسی قسم کا ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا تو میری فکر دور ہوئی۔

اگلے روز اتوار تھا، میں پہلے کی طرح چونچال ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ آج مس گلبرٹ سے جی بھر کر باتیں کروں گا، مگر اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ریاض بھاگا چلا آرہا ہے۔

"ارے غضب ہو گیا۔" اس نے میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔ "اس دن والے مذاق نے کچھ اور ہی رنگ اختیار کر لیا۔"

پھر کچھ بتائے بغیر وہ مجھے زبردستی کھینچتا ہوا ہوٹل سے باہر لے گیا جہاں اس کی ٹیکسی کھڑی تھی۔ ہم شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔

شہر میں سچ مچ کا ایک جلوس نکلا ہوا تھا۔ کسی الگ تھلگ گمنام گوشے میں نہیں بلکہ شہر کے عین بیچوں بیچ، اس میں دس بیس نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں سائیس شامل تھے۔

جلوس بڑا قاعدے کا تھا یعنی اس میں کسی قسم کا غیر متعلقہ عنصر شامل نہیں تھا، نہ ڈھول ڈھمک ڈھمکا تھا اور نہ اونٹ، البتہ یہ لوگ ریاض ہی کا بنایا ہوا انقلابی گیت جوش و خروش سے گاتے ہوئے جا رہے تھے:

ہیا
بولو ہیا ہیا
بھوکن پیٹین پر ت پھونا ہیں
چوہن ناچت تھیا تھیا
ہیا
بولو ہیا ہیا

اس میں شبہ نہیں کہ یہ جلوس بڑے معرکے کا تھا اور مس گلبرٹ کے دیکھنے کی خاص چیز لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ ہوٹل واپس آ کر میں نے اور ریاض نے اس کا ذکر مس گلبرٹ سے کرنا مناسب نہ سمجھا۔

فینسی ہیر کٹنگ سیلون

آبادیوں کی ادل بدل نے ایک دن ایک اجنبی شہر میں چار حجاموں کو اکٹھا کر دیا۔ وہ ایک چھوٹی سی دکان پر چائے پینے آئے۔ جیسا کہ قاعدہ ہے، ہم پیشہ لوگ جلد ہی ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں۔ یہ لوگ بھی بہت جلد ایک دوسرے کو جان گئے۔ چاروں وطن سے لُٹ لٹا کر آئے تھے۔ جب اپنی اپنی بپتا سنا چکے تو سوچنے لگے کہ اب کریں تو کیا کریں۔ تھوڑی تھوڑی سی پونجی اور اپنی اپنی کسبت ہر ایک کے پاس تھی ہی۔ صلاح ٹھہری کہ چاروں مل کر ایک دکان لیں اور ساجھے میں کام شروع کر دیں۔

یہ تقسیم کے آغاز کا زمانہ تھا۔ شہروں میں افرا تفری پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ دل جمعی سے کوئی کام نہ کر پاتے تھے۔ تمام کاروبار سرد پڑے ہوئے تھے، پھر بھی ان حجاموں کو دکان کے لیے کافی دوڑ دھوپ کرنی پڑی۔ وہ کئی دن تک سرکاری دفتروں کے چکر کاٹتے رہے اور چھوٹے چھوٹے افسروں، کلرکوں اور چپراسیوں تک کو اپنی دکھ بھری کہانی بڑھا چڑھا کر سناتے رہے، آخر کار ایک افسر کا دل پسیج گیا اور اس نے ان چاروں کو شہر کے ایک اہم چوک میں ایک حجام ہی کی دکانِ دلا دی جو ہنگامہ کے دنوں میں دکان میں تالا ڈال بھاگ گیا تھا۔

یہ دکان زیادہ بڑی تو نہ تھی، پر اس کے مالک نے اس میں اچھا خاصا سیلونوں کا سا ٹھاٹھ

بانٹھ کر رکھا تھا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ لکڑی کے تختے جوڑ اوپر سنگِ مرمر کی لمبی لمبی سلیں جما، ٹیبل سے بنالیے تھے۔ تین ایک طرف اور دو ایک طرف، ہر ایک ٹیبل کے ساتھ دیوار میں جڑا ہوا ایک بڑا آئینہ تھا اور ایک اونچے پایوں کی کرسی جس کے پیچھے لکڑی کا گدی دار اسٹینڈ لگا ہوا تھا۔ گاہک ٹھنگنے قد کا ہوا تو اسٹینڈ کو نیچے سرکا لیا، لمبے قد کا ہوا تو اونچا کر لیا اور گدی پر اس کے سر کو ٹکا مزے سے داڑھی مونڈنے لگے۔

ضرورت کی یہ سب چیزیں مہیا تو تھیں مگر تھیں ذرا پرانے فیشن کی اور ٹوٹی پھوٹی سنگ مرمر کی سلوں کے کنارے اور کونے جگہ جگہ سے شکستہ تھے۔ آئینے تھے تو بڑے بڑے مگر ذرا پتلے، اس کی وجہ سے گاہکوں کو اپنی صورتیں چپٹی چپٹی سی نظر آتی تھیں۔ ایک آئینے کے بیچ میں کچھ اس طرح بال پڑ گیا تھا کہ دیکھنے والے کو اس میں بیک وقت ایک کے دو چہرے نظر آتے مگر دونوں ادھورے جو ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر مضحکہ خیز صورتیں پیدا کرتے۔ چنانچہ اس آئینے کے سامنے بیٹھنے والا اپنی گردن کو تین چار مرتبہ مختلف زاویوں پر اونچا نیچا کیے بغیر نہ رہ سکتا۔ علاوہ ازیں اس دکان میں شمپو کا بھی کوئی انتظام نہ تھا۔

لیکن ان حجاموں نے ان خامیوں کا زیادہ خیال نہ کیا۔ سچ یہ ہے کہ یہ بات ان کے وہم و خیال میں بھی نہ آسکتی تھی کہ ایک دن انہیں یہ سب سامان بنا بنایا مفت مل جائے گا۔ اپنے وطن میں وہ اب تک بڑی گمنامی کی زندگی بسر کرتے رہے تھے۔ ان میں سے ایک جو عمر میں سب سے بڑا تھا اور استاد کہلاتا تھا اس نے کچھ مستقل گاہک باندھ رکھے تھے جن کے گھر وہ ہر روز یا ایک دن چھوڑ کر ڈاڑھی مونڈنے جایا کرتا تھا، اس سے عمر میں دوسرے درجے پر جو حجام تھا اس نے ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر لاریوں کے اڈے سنبھال رکھے تھے۔ دن بھر کسبت گلے میں ڈالے ڈاڑھی بڑھوں کی ٹوہ میں رہا کرتا اور دوسرے دو حجام جو نو عمر تھے ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو روپے یومیہ پر کبھی کسی دکان میں تو کبھی کسی دکان میں کام کیا کرتے تھے۔

اب اچانک قسمت نے ان لوگوں کو زندگی میں پہلی مرتبہ آزادی اور خود مختاری کا یہ موقع جو -

بخشا تو وہ بہت خوش ہوئے اور دکان کو اور زیادہ ترقی دینے اور اپنی حالت کو سنوارنے پر کمر بستہ ہو گئے۔

سب سے پہلے ان لوگوں نے بازار سے ایک کوچی اور چونا لا کر خود ہی دکان میں سفیدی کی اور اس کے فرش کو خوب دھویا پونچھا۔ اس کے بعد نیلام گھر سے پرانے انگریزی کپڑوں کے دو تین گٹھر سستے داموں خریدے، ان میں سے قمیصوں اور پتلونوں کو چھانٹ کر الگ کیا، پھٹے کپڑوں کو سیا۔ جہاں جہاں پیوند لگانے کی ضرورت تھی وہاں پیوند لگائے۔ جن حصوں کو چھوٹا کرنا تھا ان کو چھوٹا کیا اور یوں ہر ایک نے اپنے لیے دو دو تین تین جوڑے تیار کر لیے۔ اس کے علاوہ ہر ایک کو ایک ایک چادر کی بھی ضرورت تھی جسے بال کاٹنے کے وقت گاہک کے جسم پر گردن کے نیچے لپیٹنا ضروری ہوتا ہے یہ ذرا مشکل کام تھا مگر ان لوگوں نے سایوں، جمپروں، کوٹوں اور پتلونوں کو پھاڑ کر جیسے تیسے دو چادریں بنا ہی لیں۔ کپڑوں کے اسی ڈھیر میں انہیں ریشم کا سیاہ پردہ بھی ملا جس پر سنہرے رنگ میں تتلیاں بنی ہوئی ہیں، کپڑا تھا تو بوسیدہ مگر ابھی تک اس میں چمک دمک باقی تھی۔ اسے احتیاط سے دھو کر دکان کے دروازے پر لٹکا دیا۔

اپنے اپنے اوزار سب کے پاس تھے ہی، ان کی تو فکر نہ تھی، البتہ تھوڑے داموں والی کئی چیزیں خریدی گئیں مثلاً سلولائڈ کے پیالے صابن کے لیے، ڈاڑھی کے برش، پھٹکری، چھوٹی بڑی کنگھیاں، تولیے، دو تین تیز خوشبو والے دیسی تیلوں کی شیشیاں، ایک گھٹیا درجے کے کریم کی شیشی۔ ایک سستا سا پوڈر کا ڈبہ۔ علاوہ ازیں کباڑیوں کی دکانوں سے ولایتی لونڈر کی ٹیڑھی ترچھی خالی شیشیاں خرید ان میں سرسوں کا تیل بھر دیا۔

دکان کی آرائش کی طرف سے بھی یہ لوگ غافل نہ رہے۔ دکان کے پہلے مالک نے اس میں نہ جانے کس زمانے کی دقیانوسی مذہبی تصویریں لٹکا رکھی تھیں، ان کو اتار ڈالا اور ان کی جگہ دو ایک پرانے امریکن فلموں کے بڑے بڑے رنگدار پوسٹر جو ایک کباڑیے کے

ہاں سے لے آئے تھے، دکان کے اندر دیواروں پر چسپاں کر دیئے۔ علاوہ ازیں دو تین قطعات اور ایک کلینڈر جس میں ملک کے بڑے بڑے سیاسی لیڈروں کے فوٹو تھے، دیوار پر ٹانگ دیئے۔ دکان کو جلد چلانے کے خیال سے انہوں نے اجرتیں بہت کم رکھیں۔ مرّوجہ اجرتوں سے نصف سے بھی کم، چنانچہ ایک گتے پر سیاہ روشنائی سے حجامت کی اجرتیں لکھوا کر اسے دیوار پر ایسی جگہ لٹکا دیا کہ گاہک جیسے ہی دکان میں داخل ہو اس کی نظر سب سے پہلے اسی پر پڑے۔

پہلے حجام نے اس دکان کا نام "فینسی ہیر کٹنگ سیلون" رکھا تھا۔ یہ نام دکان کی پیشانی پر بہت جلی حروف میں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھا ہوا تھا۔ ایک بابو سے "فینسی" کا مطلب معلوم کر کے بہت خوش ہوئے اور فیصلہ کیا کہ فی الحال اسی سے کام لیا جائے۔ کوئی نیا نام رکھتے تو اس کو مٹانے اور اس کو لکھوانے پر خاصی رقم خرچ کرنی پڑتی۔

جس روز باقاعدہ طور پر دکان کا افتتاح ہونا تھا، انہوں نے دوپہر کو بڑی محنت سے ایک دوسرے کی حجامتیں بنائیں، لمبی لمبی قلمیں رکھیں۔ گرم پانی سے خوب مل مل کر نہائے، صاف ستھری قمیصیں اور پتلونیں پہنیں، جن کو انہوں نے قریب کی ایک لانڈری سے دھلوا لیا تھا، بالوں میں تیل ڈالا، پٹیاں جمائیں، گردن اور چہرے پر ہلکا ہلکا پوڈر ملا اور یوں چاق وچوبند ہو اگر بتیوں کی بھینی بھینی خوشبو میں، استروں کو، جن کی دھار وہ رات بھر سلیوں پر تیز کرتے رہے تھے، ہتھیلیوں پر ہلکا ہلکا پٹکتے ہوئے خود کو خدمتِ خلق کے لیے پیش کر دیا۔

پہلی شام کچھ زیادہ کامیاب ثابت نہ ہوئی۔ کل پانچ گاہک آئے، تین شیو اور دو بال کٹائی کے اور وہ بھی آدھ آدھ پاؤ پاؤ گھنٹے کے وقفے پر مگر یہ لوگ ذرا مایوس نہ ہوئے ہر گاہک کا پُر جوش خیر مقدم کیا، اس کو بٹھانے سے پہلے کرسی کو دو بار جھاڑا پونچھا، اس کی ٹوپی پگڑی یا کوٹ لے کر احتیاط سے کھونٹی پر ٹانگ دیا۔ ڈاڑھی کے بال نرم کرنے کے لیے دیر تک برش سے جھاگ کو پھینٹا، بڑے نرم ہاتھ سے اُسترا چلایا، اور اگر احتیاط کے باوجود کہیں ہلکا سا چر کا

لگ بھی گیا تو بڑی چابک دستی سے خون کو صابن کے جھاگ میں چھپائے رکھا تاوقتیکہ پوری ڈاڑھی نہ مونڈلی اور پھر اطمینان سے پھٹکری پھیر کر زخم کو نیست ونابود کر دیا۔

ایک حجام نے اس خیال سے کہ بال کاٹنے میں زیادہ وقت لگایا تو گاہک خوش ہوتا ہے، ایک دفعہ بال تراش کر دوبارہ تراشنے شروع کر دیئے۔ آخر میں اس نے گاہک کے سر میں تیل ڈال یوں ہلکے ہلکے مزے مزے ملنا شروع کیا کہ گاہک کی آنکھوں میں سرور کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس کو اپنی محنت کا صلہ جلد ہی مل گیا۔ گاہک نے اجرت کے علاوہ ایک آنہ اسے "بخشش" کے طور پر بھی دیا۔

اس شام کام کی کمی کے باوجود ان لوگوں نے دیر تک دکان کھلی رکھی، پھر دکان بڑھانے کے بعد بھی وہ دیر تک جاگتے رہے اور ہنسی مذاق کی باتیں کرتے رہے۔

دوسرے دن دفتروں میں کوئی تعطیل تھی۔ صبح کو آٹھ بجے ہی سے گاہک آنے شروع ہو گئے۔ دس بجے کے بعد تو یہ کیفیت ہو گئی کہ ایک گیا نہیں کہ دوسرا آ گیا، پھر بعض دفعہ تو تین تین کاریگر بیک وقت کام میں مصروف رہے۔ رات کو دکان بڑھا کر حساب کیا تو ہر ایک کے حصے میں تقریباً چار چار روپے آئے۔ تیسرے روز پھر مندا رہا مگر چوتھے روز پھر گاہکوں کی گہما گہمی دیکھ کر چاروں کو یقین ہو گیا کہ دکان قطعی طور پر چل نکلی ہے۔

یہ لوگ اس اجنبی شہر میں اکیلے ہی آئے تھے لہٰذا رات کو فرش پر بستر جما دکان ہی میں پڑ رہتے، ایک چھوٹی سی انگیٹھی، ایک کیتلی اور دو تین روغنی پرچ پیالیاں خرید لیں، صبح کو دکان ہی میں چائے بناتے اور ناشتہ کرتے، دوپہر کو تنور سے دو ایک قسم کے سالن اور روٹیاں لے آتے اور چاروں مل کر پیٹ بھر لیتے۔

دکان کو قائم ہوئے ابھی آٹھ دن ہی ہوئے تھے کہ ایک دن سہ پہر کو ایک اَدھیڑ عمر دبلا پتلا شریف صورت آدمی دکان میں داخل ہوا۔ اس کے کپڑے میلے تھے، مگر پھٹے ہوئے نہ تھے۔ سر پر اس وضع کی پگڑی جیسے منشی لوگ باندھا کرتے ہیں، پاؤں میں نری کا جوتا،

ڈاڑھی بڑھی ہوئی۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اس میں سفید بال زیادہ ہیں یا کالے، ایک گھٹیا درجہ کی عینک لگائے ہوئے تھا جس کی ایک کمانی ٹوٹی ہوئی تھی اور اسے دھاگے سے جوڑ رکھا تھا۔ ان لوگوں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ پہلے تو وہ جھجکا مگر پھر بیٹھ گیا۔

ایک حجام نے پوچھا۔ ''شیو؟''

اس نے کہا۔ ''نہیں۔''

''بال؟''

''نہیں۔''

''اور پھر کیا چاہتے ہو؟'' استاد نے پوچھا۔

''مہربانی کر کے میرے ناخن کاٹ دو۔'' اس نے کہا۔

ناخن کٹوانے کے بعد بھی وہ شخص وہیں بیٹھا رہا۔ آخر جب ان لوگوں نے بار بار اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے کہنا شروع کیا۔

''صاحب میں ایک غریب مہاجر ہوں، میں اپنے وطن میں ایک بنیے کا منشی تھا اس کے ہاں راشن کارڈوں کی پرچیاں لکھا کرتا تھا اور حساب کتاب کا کام بھی کیا کرتا تھا۔ وطن چھوٹا تو یہ روزگار بھی چھوٹ گیا۔ اس شہر میں کئی دن سے بیکار پھر رہا ہوں، کئی جگہ نوکری کی تلاش میں گیا مگر ہر جگہ پہلے ہی سے منشی موجود تھے۔ اگر آپ مجھے کوئی کام دلوا دیں تو عمر بھر احسان نہ بھولوں گا۔ میں اس بیکاری سے ایسا تنگ آ گیا ہوں کہ جو کام بھی آپ مجھے بتائیں گے دل و جان سے کروں گا۔ حساب کتاب کے کام کے علاوہ میں کھانا پکانا بھی جانتا ہوں۔''

اس کی بات سن کر یہ لوگ تھوڑی دیر خاموش رہے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے صلاح مشورہ کرتے رہے۔ آخر استاد نے زبان کھولی:

''دیکھو میاں! ہم خود مہاجر ہیں اور نیا نیا کام شروع کیا ہے۔ تنخواہ تو ہم تم کو دینے کے نہیں، ہاں کھانا دونوں وقت ہمارے ساتھ کھاؤ بلکہ خود ہی پکاؤ کیونکہ تم ہمارے بھائی

ہو۔ بس تھوڑا سا اپنا دکان کو جھاڑ پونچھ دیا کرنا۔ پھر جب کہیں تمہارا کام بن جائے تو شوق سے چلے جانا، ہم روکیں گے نہیں۔"

اس شخص نے بڑی خوشی سے ان کی یہ شرط منظور کرلی۔ شکریہ ادا کیا اور وہیں رہ پڑا۔

دوسرے دن بازار سے ایلومینیم کی ایک دیگچی اور کچھ اور برتن خریدے گئے اور دکان میں ہنڈیا پکنے کا سامان ہونے لگا مگر پہلے ہی روز ان پر یہ بات ظاہر ہوگئی کہ یہ شخص کھانا پکانا کچھ واجبی سا جانتا ہے تاہم اسے نکالا نہیں گیا۔ جھاڑنے پونچھنے میں وہ کافی چست تھا۔ بازار سے سودا بھی دوڑ کر لے آتا تھا، سچ یہ ہے کہ یہ ایک شخص جو آٹھ پہر غلامی کرنے کو تیار تھا، خط پتر لکھ سکتا تھا، حساب کتاب جانتا تھا، آقاؤں سے ادب سے پیش آتا تھا دو وقت کی روٹی پر کچھ مہنگا نہ تھا۔

یوں ہی دن گزرتے گئے، یہاں تک کہ دکان کھلے دو مہینے ہوگئے۔ اس عرصے میں دکان نے خاصی ترقی بھی کرلی تھی۔ ان لوگوں نے اس کے لیے کچھ نیا فرنیچر بھی خرید لیا تھا شمو کے لیے بیسن وغیرہ بھی لگوا لیا تھا اور تھوڑی تھوڑی رقم ہر ایک نے بچا بھی لی تھی۔

تیسرا مہینہ ابھی آدھا ہی گزرا تھا کہ ایک روز صبح ہی صبح استاد کو اپنے بیوی بچوں کی یاد بے طرح ستانے لگی۔ دوپہر ہوتے ہوتے وہ ٹھنڈے ٹھنڈے سانس لینے لگا۔ تیسرے پہر اس کی اداسی اور بھی بڑھ گئی۔ شام ہونے سے پہلے ہی اس نے اپنے ساتھیوں سے چار دن کی چھٹی لی اور بیوی بچوں کو لے آنے کے لیے روانہ ہوگیا جو کوئی دو سو میل دور کسی شہر میں اپنے کسی رشتہ دار کے دروازے پر ناخواندہ مہمان بنے پڑے تھے۔

استاد نے چار دن میں لوٹ آنے کا پکا وعدہ کیا تھا اور بڑی بڑی قسمیں کھائی تھیں مگر واپسی میں پورے پندرہ دن لگ گئے۔ بیوی بچوں کو تو اسٹیشن کے مسافر خانے ہی میں چھوڑا اور خود دکان پر پہنچا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو بیماریوں کی ایک طویل داستان سنائی جن میں

اس کی بیوی بچے مبتلا تھے، اور وہ تکلیفیں بھی بیان کیں جو بیوی بچوں کو یہاں لانے میں اسے اٹھانی پڑیں۔ آخر میں اس نے خرچ کی تنگی کا ذکر کیا اور روپیہ قرض مانگا۔

یہ بات تو ظاہر ہی تھی کہ جتنے روز استاد نے دکان میں کام نہیں کیا تھا اتنے روز کی آمدنی میں اس کا کوئی حصہ نہ تھا اور پھر ایک کاریگر کے کم ہو جانے سے آمدنی بھی نسبتاً کم ہی ہوئی تھی مگر کچھ تو بزرگی کا لحاظ کرتے ہوئے اور کچھ مروّت کی وجہ سے اس کے ساتھیوں نے اسے یہ بات نہ جتائی بلکہ ہر ایک نے اپنی اپنی جیب سے پانچ پانچ روپے نکال کر اس کے حوالے کر دیئے۔ پندرہ روپے استاد کی ضرورتوں کے مقابلے میں بہت ہی کم تھے مگر وہ چپ چاپ یہ رقم لے کر چلا گیا۔

دوسرے دن سے پھر چاروں آدمی کام کرنے لگے۔ اب تک تو ان کا یہ قاعدہ رہا تھا کہ گاہکوں سے اُجرتیں لے لے کر اپنے پاس ہی جمع کرتے رہتے اور رات کو دکان بڑھاتے وقت ساری رقم اکٹھی کر کے آپس میں برابر برابر تقسیم کر لیتے۔ دکان کے رکھ رکھاؤ، ٹوٹ پھوٹ اور اپنے اور نوکر کے کھانے پینے پر جو رقم خرچ ہوتی اس میں وہ چاروں برابر کے ساجھی تھے مگر استاد نے دوسرے ہی دن باتوں باتوں میں اپنے ساتھیوں سے کہہ دیا کہ بھئی میں بیوی بچوں والا ہوں، پردیس کا معاملہ ہے، ان کو اکیلا کیسے چھوڑ سکتا ہوں، اس لئے رات کو میں ان کے پاس سویا کروں گا، دوسرے یہ کہ کھانا بھی میں ان کے ساتھ ہی کھایا کروں گا۔ آج سے تم کھانے پینے کے خرچ میں سے میرا نام نکال دو … اور بھائیو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں ادھر تو تمہارے ساتھ خرچ کروں اور ادھر گھر پر بھی۔

اس کے ساتھی یہ بات سن کر خاموش ہو رہے۔ اب استاد دوپہر کو کھانا کھانے گھر چلا جاتا جو اس نے قریب ہی کہیں لے لیا تھا۔ دو گھنٹے بعد لوٹتا۔ رات کو بھی جلد دکان بڑھوا، اپنا حصہ لے چلتا بنتا۔

کوئی ہفتہ بھر تک یہی سلسلہ رہا مگر اس کے بعد استاد کے تینوں ساتھیوں کے طور

ایک دَم سے بدل گئے۔ اب وہ اکثر آپس میں کھسر پھسر کرتے اور چپکے چپکے استاد کی حرکات و سکنات کو غور سے دیکھتے رہتے خصوصاً اس وقت جب حجامت کے بعد گاہک سے استاد اجرت وصول کرتا وہ کن انکھیوں سے دیکھتے رہتے کہ استاد پیسے کس جیب میں ڈالتا ہے۔

ایک رات جب استاد دکان سے رخصت ہوا تو اس کے تینوں ساتھی دیر تک جاگتے اور آپس میں باتیں کرتے رہے۔ انہیں استاد کے خلاف کئی شکایتیں تھیں جنھیں وہ اب تک بڑے صبر سے درگزر کرتے رہے تھے مگر اب، جب انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ استاد روپے پیسے کے معاملے میں بھی کھرا نہیں ہے تو وہ صبر نہ کرسکے۔ انہوں نے استاد کی اس دھوکہ بازی کی روک تھام کے لیے بہت سی تجویزیں سوچیں مگر کسی پر دل نہ جما، آخر بڑی رات گئے، ایک ترکیب ان کے ذہن میں آئی اور وہ اطمینان سے سو گئے۔ دوسرے دن جب استاد دکان پر آیا تو ان تینوں نے آپس میں لڑنا جھگڑنا شروع کردیا، ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا:

''میں نے خود اپنی ان گناہگار آنکھوں سے دیکھا ہے کہ رات تم نے گاہک سے چونی لے کر اپنی پتلون کی جیب میں ڈال لی حالانکہ سارے پیسے تم اپنی قمیص کی جیب میں ڈالا کرتے ہو۔''

''دوسرے نے کہا تم بکتے ہو۔ خود پکے بے ایمان ہو۔ پرسوں گاہک نے تمہیں ایک دونی اور دو اکنیاں دی تھیں۔ ایک دونی اور ایک اکنی تو تم نے جیب میں ڈال لی اور ایک اکنی چالاکی سے انگلیوں کے بیچ ہی میں دبائے رکھی۔''

اس مرتبہ تیسرے نے کہا ''ارے میاں لڑتے جھگڑتے کیوں ہو، جو ہوا اس کو تو کرو معاف، آئندہ کے لیے تمہیں ایک ترکیب بتاتا ہوں کہ ہم میں سے کوئی چاہے بھی تو اس قسم کا دھوکا نہیں کرسکے گا، وہ یہ کہ دروازے کے قریب میز کرسی ڈال دو۔ کرسی پر تو منشی کو بٹھادو اور میز پر ایک صندوقچی رکھ دو جس کے ڈھکنے میں سوراخ ہو۔ بس گاہک حجامت کے پیسے اس

صندوقچی میں خود ہی ڈال دیا کرے۔ ہم میں سے کوئی خود ایک پائی بھی وصول نہ کرے۔ منشی مفت میں روٹیاں بٹورا کرتا ہے اس سے یہ کام کیوں نہ لیا جائے۔ یہ اس بات کا بھی دھیان رکھے گا کہ کوئی شخص بغیر اُجرت دیئے نہ چلا جائے یا کھوٹے سکے نہ دے دے۔ پھر چاہو تو منشی ساتھ ساتھ کاپی میں رقمیں بھی لکھتا جائے گا۔ آخر کس لیے رکھا ہے اس کو!"

اس پر پہلے نے کہا۔ "بہت ٹھیک۔ مجھے منظور ہے لیکن یہ نہیں مانے گا، بے ایمانی جو ٹھہری جی میں۔"

اس پر دوسرے نے بھنا کر کہا۔ "کیوں میں کیوں نہ مانوں گا۔ اچھا ہے، ایسا ہو جائے، جھوٹ سچ آپ ظاہر ہو جائے گا۔"

تیسرے نے استاد سے پوچھا۔ "کیوں استاد تمہاری کیا رائے ہے؟"

استاد کچھ نہ کہہ سکا۔ نہ اس تجویز کے حق میں نہ اس کے خلاف۔ اس نے خاموش ہی رہنے میں مصلحت سمجھی۔

دوسرے ہی دن سے اس تجویز پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ ہر روز رات کو دن بھر کی آمدنی کا باقاعدہ حساب ہوتا اور اس میں سے ہر ایک کو پورا پورا حصہ ملتا۔ چار دن نہ گزرنے پائے تھے کہ اس میں اتنی ترمیم اور کر دی گئی کہ آمدنی کا حصہ بجائے روز کے بجائے ہفتہ کے ہفتہ کیا جائے، اس طرح ہر شخص کو معقول رقم مل سکے گی۔ ہر روز جو تھوڑے پیسے ملتے ہیں ان سے تو کسی کی بھی پوری نہیں پڑتی۔ ہاں اگر ہفتہ ختم ہونے سے پہلے ہی کسی ساجھے دار کو کچھ رقم کی ضرورت پڑ جائے تو وہ منشی سے پرچی لکھوا کر پیشگی لے سکتا ہے۔

استاد نے اس کی بھی نہ مخالفت کی نہ موافقت۔ وہ خاموش ہی رہا۔

مگر استاد اپنی خاموشی کو زیادہ دن تک قائم نہ رکھ سکا۔ ایک دن وہ صبح ہی صبح دکان پر پہنچا اور چھوٹے پر استرے کی دھار گھستے ہوئے ایک دَم اپنے ساتھیوں پر برس پڑا:

"بس جی بس۔ میں تم لوگوں کے ساتھ کام نہیں کر سکتا۔ انصاف کا تو آج کل زمانہ

ہی نہیں ہے۔ تم نے گدھے اور گھوڑے کو برابر سمجھ لیا ہے۔ تم میں سے نہ تو کوئی میرے جتنا پرانا کاریگر ہے اور نہ ہنر مند، پھر ڈاڑھی مونڈنے میں میرا ہاتھ ایسا ہلکا ہے کہ ہر شخص مجھی سے ڈاڑھی منڈانا چاہتا ہے۔ میں ایسے کئی آدمیوں کو جانتا ہوں کہ جب میں کام میں مصروف ہوتا ہوں تو وہ دکان میں آتے ہی نہیں بلکہ باہر ہی باہر ٹہلتے رہتے ہیں کہ کہیں دوسرے سے ڈاڑھی نہ منڈانی پڑ جائے۔ پھر جہاں مجھے خالی ہوتے دیکھتے ہیں، لپک کر میری کرسی پر آبیٹھتے ہیں۔ منشی اس بات کا گواہ ہے کہ میری روز کی کمائی تم لوگوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اب تم ہی انصاف کرو کہ جب میں ہنر میں بھی تم سے بڑھ کر ہوں اور گاہک بھی زیادہ میرے ہی پاس آئیں۔ کام بھی زیادہ میں ہی کروں، کمائی بھی زیادہ میری ہی ہو، تو پھر اس کی کیا وجہ کہ مجھے بھی اتنا ہی ملے جتنا تم سب کو ملتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تم لوگ میرا حصہ مجھے دے دو اور دکان خود سنبھال لو۔ اگر یہ نہیں تو کام کے لحاظ سے ہر ایک کی تنخواہ مقرر کردو۔ آمدنی میں سے تنخواہیں نکال کر جتنی رقم بچے گی وہ ہم چاروں آپس میں برابر برابر بانٹ لیا کریں گے۔ اگر تم کو یہ بات منظور ہو تو اس سے اچھی اور کوئی بات نہیں، ورنہ صاحب ایسی دکان اور ایسے ساجھے داری کو میرا دور ہی سے سلام۔ بندہ کہیں اور قسمت آزمائے گا۔ جتنے پیسے مجھے یہاں ملتے ہیں اس سے زیادہ تو میں آنکھ بند کر کے جس سیلون میں چلا جاؤں، لے سکتا ہوں۔"

استاد کی یہ تقریر اس کے تینوں ساتھیوں نے بہت غور اور توجہ سے سنی۔ اس میں کچھ باتیں ٹھیک بھی تھیں مثلاً ہنر مندی میں استاد واقعی ان تینوں سے کہیں بڑھ کر تھا مگر اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی تھا کہ وہ ساجھے داری میں اپنی ہنر مندی کا ناجائز دباؤ ڈالے۔ جب ساجھا ہی ٹھہرا تو ہنر کی کون پروا کرتا ہے۔ ساجھا ایک کنبہ کی طرح ہے جس میں کمانے والے فرد اپنی اپنی بساط کے مطابق کنبہ کی پرورش کرتے ہیں۔ کم و بیش کمانے والوں یا نہ کمانے والوں میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی جاتی اور یہ استاد کی حد درجہ کم ظرفی ہے کہ

زیادہ ہنر منداور کم ہنر مند کا سوال اٹھا کر ساجھے میں تفریق پیدا کرنا چاہتا ہے۔

استاد کے دکان سے قطع تعلق کر لینے کا مطلب بھی وہ خوب سمجھتے تھے۔ اس کا مطلب تھا ایک بھاری رقم بطور معاوضہ استاد کو دینا اور یہ رقم ان کے پاس نہ تھی، دوسری صورت یہ تھی کہ یہ تینوں دکان سے علیحدہ ہو جاتے مگر علیحدہ ہو کر جاتے تو کہاں جاتے۔ نہ کام ہی میں ایسی مہارت تھی کہ دوسری جگہ آسانی سے نوکری مل سکتی اور نہ سر چھپانے ہی کا کوئی ٹھکانہ تھا لہٰذا گلے شکوے تو انہوں نے بہت کیے مگر انجام کار انہوں نے استاد کی تنخواہوں والی شرط مان ہی لی۔ تنخواہیں مقرر کرنے کے مسئلے نے خاصا طول کھینچا، آخر بحث و تمحیص کے بعد یہ طے پایا کہ استاد کو تو ڈیڑھ سو روپے ماہوار ملے اور اس سے نچلے کاریگر کو ایک سو بیس، تیسرے کو سو اور چوتھے کو اسی۔ ساتھ ہی یہ بھی قرار پایا کہ تنخواہوں کا حساب مہینے کے مہینے ہوا کرے۔

استاد دل میں بہت خوش تھا کہ بالآخر اس نے اپنا تفوق اپنے ساتھیوں پر قائم کر لیا۔ ادھر اس کے ساتھی کچھ دن پژمردہ رہے مگر پھر مہینے کے بعد ایک معقول رقم ہاتھ آنے کے خیال نے رفتہ رفتہ ان کا غم دور کر دیا اور وہ بڑی بے تابی سے مہینہ کے ختم ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

خدا خدا کر کے جب مہینہ ختم ہوا اور تنخواہ کا دن آیا تو یہ دیکھ کر ان چاروں حجاموں کو حیرانی اور مایوسی کی کوئی حد نہ رہی کہ پچھلے مہینے دکان سے جو آمدنی ہوئی تھی ان میں سے ان کی آدھی آدھی تنخواہیں بھی نہیں نکلتی تھیں۔ ان لوگوں کو سب سے زیادہ اچنبھا اس بات پر ہوا کہ دکان پہلے سے زیادہ ترقی پر تھی۔ گاہک بھی پہلے سے زیادہ آ رہے تھے مگر اس کے باوجود انہیں جو رقم ملی اس کا یومیہ ابتدائی دنوں کے یومیہ سے بھی کم تھا۔ منشی کے کھاتے کی جانچ پڑتال کی گئی مگر اس نے پائی پائی کا حساب بتا دیا۔ ہر شخص کی روز کی کمائی۔ چاروں کی روز کمائی، ہفتہ کی کمائی، مہینہ کی کمائی۔ الگ الگ بھی اور مشترکہ بھی پورا چٹھا کھول کر رکھ دیا۔ کیا مجال

جو کوئی شخص اس حساب میں غلطی نکال سکے۔

قاعدہ ہے کہ روپیہ باہر سے آنے والا ہو یا بندھی ہوئی تنخواہ ہو تو انسان خواہ مخواہ اپنا خرچ بڑھا لیتا ہے، یا اس کے بھروسے پر قرض لے لیتا ہے۔ ان میں سے دو حجام ایک استاد اور ایک اور اسی امید پر محلے کے بعض دکانداروں کے مقروض ہو گئے۔ قرض خواہ کے تقاضے کا ڈر تو تھا ہی، آئندہ قرض کا دروازہ بند ہو جانے کا بھی احتمال تھا۔

اس روز رات کو جب وہ دکان بڑھانے لگے تو حد درجہ دل شکستہ اور مایوس نظر آتے تھے۔ سب سے زیادہ مسکین پن منشی کے چہرے سے ٹپک رہا تھا۔ ہر چند اس کی کوئی تنخواہ مقرر نہ تھی، پھر بھی اپنے آقاؤں کی اس مصیبت میں وہ برابر کا شریک نظر آتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ان کے قریب آیا اور درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں جھجک جھجک کر کہنے لگا:

"آپ لوگوں نے میرے ساتھ جو بھلائی کی ہے میں عمر بھر اسے نہیں بھول سکتا آج آپ کو پریشان دیکھ کر میرا دل بے حد کڑھا ہے۔ اب میں آپ کو سچی بات بتاتا ہوں وہ بات یہ ہے کہ جب میں اپنے وطن میں بنئے کے ہاں نوکر تھا تو ہر مہینے تنگی ترشی کر کے اپنی تنخواہ میں سے کچھ روپے بچا لیا کرتا تھا۔ چند مہینوں میں خاصی پونجی جمع ہو گئی، وطن سے چلتے وقت ساتھ لیتا آیا اور یہاں ڈاک خانے میں جمع کرا دی تاکہ آڑے وقت میرے کام آئے...... مگر اب آپ کو پریشان دیکھ کر دل نے گوارا نہ کیا کہ میرے پاس روپیہ ہو اور میں اسے اپنے بھائیوں سے چھپائے رکھوں۔ اگر آپ کہیں تو کل میں ڈاک خانے سے اپنا روپیہ نکال لاؤں۔ آپ اسے کام میں لائیے جب دکان کی آمدنی بڑھ جائے تو مجھے لوٹا دینا۔ میں کوئی نفع نہیں لوں گا۔"

"تمہارے پاس کتنے روپے ہیں؟" حجاموں نے پوچھا۔ کچھ تامل کے بعد منشی نے دھیرے سے کہا "سو روپے"

دوسرے دن منشی ڈاک خانہ سے سو روپے نکال لایا، اور ان سے الگ الگ رسید لے

کر وہ رقم ان میں تقسیم کر دی۔ اس طرح ان کی پریشانیاں کسی قدر دور ہو گئیں مگر اگلے مہینے دکان میں اس سے بھی کم آمدنی ہوئی۔ اب تو یہ لوگ بہت گھبرائے منشی نے بڑی چھان بین کے بعد آمدنی کم ہونے کی یہ وجہ دریافت کی کہ چونکہ چوک کے دوسرے ہیئر کٹنگ سیلونوں نے بھی ان کی دیکھادیکھی یامندے کی وجہ سے اپنے ہاں کی اجرتیں کم کر دی ہیں، اس لیے وہ گاہک جو محض کفایت کے خیال سے ان کے ہاں لپک آئے تھے۔ اب سب سیلونوں میں بٹ گئے ہیں۔

ان لوگوں نے منشی کی بات کا کچھ یقین کیا کچھ نہ کیا، بہر حال وہ اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتے تھے چونکہ منشی اب کے اپنے ایک بھائی سے سو روپے قرض لے آیا تھا، اس لیے ان لوگوں کو زیادہ پریشانی نہ اُٹھانی پڑی۔ تیسرے مہینے صورتحال کچھ کچھ سُدھر گئی اور انہوں نے کسی قدر اطمینان کا سانس لیا مگر چوتھے مہینے آمدنی ایک دم پھر کم ہو گئی۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ اس دفعہ منشی نے ان کی امداد کرنے سے بالکل معذوری ظاہر کر دی۔ اس نے کہا:

"بھائیو! اگر میرے پاس روپیہ ہوتا یا میں کہیں سے لاسکتا تو میں آپ کے قدموں میں نچھاور کر دیتا لیکن میرے پاس جو کچھ تھا، میں پہلے ہی آپ کی نذر کر چکا ہوں۔"

اس روز تو انہوں نے زیادہ اصرار نہ کیا مگر دوسرے دن صبح ہوتے ہی چاروں کے چاروں نے پھر منشی کو آگھیرا، جب ان کی خوشامدوں اور التجاؤں کی حد نہ رہی تو منشی نے کہا۔ "اچھا بھائیو! شام تک صبر کرو۔"

شام ہوئی تو وہ چاروں حجاموں سے یوں مخاطب ہوا:

"صاحبو! مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دکان کی حالت کبھی نہیں سُدھرے گی اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ لوگوں نے اپنی اپنی جو تنخواہیں مقرر کر رکھی ہیں، آمدنی سے کہیں زیادہ ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ دکان چلے اور آپ کی پریشانیاں دور ہوں تو سب سے پہلے آپ اپنی اصلاح کیجئے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ سب اپنے اپنے اخراجات کو کم کیجئے اور

دوسرے یہ کہ آپ اپنی اتنی ہی تنخواہیں مقرر کیجئے جتنی عام طور پر اس قسم کے سیلونوں میں ملازموں کو دی جاتی ہیں۔ اگر آپ میری تجویز کی ہوئی تنخواہ منظور کریں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، بلکہ اس بات کا ٹھیکہ لیتا ہوں کہ ہر مہینے آپ کو پوری تنخواہ ملا کرے گی۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر آپ میرے کہنے پر چلیں تو آپ کو ہر مہینے کی پہلی کو پیشگی ہی تنخواہ مل جایا کرے گی۔ یہ روپیہ کہاں سے آئے گا، اس سے آپ کو مطلب نہیں۔ چاہے میں چوری کروں، ڈاکہ ڈالوں۔ مگر آپ کو تنخواہ پیشگی ہی ملتی رہے گی۔ آپ نے میرے ساتھ ایسی بھلائی کی ہے کہ میں عمر بھر نہیں بھول نہیں سکتا، اور بھائیو! اگر آپ کو یہ شرط منظور نہ ہو تو آپ جائیں اور آپ کا کام میں آپ کے لیے رُوپے کا بندوبست نہیں کر سکتا۔"

چند لمحے خاموشی رہی۔ اس کے بعد استاد نے منشی سے پوچھا:

"اچھا بتاؤ تو تم ہماری کیا کیا تنخواہیں مقرر کرتے ہو؟"

منشی نے جواب دیا: "گستاخی معاف میں زیادہ سے زیادہ آپ کو اسّی روپے دے سکتا ہوں۔ دوسرے نمبر والے کو ساٹھ، تیسرے کو پچاس اور چوتھے کو چالیس۔ اگر آپ لوگ یہ تنخواہیں منظور کریں تو ابھی جا کر، چاہے مجھے دُگنے تگنے سود پر قرض ہی لینا پڑے، آپ سب کے لیے دو سو تیس روپے بطور پیشگی تنخواہ کے لے آتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ ہر مہینے اسی طرح آپ کو پیشگی تنخواہ ملا کرے گی یاد رکھو میرے دوستو یہ تنخواہیں کسی بڑے ہیئر کٹنگ سیلون کے ملازموں کی تنخواہیں سے کم نہیں ہیں۔ آپ لوگ جا کر خود دریافت کر سکتے ہیں البتہ اپنے ملازموں کی پیشگی تنخواہ دینا صرف اسی سیلون کی خصوصیت ہو گی ..." منشی کی یہ تقریر سن کر چاروں حجام گم سم سے رہ گئے اور کسی نے اس کی بات کا جواب نہ دیا مگر یہ خاموشی بڑی صبر آزما تھی۔ انہوں نے بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر گردنیں جھکا لیں۔

بردہ فروش

پنجاب کے اضلاع میں ایسے کئی چھوٹے چھوٹے قصبے ہیں جن کی آبادی تو چند سو نفوس سے زیادہ نہیں مگر جن کو ریلوے اسٹیشن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان اسٹیشنوں پر عموماً ایک ویرانی کی سی کیفیت رہتی ہے کیونکہ میل اور ایکسپریس کی قسم کی گاڑیاں تو یہاں ٹھہرنا کسر شان سمجھ کر آندھی کے تیز جھکڑ کی طرح گزر جاتی ہیں، البتہ سست رفتار گاڑیاں چار چار پانچ پانچ گھنٹے کے بعد ان اسٹیشنوں پر آ کے رُکتی اور گھڑی دو گھڑی کے لیے ان کی رونق بڑھا جاتی ہیں مگر ان کے جاتے ہی یہاں پھر اُلّو بولنے لگتا ہے۔

جمال پورہ پنجاب کا ایک ایسا ہی ریلوے اسٹیشن ہے۔ اسوج کا مہینہ، سہ پہر کا وقت۔ چار بجے ہیں۔ ٹھیک سینتالیس منٹ کے بعد ایک ڈاؤن پسنجر ٹرین آنے والی ہے۔ اسٹیشن پر چہل پہل شروع ہو گئی ہے۔ اسٹیشن کا بابو جو دیر سے نہ جانے کہاں غائب تھا، اب بار بار اپنے کمرے سے نکلتا اور اندر جاتا ہوا دکھائی دینے لگا ہے۔ آس پاس کے گاؤں کے جو مسافر گاڑی سے گھنٹوں پہلے آ کے اسٹیشن کی ڈیوڑھی میں یا ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے آس پاس لمبی تانے پڑے تھے انگڑائیاں لیتے ہوئے اُٹھ بیٹھے ہیں اور اسٹیشن کے نل کے ارد گرد بڑی فراغت کے ساتھ جو شاید صرف دیہاتیوں ہی کو نصیب ہوتی ہے، ہاتھ منہ دھونے میں مصروف ہیں۔ ایک خوانچے والا بھی پلیٹ فارم پر ہانک لگاتا پھرنے لگا ہے۔ ایک سُوکھا ہوا کھجلی کا مارا

کتااس کی جھلنی کی زد سے دور دور رہ کے اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ جس جگہ وہ خوانچہ لگاتا ہے کتا بھی وہیں اس سے گز سوا گز پرے ہٹ کے بیٹھ جاتا ہے۔

اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کے باہر پلیٹ فارم کی واحد بنچ پر دو عورتوں نے قبضہ جما رکھا ہے۔ ان میں سے ایک اُدھیڑ عمر ہے اور ایک جوان۔ اُدھیڑ ایک گٹھڑی سر کے نیچے رکھے لیٹی ہوئی ہے اور جوان اس کے پائنتی بیٹھی ہے۔ اُدھیڑ عمر اپنی سیدھی سادی وضع اور کپڑوں سے صاف دیہاتن معلوم ہوتی ہے مگر جوان کا لباس نچلے طبقے کی شہری لڑکیوں کا سا ہے جو کسی میلے یا شادی بیاہ میں آئی ہوں۔ ہاتھ پاؤں میں مہندی رچی ہوئی، بڑے بڑے پھولوں والی اودے رنگ کی چھینٹ کی شلوار اور قمیص۔ سر پر ململ کا دوپٹہ سرخ رنگا ہوا جس کے کناروں پر جھوٹا سنہری گوٹا ٹکا ہوا۔ ناک میں سونے کی کیل، کان میں چاندی کی بالیاں ہونٹوں پر دنداسے سے سیاہی مائل گہرا سرخ رنگ چڑھا ہوا، تیکھے نقش، نظر میں حد درجے کی شوخی اور بے باکی، جوانی اس کے انگ انگ سے اُبلی پڑتی ہے۔ وہ بازو پھیلائے دونوں ہتھیلیوں کو گدی کے نیچے رکھے۔ بنچ سے ٹیک لگائے بیٹھی ہے اور ہر آتے جاتے کو غور سے دیکھ رہی ہے، لیکن چونکہ پلیٹ فارم پر سواریاں کم ہیں اس لیے اسٹیشن کے کوّے اور کتے ہی ہر پھر کر اس کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔

اسٹیشن کا بابو سر پر تیل چپڑے پٹیاں جمائے منہ میں سگرٹ دبائے اپنے کمرے سے باہر نکلا اور جوان لڑکی پر ایک چھچھلتی ہوئی نظر ڈال کے پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔ لڑکی اسے دیکھتے ہی بنچ سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور گنوارپنے سے مسکراتی ہوئی اس کے پاس پہنچی۔

"بابو صاحب۔ ایک سگرٹ اور پلا دو۔"

بابو نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا کہ کوئی سن تو نہیں رہا۔

"بھاگ جاؤ۔ سگرٹ نہیں ہے۔"

"پلا بھی دو بابو صاحب۔ ابھی ابھی سو کے اٹھی ہوں۔ اللہ کی سوں بڑی طلب لگی

ہوئی ہے۔"

مگر بابو نے کچھ جواب نہ دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا پلیٹ فارم پر دور نکل گیا۔ لڑکی کھسیانی سی ہو کر کچھ دور اس کے پیچھے پیچھے چلی۔ راستے میں اسے ایک کتا لیٹا ہوا نظر آیا اور اس نے شرارت سے اس کی دُم پر پاؤں رکھ دیا۔ کتا ہڑبڑا کر بھونک پڑا اور لڑکی خوانچے والے پر گرتے گرتے بچی۔ پَل بھر کے بعد وہ خوانچے والے سے کہہ رہی تھی: "خوانچے والے! کیا ہے تیرے پاس؟"

"پکوڑے۔ گڑ کی ریوڑیاں۔"

"ہشت!"

"جھاڑی بوٹی کے بیر۔"

"ہشت!"

"مونگ پھلی۔ میٹھے چنے۔"

"لا ایک آنے کی مونگ پھلی دے۔"

مونگ پھلی اپنے دوپٹے کے پلّو میں ڈلوا کے وہ واپس چل پڑی۔

"بی بی پیسے تو دیتی جاؤ۔"

"کیسے پیسے؟"

"مونگ پھلی جو دی ہے اکنی کی۔"

"اکنّی تو میرے پاس نہیں ہے۔"

"تو لاؤ روپے کا ناداں دے دوں۔"

"روپیہ بھی نہیں ہے۔"

"تو پھر مونگ پھلی پھیر دو۔"

"واہ۔ وہ تو میں نہیں پھیرنے کی۔"

خوانچے والے کے صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا تھا اور قریب تھا کہ وہ چلّا اٹھتا، مگر عین اس وقت اس لڑکی کے ساتھ والی اَدھیڑ عورت آ پہنچی، وہ ایک ہی نظر میں معاملے کو تاڑ گئی۔

"گھبراؤ نہیں بھیّا، کتنے پیسے ہیں تمہارے؟"

"چار۔"

"یہ لو۔"

اور وہ لڑکی کا بازو پکڑ کر اسے وہاں سے لے گئی۔

"ریشماں۔" اس نے پیار اور ملامت کے ملے جلے لہجے میں کہا۔ "میں نے بہت دفعہ تمہیں سمجھایا ہے کہ پیسہ پاس نہ ہو تو کوئی چیز نہ خریدا کرو۔"

"اونہہ۔" ریشماں نے الہڑپن سے کہا۔ "دکاندار کو پیسے تو مل ہی جاتے ہیں مائی جی!"

"کوئی گھنٹہ بھر کے بعد وہ دونوں عورتیں تیسرے درجے کے ایک زنانے ڈبّے میں سفر کر رہی تھیں۔ ڈبا سواریوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مگر انھوں نے جیسے تیسے ایک کونے میں جگہ حاصل کر ہی لی تھی۔ دونوں سر جوڑ کر چپکے چپکے باتیں کر رہی تھیں۔ مائی جی کہہ رہی تھی:

"اور پھر ریشماں یہ چودھری ہے بڑا کھاتا پیتا۔ اس کے پاس پہلی بیوی کا بہت سا زیور ہے جو اس نے کہیں چھپا رکھا ہے۔ تمہیں الہڑپن کی باتیں چھوڑ کر اس کا دل مٹھی میں لینا ہو گا۔ خوب اس سے پیار محبت کی باتیں کرنا، حقہ خوب تازہ کر کے بھر کر نارات کو ہاتھ پاؤں داب دیا کرنا، بس اس کو تم پر بھروسہ ہو جائے گا اور وہ گھر کی کنجیاں تمہارے حوالے کر دے گا۔ اس طرح جب دو تین مہینے میں ساری چیزیں تمہارے قبضے میں آ جائیں گی تو میں تمہیں اس کے گھر سے نکال لے جاؤں گی۔"

"اس بڈھے کھوسٹ کرم دین کے بارے میں بھی تو تم یہی کہتی تھیں کہ ہے تو

کنجوس مگر بڑا پیسے والا ہے۔ خاک بھی نہ نکلا کم بخت کے گھر سے۔"

"اس نے سب کو دھوکا دیا۔ بڑا فریبی دغا باز تھا۔ اچھا ہوا میں نے جلد ہی اس کے گھر سے تمہیں نکال لیا۔"

"کم بخت میری کیسی چوکسی کرتا تھا۔ محلے والوں سے الگ کہہ رکھا تھا اور ایک بڑھیا دیکھ بھال کے لیے الگ رکھ چھوڑی تھی۔ ایک دن مجھ پر شک ہوا، مجھے کوٹھڑی کے اندر لے گیا۔ چھوی دکھا کے کہنے لگا۔ "یاد رکھ تو نے کبھی بھاگنے کی کوشش کی تو اس چھوی سے دو ٹکڑے کر دوں گا۔ بس اسی دن سے مجھے اس سے نفرت ہو گئی۔"

"خیر اس سے تو خدا نے تمہارا پیچھا چھڑا دیا۔ مگر یہ چوہدری ہے بڑا نمازی اور پرہیز گار۔ جب سے بیوی مری ہے، گھر بسانے کے سوا اور کوئی فکر ہی نہیں۔"

"زیادہ بڈھا تو نہیں؟"

"نہیں ایسا بڈھا نہیں۔"

"کیا عمر ہو گی بھلا؟"

"یہی کوئی پچاس پچپن برس۔"

رات کے کوئی پونے بارہ بجے گاڑی اس قصبے کے اسٹیشن پر رکی۔ جہاں ان عورتوں کو جانا تھا۔ گاڑی سے اتر کر اسٹیشن کے مسافر خانے میں پہنچیں اور رات وہیں گزاری۔ صبح کو اندھیرا ہی تھا کہ مائی جی نے ریشماں سے اس کا سرخ دوپٹہ لے لیا اور اسے اوڑھنے کے لیے ایک سفید چادر دے دی تاکہ وہ بھی دیہاتن معلوم ہو، نئے گاؤں کا معاملہ تھا۔ احتیاط شرط تھی، جتنے کم لوگوں کی نظر ان پر پڑے اتنا ہی اچھا۔ دونوں نے لمبے لمبے گھونگھٹ نکال لیے اور پیدل قصبے کی طرف چل دیں۔

ریشماں کو چودھری گلاب کے گھر میں رہتے ہوئے پندرہ بیس روز ہو چکے تھے مگر وہ

ابھی تک نہیں سمجھ سکی تھی کہ اس نئے گھر میں اسے کیا رویہ اختیار کرنا چاہیئے۔ پہلے دن جب وہ آئی تھی تو اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ نہ جانے اسے کن حالات سے واسطہ پڑے گا۔ چودھری کس قماش کا آدمی ہے۔ کرم دین کی طرح ظالم تو نہیں، اس سے زیادہ کام تو نہیں لے گا۔ اسے مارے پیٹے گا تو نہیں۔ اس کی رکھوالی کون لوگ کریں گے۔ تاہل کی قربتیں کن ناخوشگوار فرائض کی حامل ہوں گی اور کیا ایک مرتبہ پھر وہ زندگی کو مسلسل فریب بنائے رکھنے میں کامیاب ہو سکے گی؟ مگر چند ہی روز میں اس کے یہ سارے اندیشے غلط ثابت ہوئے اور اس میں پھر اس کی فطری چونچالی اور الہڑ پن پیدا ہو گیا۔

چودھری گلاب ایک سیدھا کم گو اور بے آزار انسان تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس کی عمر ساٹھ برس سے کم نہ تھی مگر وہ دیہاتی زمینداروں کی طرح لمبا چوڑا تھا اور ابھی اس کے ہاتھ پاؤں خوب مضبوط تھے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی عمر کا وہ دَور شروع ہو گیا تھا جب جوش سرد پڑ جاتا ہے اور احساس کو بیدار کرنے کے لیے کچوکوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ عمل کی جگہ ذہنی آسودگی اور اطمینان قلب لے لیتے ہیں اور لذت کشی میں کوئی کمی رہ جاتی ہے تو اسے تخیل پورا کر دیتا ہے۔

پھر چونکہ وہ نمازی اور پرہیز گار تھا اس لیے ہمیشہ صاف ستھرا رہتا تھا۔ ریشماں کو اس کے کپڑوں اور جسم کے کسی حصے سے بدبو نہیں آتی تھی، اس کی سفید لمبی ڈاڑھی تھی جس میں وہ ہر روز کنگھی کیا کرتا تھا۔ سر پر اکا دکا ہی بال رہ گئے تھے۔ آنکھوں میں صبح شام سرمہ لگاتا۔ اس کے طور طریقوں میں ایک عجیب طرح کا بھولا پن تھا جس نے اسے ایک پیارا پیارا بڈھا بنا دیا تھا۔ پہلی بیوی سے اس کی دو بیٹیاں تھیں جو مدت ہوئی بیاہی جا چکی ہے، اولاد نرینہ کوئی نہ تھی جس کی اسے آج بھی حسرت تھی۔

ریشماں اکثر اس سے الھڑ پن میں پوچھتی:

"چوہدری تم نماز کے بعد کیا دعا مانگا کرتے ہو؟"

چوہدری مسکرانے لگتا۔

"اللہ سے بیٹا مانگتے ہو؟"

چوہدری ہنس پڑتا۔

"یہ بھی تو دعا مانگا کرو کہ ریشماں کی بڑی سی عمر ہو۔"

اس کے جواب میں چودھری گلاب بڑے پیار سے اس کا گال تھپتھپا دیتا۔

ریشماں کو دو وقت کی ہنڈیا کے سوا اور کوئی کام نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اُپلے تھاپنا جھاڑو دینا، گائے بھینسوں کی سانی، دودھ دوہنا، یہ سب کام گاؤں کی ایک بُڑھیا کیا کرتی تھی جسے چوہدری معاوضے میں اجناس اور سبزیاں دیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ کئی کسان تھے جو چوہدری کے کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ خود چوہدری بھی زیادہ تر کھیتوں ہی پر رہا کرتا۔ اس نے پہلے ہی دن سے گھر کا سارا انتظام ریشماں کے سپرد کر دیا تھا چنانچہ وہ ہنڈیا روٹی سے فارغ ہو کر دن بھر مزے سے پلنگ پر پڑی بڑھیا پر حکم چلایا کرتی۔

کرم دین کے گھر میں اور اس گھر میں کتنا فرق تھا۔ وہاں وہ سچ مچ زر خرید لونڈی تھی اور یہاں گھر کی مالکہ۔ وہاں وہ خود اپنی نظروں میں ذلیل تھی اور یہاں سب لوگ اس کا ادب کرتے تھے۔ یہاں تک کہ خود چودھری بھی اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

ریشماں کی عمر پانچ برس کی تھی کہ کوئی شخص اسے شہر کے ایک محلے سے اُٹھا لے بھاگا تھا۔ اس نے مختلف دیہات میں پرورش پائی تھی یہاں تک کہ اس کی عمر شادی کے لائق ہو گئی۔ ایک عورت نے اپنے آپ کو اس کی چچی ظاہر کر کے ایک کھاتے پیتے گھر میں اچھی قیمت پر اسے فروخت کر ڈالا۔ پہلے پہل وہ جس شخص کے پلے پڑی وہ تھا تو کم عمر مگر بالکل سودائی تھا جس سے کوئی باپ اپنی بیٹی، بیاہنے کو تیار نہ تھا۔ سودائی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ حد درجہ ظالم بھی تھا۔ جب وحشت اٹھتی تو بلا قصور ریشماں کو مارنے پیٹنے لگتا۔ ایک دفعہ اس زور سے ریشماں کا گلا گھونٹا کہ اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں، قریب تھا کہ

ریشماں دَم توڑ دے مگر عین اس وقت ایک نوکرانی نے دیکھ کر شور مچادیااور وہ ڈر کے بھاگ گیا۔

رفتہ رفتہ ریشماں نے اس وحشی سے نپٹنے کی ایک ترکیب سوچ لی، جس دن ریشماں کواس کے تیور ذرا بھی بدلے ہوئے نظر آتے وہ خود بھی سودائی بن جاتی اور پھکنی، چمٹا، گڑوی جو بھی ہاتھ لگتا۔ میاں کے دے مارتی، یہ حربہ کارگر ثابت ہوتا، اور وہ فوراً ٹل جاتا۔ یونہی چار سال گزر گئے لیکن اس قسم کی زندگی جس میں ہر وقت جان کا خوف لگا رہتا ہو۔ آخر کب تک گزاری جاسکتی تھی چنانچہ وہ بھاگنے کی ترکیبیں سوچنے لگی۔ اس کی جان پہچان ایک بُڑھیا سے ہوگئی جس کا تعلق بردہ فروشوں کے ایک گروہ سے تھا، یہ بُڑھیا ریشماں کو تھوڑے ہی دنوں میں وہاں سے بھگالے جانے میں کامیاب ہوگئی اور اس نے اسے مائی جمی کے ہاتھ بیچ ڈالا۔

سودائی کے ساتھ چار سال گزار کے وہ خود بھی نیم وحشی ہو چکی تھی۔ اس میں اچھے برے کی تمیز نہ رہی تھی مگر مائی جمی نے تین چار مہینے اپنے ساتھ رکھا۔ اسے خوب کھلایا پلایا اور آخر پیار محبت سے اسے رام کر لیا۔ اب اس نے اسے اپنے پیشے کی تعلیم دینی شروع کی۔

مائی جمی کا بردہ فروشی کا طریقہ سب سے جدا تھااور ایک فن کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ہمیشہ بڈھوں کو پھانسا کرتی جو خاص کر جوان لڑکیوں کے آرزو مند رہتے اور جن سے ان کی اچھی قیمت مل جاتی۔ پھر جب لڑکیاں زیور اور روپیہ لے کر بھاگ جاتیں تو وہ بدنامی اور جگ ہنسائی کی وجہ سے اس کا زیادہ چرچا نہ کرتے اور بڑھاپے کی وجہ سے دوڑ دھوپ اور پیچھا کرنے کی بھی ان میں ہمت نہ ہوتی۔ اس طرح چند ہی ماہ میں یہ واقعہ رفت گزشت ہو جاتا، اور پھر کہیں دور نئے شکار کی تلاش از سر نو شروع ہو جاتی۔

ریشماں نے جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ جس قسم کی زندگی گزاری تھی۔ اس سے وہ زندگی کو ایک خوفناک کھیل سمجھنے لگی تھی جس میں کھلاڑی ہر وقت جان کی بازی لگائے رکھتا ہے اور آخر ایک دن اسے جان سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں ریشماں کی مہم پسند طبیعت

کو یہ کھیل جس میں ایک طرح سے مَردوں سے انتقام لینے کا جذبہ بھی شامل تھا، بھا گیا تھا مگر بدقسمتی سے اب تک اسے تکلیفیں ہی تکلیفیں اٹھانی پڑی تھیں اور وہ لذت نہ مل سکی تھی جو کسی خوفناک کھیل کی کامیابی پر کھلاڑی کو حاصل ہوتی ہے۔ چوہدری گلاب کے گھر بس کر اسے پہلی مرتبہ زندگی کی قدر و قیمت معلوم ہوئی۔ اس گھر میں کیسی عافیت تھی اور باہر کیسے کیسے خطرے، جن لوگوں کو فریب دیا گیا، ان کے غضب ناک چہروں کا ہر وقت آنکھوں کے سامنے پھرتے رہنا، اجنبی شکلوں پر خواہ مخواہ ان کا دھوکا ہونا، رہ رہ کے چونک پڑنا، سوتے سوتے چیخ اٹھنا۔

دن گزرتے گئے۔ یہاں تک کہ ریشماں کو چوہدری گلاب کے گھر میں بسے تین مہینے ہو گئے۔ اس دوران میں وہ آرام اور عافیت کی اور بھی زیادہ عادی ہو گئی ادھر چوہدری روز بروز اس کا پہلے سے زیادہ گرویدہ ہوتا جا رہا تھا اور آئے دن اس کے لیے چھوٹے چھوٹے زیور لانے لگا تھا۔

ایک دن وہ گھر میں اکیلی تھی کہ ایک بُڑھیا بھیک مانگنے آئی۔ جب ریشماں آٹے کی مُٹھی فقیرنی کی جھولی میں ڈال رہی تھی تو اس نے چپکے سے کہا:

"مجھے پہچانا؟ مجھے مائی جی نے بھیجا ہے، کہو کب چلنا ہے؟"

اس نے بُڑھیا کو پہچان لیا اور یکبارگی کانپ اٹھی۔ چہرے کا رنگ فق ہو گیا مگر پھر جلد ہی سنبھل گئی۔ بولی:

"مائی جی سے کہنا ابھی نہیں۔ ابھی مجھے زیوروں کا پتہ نہیں لگا، ایک مہینہ اور ٹھہر جائے۔"

فقیرنی بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔

ایک مہینہ اور گزر گیا۔ اب کے مائی جی خود آئی اور صبح کو ایسے وقت آئی جب چوہدری گھر میں موجود تھا۔ وہ اسے ریشماں کی خالہ سمجھتا تھا جو غربت کی وجہ سے اپنی بہن کی

نشانی کو بیچ دینے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اس نے مائی جی کو عزت سے گھر میں بٹھایا اس کی مزاج پُرسی کی، پھر دونوں کو تنہا چھوڑ کر کھیتوں پر چلا گیا۔

"کہو زیوروں کا پتہ لگا؟" مائی جی نے پوچھا۔

"مجھے کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ وہ ایک ایک کر کے خود ہی مجھے زیور دے رہا ہے۔ لو دیکھو!"

"اری، ان دو انگوٹھیوں اور کان کے بُندوں کو تُو زیور کہہ رہی ہے، پگلی زیور تو ہوتا ہے ست لڑا مالا، کڑے، جُھومر، چمپا کلی، لیکن بس اب ہمیں کچھ نہیں چاہیے میں تجھے لینے آئی ہوں۔ آج رات کو تیار رہیو۔ میں نے گھوڑی کا انتظام کر لیا ہے۔"

"نہیں مائی جی! ابھی نہیں۔" اس نے سہم کر لجاجت سے کہا۔ "مجھے اس گھر میں بہت آرام مل رہا ہے۔ میں ابھی نہیں جانا چاہتی۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔ مجھ سے کمّو نے بھی یہی کہا تھا کہ اس کے طور بدلے ہوئے ہیں مگر میں نے یقین نہیں کیا۔" پھر وہ تحکمانہ لہجے میں کہنے لگی۔ "سن لڑکی۔ بیوقوفی کی بات نہ کر، تجھے میرے ساتھ جانا ہے اور آج ہی رات کو۔ ایک بڑا امیر نمبردار تیرا گاہک پیدا ہوا ہے جو تجھے سونے سے لاد دے گا اور میں اس سے بات پکی کر آئی ہوں۔"

"مائی جی۔" ریشماں نے اور بھی گڑگڑا کر کہا۔ "میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں، مجھے اسی گھر میں رہنے دے۔ میں تجھے یہ سارا زیور دے دوں گی اور چوہدری اور جو کچھ دے گا وہ بھی تیرا ہی ہو گا مگر مجھے یہیں چھوڑ دے۔"

مائی جی کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی:

"اری ابھی تُو نے دیکھا ہی کیا ہے۔ بڈھے پر کیا مرنا۔ زندگی کا مزہ لینا ہے تو کسی جوان پر مر۔ اس بڈھے میں رکھا ہی کیا ہے۔"

"نہیں نہیں، مجھے کسی مرد کی ضرورت نہیں۔ مجھے یہ بڈھا بھی نہیں چاہیے، میں تو

فقط آرام سے زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔"

"دیکھ ریشماں۔" مائی نے بڑے گمبھیر لہجے میں کہا۔" جو تو چاہتی ہے وہ تو ہونے کا نہیں۔ اگر تو سیدھی طرح نہیں مانے گی تو پھر میں دوسرا گر بھی جانتی ہوں۔ تجھے معلوم نہیں کہ کرم دین ابھی تک چھوی لیے تیری تلاش میں پھر رہا ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں کہ میں نے تجھے بھگایا تھا۔ میں اب بھی اس کے پاس جا سکتی ہوں اور تیرا پتہ بتا سکتی ہوں۔"

مائی جی کی زبان سے یہ الفاظ مشکل ہی سے نکلے ہوں گے۔ ایسا معلوم ہوا جیسے یکبارگی بھونچال آ گیا ہو۔ ریشماں نے بپھری ہوئی شیرنی کی طرح مائی کو دبوچ لیا اور ناخنوں سے اس کا چہرہ لہولہان کر دیا۔ پھر پیٹ پر اس زور کی دو تین لاتیں ماریں کہ تھوڑی دیر کے لیے بُڑھیا کا سانس بند ہو گیا۔

"حرامزادی، کٹنی، بدمعاش، ڈائن، نکل جا میرے گھر سے۔ نہیں تو خون پی لوں گی تیرا۔"

یہ کہتے کہتے اس نے مارے طیش کے مائی جی کے منہ پر تھوک دیا۔

ریشماں کے چہرے سے اس وقت ایسا وحشی پن ٹپک رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا جو کچھ کہہ رہی ہے وہ سچ مچ کر گزرے گی۔ اس کے پہلے ہی حملے نے مائی جی کی ایسی سٹی گم کر دی تھی کہ وہ اپنی مدافعت بھی نہ کر سکی تھی۔ وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ کپڑے جھاڑے، چادر سے چہرہ پونچھا جو اس وقت نفرت سے سخت گھناؤنا ہو رہا تھا۔ وہ بغیر ایک لفظ منہ سے نکالے چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی ریشماں نے خود کو پلنگ پر پٹخ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دوپہر کو جب چودھری گلاب کھانا کھانے آیا تو وہ پہلے کی طرح ہشاش بشاش پلنگ سے اٹھی اور کھانا نکالنے کے لیے چولہے کی طرف گئی۔

"تمہاری خالہ چلی گئی؟" چودھری نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"کھانا تو کھلا دیا ہوتا۔"

"ان کے پیٹ میں اچانک سخت درد اٹھا اور وہ اپنے گاؤں کے حکیم کے پاس دوا لینے چلی گئیں۔"

اس واقعے کو ایک ہفتہ گزر گیا مگر اس عرصے میں ریشماں کے دل کا چین مفقود ہو چکا تھا۔ ہر آہٹ پر اسے کسی کے قدموں کا گمان ہونے لگا تھا۔ وہ بار بار دروازے کی طرف جاتی اور واپس آجاتی۔ دو چار ہی دن میں اس کی آنکھوں کے گرد گڑھے پڑ گئے اور چہرے پر زردی چھا گئی جیسے یکبارگی کسی مہلک مرض نے آلیا ہو۔ وہ چوہدری سے کچھ کہنا چاہتی تو منہ سے بات نہ نکلتی۔ چوہدری اس سے کچھ کہتا تو وہ بے خیالی میں کچھ نہ سنتی اور چوہدری کو ایک ایک بات تین تین چار چار بار دہرانی پڑتی۔ چوہدری نے اس تبدیلی کو محسوس کیا اور کہا:

"تمہارا جی اچھا نہیں ہے چلو میں تمہیں حکیم کے پاس لے چلوں۔"

"نہیں مجھے کچھ نہیں ہوا۔" اس نے کہا۔ "بچپن ہی سے میری حالت کبھی کبھی ایسی ہو جایا کرتی ہے مگر چند ہی دنوں میں آپ ہی آپ ٹھیک ہو جاتی ہوں۔"

دن پر دن گزرتے گئے مگر اس کی حالت میں فرق نہ آیا۔ اس دوران میں کئی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ وہ چوہدری سے سارا حال کہہ دے اور اپنے کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دے مگر اس کا احساسِ خودی جسے خود چوہدری کے حسن سلوک نے اس میں پیدا کر دیا تھا اس کی اجازت نہ دیتا تھا۔ کیا وہ چوہدری کے سامنے اعتراف کر لے کہ وہ پرلے درجے کی مکار اور جھوٹی ہے اور ان چار ماہ میں جو اس نے اس گھر میں گزارے ہیں، اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ فریب سے پُر تھا اور اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ چوہدری پر یہ حقیقت کھلنے پر کہ ■ ایک جرائم پیشہ گروہ سے تعلق رکھتی ہے جو کئی گھروں کو لوٹ چکا ہے اور عنقریب اس کو بھی لوٹنے والا تھا، اسے بے عزت کر کے گھر سے نکال نہ دے گا، چنانچہ اس نے خاموش ہی رہنا مناسب سمجھا اور اپنے معاملے کو تقدیر پر چھوڑ دیا۔

اسے اس بات کا افسوس نہیں تھا کہ اس نے مائی تجی کے ساتھ ایسا درشت سلوک کیا۔ اگر وہ زمانہ سازی سے کام لیتی تو شاید مائی تجی کو دو تین مہینے تک اور ٹال سکتی تھی مگر امید و بیم میں رہ کر جینا اس کی سرشت کے لیے موت سے بدتر تھا اور وہ چاہتی تھی کہ جو بات بھی ہونی ہو دو ٹوک ہو جائے اور وہ خوش تھی کہ اس نے مائی تجی سے اپنا بدلہ لے لیا تھا۔ صبر کے ساتھ اس آنے والی گھڑی کا انتظار کرنے لگی۔ اسے زیادہ زحمت نہ اٹھانی پڑی اور وہ گھڑی آہی پہنچی۔

شام کا وقت تھا۔ گھروں میں دیئے جل چکے تھے۔ وہ چولہے کے پاس بیٹھی چوہدری کو کھانا کھلا رہی تھی کہ ایک کسان کھانستا ہوا گھر کے آنگن میں داخل ہوا:

"چوہدری صاحب!" اس نے کہا۔ "کوئی شخص آپ سے ملنے آیا ہے۔"

"کون ہے؟"

"کوئی بوڑھا زمیندار ہے، سفید ڈاڑھی والا۔ نام نہیں بتلایا۔ کہتا ہے، بہت ضروری کام ہے بڑی دُور سے آیا ہوں۔"

"اچھا! اسے باہر چارپائی پر بٹھاؤ اور حقہ بھر کے پلاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

ریشماں کا سر چکرا گیا اور اس نے سہارا لینے کے لیے اپنا ایک ہاتھ زمین پر ٹیک دیا مگر یہ کیفیت لمحہ بھر سے زیادہ نہ رہی۔ سنبھل گئی اور خاموشی سے چوہدری کو کھانا کھاتے دیکھنے لگی، رفتہ رفتہ اس کے ارادے میں مضبوطی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ ہر خطرے کا مقابلہ کر سکے گی۔

کھانا کھا کے چوہدری نے کلی کی، ڈاڑھی مونچھ پر ہاتھ پھیرا۔ پھر تہمد کے پلّے سے منہ پونچھتا ہوا باہر نکل گیا۔

ایک منٹ، دو منٹ، پندرہ منٹ گذر گئے مگر چوہدری نہ آیا ریشماں نے سوچا کہ ابھی وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے ہوں گے اور اصل واقعہ ابھی نہیں چھڑا ہو گا کیونکہ وہ

برابر قے کی گڑگڑاہٹ سن رہی تھی۔

آخر کوئی آدھ گھنٹے کے بعد چوہدری واپس آیا۔ اس کی حالت انتہائی اضطراب کی تھی۔ اس کی آنکھیں بھنچی ہوئی تھیں، ہاتھ کانپ رہے تھے اور ڈاڑھی کف آلود تھی۔

"کیوں ری۔" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "تو کرم دین کو جانتی ہے؟"

ایک ایسی آواز میں جو سرگوشی سے ذرا ہی اونچی تھی، ریشماں نے کہا۔

"ہاں!"

"تو پھر وہ سب سچ ہے جو کہتا ہے؟"

بغیر یہ جاننے کی خواہش کیے کہ وہ کیا کہتا ہے، ریشماں نے کہا:

"ہاں!"

اور اس کے ساتھ ہی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے یکبارگی کوئی بڑا بھاری بوجھ اس کے سینے سے اُٹھ گیا۔

"بدذات بے حیا عورت۔"

یہ پہلے سخت لفظ تھے جو چوہدری کی زبان سے اس نے اپنے بارے میں سنے تھے۔ یہ عجیب بات تھی کہ ان لفظوں نے اس کے احساسِ خودی کو صدمہ نہیں پہنچایا بلکہ اسے مزہ آیا اور ایک خفیف سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیلنے لگی۔

چوہدری نے غصّے سے ایک دو مرتبہ زمین پر پاؤں پٹکے، کوٹھڑی کے اندر گیا۔ آنگن میں گھوما، جیسے نہیں جانتا کہ کیا کرے، آخر وہ باہر نکل گیا۔

ریشماں اب اپنے کو پہلے کی طرح پھر بے خوف اور آزاد محسوس کر رہی تھی، ہر قسم کے بندھنوں میں اس نے اپنے کو خواہ مخواہ جکڑ لیا تھا، مگر اب وہ مسرّت کے ساتھ ہر تماشہ دیکھنے کے لیے تیار تھی، خواہ وہ انجام کار اس کی اپنی زندگی کا المیہ ہی کیوں نہ ثابت ہو۔

وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی آنگن میں گئی اور دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہوئے

ان کی باتیں سننے لگی۔ وہ دونوں چارپائی پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ چودھری گلاب بڑے جوش میں کہہ رہا تھا:

"نالش دعوے کرنا، عدالت میں جانا تو نامردوں کا کام ہے۔ مردوں کا طریقہ دوسرا ہے، اگر تمہیں منظور ہے تو ابھی چل کے فیصلہ کئے لیتے ہیں۔"

"مجھے منظور ہے۔ کرم دین نے مونچھ کو تاؤ دے کر کہا۔ "میں بھی گیدڑ نہیں ہوں۔"

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد چوہدری گلاب، کرم دین اور ریشماں تینوں کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے قصبے کے اُس طرف جا رہے تھے جدھر گھنا جنگل تھا اور آبادی کے آثار نہ تھے۔ یہ ماگھ کے آخری دن تھے۔ سردی زوروں پر تھی، تیرھویں یا چودھویں کا چاند نکلا ہوا تھا۔ جوں جوں وہ بلند ہوتا جاتا خنکی بڑھتی جاتی۔ انہوں نے گاڑھے کی چادروں میں اپنے کو لپیٹ رکھا تھا۔ دونوں مرد آگے آگے تھے اور ریشماں پیچھے پیچھے۔ وہ خاموش چلتے چلے گئے، یہاں تک کہ وہ جنگلوں میں پہنچ گئے مگر ان کے قدم اب بھی نہیں تھمے، وہ چاند کی کرنوں کی روشنی میں جو درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر پگڈنڈی پر پڑ رہی تھیں، برابر چلتے رہے۔ آخر وہ جنگل بھی ختم ہو گیا اور ایک ایسی جگہ آ گئی جہاں ہر طرف ٹیلے ہی ٹیلے تھے۔ خاردار جھاڑیاں تھیں اور مردہ جانوروں کے پنجر پڑے تھے۔ یہ جگہ ایسی اجاڑ تھی کہ رات تو رات، دن کے وقت بھی کسی انسان کا ادھر گزر نہیں ہوتا تھا۔

ایک اونچا سا صاف اور ہموار قطعہ زمین دیکھ کے چوہدری گلاب ٹھہر گیا۔

"بس یہ جگہ ٹھیک ہے۔" اس نے کہا۔ یہ پہلا فقرہ تھا جو پچھلے دو گھنٹے کی مسافت کے دوران ان میں سے کسی کی زبان سے نکلا تھا۔

"جیسی چوہدری صاحب کی مرضی۔" کرم دین نے جواب دیا۔

دونوں کے چہروں پر تناؤ تھا اور ابرو چڑھے ہوئے۔ دونوں نے اپنی اپنی چادریں پگڑیاں اور کرتے اتار کے زمین پر رکھ دیئے اور تہمد کو لنگوٹ کی طرح کس لیا۔ پھر دو چھویاں

چاندنی میں چمکنے لگیں اور دونوں میدان میں اُتر آئے۔

ریشماں چلتے چلتے تھک گئی تھی۔ وہ ان سے ذرا فاصلے پر ایک پتھر پر بیٹھ گئی، اس کے چہرے پر ایک تحقیر آمیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ دلچسپی سے ان کی لڑائی دیکھنے لگی۔ ایسا منظر اس نے اپنی عمر میں پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس کے دل میں اب ذرہ بھر خوف باقی نہ رہا تھا، نہ اس کی فکر تھی کہ ان دونوں میں سے کون فتح یاب ہو کر اس کی قسمت کا مالک بنتا ہے۔ وہ بڑی مسرت اور چونچالی کے ساتھ ان بڈھوں کی جنگ دیکھ رہی تھی، جیسے بچے پچھوں کی کشتی کا تماشہ دیکھتے ہیں۔

کچھ دیر تو دونوں چھویاں تانے بے حرکت آمنے سامنے کھڑے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے پینترے بدلے۔ چاندنی میں ان کی چاندیں چمک رہی تھیں اور سفید داڑھیاں جو اس وقت اور بھی سفید دکھائی دیتی تھیں ہل رہی تھیں۔

وہ پاؤ گھنٹے تک اسی طرح برابر پینترے بدلا کئے مگر ابھی تک ایک کی چھوی نے دوسرے کے جسم کو نہیں چھوا تھا۔ صرف ایک مرتبہ چوہدری گلاب کی چھوی کرم دین کی چھوی سے ٹکرا گئی تھی مگر اس کے بعد دونوں پیچھے ہٹ گئے، اسی میں وہ دونوں ہانپنے لگے تھے۔

ریشماں کو اس تماشے سے جلد ہی اکتاہٹ محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے جمائیاں لینی شروع کر دیں، اسے اب سردی بھی لگنے لگی تھی۔ اُس نے ٹیلوں کے اس پار دیکھنا شروع کیا، شاید دور کوئی نالہ بہہ رہا تھا جس کا ہلکا ہلکا شور اس ہُو کے عالم میں بڑا تسکین بخش معلوم ہوتا تھا۔

اچانک کرم دین نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ ذرا تھم جاؤ۔ اس کے تہمد کا پلو جس کو اس نے لنگوٹ کی طرح پیچھے اُڑس رکھا تھا باہر نکل آیا۔ اسے ایک ہاتھ میں چھوی اور دوسرے میں لنگوٹ تھامے دیکھ کر ریشماں ضبط نہ کر سکی، اور اُس نے بے اختیار قہقہہ لگا دیا۔ دونوں

مرد پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

ریشماں ہنسے جا رہی تھی۔ ہر چند اسے احساس تھا کہ ایسے نازک وقت میں اس کا ہنسنا بڑا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے، مگر اسے پرواہ نہ تھی۔

"اگر میں زندہ بچ رہا۔" کرم دین نے کھسیانا ہو کر کہا" تو سب سے پہلے اسی چھنال کے ٹکڑے کروں گا۔"

"اس بے حیا کو تو اب میں بھی گھر میں نہیں بساؤں گا۔" چوہدری گلاب نے کہا۔

"بس ناک کاٹ کے چھوڑ دوں گا۔"

"تو چوہدری آؤ پہلے کیوں نہ اسی کا قصہ پاک کریں، ہم بھی کیسے بے وقوف ہیں کہ اس فاحشہ کے پیچھے جانیں وئیے دیتے ہیں۔ اس کا کیا ہے کل کسی اور کی بغل گرم کر رہی ہو گی۔"

چوہدری گلاب نے کچھ جواب نہ دیا، کرم دین نے اس کی خاموشی کو رضا تصور کیا اور وہ یکبارگی چھوی لے کر ریشماں کی طرف جھپٹا مگر جلدی میں کپڑوں کے ڈھیر میں اُلجھ گیا اور ریشماں کو بھاگنے کا موقع مل گیا۔ وہ تیزی سے دوڑ کر ایک ٹیلے پر چڑھ گئی۔ کرم دین بھی اس کے پیچھے بھاگا، اسے دیکھ کر وہ پھر دوڑی۔ کرم دین نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ دونوں دیر تک ٹیلوں پر اِدھر اُدھر بھاگتے رہے۔ کرم دین دوڑتے دوڑتے بے دَم ہو گیا تھا مگر انتقام کی آگ نے اسے ایسا باؤلا بنا دیا تھا کہ وہ گرتا پڑتا اس کا تعاقب کیے جا رہا تھا۔ یہ سلسلہ آدھ گھنٹے تک جاری رہا، بالآخر ریشماں کے کپڑے ایک جھاڑی کے کانٹوں میں اُلجھ گئے اور دوسرے لمحے کرم دین نے آ کے اسے چٹیا سے پکڑ لیا اور گھسیٹتا ہوا لے چلا۔ ریشماں نے دانتوں سے اس کے ہاتھوں کو کاٹ کاٹ کے لہولہان کر دیا مگر اس نے چٹیا نہ چھوڑی۔

دونوں اس جگہ پہنچے جہاں چوہدری گلاب ان کا انتظار کر رہا تھا۔ اس دوران میں وہ کپڑے پہن چکا تھا۔ اس بلا کی سردی میں ننگے رہنے پر اس کا جسم اکڑ گیا تھا مگر اب گاڑھے کی

چادر کی بغل مارے وہ بہت مگن معلوم ہوتا تھا۔

کرم دین نے کہا"بے حیا بھاگنا چاہتی تھی مگر میں بھی پاتال تک اس کا پیچھا نہ چھوڑتا۔ کیوں چوہدری جی لگاؤں ایک ہاتھ۔"

یہ کہہ کر اس نے چھوی اٹھائی چوہدری گلاب جواب نہ دینے پایا تھا کہ ایک آواز ٹیلوں میں گونج اٹھی:

"او چوہدریو ٹھہر جاؤ۔"

یہ مائی جمّی تھی جو اُن کے پیچھے پیچھے چلتی رہی تھی اور ایک ٹیلے کے کھڈ میں چھپ کے دُور سے سارا ماجرا دیکھتی رہی تھی۔

"او بردہ فروش چڑیل تو کہاں سے آگئی۔" کرم دین سے غصّے سے کہا:" یہ سب تیرے ہی کرتوت ہیں، آاِس کے ساتھ تیری زندگی کا بھی قصہ پاک کریں۔"

چند لمحوں میں مائی جمّی ان کے پاس پہنچ گئی۔

"لو مار ڈالو۔" اس نے بے خوفی سے اپنا سینہ آگے کرتے ہوئے کہا۔" مگر یاد رکھو تم بھی پھانسی سے نہیں بچو گے۔ میرے کنبے والے تھانے میں فوراً اطلاع کر دیں گے اور سپاہی آکے تمہیں ہتھکڑیاں لگا کے لے جائیں گے۔"

"کیا بکتی ہے کتنی۔" چوہدری گلاب نے کہا۔"وہ اب تک اس قصّے میں خاموش رہا تھا مگر جمّی کی اِس زبان درازی کو برداشت نہ کر سکا۔

کچھ لمحے خاموشی رہی۔ اس کے بعد جمّی نے پھر زبان کھولی مگر اب کے اس کا لہجہ مصالحت آمیز تھا۔

"سنو۔" اس نے کہا"اگر تمہیں وہ سارا روپیہ مل جائے جو تم نے اس پر خرچ کیا ہے تو کیا تم اسے مجھے دے دو گے۔؟"

دونوں شخص کچھ دیر سوچتے رہے، اس کے بعد کرم دین نے کہا:

"اگر میرے چار سو روپے مجھے واپس مل جائیں تو پھر وہ چاہے بھاڑ میں جائے میری بلا سے۔"

"تم چار سو چھوڑ پانچ سو لینا، اور چوہدری گلاب تم کیا کہتے ہو؟"

"اگر کرم دین کو اعتراض نہیں تو مجھے بھی اعتراض نہیں۔" چوہدری نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

"تمہیں بھی تمہارا سات سو روپیہ مل جائے گا چوہدری گلاب۔ بات یہ ہے کہ یہاں سے کوئی دس کوس پر ایک نمبردار رہتا ہے جو ریشماں جیسی لڑکی کے دو ہزار روپے دینے کو تیار ہے۔ تم مجھے ایک دن کی مہلت دو اور ریشماں کو بھی اپنے پاس رکھو۔ کل شام کو جب میں تمہارا روپیہ لوٹا دوں گی تو تم اسے میرے حوالے کر دینا۔"

ریشماں نے گردن اٹھائی۔ مائی تجّی کی طرف دیکھا اور ایک جھرجھری لی۔ چوہدری گلاب نے مائی تجّی کی بات کا کچھ جواب نہ دیا۔ مائی تجّی نے اس کی ضرورت نہ سمجھی۔ اس کے لیے خاموشی ہی کافی تھی۔

اب کرم دین بھی کپڑے پہن چکا تھا۔ وہ چاروں واپس چل دیئے۔ پہلے کی طرح مرد آگے آگے اور عورتیں پیچھے پیچھے۔ سردی اب پہلے سے بڑھ گئی تھی جس کی وجہ سے اب ان کے قدم آپ ہی آپ تیز تیز اُٹھ رہے تھے۔ کچھ دیر تو وہ خاموشی سے چلتے رہے۔ آخر کرم دین نے چوہدری گلاب سے کہا:

"بڑی خشک سردی پڑی ہے اب کے سال۔ ہماری فصلوں کا تو ناس ہی ہو گیا۔ یہاں کیا حال ہے چوہدری صاحب؟"

"یہاں بارش کی ایک بوند نہیں پڑی۔" چوہدری گلاب نے جواب دیا۔

"پھر یہ خشک سردی بیماریاں بھی تو لاتی ہے۔ خاص کر ڈھور ڈنگر کے لیے، میری ایک بھینس پالا کھا کے مر گئی۔"

"اوہو"

پھر کچھ دیر خاموشی رہی۔

"چاول کا کیا بھاؤ ہے یہاں۔" کرم دین نے پھر پوچھا۔

"بیگمی سوا دو سیر۔" چوہدری گلاب نے جواب دیا۔

"ہمارے ہاں ڈھائی سیر کا بھاؤ ہے۔" کرم دین نے کہا۔

ریشماں اس خنک چاندنی میں ایک خواب کے سے عالم میں چلی جا رہی تھی، نہ تو اس کے کان کچھ سُن رہے تھے نہ آنکھیں کچھ دیکھ رہی تھیں اور نہ یہ خبر تھی کہ قدم کہاں پڑ رہے ہیں۔

تنکے کا سہارا

ہمارے محلّے میں ایک میر صاحب رہا کرتے تھے۔ نام سے تو ان کے شاید دو ایک آدمی ہی واقف تھے مگر رفتہ رفتہ سب کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ چنگی خانے میں ملازم ہیں۔ خدا معلوم وہاں کیا کام کرتے تھے مگر شام کو جب لوٹتے تو کبھی دو چار گنے، کبھی گڑ کی بھیلی، کبھی پان، کبھی کھجوریں رومال میں بندھی ہوئی ان کے ہاتھ میں ہوتیں۔ اَدھیڑ عمر، دُبلے پتلے منحنی سے آدمی مگر خوش اخلاق اور وضع دار۔ کتھئی رنگ کی بوسیدہ سی شیروانی اور سفید صافہ۔ جاڑے گرمی یہی ان کا لباس رہتا۔ چگی ڈاڑھی، باچھوں میں ہلکی پیک بہی ہوئی۔ راستے میں کبھی محلّے کے بچے کھیلتے ہوئے مل جاتے تو رومال سے کھجوریں یا بیر نکال نکال کے انہیں دیا کرتے اور شفقت سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا کرتے۔ وہ خود بھی کئی بچوں کے باپ تھے۔

اس محلّے میں یوں تو غریب غربا ہی بستے تھے مگر کچھ کھاتے پیتے لوگوں کے بھی تھے۔ یہ ایک بڑا سا چوکور احاطہ تھا جس کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے دو منزلہ مکان تھے اور بیچ میں کھلا میدان، نچلی منزل میں دو دو کوٹھڑیوں اور ایک ایک آنگن کے مکان تھے۔ ان میں زیادہ تر گاڑی بان بسے ہوئے تھے جن کے نام سے یہ محلّہ مشہور تھا، ان کی گاڑیاں اور مویشی رات کو اسی میدان میں پڑے رہتے تھے اور وہ خود بھی سخت جاڑے کے دو ایک مہینوں کو چھوڑ کر باقی سارے سال باہر میدان ہی میں سوتے تھے۔ میر صاحب کا

خاندان بھی ان نچلے مکانوں ہی میں سے ایک میں رہتا تھا۔

اوپر کی منزل والے مکانوں میں جن کی مکانیت نسبتاً بہتر تھی، کچھ تو دفتروں کے بابو اور منشی متصدی رہتے تھے اور کچھ بیوپاری اور دکاندار جن کی دکانیں محلّے کے قریب ہی بازار میں تھیں۔ ایک حاجی صاحب تھے جو ہیڈ کلرکی سے ریٹائر ہو کر پنشن پا رہے تھے۔ ان کا بڑا سا کنبہ تھا۔ ایک لڑکا کسی دفتر میں ٹائپسٹ تھا۔ دوسرا بیمہ کا کام کرتا تھا دونوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ علاوہ ازیں ایک لڑکا اسکول میں پڑھتا اور پھر حاجی صاحب کی بیگم بھی حیات تھیں۔ یہ سب لوگ دو ملحقہ گھروں میں رہتے تھے جن کی درمیانی دیوار کو بیچ میں سے توڑ کر آنے جانے کے لیے راستہ بنالیا گیا تھا۔

حاجی صاحب کے علاوہ اس احاطے میں ایک اور کھاتا پیتا گھر ٹھیکیدار غلام رسول کا تھا جس نے سرکاری عمارتوں کے ٹھیکہ میں خاصی دولت پیدا کی تھی۔ ایک گھر مہر فضل دین فروٹ مرچنٹ کا تھا۔ ایک میں چوہدری فتح محمد انجینئر رہتے تھے۔ ایسے ہی دو ایک گھر اور تھے جن کو نسبتاً خوش حال کہا جا سکتا تھا۔

ایک دفعہ جاڑوں میں میر صاحب بیمار پڑ گئے۔ معمولی مرض تھا انھوں نے پروا نہ کی اور برابر کام پر جاتے رہے مگر مرض بڑھتا گیا اور دو چار ہی دن میں وہ نڈھال ہو کر چارپائی پر پڑ گئے۔ محلّے کے لوگوں نے دو ایک مرتبہ انھیں لاٹھی کے سہارے عطار کی دکان پر کھڑے دیکھا۔ اس کے بعد وہ کئی دن نظر نہ آئے اور آخر ایک دن اچانک یہ خبر سارے محلّے میں پھیل گئی کہ چنگی والے میر صاحب چل بسے۔

محلّے والے ان کی خستہ حالی سے تو واقف تھے مگر یہ بات کسی کے گمان میں نہ تھی کہ مرنے کے بعد ان کی تجہیز و تکفین کے لیے بھی گھر سے کچھ نہیں نکلے گا۔ مرحوم کو اس محلّے میں رہتے تقریباً چار برس ہو گئے تھے مگر اس عرصے میں وہ سب سے الگ تھلگ ہی رہے تھے۔ ویسے تو محلّے کے لوگوں کے ساتھ ہمیشہ خوش اخلاقی سے پیش آتے رہے۔ مگر انھوں

نے کسی سے میل جول بڑھانا پسند نہیں کیا نہ خود کسی کے ہاں گئے نہ کسی کو اپنے ہاں بلایا ان کے بچے بھی گھر سے کم ہی باہر نکلا کرتے تھے چنانچہ ہمسایوں پر ان کے گھر کی صحیح حالت کبھی ظاہر نہ ہونے پائی تھی، مگر اب اچانک میر صاحب مرحوم کی غربت کا پورا اندازہ ہو جانے پر اہلِ محلہ بھوچکارہ گئے۔ پردیس میں ایک شریف سید مسلمان کے لاشے کی اس بے کسی و رُسوائی پر ان کی رگِ حمیت پھڑک اٹھی۔ دم بھر میں محلّے کی عورتیں مرحوم کے گھر میں اور مرد باہر جمع ہو گئے۔ فوراً چندہ کیا گیا اور میر صاحب کی میت کو عزت و آبرو کے ساتھ آخری منزل تک پہنچا دیا گیا۔

اگلے روز صبح کو محلّے کی مہترانی سگو، آئی تو دیکھا کہ سیّد کی بیوہ آنگن میں زمین پر بیٹھی ہے۔ چار بچوں کو تو اپنے گرد بٹھار کھا ہے اور پانچواں گود میں ہے۔ ہنستی جا رہی ہے اور مُٹھی میں مٹی بھر بھر کے بچوں کے سروں پر ڈالتی جا رہی ہے۔ اس واقعہ کے بعد محلّے والوں نے میر صاحب مرحوم کے بیوی بچوں کو اپنی سر پرستی میں لے لینا اپنا فرض قرار دے لیا۔

میر صاحب مرحوم ایک زوال پذیر خاندان کے آخری فرد تھے جنھیں فکرِ معاش نے ترکِ وطن پر مجبور کیا تھا۔ وہ برسوں دیس دیس کی خاک چھانتے پھرے، جہاں ذرا سا بھی سہارا ملا وہیں کے ہو رہے اور بیوی بچوں کے ساتھ جیسے تیسے زندگی کے دن پورے کرتے رہے۔ وہ خود تو شہری زندگی کے پروردہ تھے مگر بیوی گاؤں کی رہنے والی سیدھی سادی عورت تھی، زمانے کی اونچ نیچ سے بے خبر، صحت اچھی تھی، شکل صورت کی بھی بُری نہیں تھی، تھی تو وہ بھی سیّدزادی ہی مگر اس میں غرور نام کو نہ تھا۔

میر صاحب سے شادی کے نو برس میں اُس کے ہاں چھ بچے ہوئے تھے۔ چار لڑکیاں اور دو لڑکے۔ ایک لڑکی شیر خواری ہی میں مر گئی تھی، باقی پانچ بچوں میں سب سے بڑی کبریٰ تھی جس کی عمر آٹھ برس تھی۔ اس سے چھوٹی صغریٰ کی سات برس، پھر دو لڑکے تھے فرزند علی اور حشمت علی۔ ایک پانچ برس کا دوسرا ساڑھے تین برس کا۔ سب سے چھوٹی

کلثوم تھی جو ابھی چار ہی مہینے کی تھی۔ پردیس میں یوں اچانک شوہر کے اٹھ جانے اور خود بچوں کے ساتھ بے سہارا رہ جانے پر غریب عورت کے دماغ کو سخت صدمہ پہنچا تھا اور وہ اپنے اور بچوں کے بارے میں کچھ سوچنے سمجھنے سے قاصر تھی، اودھر بچے بھی اپنی اپنی عقل کے مطابق اس واقعہ کی اہمیت کو کچھ کچھ سمجھ کر گم سم رہ گئے تھے۔ انھوں نے نہ تو روٹی کے لیے ضد کی تھی اور نہ مٹھائی کے لیے پیسہ مانگا۔ وہ خود ہی چنگیر میں سے سُوکھی روٹی کے ٹکڑے نکال نکال کر کھاتے رہے تھے۔

اگلے روز محلے والوں کی سرپرستی عملی صورت میں ظاہر ہونی شروع ہو گئی۔ محلے میں ایک شخص رہتا تھا جس کی قریب ہی بازار میں دودھ دہی کی دُکان تھی علی الصباح اس کی دکان کا ایک لڑکا ایک کوزے میں پاؤ بھر تازہ تازہ دودھ لیے میر صاحب مرحوم کے مکان پر پہنچا اور دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ کبریٰ نے دروازہ کھولا تو وہ بولا:

"استاد نے یہ دودھ بھیجا ہے چائے کے لئے۔ ہر روز ایسے ہی آیا کرے گا" اور وہ دودھ کا کوزہ لڑکی کو دے کر چلا گیا۔

اسی طرح تھوڑی دیر کے بعد محلے کے بڑ قصاب کے ہاں سے ڈیڑھ پاؤ چربی دار گوشت آ گیا، کنجڑے نے سبزی بھیج دی۔ غرض دس بجتے بجتے ضرورت کی کچھ اور چیزیں بھی پہنچ گئیں۔ بارہ بجے کے قریب بھٹیارے کے ہاں سے آٹھ دس گرم گرم روٹیاں لگ کر آ گئیں ان میں ایک روٹی اس نے خاص طور پر چھوٹے بچوں کے لیے روغنی لگا کر بھیجی تھی اور کہلا بھیجا تھا کہ کم پڑیں تو اور منگوا لینا۔ اس شق میں پورا محلہ شامل تھا کیونکہ جن جن گھروں سے روٹیاں لگنے آئی تھیں بیبیوں نے ایک ایک پیڑا سیدانی کے نام کا پہلے ہی الگ کر دیا تھا۔

محلے کا ایک گاڑی بان اپنے چھکڑے میں ٹال کے لیے لکڑیاں لادا کرتا تھا۔ وہ بھرا ہوا چھکڑا لے کر بیوہ کے دروازہ پر پہنچا اور پردہ گرا کر دو من لکڑی گھر کے اندر ڈال گیا۔

دوپہر کو حاجی صاحب کے ہاں سے پرانے کپڑوں کا گٹھر سید کی بیوہ کے ہاں بھیجا

گیا۔ ساتھ ہی جمن بی نے کہلوا بھیجا کہ کبریٰ اور صغریٰ کو بھیج دو، کلام پاک کا سبق پڑھ جائیں اور چٹیا بھی کرالیں۔

تیسرے پہر حاجی صاحب نے محلّے کے تین چار معتبر آدمیوں کو اپنے ساتھ لیا اور اس احاطے کے مالک کے پاس پہنچے۔ انھوں نے اس سے دین اور آخرت کی بہت سی باتیں کی۔ سادات کی قربانیاں اور عظمتیں جتلائیں اور بالآخر اسے اس امر پر راضی کر لیا کہ وہ بیوہ سیدانی کا پچھلے چار ماہ کا واجب الادا کرایہ معاف کر دے اور آئندہ اس سے آٹھ کے بجائے چھ روپے ماہوار کرایہ لیا کرے۔ یہ رقم حاجی صاحب نے محلّے کے کھاتے پیتے گھروں پر بطور ماہانہ چندہ عاید کی۔ چونکہ چار چھ آنے کی بات تھی، غریب بھی خوشی خوشی اس چندہ میں شامل ہو گئے اور یہ طے پایا کہ کرایہ ادا کر کے جو رقم بچ رہے وہ بیوہ کو نقدی کی صورت میں دے دی جائے تاکہ اس سے وہ اپنی دوسری ضرورتیں پوری کر سکے۔

سگو نے کہا: ''میں اپنی آٹھ آنے مہینہ تنخواہ چھوڑ دوں گی۔'' مگر اس کی اس پیشکش کو منظور نہیں کیا گیا کہ یہ کمین لوگ ہیں شاید کبھی طعنہ دے بیٹھیں۔

نچلے مکانوں میں میر صاحب مرحوم کے مکان سے ملا ہوا ایک گھر تھا جس میں ایک نوجوان جوڑا حال ہی میں آ کر بسا تھا۔ میاں کسی چھاپے خانے میں کام کرتا تھا۔ بیوی گھر کے مختصر سے کام سے فارغ ہو کر دن بھر پلنگ پر پڑی رہتی، جس دن محلّے والوں کی طرف سے بیوہ سیدانی کے ہاں کھانے پینے کا سامان پہنچا وہ جلد جلد میاں کو ناشتہ کرا، کام پر بھیج دروازے پر قفل ڈال سیدانی کے ہاں چلی آئی۔ گھر میں جھاڑو دی۔ بچوں کا منہ دھلایا۔ چولہے میں راکھ بھری تھی، اسے صاف کر کے آگ جلائی، پکانے کا سامان آ ہی چکا تھا، جلد جلد مصالحہ پیس کر ہنڈیا چولہے پر چڑھا دی۔ روٹیاں تنور سے آ گئی تھیں، سب بچوں کو کھانا نکال کر دیا۔ سیدانی خاموش بیٹھی کھوئی کھوئی نظروں سے اسے یہ سب کام کرتے دیکھتی رہی۔ جب ہمسائی نے اس سے کھانا کھانے کو کہا تو اس نے منہ پھیر لیا۔ اس پر ہمسائی نے اسے سمجھایا کہ اپنی

شیر خوار بچی کا خیال کرو۔ کھاؤ گی نہیں تو دودھ کیسے اُترے گا، غرض زور دے کر چند نوالے اس کو کھلا ہی دیئے۔

شام کو اس کامیاں چھاپے خانے سے سینما کے کچھ رنگدار پوسٹر لایا۔ یہ پوسٹر اس نے بیوہ کے بچوں کو دے دیئے، پھر بڑے لڑکے فرزند علی کو سائیکل پر اپنے آگے بٹھا کر گول باغ کی سیر کرانے لے گیا۔

غرض دو چار ہی دن میں محلّے کے سب لوگوں نے مل کر میر صاحب مرحوم کے پسماندگان کے رہنے سہنے کا خاطر خواہ انتظام کر دیا۔ رفتہ رفتہ بیوہ کے حواس بھی بجا ہونے لگے اور وہ گھر اور بچوں کی دیکھ بھال کی طرف زیادہ توجہ کرنے لگی۔ شروع شروع میں اسے محلّے والوں کی امداد قبول کرتے ہوئے حجاب محسوس ہوا تھا مگر اس بیچارگی میں وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ ناچار قسمت پر شاکر ہو کر بیٹھ گئی۔

اُدھر محلے والوں کو اپنی اس اجتماعی کوشش سے ایک ایسی تسکین کا احساس ہو رہا تھا جو زندگی میں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ نیکی کے جذبے نے دِلوں کو گداز کر دیا تھا۔ ہر شخص اخلاقی طور پر اپنے کو پہلے سے بلند محسوس کرنے لگا تھا اور وہ لوگ جو اَب تک ایک دوسرے سے بے تعلق خود غرضانہ زندگی بسر کر رہے تھے، ان میں ایک باہمی رواداری پیدا ہو گئی تھی جیسے وہ ایک ہی خاندان کے فرد ہوں۔

اس سلسلے میں سب سے پیش پیش حاجی صاحب کا گھر تھا جہاں اس لاوارث سید خاندان کو زیادہ سے زیادہ آسائش پہنچانے کے لیے تجویزیں سوچی جاتی تھیں۔ حاجی صاحب مردوں میں اور حجن بی عورتوں میں پہروں اسی کا تذکرہ کیا کرتیں۔ بڑی بی کو سب سے زیادہ فکر کبریٰ و صغریٰ کی شادی کے لیے جہیز جمع کرنے کی تھی۔ وہ ابھی سے ان لڑکیوں کے لیے مناسب رشتوں کی کھوج میں رہنے لگی۔

دن گزرتے گئے۔ یہاں تک کہ ایک سال ہو گیا۔ اس عرصے میں محلّے والے

میر صاحب مرحوم کے اہل و عیال کی پرورش کرتے رہے اور جس جس نے جو جو چیز اپنے ذمے لی تھی اسے وہ بلاناغہ مہیا کرتا رہا۔ ادھر اب بیوہ سیدانی کو کچھ کچھ سلائی کا کام بھی ملنے لگا تھا جس میں اس کی بڑی بیٹی اس کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ دونوں لڑکوں کو اسکول میں داخل کر دیا گیا تھا۔ حاجی صاحب نے اپنے رسوخ سے ان کی فیسیں معاف کروادی تھیں۔ بڑا لڑکا فرزند علی جسے میر صاحب مرحوم نے گھر پر پڑھانا شروع کیا تھا دوسری میں اور چھوٹا حشمت علی پہلی میں داخل کر لیے گئے۔ لڑکیوں کو جن بی گھر پر پڑھاتیں۔ ساتھ ساتھ خانہ داری کی باتیں اور سینا پرونا بھی سکھاتیں۔

اسی طرح چار برس گزر گئے۔ سید کی بیوہ اور اس کے بچے محلے والوں کی امداد پر جو نقدیا جنس کی صورت میں انھیں ملتی گزر کرتے رہے۔ چونکہ اس امداد میں پندرہ بیس گھر شامل تھے اس لیے کسی کو بوجھ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اتنی رقم تو ہر ماہ جھوٹ موٹ کے یتیم خانے والے ہی بٹور لے جاتے تھے، چنانچہ ہر شخص مطمئن تھا کہ وہ صحیح معنوں میں مستحقوں کی امداد کر رہا ہے۔

اب صغریٰ اور کبریٰ تیرہ تیرہ چودہ چودہ برس کی ہو گئی تھیں۔ بلوغت کو پہنچ کر دونوں نے خوب رنگ روپ نکالا تھا۔ اگرچہ گھر میں سخت پردہ تھا اور لڑکیاں محلے کے دو ایک گھروں کے سوا اور کہیں آتی جاتی نہ تھیں، پھر بھی محلے کے ہر گھر میں ان کے حُسن و جمال کا چرچا تھا، خاص کر صغریٰ کا جس کی نیلی نیلی آنکھیں اور بھورے بال اس کے سرخ و سفید چہرے پر بہت بھلے معلوم ہونے لگے تھے۔ اس سے لوگوں کے دلوں میں ان کے مستقبل کے بارے میں طرح طرح کے اندیشے پیدا ہونے لگے تھے۔

ایک دن مہر فضل دین فروٹ مرچنٹ سے اس کی بیوی نے کہا:

"کچھ خبر بھی ہے، یہ صغریٰ کبریٰ کو جن بی سارا سارا دن اپنے پاس کیوں بٹھا رکھتی ہیں!"

مہر فضل دین نے استفسار بھری نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا۔

”وہ اپنے بیٹے الطاف سے صغریٰ کو بیاہنے کی فکر میں ہیں جبھی تو کوئی اور لڑکا ان کی نظروں میں نہیں جچتا۔ میں نے اپنے بھانجے کے لیے کوشش کی تو ٹال مٹول کرنے لگیں۔ میں کہتی ہوں ان لڑکیوں کا جن بی کے ہاں جانا بند کرانا چاہیے۔“

”مگر وہاں تو جن بی سے کلام مجید پڑھنے جاتی ہیں۔“

”جن بی کو خود تو کچھ آتا جاتا نہیں دوسروں کو خاک پڑھائیں گی۔ میں نے سُنا ہے جیسا غلط سلط کلام مجید وہ پڑھتی ہیں۔“

ادھر فتح محمد انجینئر اپنی بیوی سے کہہ رہے تھے۔“

”ہمیں لڑکیوں کی ضرورت نہیں۔ ہمیں تو میر صاحب کا چھوٹا لڑکا مل جائے جسے ہم متبنّےٰ بنالیں۔ میں اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت بھیج سکتا ہوں۔ ہمارے کوئی اولاد تو نہیں بس وہی ہماری جائداد کا مالک ہو گا مگر حاجی صاحب کہاں ماننے والے ہیں۔“

غرض رفتہ رفتہ اہلِ محلّہ اس خاندان کی سرپرستی میں حاجی صاحب کے حد سے بڑھے ہوئے دخل کو ناپسند کرنے لگے تھے، پھر جس ڈھب سے بچوں کی پرورش ہو رہی تھی، اس سے بھی بعض لوگوں کو اختلاف تھا۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ حاجی صاحب کا بیٹا جو بی۔ اے میں پڑھتا تھا علانیہ صغریٰ سے اپنے عشق کا اظہار کرنے لگا۔ اس نے اپنے ”عشق جنوں پروَر“ کے بارے میں ایک نظم بھی ایک ادبی رسالے میں چھپوائی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محلّے کی عورتوں نے سید کی بیوہ پر دباؤ ڈال کر حاجی صاحب کے ہاں صغریٰ کبریٰ کا آنا جانا بالکل بند کرادیا۔ رہی لڑکیوں کی تعلیم، تو یہ کام محلّے کی مسجد کے امام صاحب کے سپرد کر دیا گیا۔

ان مولوی صاحب کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ رنگ سانولا تھا مگر خدوخال میں خاصی جاذبیت تھی۔ آنکھوں میں سرمہ لگاتے۔ ڈاڑھی میں ابھی سفید بال کم ہی نمودار ہوئے تھے۔ خاصے خوش الحان تھے ان کی اذان کی آواز محلّے بھر میں سنائی دیا کرتی تھی۔ وہ کئی

شہروں میں مسجدوں کے امام رہ چکے تھے مگر طبیعت سیلانی تھی اس لیے کہیں بھی پانچ چھ مہینے سے زیادہ نہیں نکے۔ امام صاحب صبح کی نماز کے بعد بیوہ سیدانی کے گھر آجاتے اور دو گھنٹے تک لڑکیوں کو قرآن شریف کے ساتھ ساتھ اُردو، فارسی بھی پڑھاتے۔

اسی زمانے میں میر صاحب مرحوم کے خاندان پر اچانک ایک ایسی مصیبت ٹوٹ پڑی جس سے محلے کے لوگ وقتی طور پر اپنے اختلافات بھول گئے۔ ہوا یہ کہ فرزند علی نے جو اَب بارہ برس کا ہو گیا تھا اسکول میں کسی لڑکے کے پیٹ میں چاقو گھونپ دیا۔ اس لڑکے کو کسی طرح فرزند علی کے خاندان کے حالات معلوم ہو گئے تھے اور وہ اسے اکثر چھیڑا کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا۔ "تو بے غیرت ہے تو محلے والوں کے ٹکڑوں پر پلا ہے دیکھ لیجیو ایک دن تیری بہنیں ایکٹریس بنیں گی ایکٹریس!"

چونکہ وہ لڑکا عمر میں فرزند علی سے بڑا تھا اور طاقت ور بھی تھا اس لیے فرزند علی طرح دے جایا کرتا تھا لیکن آخر ایک دن تنگ آ کر اس لڑکے کے چاقو مار دیا۔ وہ لڑکا تھوڑی ہی دیر میں چل بسا اور فرزند علی کو پولیس پکڑ کے لے گئی۔

یہ مقدمہ مہینوں چلتا رہا۔ حاجی صاحب اور محلے کے دوسرے بااثر لوگوں نے بہتیرا زور لگایا مگر فرزند علی سزا سے نہ بچ سکا اور وہ پانچ برس کے لیے بورسٹل جیل بھیج دیا گیا۔ اس واقعہ سے محلے والوں کی ہمدردی میر صاحب مرحوم کے خاندان سے پھر تازہ ہو گئی کئی دن تک محلے کی عورتیں بیوہ سیدانی کے گھر آتی اور اس کی دلجوئی کرتی رہیں۔ غریب عورت ایک بار پھر قسمت کو رو کر بیٹھ رہی۔

جس زمانے میں صغریٰ و کبریٰ جمن بی سے پڑھنے آیا کرتی تھیں تو الطاف کو کبھی کبھار ان کی ایک جھلک دیکھ لینے کا موقع مل جاتا تھا۔ مگر اب جو مہینوں صغریٰ اس کی نظروں سے اوجھل رہی تو اس کی بے تابی حد سے بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی ماں جمن بی سے صاف کہہ دیا کہ اگر میری شادی صغریٰ سے نہ ہوئی تو میں زہر کھا لوں گا۔

اس کی بے تابی نے اس مسئلے کو اور بھی اُلجھا دیا کیونکہ اس کی حرکات کی وجہ سے اہلِ محلہ اسے چھچھورا اور آوارہ مزاج سمجھنے لگے تھے اور حاجی صاحب کو ان کی مخالفت کے ڈر سے اس رشتے کا ذکر چھیڑنے کی جرأت نہ ہوتی تھی، کچھ یہ دقت بھی تھی کہ جب تک بڑی لڑکی کا بیاہ نہ ہو جائے چھوٹی کا سوال کیونکر اُٹھایا جائے۔

جوں جوں دن گذرتے گئی محلے والے حاجی صاحب کے اور بھی زیادہ مخالف ہوتے گئے یہاں تک کہ معمولی معمولی دکاندار بھی ان پر آوازیں کسنے لگے اور ان کے لیے بازار میں آنا جانا مشکل ہو گیا۔

بڑ قصاب کہتا "دیکھیں حاجی صاحب کیسے لڑکے کی شادی رچاتے ہیں۔ پہلے وہ میرا پانچ سو روپیہ تو ادا کرویں۔ میں تو انہی کے کہنے پر اتنے عرصے میر صاحب کے ہاں گوشت پہنچاتا رہا ہوں۔"

کنجڑا کہتا۔ "اتنا ہی ناتواں میرا بھی نکلتا ہے بھائی۔"

شیر فروش کہتا۔ "ہم نے بھی مفت دودھ نہیں پلایا۔"

غرض محلے کے حالات اس درجہ بگڑ گئے تھے کہ اگر حاجی صاحب کی بزرگی آڑے نہ آتی تو ہاتھاپائی تک نوبت پہنچ گئی ہوتی۔

ایک دن جب اہلِ محلہ مسجد میں عشاء کی نماز پڑھ کر جانے لگے تو امام مسجد نے جو میر صاحب مرحوم کی لڑکیوں کو گھر پر پڑھانے آیا کرتے تھے، حاجی صاحب اور چند دوسرے معتبر لوگوں کو یہ کہہ کر روک لیا کہ آپ سے ایک ضروری مسئلے پر بات کرنی ہے۔ جب اور لوگ چلے گئے تو امام صاحب نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا:

"آپ سب حضرات نہایت ہی نیک دل اور خدا ترس ہیں۔ خدا شاہد ہے میں نے اتنے شریف اور ہمدرد انسان اور کسی محلے میں نہیں دیکھے۔ آپ نے میر صاحب مرحوم کے خاندان سے جو فیاضانہ سلوک کیا ہے اور اس سلسلے میں جو عملی قدم اٹھائے ہیں، اس کا اجر

خدا اور اُس کا رسول ﷺ آپ کو دے گا، کاش میرے پاس بھی پیسہ ہوتا اور میں بھی اس کارِ خیر میں آپ کا شریک ہوتا لیکن اب میں آپ کے سامنے ایک تجویز پیش کرتا ہوں جو فرمانِ خُدا اور سنّتِ رسول ﷺ ہے، یعنی میں سیّد کی بیوی سے عقد کا خواہاں ہوں۔ مجھے آپ لوگوں پر پورا اعتماد ہے کہ اس لاوارث سیّد خاندان کی بہتری کے لیے آپ اس کارِ خیر میں میری امداد کریں گے۔"

حاجی صاحب اور دوسرے لوگ امام صاحب کی اس تجویز کو سن کر دم بخود رہ گئے۔

"بہتر ہے۔" آخر حاجی صاحب بولے۔ "اس امر میں بیوہ سیدانی کی رائے بھی لے لی جائے۔"

دوسرے دن دوپہر کے بعد محلّے کی کچھ عورتیں بیوہ سیدانی کے ہاں پہنچیں اور اس سے عقدِ ثانی کی بات چھیڑی۔ سیدانی بی دیر تک خاموش سر جھکائے بیٹھی رہیں، پھر یک لخت ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ جب محلّے کی عورتوں نے بار بار اپنا سوال دہرایا تو وہ رک رک کر اتنا کہہ سکیں:

"جب اللہ اور رسول ﷺ کا یہی حکم ہے تو مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔"

یہ کہتے کہتے سیدانی کے رخساروں پر جن میں ابھی تک خون کی چند بوندیں باقی تھیں ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔

اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد امام مسجد جو قاری نور الہدیٰ کے نام سے یاد کئے جاتے تھے اپنا مختصر سامان جس میں ایک صندوقچہ، ایک چھوٹی دری اور مسئلے مسائل کی چند کتابیں شامل تھیں، لے کر مسجد کے حجرے سے سیّد کی بیوہ کے گھر اُٹھ آئے۔

صبح صبح شیر فروش کا لڑکا حسبِ معمول میر صاحب مرحوم کے بیوی بچوں کے لیے کوزے میں دودھ لے کر آیا، اس کی آواز سن کر امام صاحب خود دروازے پر آگئے۔

"میاں لڑکے!" انہوں نے پُر وقار لہجے میں کہا "اپنے استاد سے کہنا وہ اب دودھ نہ

بھیجا کریں۔ ہمیں جتنے کی ضرورت ہوگی ہم خود مول لے آئیں گے۔ہاں کوئی نذر نیاز کی چیز ہو تو مسجد میں بھیج دی جایا کرے۔"

پُتلی بائی

محبت کا جذبہ پہلے پہل انسان کے دل میں کب بیدار ہوتا ہے، اس کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں، بعض لوگ لڑکپن ہی سے عاشق مزاج ہوتے ہیں اور بعض بلوغت کو پہنچ کے بھی اس جذبے سے بے بہرہ ہی رہتے ہیں۔

میری عمر کوئی نو دس برس کی ہوگی کہ مجھے عشق ہو گیا۔ عہدِ طفلی کا وہ معصوم عشق نہیں جو کھلونوں سے بہل جاتا ہے بلکہ سچ مچ کا ہجر و وصال والا عشق جس میں محبوب کی یاد آہیں بھرواتی ہے۔ دل میں ہوک اٹھتی ہے۔ چہرے کا رنگ زرد رہنے لگتا ہے بھوک پیاس کی سدھ نہیں رہتی۔

جس نے مجھے اس مرض میں مبتلا کیا وہ میری ہم عمر لڑکی نہ تھی۔ بلکہ بیس بائیس برس کی ایک پوری جوان عورت تھی۔ ایک خوبصورت ایکٹریس!

اُن دنوں ہم جس محلّے میں رہتے تھے اس کے قریب ہی ایک تھیٹر تھا اس کے پچھواڑے ایک گلی جس میں کئی چھوٹے چھوٹے مکان تھے۔ ان مکانوں میں متوسط درجے کے لوگ رہا کرتے تھے علاوہ ازیں کچھ کمرے تھیٹر کے مالک نے اپنے ایکٹروں کے رہنے کے لیے کرائے پر لے رکھے تھے۔ اس ایکٹرس کو جو دو کمرے دیئے گئے وہ ہمارے مکان کے بالکل سامنے تھے اور خاص کر وہ کمرہ تو جس میں وہ سویا کرتی تھی میرے اس چھوٹے

سے کمرے کے عین مقابل تھا جو والد نے مجھے لکھنے پڑھنے کے لیے دے رکھا تھا۔ اس کا کمرہ روشنی کے کچھ ایسے رُخ پر تھا کہ باوجود اس چق کے جو ہر وقت اس کے دروازے پر پڑی رہتی تھی، مجھے کمرے کی ایک ایک چیز صاف دکھائی دیتی تھی، چنانچہ میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے اسے دن رات دیکھا کرتا۔ سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے، سنگھار کرتے، کھانا کھاتے۔ کبھی کبھی میں اپنے کمرے کی کھڑکی بند کر لیتا تاکہ اس کے شیشوں میں سے اسے اور آزادی کے ساتھ دیکھ سکوں۔

میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ والد کی کاروباری مصروفیتیں انہیں دن بھر گھر سے باہر رکھتیں۔ والدہ کا وقت زیادہ تر باورچی خانے میں کٹتا کھانا پکانے سے فرصت ملتی تو سینا پرونا لے بیٹھتیں، غرض گھر میں مجھے اس تاک جھانک سے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔

وہ ایک دُبلی پتلی نازنین سی عورت تھی۔ پُتلی بائی کا نام اس پر خوب پھبتا تھا قد کسی قدر لمبا۔ بال سیاہی میں سنہراپن لیے ہوئے جو اس کی کمر تک پہنچتے، بلور کی طرح صاف و شفاف جسم۔ چہرہ کندن کی طرح دمکتا ہوا، ماتھے پر سرخ بندی، نشیلی نشیلی آنکھیں جنہیں کاجل سے لمبا لمبا بنا لیا جاتا اور جو مصر قدیم کی عورتوں کی آنکھوں کی یاد دلاتی تھی۔ ہاتھ پاؤں میں مہندی رچی ہوئی، حرکات میں ایک تھکی تھکی سی کیفیت۔ صبح کو جس وقت وہ انگڑائی لیتی ہوئی پلنگ سے اٹھتی تو اس کی لمبی لمبی لچکتی ہوئی بانہوں میں شاخوں کی سی ادا پیدا ہو جاتی۔

اس کا شب خوابی کا لباس بس باریک ململ کی ایک سفید دھوتی تھا جسے وہ بے پروائی سے اپنے گرد لپیٹے رکھتی اور جس میں سے اس کے جسم کے خطوط و خم کی ساری رعنائیاں پھوٹی پڑتیں۔ اسے پھولوں کا بہت شوق تھا۔ میں نے اس کی سنگھار میز کسی روز بھی پھولوں کے گلدستے سے خالی نہیں دیکھی۔ کبھی کبھی اس کی خواب گاہ کی کسی دیوار کی کسی کھونٹی پر بھی پھولوں کا ہار ٹنگا ہوا نظر آتا۔ وہ خود بھی اپنے جسم کو پھولوں کے طرح طرح کے گہنوں سے آراستہ کیا کرتی، چنانچہ صبح کو اس کے بستر پر، گلے میں، کانوں میں، کلائیوں پر،

جوڑے میں پھول ہی پھول دکھائی دیتے۔ رات بھر میں وہ باسی ہو جاتے، اور صبح کو وہ انہیں نوچ نوچ کر پھینک دیتی۔ یہ وہ پھول تھے جو ہر روز رات کو اس کے مداح اسٹیج پر اس پر نچھاور کیا کرتے تھے۔

میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ایک حیرت کے عالم میں اس کی کیفیت دیکھا کرتا۔ گھنٹوں دیکھتے رہنے پر بھی سیری نہ ہوتی۔ خاص کر اتوار کو جب مجھے اسکول سے چھٹی ہوتی تو میں اسکول کے کام کے بہانے سارے دن اپنے کمرے میں پڑا رہتا اور اس کو مختلف کیفیتوں میں دیکھا کرتا۔ اور جب مجھے طوعاً کرہاً اسکول جانا پڑتا وہاں بھی میرا وقت اسی کے خیال میں کٹتا۔ کئی بار میری بے خیالی اور سبق سے عدم توجہی پر استاد میری سرزنش کر چکے تھے، چنانچہ مجھ کو بڑی کوشش کے ساتھ اپنا دھیان کتاب کی طرف لگانا پڑتا مگر جیسے ہی اسکول کی چھٹی ہوتی بھاگا بھاگا گھر پہنچتا اور سب سے پہلے اپنے کمرے میں پہنچ کر اپنی محبوبہ پر ایک نظر ڈالتا۔ وہ عموماً اس وقت تک ریہرسل سے آچکی ہوتی اور غسل کر کے سنگھار میز کے سامنے بیٹھی اپنے لمبے سیاہی مائل سنہرے بالوں میں کنگھی کر رہی ہوتی۔

کبھی کبھی وہ آئینے کے سامنے بیٹھی خود اپنے حسن کا مشاہدہ کرنے میں محو ہوتی وہ اپنے جسم کو گھما پھرا کر مختلف زاویوں سے اس پر ناقدانہ نظریں ڈالتی۔ ایسے میں میں چپکے سے اپنے کمرے کے دروازے میں اندر سے کنڈی لگا لیتا اور اس کے ساتھ ہی کھڑکی کے پٹ بند کر دیتا تاکہ اسے شبہ تک نہ ہو کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے اور چپکے چپکے کھڑکی کے شیشے میں سے اسے دیکھتا رہتا۔ اس کا یہ انداز مجھے ان قدیم یونانی مرمریں مجسموں کی یاد دلایا کرتا جنہیں میں نے اپنے شہر کے عجائب خانے میں دیکھا تھا۔

اس کے ساتھ کوئی مرد نہ تھا بس ایک بوڑھی ماما تھی جو اوپر کا کام بھی کرتی اور ہنڈیا بھی پکاتی تھی۔ یہ کام وہ دوسرے کمرے میں انجام دیتی اور میری محبوبہ زیادہ تر اپنی خواب گاہ ہی میں رہا کرتی۔ اس سے کوئی ملنے نہیں آتا تھا، البتہ کسی کسی شام تھیٹر کا مالک موٹر لے کر

نیچے آجاتا اور ہارن بجاتا۔ وہ پہلے ہی سے تیار ہوتی اور اس کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر سیر کو چلی جاتی۔ ایسے موقعوں پر میں اس سے پہلے ہی گلی سے باہر سڑک پر پہنچ جایا کرتا تاکہ قریب سے اس کو ایک نظر دیکھ سکوں۔ اس سے آنکھیں چار کرنے کی مجھے کبھی جرأت نہیں ہوئی۔ میں عموماً اسے چُھپ چُھپ کے یا صرف اس وقت گھورا کرتا جب وہ میری طرف نہ دیکھ رہی ہوتی۔

میرے والد پرانے خیال کے آدمی تھے اور تھیٹر تماشے کو برا جانتے تھے۔ میں کبھی یہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ مجھے تھیٹر جانے کی اجازت مل جائے گی۔ اس لیے اپنی محبوبہ کو اسٹیج پر دیکھنے کی حسرت میرے دل ہی میں رہتی۔ البتہ میں اس کی آواز برابر سنا کرتا اس کے لیے مجھے راتوں کو جاگنا پڑتا۔ پچھلے پہر جب سب سو جاتے تو رات کے سناٹے میں اس کی آواز تھیٹر سے ہمارے گھر تک صاف سنائی دیا کرتی اور میں اس کے سریلے نغموں کو سن سن کو بیٹھے سپنوں میں کھو جاتا۔

دن پر دن گزرتے گئے اور میرا عشق بڑھتا ہی چلا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں روز بروز دبلا ہوتا گیا۔ میرے چہرے کا رنگ زرد رہنے لگا۔ آنکھوں کے نیچے گڑھے پڑ گئے میں ہر وقت سہا سہا سا رہتا۔ کسی سے آنکھ ملا کے بات کرنے کی مجھے جرأت نہ ہوتی۔ شاید ڈرتا تھا کہ کہیں میری آنکھیں میرے دل کا راز فاش نہ کر دیں۔

میرے ماں باپ نے میری یہ حالت دیکھی تو سخت فکر مند ہوئے۔ والد مجھے ایک حکیم صاحب کے پاس لے گئے۔ وہ حضرت دیر تک میری نبض دیکھا کیے مگر انہیں کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ مجھے کیا مرض ہے۔ فرمانے لگے "لڑکا پڑھنے میں بہت محنت کرتا ہے۔ اسے خشکی ہو گئی ہے۔" اور انہوں نے کئی قسم کی مرغن غذائیں میرے لیے تجویز کیں۔ میرے لیے گھر کا معمولی کھانا بھی زہر تھا، ان غذاؤں سے رغبت کیونکر پیدا ہوتی چنانچہ والدہ کے سخت اصرار پر دو چار نوالے حلق سے اتار کے ہاتھ کھینچ لیتا۔

یہ تو گھر کا حال تھا۔ اسکول میں مجھے اور بھی مشکل پیش آتی، وہاں میری تندرستی کی تو کسی کو فکر نہ تھی۔ البتہ تعلیم کی طرف سے بے پروائی کسی طرح بھی برداشت نہ کی جاسکتی تھی اور میری یہ کیفیت تھی کہ مجھے معلوم ہی نہ ہوتا کہ استاد پڑھا کیا رہے ہیں، وہ مجھے سزائیں دے دے کر تھک گئے تھے انہیں حیرت تھی کہ وہ لڑکا جس کو وہ ہونہار سمجھ رہے تھے، اچانک ایسا غبی کیونکر ہو گیا۔

گھر آکر جب میں کھڑکی میں سے اپنی محبوبہ کو دیکھتا تو خوشی کی ایک لہر میرے سارے جسم میں دوڑ جاتی اور میں دن بھر کی تکلیفیں بھول جاتا۔

ایک دن مجھے اسکول سے جلد ہی چُھٹی مل گئی۔ مجھے خوب یاد ہے یہ بڑا سہانا دن تھا۔ کئی روز کی مسلسل گرمی اور دھوپ کے بعد آسمان پر اَبر چھایا تھا۔ ٹھنڈی ہَوا چلنے لگی تھی۔ میرے ساتھی تو گیند بلا اور فٹ بال لے کر خوشی خوشی کھیل کے میدان کی طرف چلے اور میں نے گھر کی راہ لی۔ جلد جلد مکان کی سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں پہنچا کھڑکی سے جھانکا تھا کہ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میری محبوبہ جن دو کمروں میں رہتی تھی وہ خالی پڑے تھے، چقیں اتار لی گئی تھیں اور کھلے دروازوں کے کواڑ ہَوا سے ہل رہے تھے۔ میں دوڑ کر نیچے گلی میں پہنچا اور بازار کی طرف گیا، جدھر تھیٹر کا دروازہ تھا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ تھیٹر کے پردے اور ساز و سامان چھکڑوں پر لادا جا رہا ہے، میں بھونچکا رہ گیا۔ کمپنی کا ایک ملازم لڑکا اسباب لدوا رہا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اس سے پوچھا:

"یہ کمپنی کہاں جا رہی ہے؟"

"دوسرے شہر کو۔" اس نے جواب دیا۔

"وہاں سے کب واپس آئے گی؟"

"واپس نہیں آئے گی، وہاں سے کسی اور شہر کو چلی جائے گی۔"

"کیا یہاں پھر کبھی نہیں آئے گی؟"

"کیا پتہ۔ شاید پانچ چھ برس کے بعد پھر آنا ہو۔"

یہ سن کر مجھ پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ اس لڑکے کو میری حالت پر اچنبھا ہوا۔ وہ مجھ سے کچھ پوچھنے ہی کو تھا کہ میں جلد ہی سنبھل کر وہاں سے بھاگ آیا۔

یہ بات تو میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھی کہ یوں بھی ہو سکتا ہے۔ میں گرتا پڑتا گھر پہنچا۔ میں نے بے جان ہو کے اپنے کو پلنگ پر پٹخ دیا۔ نہ جانے کب تک میں بے حس پڑا رہا جب ہوش آیا تو میرا جسم تنور کی طرح تپ رہا تھا۔ آئے دن نئے نئے ڈاکٹر حکیم مجھے دیکھنے آتے۔ والدہ دیر دیر تک سجدے میں پڑی میری صحت یابی کے لیے دعائیں مانگا کرتیں اور طرح طرح کی منتیں مانتیں۔ آخر خدا نے مجھے شفا دی اور میں کوئی دو مہینے کے بعد بستر سے اٹھ بیٹھا۔

ان ہی دنوں ایسا اتفاق ہوا کہ والد کو اپنا کاروبار کسی دوسرے شہر میں منتقل کرنا پڑا چنانچہ ہم سب ان کے ساتھ اس شہر کو خیر باد کہہ کر وہاں جا بسے اور اس طرح تبدیلیٔ آب و ہوا سے میں رفتہ رفتہ بالکل اچھا ہو گیا۔

اس کے بعد جو دس برس گزرے ان میں میں نے پتلی بائی کو پھر کبھی نہیں دیکھا۔ اس عرصے میں میں نے اپنی تعلیم مکمل کر لی اور والد کے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹانے لگا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں نے اپنے لڑکپن کے عشق کو فراموش کر دیا تھا یا اس عورت کی یاد میری دل سے محو ہو گئی تھی۔ میں اب بھی دردِ محبت کی اس خلش کو محسوس کرتا تھا۔ میں اب بھی اکثر اس کے تصوّر سے دل بہلایا کرتا تھا، البتہ اب میرے دل کو صبر آ گیا تھا اور اس کی یاد لذت بخش تھی۔

جب میری عمر پچیس برس کی ہوئی تو والد نے اپنے ایک عزیز دوست کی صاحبزادی سے، جو علاوہ قبول صورت ہونے کے، پڑھی لکھی بھی تھی، میرے رشتے کی بات ٹھہرائی مجھے شادی کی کچھ ایسی خواہش نہ تھی مگر والدین کی خوشی کے آگے میں نے سر جھکا دیا۔

شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ جب شادی میں ایک مہینہ رہ گیا تو میں نے والد سے کہا کہ میں گرمیوں کے دو ہفتے اپنے ایک دوست کے پاس پہاڑ پر گزارنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کسی قدر تامل کے بعد مجھے اجازت دے دی، دراصل میں تاہل کے رشتے میں جکڑے جانے سے پہلے اپنی آزادی کے آخری دن فراغت سے گزارنا چاہتا تھا۔

وہ پہاڑی اسٹیشن جہاں میں اپنے دوست کے ہاں مہمان ٹھہرا تھا، اپنے پورے شباب پر تھا، موسم اتنا اچھا تھا کہ پچھلے کئی برس میں دیکھنے میں نہیں آیا تھا، چنانچہ چاروں طرف سے مخلوق ٹوٹ پڑی تھی۔ کوئی پورے سیزن کے لیے کوئی دو مہینے کے لیے اور کوئی ہفتہ بھر ہی کے لیے چلا آیا تھا۔ تمام ہوٹل اور مکان سیلانیوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ ان میں زیادہ تر مرفہ الحال لوگ تھے جو نشاط اور تفریح کی تلاش میں یہاں آئے تھے، ان کی بیٹیاں چست لباس پہن کر گھوڑے کی سواری کرتیں۔ لڑکے جوا کھیلتے، بیویاں شادی سے پہلے کے معاشقوں کے ہیروؤں کو جن کے جذبات سرد پڑ چکے ہوتے، رام کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ میک اپ کرتیں اور ان سے طرح طرح کے کام نکلوانے میں ہمہ تن مصروف رہتیں اور شوہر کلب میں اپنی جوانی کے پرانے دوستوں کے ساتھ مل کر وہسکی پیتے اور ایک دوسرے کو فحش لطیفے سناتے رہتے۔ جوان لڑکیوں اور لڑکوں سے کہیں زیادہ اَدھیڑ عمر والوں کے رومان چلتے اور شادی بیاہ کے مرحلے طے ہوتے۔

میرا میزبان ایک عیال دار اور کاروباری شخص تھا، اس کو اپنے ہی جھمیلوں سے فرصت نہ تھی کہ میری طرف توجہ کرتا۔ چنانچہ اس نے مجھے بخوشی اجازت دے دی تھی کہ جہاں چاہوں جاؤں اور جب چاہوں آؤں اگر کھانے کے وقت پر آجاؤں تو خیر ورنہ میرا انتظار نہ کیا جائے۔ اس طرح مجھے اس مقام پر آزادی سے گھومنے پھرنے کا خوب موقع مل گیا اور میں نے دس بارہ روز ہی میں خوب سیر و تفریح کرلی۔

ایک دن سہ پہر کو میں ایک لمبی سڑک پر جو ایک اونچے پہاڑ کے گرداگرد تقریباً

ہموار چلی گئی تھی، چلا جارہا تھا کہ سامنے سے دو عورتوں کو آتے دیکھا۔ یوں تو اس سڑک پر ایک سے ایک فیشن ایبل عورت نظر آتی تھی مگر ان کا انداز مختلف تھا۔ ان کے سنگھار اور لباس میں بھڑک کم اور سادگی زیادہ تھی۔ وہ ہلکے رنگوں کی ساڑھیاں پہنے ہوئے تھیں۔ ایک ہی نظر میں میں نے اپنے بچپن کی محبوبہ تھیٹر کی ایکٹرس پتلی بائی کو پہچان لیا۔ ہر چند وہ اب اُدھیڑ عمر ہو گئی تھی اور جسم میں کسی قدر بھاری بھر کم پن بھی آ گیا تھا مگر سنگھار اور چست لباس نے ابھی تک اسے جوان بنائے رکھا تھا۔ اس کا حسن آج بھی ویسا ہی نظر فریب تھا جیسا کہ پندرہ برس پہلے میں نے دیکھا تھا۔ بال ویسا ہی سیاہی میں سنہرا پن لئے ہوئے، چہرہ پہلے سے زیادہ دمکتا ہوا وہی نشیلی نشیلی سی آنکھیں جو مجھے بے خود بنادیا کرتی تھیں، پھولوں سے اس کا شوق بدستور قائم معلوم ہوتا تھا کیونکہ ڈیلیا کا ایک سیاہی مائل سرخ پھول اس کے جوڑے کی زینت تھا۔

اس کو دیکھ کر میں مبہوت رہ گیا اور پھر لمحہ بھر ہی میں میرے دل میں اپنے لڑکپن کا خوابیدہ جذبۂ عشق ایک طوفان کی طرح امنڈنے لگا۔ اب میں لڑکا نہیں تھا بلکہ پچیس برس کا ایک پورا جوان تھا۔ میرے احساسات اب مبہم نہیں رہے تھے بلکہ واضح اور زیادہ گہرے ہو گئے تھے۔ اب میں بخوبی سمجھنے لگا تھا کہ ایک مرد جب کسی عورت سے محبت کرتا ہے تو وہ اس سے کیا چاہتا ہے۔

پتلی بائی کے ساتھ جو نوجوان لڑکی تھی وہ بھی حُسن و جمال میں اس سے کسی طرح کم نہ تھی بلکہ شباب نے اس کے حُسن کو کچھ زیادہ ہی شاداب بنادیا تھا لیکن مجھ کو اس کے حُسن و شباب سے کیا غرض تھی۔ میری نظریں تو اپنی محبوبہ کے پیارے پیارے چہرے پر ہی گڑی ہوئی تھیں۔

ذرا سی دیر میں وہ دونوں میرے سامنے سے گزر گئیں۔ میں پلٹا اور میرے قدم مجھے بے اختیار ان کے پیچھے پیچھے لے گئے۔ تقدیر نے یوں غیر متوقع طور پر مجھے اس کے دیدار کا

جو موقع دیا تھا۔ میں چاہتا تھا اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤں۔ اس کو جی بھر کے دیکھ لوں، پھر کون جانے کب دیکھنا نصیب ہو یا ممکن ہے کہ شادی کے بعد میں اس کے خیال تک کو گناہ سمجھنے لگوں لیکن ابھی تک تو میں آزاد تھا۔

وہ دیر تک اس سڑک پر چہل قدمی کرتی رہیں۔ میں بھی ان سے تھوڑی دور رہ کر ان کا تعاقب کرتا رہا۔ جب کبھی وہ سورج اور بادلوں یا نیچے پھیلی ہوئی وادی کا نظارہ کرنے ٹھہر جاتیں تو میں بھی رک جاتا لیکن اس طرح کہ میری بیگانگی کا بھرم قائم رہے۔ کبھی کبھی وہ سڑک کے کنارے زمین پر لگی ہوئی کسی دکان پر چیزیں دیکھنے ٹھہر جاتیں تو میں ان سے آگے بڑھ جاتا۔ مگر تھوڑی ہی دور جا کر لوٹ آتا۔ اس طرح مجھے اپنی محبوبہ کا چہرہ اچھی طرح دیکھنے کا موقع مل جاتا۔

غروبِ آفتاب کے بعد وہ سیر سے لوٹیں اور تھوڑی دیر میں ایک متوسط درجے کے فیشن ایبل ہوٹل میں پہنچ گئیں، میں دل میں بہت خوش ہوا کہ میں نے ان کی قیام گاہ کا پتہ لگا لیا ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ چاہتا بھی نہ تھا۔ نہ مجھے اس کے حالات معلوم کرنے کی خواہش تھی نہ یہ جاننے کی کہ تھیٹریکل کمپنی میں کام کرتی ہے یا اس پیشے سے الگ ہو گئی ہے۔ میں تو فقط اس کی صورت کا دیوانہ تھا جیسے کسی کو آرٹ کی کوئی تصویر عزیز ہو۔

اگلے روز دیدار کی ہوس مجھے کشاں کشاں اس ہوٹل کی طرف لے گئی، کوئی دو گھنٹے کے بعد جس کے دوران میں میں نے ہوٹل کے پچاسوں چکر کاٹ ڈالے ہوں گے، وہ دونوں پھر نمودار ہوئیں۔ آج انہوں نے اور ہی رنگوں کی ساڑھیاں پہن رکھی تھیں۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پھر تعاقب کا سلسلہ شروع کر دیا اور اس وقت تک پیچھا نہ چھوڑا جب تک کہ انہیں واپس ہوٹل میں نہ پہنچا دیا۔

تیسرے دن جو اس پہاڑ پر میرے قیام کا آخری دن تھا۔ میری بے قراری کچھ زیادہ بڑھ گئی تھی اور میں نے صبح ہی سے ہوٹل کا طواف شروع کر دیا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب وہ

نمودار ہوئیں اور کوئی گھنٹہ بھر تک دکانوں میں خرید و فروخت کرنے کے بعد وہ پھر ہوٹل میں پہنچ گئیں۔ میرے دل نے وہاں سے جانا گوارانہ کیا اور میں نے وہ دن اسی ہوٹل کے پاس گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔

سہ پہر کو چار بجے وہ پھر ہوٹل سے نکلیں۔ میں انتظار کرتے کرتے تھک کے چُور ہو گیا تھا مگر اپنی محبوبہ کو دیکھنا تھا کہ اچانک مجھ میں پھر چستی اور توانائی پیدا ہو گئی۔ چونکہ اسے دیکھنے کا یہ آخری موقع تھا اور میرا دل اس کے قرب کا متمنی تھا۔ اس لیے میں نے ساری احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر ان کے قریب قریب ہو کے چلنا شروع کر دیا۔ شام ہو چکی تھی، ہم ایک چھوٹی سی بل کھاتی ہوئی سڑک پر چلے جارہے تھے، نیچے میلوں تک وادی پھیلی ہوئی تھی جس پر دُھند کی چادر گہری ہونی شروع ہو گئی تھی۔ دیودار کے اونچے اونچے درختوں کے لامتناہی سلسلے سڑک کے کنارے سے شروع ہو کے نیچے کھڈوں میں دور دور تک چلے گئے تھے۔ مغرب میں سرمئی بادل شفق کے لالہ زار پر چھائے جارہے تھے۔ اندھیرا پھیلتا جارہا تھا اور لوگوں کی آمد و رفت کم ہو چلی تھی۔ ہوا نرم اور سبک تھی۔ میں ایک نشے کے عالم میں بہا چلا جارہا تھا۔ اس وقت میرے اور ان کے درمیان پانچ سات قدم ہی کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

اچانک ایک موڑ پر پہنچ کر بچی بائی پیچھے مڑی اور مجھے گھورنے لگی۔ میرے قدم وہیں جم کے رہ گئے اور اتنی ہمت نہ ہوئی کہ ان کے پاس سے گزر جاؤں وہ نہایت غصّے میں تھی، اس کی آنکھوں سے قہر و غضب برس رہا تھا۔ اس نے بلند آواز میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے گویا وہ اسٹیج پر ایکٹ کر رہی ہو مجھ سے کہا:

"بدمعاش تو میری بیٹی کا پیچھا کرنے سے باز نہیں آئے گا۔ میں تجھے پولیس کے حوالے کر دوں گی۔"

مجھے چکر آ گیا۔ اگر میں جلدی سے ایک درخت کی ٹہنی کو نہ تھام لیتا تو میرا کھڈ میں گر

پڑنا یقینی تھا۔ خدا معلوم وہ لوگ کب اور کدھر چلے گئے۔ خدا معلوم میں کب اور کس راستے سے اپنے ٹھکانے پر پہنچا لیکن وہ دن اور آج کا دن اپنے بچپن کے اس رومان کی یاد سے جی بہلانے کی میرے دل میں پھر کبھی خواہش پیدا نہ ہوئی۔

مکر جی بابو کی ڈائری

کئی روز کی مسلسل مصروفیتوں کے بعد درما ایشیاٹک کمپنی کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر مکر جی بابو کو فراغت کی ایک شام نصیب ہوئی تو انہوں نے سوچا کہ اسے یونہی نہیں گنوانا چاہیے۔ لندن کی ایک تنگ اور پُر پیچ گلی میں جو پکاڈلی سرکس سے زیادہ دور نہ تھی، ایک پرانے مکان کی چوتھی منزل پر ان کا ایک چھوٹا سا دفتر تھا۔ دفتر کیا تھا ایک مختصر سا بیڈ سٹنگ روم تھا جس کو دو تین چھوٹی چھوٹی میزوں، کرسیوں، ٹائپ رائٹر، میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون اور فائلوں کی کثرت نے جنہیں کمرے کے گوشوں میں تلے اوپر بڑی ترتیب سے چنا گیا تھا۔ اچھا خاصا کاروباری رنگ دے دیا تھا۔

مکر جی بابو آج دفتر میں اکیلے ہی تھے، کیونکہ ڈائریکٹر پچھلے روز پیرس کے ہفتہ بھر کے دورے پر چلا گیا تھا اور سوِس ٹائپسٹ لڑکی نے، جس کا کام دفتر کی دیکھ بھال اور جھاڑ پونچھ بھی تھا، دانت کے درد کی وجہ سے چھٹی لے لی تھی، چنانچہ وہ خود کو بہت آزاد محسوس کر رہے تھے۔

مکر جی بابو کو لندن آئے پندرہ برس سے زیادہ عرصہ ہو چکا تھا۔ کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ باپ نے انجینئری کی تعلیم کے لیے بھیجا تھا مگر تعلیم ختم نہ ہوئی تھی کہ جنگ چھڑ گئی۔ انہوں نے انجینئری کو تو خیر باد کہا اور اے آر پی میں بھرتی ہو گئے، اسی

دوران میں باپ کا انتقال ہو گیا۔ بڑے مکر جی نے کچھ زیادہ جائداد نہیں چھوڑی تھی اور حقدار کئی تھے، چار تو بیٹے ہی تھے چنانچہ انہوں نے وطن کو لوٹنا زیادہ سود مند نہ سمجھا اور روزی کمانے کے لیے یہیں ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ شروع شروع میں انہوں نے کئی دھندے کئے مگر کام نہ چلا۔ آخر ایک ہم وطن بھائی کے ساتھ مل کر ایک کمپنی کھول لی۔ اس کام میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی مگر وہ خود ورآمد برآمد کے چکر میں ایسے پھنسے کہ یہیں کے ہو رہے۔

مکر جی بابو خاصے بھاری بھرکم خوش وضع آدمی تھے۔ ٹھنڈے ملک میں عرصۂ دراز کی بود و باش سے ان کا سانولا رنگ نکھر آیا تھا۔ چالیس کے لگ بھگ عمر تھی، کن پٹیوں پر بالوں نے سفید ہونا شروع کر دیا تھا مگر اس کے باوجود چہرے پر نوجوانوں کی سی شادابی تھی، آنکھیں دائمی مسکراہٹ لیے ہوئے۔ انہوں نے مغربی اطوار و خصائل کا مطالعہ نفسیات کے ایک طالب علم کی طرح کیا تھا اور وہ انگریزوں کے مزاج کو خوب سمجھتے تھے۔ علاوہ ازیں ان کے میل جول میں ایک کاروباری بے لاگ پن بھی ہوتا تھا۔ ان ہی خصوصیات کی وجہ سے لندن کے نچلے متوسط طبقوں میں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی۔

مکر جی بابو نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی۔ گرجا گھر کی مخروطی چوٹی کے پیچھے ملگجا سا آسمان نظر آ رہا تھا۔ یہ جولائی کی ایک نسبتاً گرم سہ پہر تھی۔ صبح کو سورج خاصا تیزی سے چمکا تھا مگر بارہ بجتے بجتے بادل گھر آئے تھے جو اب چھٹنے شروع ہو گئے تھے، غرض موسم کی طرف سے زیادہ اندیشہ نہ تھا اور ایک دلچسپ شام گزارنے کی توقع کی جا سکتی تھی۔

لندن میں سینما، تھیٹر اور راگ رنگ کی محفلوں کو چھوڑ کر تفریحات کے بیسیوں اور ذریعے ہیں جو ندرت، رومان، لذت پرستی اور مہنگائی کے مختلف درجے رکھتے ہیں، ان میں سے بعض بہت گراں ہیں اور خطرناک نتائج کے حامل بھی ہو سکتے ہیں، مثلاً مے فیر کی کسی کلب کو رونق بخشنا اور کسی پری کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کرنا اور بعض بالکل معصوم

جن پر کچھ بھی خرچ نہیں آتا مثلاً ٹرافالگر سکیئر میں کبوتروں کو دانہ کھلانا۔ عین بھیڑ بھڑکے کے وقت خود کو لندن کی ٹیوب کے ہجوم میں گم کر دینا۔ مکر جی بابو کا تفریح کا طریق اوروں سے کسی قدر مختلف تھا۔ وہ پہلے کسی ہم صحبت سے ملاقات کی ٹھہراتے اور پھر باقی پروگرام اس کی مرضی پر چھوڑ دیتے تھے چنانچہ آج بھی انہوں نے اسی پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔

انہوں نے میز کی دراز سے ایک پرانی، سیاہ جلد والی کتاب نما ڈائری نکالی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگے۔ ڈائری کے کنارے پر انگریزی کے حروف تہجی مرقوم تھے اور ان ہی کے مطابق وہ مختلف جزوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ان کی ملاقات طبقہ اناث کی جن جن دلچسپ ہستیوں سے ہوتی تھی وہ ان کا نام پتہ، ٹیلی فون نمبر، ابتدائی ملاقات کا حال اور کئی اور ضروری اور کارآمد باتیں اس ڈائری میں درج کرتے گئے تھے۔ یہ ڈائری ان کی برسوں کی رفیق تھی اور ہر قسم کی تفریحی مہمات پر مشعلِ ہدایت کا کام دیتی تھی۔

مکر جی بابو کو "اے" کے جزو میں سب سے پہلے جو نام نظر آیا تھا وہ ایڈمز، مس پیٹریشیا ایڈمز، اس کے ذیل میں پتہ اور ٹیلی فون نمبر کے بعد یہ باتیں بطور یادداشت لکھی تھیں:

سکاٹ لینڈ کی رہنے والی، عمر ستائیس برس۔ ریڈ کراس کے دفتر میں سیکریٹری۔ رو پہلے بال، لمبا قد، دانت خراب، وعدے کی پابند، صرف شیری پیتی ہے، پہلی ملاقات ہمپٹن کورٹ میں۔

دو گھنٹے کی تفریح میں جس میں ہندوستانی کھانا شامل ہے، کل خرچ تین پونڈ۔

مکر جی بابو نے ٹیلی فون اٹھایا:

"کیا میں مس ایڈمز سے بات کر سکتا ہوں؟..... شکریہ ہیلو پیٹ کہو کیسی ہو؟ مدت سے ملاقات نہیں ہوئی۔ کہو چوٹ کا کیا حال ہے؟ کون سی چوٹ؟ ارے بھول گئیں۔ اس دن سرپنٹائن میں کشتی چلاتے ہوئے چوٹ آگئی تھی نا کہنی میں.. .اب یاد آیا، اچھی

ہو گئی، مجھے سن کر خوشی ہوئی۔ سنو! آج شام فارغ ہو؟۔۔۔ نہیں؟۔۔۔۔ ارے یہ کیوں؟...... سر میں درد ہے؟ خیر تو نہ سہی، میں نے سوچا ہم تم اکٹھے شام گزاریں گے۔ کھانا بھی ساتھ ہی کھائیں گے، خیر نہیں تو نہ سہی...... کیا کہا۔۔ کل آسکتی ہو، بھئی کل شاید مجھے فرصت نہ ہو، بہر حال ٹیلی فون کر لینا .... ہاں موسم برا نہیں، بادل چھٹ رہے ہیں، اچھا خدا حافظ پیٹ!"

اے میں انہیں جین اینڈرسن، شیلا آرنلڈ، ریٹا اٹیکن سن کے نام نظر آئے مگر انہوں نے درخورِ اعتنانہ سمجھا اور ورق الٹتے چلے گئے۔

بی کے جزو میں ان کی نظر مس مارجری بلس پر پڑی اور وہیں اٹک کر رہ گئی۔

عمر بائیس برس، قومیت خالص انگریز، برٹش میوزیم میں ملازم ہے وہیں پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

سیاہ چمکدار بال، خوب صورت آنکھیں جو کبھی نیلی معلوم ہوتی ہیں کبھی سبز، الہڑ حسینہ، غم ناک فلم دیکھنے کا شوق، فلم دیکھ کر بسورتی رہتی ہے .....رات کو ایسٹ اینڈ کی سیر کی شوقین۔

کریم ومال نوٹی پر اخصوصیت سے پسند کرتی ہے۔ اصرار سے جن بھی پی لیتی ہے مگر بیئر ہر گز نہیں پیتی۔

عام طور پر مہنگی رہتی ہے۔ جیب میں احتیاطاً پانچ پونڈ رکھنے چاہئیں۔

"ہیلو مارجری۔۔۔۔ کہو کیسی ہو — نہیں بتاتے۔۔۔

بوجھو تو جانیں، ارے پگلی میں ہوں تمہارا امکو۔ کہو آج شام آسکتی ہو؟ کیا کہا نسبت ٹھہر گئی تمہاری؟ سگائی ہو گئی تمہاری، ارے کس کے ساتھ؟ ارے بتادو ہم نہیں بتائیں گے کسی کو، وہ کون خوش قسمت شخص ہے ....؟ اچھا نہ سہی لیکن مبارک باد تو قبول کر لو .. شادی کے بعد مجھ سے ضرور ملانا.... ہاں صبح کو سورج نکلا تھا، بڑا پیارا پیارا، پھر بادل چھا گئے،

لو اب بادل پھر چھٹ رہے ہیں اچھا ماج، خدا حافظ، بہت بہت مبارک باد......"

مکرجی بابو نے دل میں کہا۔ "یہ بھی ٹھیک ہی رہا کہ وہ آنہ سکی کیونکہ جیب میں تو صرف تین پونڈ اور کوئی سات شلنگ ہی ہیں۔" اور انہوں نے ڈائری کے اس ورق کے کونے پر جس پر مارجری بلس کا حال مرقوم تھا، کانٹے کا نشان بنادیا اور پھر ورق الٹنے میں مصروف ہو گئے۔

اب کے وہ بی کے بقیہ اور سی ڈی ای کے تمام ناموں کو چھوڑتے ہوئے الیف پر رکے اور میڈ موازیل سیمن دے فے ایٹ کے نام کے نیچے یہ عبارت پڑھنے لگے:

فرانسیسی نژاد، سنہرے بال، بڑی بڑی آنکھیں، چنچل، فربہ جسم، ہنستی ہے تو گال میں گڑھا پڑتا ہے۔

میڈاویل میں ایک انگریز خاندان کے بچوں کی معلمہ ہے۔

ڈی ایپ سے پیرس کے سفر میں ملاقات ہوئی تھی، اور اس نے سیب کھانے کو دیا تھا۔

فرانسیسی ادب کی تعریف کرو تو خوش ہوتی ہے۔ شیری کے ساتھ ساتھ لائٹ ایل بھی پی لیتی ہے، ہندوستانی سالن اور پلاؤ سے رغبت ہے۔

وقت مقررہ سے آدھ پون گھنٹہ زیادہ انتظار کراتی ہے مگر پہنچ جاتی ہے۔ خاصی مہنگی ہے۔

"ہیلو کون سیمن تم ہو بھئی، شکر ہے اس وقت تم گھر پر مل گئیں۔ کہو کیا کر رہی ہو آج شام؟ ... کیا کہا پیرس سے بہن آئی ہے اور اس کا میاں بھی؟ تب تو تمھیں بہت مصروفیت ہوگی۔ کہو تو میں بھی آجاؤں.... ارے تم تو پریشان ہو گئیں ... نہیں نہیں میں نے تو یونہی دل لگی سے کہا تھا، پھر کبھی سہی۔ ایلو سورج نکل آیا۔ موسم بہت سہانا ہو رہا ہے، خدا حافظ۔"

اتنی ناکامیوں کے بعد بھی کیا مجال جو مکرجی بابو کی پیشانی پر شکن تک پڑی ہو، جن حرفوں کے ناموں پر قسمت آزمائی کئے بغیر وہ آگے بڑھ گئے تھے۔ اگر انہیں چھوڑ دیا جائے تو بھی ابھی ڈائری میں بے شمار نام اور باقی تھے۔

مونیکا ہیزل ...... عمر ۲۵ برس، ماں اطالوی، باپ انگریز، ٹنٹس برج کی ایک ملبوسات کی دکان میں ماڈل ہے، کچھ کچھ مصوری بھی جانتی ہے۔

سیاہ بال، سیاہ چشم، بالکل مشرقی حُسن کا نمونہ، خوش مذاق، بذلہ سنج، کسی بات پر اصرار نہیں کرتی۔ زیادہ خرچ نہیں کراتی۔

ٹوٹنہم کورٹ روڈ کے ایک حبشی ناچ گھر میں ملاقات ہوئی تھی۔

تین سے چار تک ٹیلی فون کے قریب رہتی ہے۔

انہوں نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالی اور پھر نمبر ملانے لگے :

"ہیلو ... ہیلو بے بی، پہچانا تم نے؟ میں ہوں میں۔ اُس رات اُس آخری سیمبا کے بعد تم اچانک کہاں گم ہو گئیں تھیں؟... اوہو معاف کیجئے گا میڈیم کیا میں مس مونیکا ہیزل سے بات نہیں کر رہا؟ مجھے مغالطہ ہوا میڈم۔ میں سخت شرمندہ ہوں میڈم، کیا کہا آپ نے؟ مس ہیزل نے نوکری چھوڑ دی، آپ ان کی جگہ کام کرتی ہیں۔ میں اپنی غلطی پر دوبارہ معافی کا خواست گار ہوں۔ کیا فرمایا آپ نے؟ میں دلچسپ آدمی معلوم ہوتا ہوں؟ شکریہ۔ بہت بہت شکریہ ...ہاں ہاں شاید کبھی ملاقات ہو جائے۔ خدا حافظ۔"

ٹیلی فون بند کر کے مکرجی بابو مسکرائے اور دل میں کہنے لگے۔ "لیجئے ان خاتون سے آج ہی ملاقات ہو سکتی تھی، بس ذرا دعوت دینے کی دیر تھی مگر بلا جانے پہچانے، دیکھے بھالے، دعوت دینا شاید ٹھیک نہ رہتا۔ ارے اس سے مونیکا کا پتہ ہی پوچھ لیا ہوتا فی الحال اس نام کو خارج ہی سمجھنا چاہیے۔"

وہ حروف بے "کے" اور ایل کے ناموں سے گزرتے ہوئے ایم کے جزو میں ہیلن

مگے خی کے نام کے نیچے یہ عبارت پڑھنے لگے۔

عمر چھبیس برس۔ اسکاٹ لینڈ کی رہنے والی۔ ماربل آرچ کارنر ہاؤس میں خادمہ ہے۔

نیلی آنکھوں کے سوا چہرے میں اور کوئی جاذبیت نہیں مگر جسم خوب گداز ہے۔

تند خو۔ مگر شادی کی بات چیت کرو، تو نرم پڑ جاتی ہے۔

گھر بنانے کی آرزو کا پے بہ پے اظہار۔ زیادہ میل جول خطرناک۔

کم خرچ بالا نشین۔ دس شلنگ بھی پاس ہوں تو شام گزاری جا سکتی ہے۔

سہ پہر کو کام سے واپس آجاتی ہے۔ گھر پر ٹیلی فون کرنا چاہیے۔

لینڈ لیڈی سے ہوشیار۔

یہ یادداشت پڑھ کر مکرجی بابو کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ مگر آخر کار انہوں نے نمبر ملا ہی ڈالا۔

"ہیلو میڈم۔ کیا میں مس مگے خی سے بات کر سکتا ہوں؟ بڑی نوازش ہوگی۔ کیا فرمایا آپ نے؟ کام میں مصروف ہیں، اس وقت نہیں مل سکتیں؟ خیر کوئی بات نہیں میں دوبارہ ٹیلی فون کر لوں گا۔ آپ کو زحمت ہوئی معافی چاہتا ہوں شکریہ، بادل چھٹ رہے ہیں۔ بہت بہت شکریہ!"

لینڈ لیڈی کے درشت لہجہ سے نجات حاصل کر کے مکرجی بابو نے اطمینان کا سانس لیا، پھر دل میں کہنے لگے۔ "اچھا ہی ہوا وہ نہ ملی، ورنہ اپنی جانب سے تو میں نے خطرہ مول لینے میں کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔

اب وہ ڈائری میں حرف ٹی کے ناموں کی سیر کر رہے تھے:

مس نورا ٹریک۔

عمر اٹھائیس برس۔ کیمڈن ٹاؤن کے چاکلیٹ فروش کی بیٹی۔ کاروبار میں باپ کا ہاتھ بٹاتی ہے۔

فربہ اندام، نک سک سے درست مگر ذرا ڈھل گئی ہے۔

"ہیلو، مہربانی کر کے ذرا مس نوراٹریک سے ملوا دیجئے؟ ارے یہ تم ہی ہو۔ کہو کیا حال ہے۔ میری آنکھوں کی پتلی، میری راحتِ جان، میں نے آواز تو پہچان لی تھی مگر ابھی ابھی ایک مغالطہ ایسا ہوا کہ مجھے محتاط ہونا پڑا۔۔ کیا کہا؟ تم خود مجھے ٹیلی فون کرنے کی سوچ رہی تھیں؟ سچ؟ پھر تو میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ کہاں ملاقات ہو؟ پکاڈلی ٹیوب اسٹیشن پر؟ وقتِ عالم کے نقشے کے سامنے؟ بالکل ٹھیک!..... ہاں ہاں ٹھیک چار بجے۔ اس وقت تین بج کر پینتیس منٹ ہوئے ہیں، بس میں بھی ٹہلتا ٹہلتا پندرہ بیس منٹ میں وہیں پہنچ جاؤں گا اور پھر ہم تم پروگرام بنائیں گے۔ واللہ سچ ہے دِل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ اوہ سویٹ ہارٹ تم اس مثل کو نہیں سمجھتیں، یہ خالص مشرقی مثل ہے، میں آج تمہیں اس کا مطلب سمجھاؤں گا۔ دیکھو بادل چھٹ گئے ہیں۔ پیارا پیارا سنہرا سورج پھر نکل آیا ہے۔ انتظار نہ کرانا .....اچھا خدا حافظ میری جان!"

اور مکرجی بابو نے وہیں ڈائری بند کر دی۔ پھر ایک لحہ بھی ضائع کیے بغیر وہ کرسی سے اُٹھے، کھونٹی سے ہیٹ، مفلر اور برساتی اٹھائی اور دفتر سے نکل پکاڈلی سرکس کو ہو لئے۔

ایک دردِ مند دِل

آرکسٹرا نے ناچ کی ایک نئی دُھن بجانی شروع کی اور ناچنے والے جن میں زیادہ تعداد لندن یونیورسٹی کے شعبہ السنہ شرقیہ وافریقیہ کے طلبا اور طالبات کی تھی، پھر مصروف رقص ہو گئے۔

ناچ کا یہ ہنگامہ لندن کی ایک بھیگی ہوئی سرد شام کو یونیورسٹی کی وسیع عمارت کے ایک کمرے میں برپا تھا۔ مجمع کچھ زیادہ بڑا تو نہیں تھا، پھر بھی دنیا کے چھ برّاعظموں میں سے کم از کم چار کی نئی پود کی نمائندگی کرتا تھا۔ یوں تو انگریزی زبان، لباس اور آداب مجلس نے سب کو ایک رنگ میں رنگ دیا تھا مگر رنگ، خدوخال، لب ولہجہ اور چال ڈھال کے اختلافات قدم قدم پر کبھی کھلے بندوں اور کبھی چھپکے سے ان کے غیر قوم ہونے کی غمازی کر دیتے تھے۔ بعض اوقات کسی زبان کے حروفِ تہجی کی محض ایک مخصوص صوت متکلم کی قومیت کا راز فاش کر دینے کے لیے کافی ہوتی تھی۔

فضل نے دوبارہ اسی سنہرے بالوں والی اجنبی لڑکی سے ناچنے کی درخواست کی جس کے ساتھ وہ ایک مرتبہ پہلے بھی ناچ چکا تھا۔ لڑکی نے اس کی درخواست کو کسی قدر تامل کے بعد منظور کر لیا اور وہ دونوں ناچنے والوں میں شامل ہو گئے۔

سنہرے بالوں والی لڑکی کا تامل کچھ رنگ اور قومیت کی تفریق کی بنا پر نہ تھا کیونکہ

اوّل تو یونیورسٹی کی تقریبات میں یہ چیز لندن کی عام مجلسی زندگی کی نسبت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ دوسرے ایسی پارٹیوں میں جو تعلیم کی ایک مقررہ معیاد ختم ہونے پر دی جاتی ہیں اور جن میں لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے سے بچھڑنے کے خیال سے جذباتی سے ہو کے کچھ زیادہ ہی اپنایت جتلانے لگتے ہیں۔ اس کا امکان اور بھی کم رہ جاتا ہے۔ دراصل اس کے تأمل کی وجہ یہ تھی کہ وہ فضل کے ساتھ رقص کر کے اس کی مہارت فن دیکھ چکی تھی اور وہ خود کو اس کے مقابلے میں کتریاتی تھی۔

ناچ کے چکر ایک دو تین، ایک دو تین کی تال پر مزے مزے چل رہے تھے .... سازندے کچھ زیادہ سُریلے نہ تھے اور طلباء سے امید بھی نہ ہو سکتی تھی کہ وہ لندن کے کسی چوٹی کے آرکسٹرا کا انتظام کریں گے۔ پھر بھی یہ لوگ نغمگی پیدا کرنے کے لیے جی توڑ کوشش کر رہے تھے۔ اُن کے چہروں کی سُرخی و بشاشت اور چشم واَبرو کی جنبشیں کہے دیتی تھیں کہ وہ طلبا کو مایوس نہیں کریں گے۔

اس سنہرے بالوں والی لڑکی نے فضل کے ساتھ رقص کرتے ہوئے بالآخر خود ہی خاموشی کو توڑا:

"آپ تو بہت اچھا ناچتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے فن کا ساتھ نہیں دے رہی۔"

"کسرِ نفسی سے کام نہ لیجئے۔" فضل نے کہا۔ "آپ بھی بہت اچھا ناچتی ہیں، یہ اور بات ہے کہ آپ کے پاس ڈپلومہ نہ ہو۔" اور یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔

"تو کیا آپ کے پاس ڈپلوما ہے؟" لڑکی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"جی ہاں اور کیا۔ باقاعدہ امتحان پاس کر کے سند حاصل کی ہے۔" اور وہ پھر مسکرایا۔

"مگر یہ سودا خاصہ مہنگا پڑا۔ ایک گنی کے تین سبق، مہینوں یہ سلسلہ جاری رہا۔"

"تو کیا اپنے ملک سے آپ یہی کام سیکھنے آئے تھے؟" لڑکی نے کسی قدر طعن کے

ساتھ پوچھا۔

"جی نہیں۔" وہ بدستور مسکراتا رہا۔ "میں قانون پڑھتا ہوں۔ ناچ تو مجھے مجبوراً سیکھنا پڑا۔"

"کیا میں پوچھ سکتی ہوں وہ کیا مجبوری تھی؟"

"جی ہاں۔ وہ بات یوں ہے کہ پچھلی گرمیوں کی تعطیلات میں میرا ارادہ یورپ کی سیاحت کا ہوا مگر افسوس والد میری رائے سے متفق نہ ہو سکے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں لندن ہی میں رہ کے زیادہ سے زیادہ وقت پڑھنے لکھنے میں صَرف کردوں، چنانچہ مجھے یہیں اپنے لیے دلچسپی کا سامان پیدا کرنا پڑا۔"

"مگر معاف کیجیے، وہ ڈپلومے کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"یہ بات خاصی مذاق معلوم ہوتی ہے اور شروع شروع میں خود بھی اسے مذاق ہی تصور کرتا رہا۔ ہوا یہ .... مگر دیکھیے یہ بات ذرا تفصیل کی محتاج ہے اور ناچ ختم ہوا چاہتا ہے۔ اگر آپ کو دلچسپی ہو تو ناچ کے بعد چند لمحوں کے لیے میری میز پر آجایئے گا۔ میں اکیلا ہی ہوں۔ میں آپ کو بتاؤں گا۔"

ناچ ختم ہوا مگر سنہرے بالوں والی لڑکی فضل کی میز کی طرف نہ گئی بلکہ ایک ٹولی میں، جو چھ سات یورپین اور ایشیائی لڑکوں اور لڑکیوں پر مشتمل تھی شامل ہو گئی۔

فضل اکیلا ہی کونے میں اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا کر پینے لگا۔

آرکسٹرا نے کئی اور دُھنیں بجائیں، مگر وہ اپنی کرسی سے نہ اٹھا۔ اس دوران میں وہ لڑکی اپنی ٹولی کے نوجوانوں کے ساتھ دو تین مرتبہ ناچی۔ اس کا آخری ناچ ایک ناٹے قد کے بھاری بھرکم چینی نوجوان کے ساتھ تھا۔ فضل دُور سے اس کا یہ ناچ بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ ناچ ختم ہونے پر اچانک اس نے فضل کی میز کا رُخ کیا اور مسکراتی ہوئی اس کے قریب آکر کہنے لگی:

"لیجیے میں چند منٹ کے لیے اپنے دوستوں سے اجازت لے کر آ گئی ہوں، آپ جلدی سے اپنا قصہ بیان کر دیجیے۔"

"بہت بہت شکریہ۔" فضل نے کہا۔ "ابھی عرض کرتا ہوں لیکن پہلے یہ پوچھنے کی اجازت دیجیے کہ آپ یہاں کس شعبے سے تعلق رکھتی ہیں؟"

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔" وہ فوراً بول اٹھی۔ "میں اسٹوڈنٹ نہیں ہوں۔ میں تو ایک لائبریری میں کام کرتی ہوں، البتہ میری ایک سہیلی یہاں ملائی زبان کی اسٹوڈنٹ ہے اور وہی مجھے یہاں لائی ہے...... آپ بھی تو یہاں نہیں پڑھتے؟"

"جی نہیں" وہ مسکرایا۔ "آپ ہی کی طرح میں بھی یہاں مہمان ہوں۔ فرق یہ ہے کہ میرے دوست کو ناچ گانے سے دلچسپی نہیں۔ اسے مجبوراً اس تقریب کا ٹکٹ خریدنا پڑا۔ جو اس نے مجھے دے دیا۔"

لمحہ بھر خاموشی رہی۔

"میں آپ کو زیادہ دیر روکنا نہیں چاہتا۔" فضل نے کہا۔ "لہٰذا ڈپلومے کی بات عرض کرتا ہوں۔ وہ بات دراصل کچھ بھی نہیں۔ میں ایک پرائیوٹ ڈانسنگ اسکول میں جایا کرتا تھا۔ دو تین مہینے میں جب میرا جی بھر گیا تو میں نے اس سلسلے کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر اسکول کی معلمہ جو سویڈن کی رہنے والی ایک اَدھیڑ عمر عورت تھی، مجھ سے کہنے لگی، تم میں اس فن کے لیے قدرتی صلاحیت ہے، جو بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے، پھر تم نے خاصی فنی استعداد بھی پیدا کر لی ہے، اب اگر تم صرف چند ہفتے اور مشق کر لو تو تمہیں اس فن میں باقاعدہ ڈپلومہ مل سکتا ہے۔"

میں یہ سُن کر بے اختیار مسکرایا۔ مگر اس نے اپنی متانت برقرار رکھی۔

"آخر اس کا فائدہ بھی کیا ہے۔"

"اور نقصان بھی کیا ہے؟" اس نے کہا۔

آخر میں رضامند ہو گیا۔ اس خاتون نے مجھے ناچ کے کچھ خاص خاص پیشہ ورانہ گر بتلائے۔ چار پانچ ہفتہ بعد میرا امتحان ہوا اور سچ مچ مجھے ڈپلوما مل گیا.....“

اور یوں فضل اور روزمری کی دوستی کی ابتداء ہوئی۔ شروع شروع میں وہ ہفتہ میں ایک آدھ مرتبہ ملتے مگر جلد ہی تین تین چار چار مرتبہ ملنے لگے۔ وہ کبھی کسی ٹیوب اسٹیشن کے باہر ملاقات کی ٹھہراتے کبھی ہائیڈپارک میں، کبھی سرپنٹائن کے کنارے، کبھی البرٹ ہال کے سامنے، دو چار ہی ملاقاتوں میں ویلز کی رہنے والی اس لڑکی کو اندازہ ہو گیا کہ فضل کی زندہ دلی، خوش کلامی، مہارتِ رقص اور خوش وضعی محض اوپری صفات ہیں، ورنہ درحقیقت وہ ایک ذہین، سنجیدہ طبع اور صالح نوجوان ہے جو اپنے اندر ایک دردمند دل رکھتا ہے۔ وہ چاہتا تو آسانی سے لندن کے عیش پسند اور نشاط طلب حلقوں کی آنکھ کا تارہ بن سکتا تھا، مگر اس کی اسے کوئی تمنا نہ تھی، وہ طبعاً کم آمیز خلوت پسند تھا۔ روزمری کو یہ معلوم کر کے بڑی حیرت ہوئی کہ فضل کا حلقۂ احباب بہت محدود ہے۔

رفتہ رفتہ روزمری نے اس کے دل کی گہرائیوں میں اترنا شروع کیا۔ اسے معلوم ہوا کہ فضل کو قانون سے جس کی تکمیل کے لیے اس کے والدین نے اسے ولایت بھیجا تھا، کوئی رغبت نہیں تھی۔ اس نے خود ہی یہ نتیجہ نکالا کہ شروع شروع میں فضل کا سیاحتِ یورپ کے منصوبے بنانا اور ان میں ناکامی پر رقص کی طرف رجوع کرنا قانون کی تعلیم سے فرار ہی کی ایک صورت تھا۔

پھر اس نے یہ بھی دیکھا کہ وہ اپنے دل میں اپنے وطن کی خدمت کا، جو حال ہی میں غلامی سے آزاد ہوا تھا، شدید جذبہ رکھتا ہے۔ وہ ان سر پھرے نوجوانوں میں سے نہیں تھا جو غیر ممالک میں جا کر خدمت وطن کے لیے عجیب و غریب ہیولے بناتے ہیں .. جنہیں عملی جامہ پہنانا مشکل ہوتا ہے۔ وہ کوئی سیدھا سادا مگر ٹھوس کام کرنا چاہتا تھا۔

”روزی۔“ وہ کہتا۔ ”قانون بے شک ملک کی خدمت کا ایک ذریعہ ہے لیکن ذرا غور

تو کرو مجھے اس کے لئے کتنے عرصے انتظار کرنا ہوگا۔ اگر میں دن رات ایک کر کے ہر سال امتحانات میں کامیابی حاصل کرتا رہوں تو بھی مجھے تین چار برس اور یہاں گذارنے ہوں گے، اور پھر امتحان پاس کر لینا ہی تو کامیابی نہیں ہے۔ اس کے بعد بھی سالہا سال محنت اور دوڑ دھوپ کی ضرورت ہے، تب کہیں رفتہ رفتہ ناموری حاصل ہوتی ہے۔"

"تم اپنے والد کو صاف صاف کیوں نہیں لکھ دیتے؟" روزمری نے ایک دن پوچھا۔

"کچھ فائدہ نہیں۔" فضل نے کہا۔ "وہ بہت پرانے خیال کے آدمی ہیں جو اولاد کو اپنی مرضی سے ہانکنا چاہتے ہیں۔ یہ نہ سمجھو کہ وہ حصولِ زر کے لیے مجھے قانون پڑھانا چاہتے ہیں کیونکہ اُن کے پاس پہلے ہی دولت کی فراوانی ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ کسی نے ان کے دل میں یہ بات ڈال دی ہے کہ قانون کا سیاست سے گہرا تعلق ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کا خاندان دولت کے ساتھ ساتھ سیاسی اقتدار بھی حاصل کر لے۔"

ایک دن صبح کو روزمری اس کے کمرے میں آئی تو دیکھا کہ وہ بڑے انہماک سے کچھ اخباروں کے مطالعہ میں مصروف ہے۔ یہ اخبار اس کے وطن سے آج ہی موصول ہوئے تھے۔ روزمری کو دیکھتے ہی وہ اچھل پڑا اور بڑے جوش و خروش سے کہنے لگا:

"روزی جب میرے ملک کو آزادی ملی تو میں وہیں تھا۔ میں تمہیں کیا بتاؤں کہ قومی ایثار و قربانی کا کتنا عظیم طوفان تھا جو میرے اہلِ وطن کے دلوں میں اُمنڈ رہا تھا۔ عورتیں اور مرد، بوڑھے اور بچے خدمتِ وطن کی اس نئی لگن سے بے چین ہیں۔ کالجوں کے طلباً اپنی تعلیم کے بعد بیلچوں سے نہریں کھودتے، پُل بناتے، مہاجروں کے لیے جھونپڑیاں تیار کرتے، تعطیل کے دنوں میں استادوں اور طالب علموں کی ٹولیاں دیہات کا گشت کرتیں تاکہ دیہاتیوں میں جنھیں ان کے پچھلے حکمرانوں نے مصلحتاً جاہل اور اَن پڑھ رکھا تھا تعلیم اور حفظانِ صحت کا پرچار کریں۔"

"غلامی اور پسماندگی کے طویل زمانے کے باوجود میرے اہلِ وطن نے دنیا پر ثابت

کردیا تھا کہ وہ ذہانت، فراست، شجاعت، علم و فن، کسی بھی لحاظ سے **اقوام ِ عالم** سے پیچھے نہیں ہیں۔ میرے ملک کی عورتوں نے اپنے چہروں سے نقاب اٹھا دیئے۔ قدامت پسندوں نے مخالفت کی مگر وہ جرأت کے ساتھ اپنی چار دیواری سے باہر نکل آئیں اور للکاریں: دشمن سے جنگ پر زخمیوں کی مرہم پٹی کون کرے گا؟"

"تمہیں خبر ہے روزی میرے اہلِ وطن خوشی خوشی اپنے نورچشموں کو ہوابازی کے مدرسوں میں بھیج رہے ہیں۔ انہیں اس کی پروا نہیں ہے کہ یہ بڑے جان جوکھوں کا کام ہے آزادی کے بعد میں نے اپنی فوج کو پہلی مرتبہ دیکھا۔ وہ جوانانِ رعنا سینہ تانے بندوقیں اُٹھائے اونچی بنےمادرِ وطن کے گیت گاتے جارہے تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مدت کی غلامی کے بعد پہلی مرتبہ مجھے اُحساس ہوا کہ ان کی قربانیوں کو غیر کی دولت نہیں خرید سکے گی۔"

"میں نے دیکھا کہ تمام انسان یکایک ایک دوسرے کے کیسے ہمدرد بن گئے ہیں، غلامی کے زمانے میں، میں پولیس والوں کو ہمیشہ بڑی حقارت کی نظر سے دیکھا کرتا تھا۔ رشوت خور، سفاک، بدزبان، اکھڑ، لیکن روزمری، اب میرا دل چاہا کہ بے اختیار ان سے لپٹ جاؤں۔ ان سے پیار کروں کیونکہ وہ میرے وطن کے امن کے محافظ ہیں۔"

"روزمری تم اندازہ کرسکتی ہو کہ آج کل میرے دل کی کیا کیفیت ہے، اور اگر مجھے تمہاری رفاقت اور ہمدردی نصیب نہ ہوتی تو میں یقیناً کسی شدید مرض میں مبتلا ہو گیا ہوتا۔"

روزمری ایک حیرت کے عالم میں فضل کی یہ بے ربط سی تقریر سن رہی تھی، فضل کی کیفیت یہ تھی جیسے کوئی بخار میں بہک رہا ہو مگر روزمری کو اس کا ایک ایک لفظ انتہائی خلوص میں ڈوبا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے اس نے مادرِ وطن کی خدمت کا اس قدر شدید جذبہ کسی شخص میں نہیں دیکھا تھا۔ اس کے ماں باپ بھائی بہن سب آسودہ حال تھے اور ویلز میں امن و عافیت کی زندگی گزار رہے تھے مگر اس کا مزاج ان سب سے مختلف تھا۔ وہ طبعاً بڑی

حساس، نیک دل اور غم گسار لڑکی تھی۔ عالمگیر اخوت پر ایمان رکھنے والی۔ وہ چاہتی تھی کہ دنیا میں اس کا وجود کسی مقصد کے لیے کار آمد ثابت ہو۔ یہی جذبہ اسے وطن سے جدا کر کے لندن لایا تھا مگر یہاں ابھی تک اسے تمنا کے پورا ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے وطن کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور وہ ان لاکھوں لڑکیوں میں سے ایک ہے جو ہر روز صبح شام لندن کی سڑکوں پر تیز تیز چلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ اس کے سنہرے بالوں کی ایک لٹ اس کی پیشانی پر آپڑی مگر وہ بدستور سوچ میں ڈوبی رہی۔

"فضل ... فضل ....." اس نے رک رک کے کہا۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تمہارے وطن کے کسی کام آسکتی ہوں؟"

فضل یہ سن کے پہلے تو بھونچکا رہ گیا، پھر ایک دَم اچھل پڑا اور بے اختیار روزمری سے لپٹ کر اس طرح ناچنے لگا جیسے بچے ناچتے ہیں۔

اگلے روز اس نے اپنے باپ کے نام سے اس مضمون کا ایک تار بھیجا:

"میں اب ایک لمحہ بھی قانون پر ضائع نہیں کرنا چاہتا، میں واپس آرہا ہوں نیز میں نے شادی بھی کرلی ہے۔"

جس وقت جہاز وطن پہنچا تو فضل کو دیکھ کے بڑی مایوسی ہوئی کہ اس کے اقربا میں سے کوئی بھی اس کے استقبال کے لیے بندرگاہ پر نہیں آیا تھا۔ ہاں ایک پرانا نوکر جس نے فضل کو گودیوں میں کھلایا تھا موجود تھا، اپنے آقازادے کو دیکھ کے وہ رو پڑا اور ایک خط نکال کے اسے دیا۔ اس کے والد نے لکھا تھا:

"برخوردار گھر کا رخ نہ کرنا۔ مجھ سے اب تمہیں کچھ واسطہ نہیں رہا۔"

وہ والد کی طرف سے اسی قسم کے سلوک کی توقع کر رہا تھا لیکن یہ امید نہ تھی کہ سارے کے سارے رشتہ دار اس سے برگشتہ ہو جائیں گے۔ روزمری صورتحال کو بھانپ

گئی۔اس نے محبت سے فضل کا ہاتھ دبایا اور کہا:

"فکر نہ کرو۔ تمہارے ساتھ میں بھی نوکری کروں گی۔"

فضل نے اس کے سنہرے بالوں کی ایک لٹ ہاتھ میں لی، اسے جھنجھوڑا اور مسکرادیا۔

اس کے والد نے شروع ہی میں اس کی تعلیم اور دوسرے اخراجات کے لیے ایک گرانقدر رقم لندن کے ایک بینک میں اس کے نام جمع کرادی تھی۔اس میں سے دونوں کے جہاز کے کرائے کے علاوہ وطن پہنچ کے بھی دو ایک ماہ تک ان کے کھانے پینے اور رہنے سہنے کا خرچ نکل سکتا تھا۔ وہ روزمری کے ساتھ درمیانے درجے کے ایک انگریزی ہوٹل میں مقیم ہوگیا۔

دو چار دن میں جب سفر کی تکان اتر گئی تو اس نے ملک کے حالات کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ہر چند ملک رفتہ رفتہ ترقی کر رہا تھا مگر نہ معلوم کیا وجہ تھی کہ لوگوں میں پہلا سا جوش و خروش نظر نہیں آتا تھا۔اخبارات میں طالب علموں کے نہریں کھودنے اور پل بنانے کی خبریں بھی نہیں آرہی تھیں، البتہ مہاجرین کا مسئلہ روز بروز سخت مشکلات پیدا کرتا جارہا تھا جنہیں حل کرنے کی حکومت مقدور بھر کوشش کر رہی تھی۔

اگلے روز اس نے سرکاری دفاتر کے چکر لگانے شروع کیے۔ اسے بعض افسروں کے نام شناسا معلوم ہوئے، اور ایک نوجوان افسر تو اس کے کالج کے زمانے کا دوست نکل آیا۔ وہ فضل سے بڑی گرمجوشی سے ملا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد فضل نے اصل مقصد چھیڑا۔

"کیا سرکار مجھے کوئی کام دے سکتی ہے؟" اس نے پوچھا۔

دوست نے فوراً جواب دیا۔

"گورنمنٹ کی اونچی جگہیں تو تم جانتے ہی ہو گے مشتہر کی جاتی ہیں اور بڑی چھان بین کے بعد پبلک سروس کمیشن کے ذریعہ پُر کی جاتی ہیں۔ رہے کلرک تو ان کی پہلے ہی افراط ہے۔ کئی عارضی محکمے اس وجہ سے ابھی تک توڑے نہ جاسکے کہ ان کے کارکنوں کا کیا حشر

ہوگا۔ البتہ پرائیویٹ فرموں میں آئے دن اچھی اچھی جگہیں نکلتی رہتی ہیں۔"

فضل نے ہوٹل میں آ کر اخبارات میں "ضرورت" کے کالموں کا بغور مطالعہ کیا، منیجر اسسٹنٹ، سیلز مین، اکاؤنٹنٹ، ٹائپسٹ، بیسیوں ہی اسامیوں کے اشتہار تھے لیکن بدقسمتی سے وہ ان میں سے کسی کا بھی تجربہ نہیں رکھتا تھا۔ لڑکوں کے پڑھانے کے دو ایک اشتہار تھے۔ یہ کام البتہ وہ کر سکتا تھا کیونکہ اس نے کالج میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اس نے ان اسامیوں کے لیے درخواستیں بھیجیں جن میں اپنے کم سے کم اخراجات کا اندازہ کر کے تنخواہ لکھی مگر اسے رسید تک نہ ملی۔

ایک پرائیویٹ فرم میں انٹرویو کے لیے گیا اور خط و کتابت کا کام کرنے کا ایک حقیر سا مشاہرہ منظور کر لیا مگر چند ہی روز میں اس فرم نے اسے جواب دے دیا، انہیں عالم فاضل نہیں چاہیے تھا بلکہ ایسا تجربہ کار جو منڈیوں کے اتار چڑھاؤ سے واقف ہو اور زیادہ سے زیادہ نفع اندوزی کے گر جانتا ہو، البتہ اگر وہ ٹائپ کا کام جانتا ہوتا تو کہیں نہ کہیں کھپ سکتا تھا، مختلف اسکولوں میں قسمت آزمائی کی لیکن کم سے کم تنخواہ پر بھی کوئی اسے لینے کو تیار نہ تھا کیونکہ وہ معلمی کی کوئی سند یا تجربہ نہیں رکھتا تھا اخباروں کے لیے مضامین لکھے مگر انہیں بلا معاوضہ بھی کسی نے قبول نہ کیا۔

اسے وطن آئے ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ اس کے پاس جو جمع پونجی تھی اس کا ایک بڑا حصہ ہوٹل کے کرائے اور کھانے پینے کے بلوں کی نذر ہو چکا تھا اور وہ دن دور نہیں تھا جب اسے اپنی اور بیوی کی طلائی گھڑیوں، بروچ، کیمرے، چاندی کے سگریٹ کیس وغیرہ کے گاہکوں کی ٹوہ لگانی پڑے۔

ایک دن وہ علی الصباح اپنے کمرے سے نکل گیا، دوپہر ہو گئی مگر وہ کھانا کھانے نہ آیا اور روز مری نے اس کے انتظار میں خود بھی کھانا نہ کھایا۔ جب وہ چائے کے وقت بھی نہ پہنچا تو اس کی بیوی کو تشویش ہوئی اور اس نے ہوٹل کے منیجر اور ملازموں سے پوچھ گچھ شروع

کی مگر کسی نے اس بارے میں کوئی اطلاع بہم نہ پہنچائی۔

آخر شام کے چھ بجے کے قریب وہ لوٹا۔ مگر روز کی طرح مضمحل اور تھکا ہارا نہیں بلکہ اچھلتا کودتا ہنستا کھلکھلاتا۔

"پیاری روزمری۔" اس نے کہا۔ "معاف کرنا تمہیں انتظار کی زحمت ہوئی مگر یہ جان کر تمہیں خوشی ہوگی کہ آخرکار، کام بن گیا۔ میں تمہیں بتاؤں گا نہیں بلکہ تمہیں ابھی میرے ساتھ چل کر اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنا ہوگا۔ میں نے آج ہی سارے انتظامات مکمل کر لیے ہیں۔"

اس نے ٹیکسی لی اور روزمری کو لے کر شہر کے ایک ایسے حصہ میں پہنچا جو تھا تو بارونق مگر آبادی زیادہ گنجان نہ تھی، مکانوں کی بالائی منزلوں میں متوسط طبقے کے لوگ رہتے تھے اور نچلے حصوں میں غریب غرباء۔ ایک بازار کے نکڑ پر کھڑے ہو کر اس نے روزمری سے کہا:

"ذرا اوپر دیکھو!"

وہ ایک سہ منزلہ عمارت کے سامنے کھڑے تھے جس کی اوپر کی منزلیں خاصی صاف ستھری تھیں البتہ نچلا حصہ، رہنے والوں نے اپنے پھوہڑپن سے خراب کر دیا تھا اور پچھلی دیوار میں پڑوس کی کسی گوالن نے اُپلے بھی تھوپ رکھے تھے۔ بالائی منزل کی پیشانی پر ایک بڑا سا نیا بورڈ آویزاں تھا جس کا روغن ابھی پورے طور پر سوکھنے نہیں پایا تھا۔ اس بورڈ پر جلی حروف میں لکھا تھا:

لندن اسکول

آف

بال روم ڈانسنگ

روز مری فی الفور سمجھ گئی اور اس کا چہرہ یک لخت زرد پڑ گیا۔ مگر کچھ تو جھٹپٹے کی وجہ سے اور کچھ اپنی کامیابی کے نشے میں چُور رہونے کے باعث فضل اس کے چہرے کے تغیر کو نہ دیکھ سکا۔

"آخر فنونِ لطیفہ کی خدمت بھی تو قوی خدمت ہی ہے نا!" اس نے کہا:

دو تماشے

مرزا برجیس قدر کو میں ایک عرصے سے جانتا تھا۔ ہر چند ہماری طبیعتوں اور ہماری سماجی حیثیتوں میں بڑا فرق تھا، پھر بھی ہم دونوں دوست تھے۔ مرزا کا تعلق ایک ایسے گھرانے سے تھا جو کسی زمانے میں بہت معزز اور متمول سمجھا جاتا تھا، مگر اب اس کی حالت اس پرانے تناور درخت کی سی ہوگئی تھی جو اندر ہی اندر کھوکھلا ہوتا چلا جاتا ہے اور آخر ایک دن اچانک زمین پر آرہتا ہے۔

مرزا کو اپنے خاندان کے اس زوال کا پورا احساس تھا مگر اس کو روکنا اس کے بس کی بات نہ تھی البتہ جہاں تک ظاہری رکھ رکھاؤ کا تعلق تھا، مرزا اس میں ذرا سی کوتاہی بھی نہ ہونے دیتا تھا۔ اس کے دل میں نہ جانے کیوں یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ خاندان کا وقار قائم رکھنے کے لیے درشت مزاجی اور تحکم لازمی ہیں۔ اس خیال نے اسے سخت دل بنادیا تھا، مگر یہ درشتی اور سختی اوپر ہی اوپر تھی، اندر سے مرزا بڑا نرم تھا اور یہی ہماری دوستی کی بنا تھی۔

ایک دن سہ پہر کو میں اور مرزا برجیس قدر انارکلی میں اس کی شاندار موٹر میں بیٹھے ایک مشہور جوتے والے کی دکان سے سلیم شاہی جوتا خرید رہے تھے۔ مرزا نے اپنا ٹھاٹھ دکھانے کے لیے یہ ضروری سمجھا تھا کہ وہ موٹر میں بیٹھے بیٹھے دکان کے مالک کو پکارے اور جوتے اپنی موٹر میں ہی ملاحظہ کرے۔ شہر میں ابھی مرزا کی ساکھ قائم تھی، اور دکان دار عام

طور پر اس کی ان اداؤں کو سہنے کے عادی تھے، چنانچہ جوتے والے نے اپنے دو کارندے مرزا کی خدمت پر مامور کر دیے۔

مگر مرزا کو کوئی جوتا پسند نہیں آ رہا تھا اور وہ بار بار ناک بھوں چڑھا کر ان کارندوں کو سخت وسست کہہ رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مرزا کو دراصل جوتے کی ضرورت ہی نہیں، اور یہ جھوٹ موٹ کی خریداری محض بھرم رکھنے کے لیے ہے۔

عین اس وقت ایک بڈھا بھکاری ایک پانچ سالہ لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھے مرزا کی موٹر کے پاس آ کھڑا ہوا۔ یہ بڈھا اندھا تھا۔ لڑکی کے بالوں میں تنکے الجھے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا مدت سے کنگھی نہیں کی گئی۔ دونوں کے تن پر چیتھڑے لگے تھے۔

"اندھے پر ترس کھاؤ رے بابا!" بڈھے نے ہانک لگائی۔

"بابو جی بھوکی ہوں پیسہ دو۔" لڑکی نے لجاجت سے کہا۔

مرزا نے ان لوگوں کی طرف توجہ نہ کی وہ بدستور جوتوں پر تنقید کرتا رہا۔ اندھے فقیر اور لڑکی نے اپنا سوال دہرایا۔ اس پر مرزا نے ایک غلط انداز نگاہ اُن پر ڈالی، اور کہا:

"معاف کرو۔ معاف کرو۔"

بھکاری اب بھی نہ ٹلے۔

"بابو جی رات سے کچھ نہیں کھایا ہے۔" اندھے نے کہا۔

"بابو جی بڑی بھوک لگ رہی ہے۔ پیٹ میں کچھ نہیں ہے۔ لو دیکھو۔"

بچی نے کہا اور جھٹ میلا کچیلا کرتا اٹھا اپنا پیٹ دکھانے لگی۔ لاغری سے بچی کی پسلیاں باہر نکلی ہوئی تھیں اور گنی جا سکتی تھیں۔ "بس ایک پیسے کے چنے بابو جی۔"

مرزا کو اس لڑکی کا میلا میلا پیٹ دیکھ کر گھن سی آئی۔

"توبہ توبہ!" اس نے بیزاری کے لہجہ میں کہا۔ "بھیک مانگنے کے لیے کیا کیا ڈھونگ رچائے جاتے ہیں۔ جاؤ جاؤ بابا خدا کے لیے معاف کرو۔"

مگر فقیر اب بھی نہ گئے۔ قریب تھا کہ مرزا غصّے سے پھٹا جاتا۔ مگر یہ تماشہ اس طرح ختم ہو گیا کہ مرزا کو اس دکاندار کا کوئی جوتا پسند نہ آیا، اور وہ اپنی موٹر کو وہاں سے بڑھا لے گیا۔

اس واقعہ کے چند روز بعد میں اور مرزا برجیس قدر شہر کے ایک بڑے سینما میں ایک دیسی فلم دیکھ رہے تھے۔ فلم بہت گھٹیا تھی۔ اس میں بڑے نقص تھے مگر ہیروئن میں بڑی چنک منک تھی اور وہ گاتی بھی خوب تھی۔ اس نے فلم کے بہت سے عیوب پر پردہ ڈال دیا تھا۔ کہانی بڑی دقیانوسی تھی۔ اس میں ایک واقعہ یہ بھی تھا کہ بنک کے ایک چپراسی کو اس الزام میں کہ اس نے بنک لوٹنے میں چوروں کی مدد کی، پانچ سال قید کی سزا ہو جاتی ہے۔ اس چپراسی کی بیوی مر چکی ہے مگر اس کا ایک چار سالہ بیٹا تھا جو اپنی بوڑھی دادی کے پاس رہتا ہے۔ چپراسی کے قید ہو جانے پر دادی پوتا بھوکوں مرنے لگتے ہیں۔ ادھر کوٹھڑی کا کرایہ نہ ملنے پر مالکِ مکان انہیں گھر سے نکال دیتا ہے۔ بڑھیا پوتے کا ہاتھ پکڑ بازار میں بھیک مانگنے لگتی ہے، وہ ہر راہ گیر سے کہتی ہے:

"بابوجی ہم بھوکے ہیں۔"

"ایک پیسے کے چنے لے دو بابو جی۔" لڑکا کہتا۔

جب فلم اس مقام پر پہنچی تو مرزا برجیس نے اندھیرے میں مجھ سے کہا:

"بھیا ذرا اپنا رومال تو دینا۔ نہ جانے میرا کہاں گیا۔

میں نے اپنا رومال دے دیا۔

جب تک تماشہ ہوتا رہا، میں نے مرزا کو سخت بے چین دیکھا۔ وہ بار بار کرسی پر پہلو بدلتا اور ہاتھ چہرے تک لے جاتا۔ خدا خدا کر کے فلم ختم ہوئی تو میں نے دیکھا کہ وہ جلدی جلدی اپنی آنکھیں پونچھ رہا ہے۔

"ایں! مرزا صاحب۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "آپ رو رہے تھے؟"

"نہیں تو۔" مرزا نے بھرائی ہوئی آواز میں جھوٹ بولتے ہوئے کہا:

"سگریٹ کے دھوئیں سے آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا۔ ارے بھئی میں یہ سوچ رہا ہوں کہ سرکار ایسے دردناک فلم دکھانے کی اجازت کیوں دیتی ہے۔"

غازی مرد

رات کو جب کبھی کتوں کے بھونکنے یا مرغ کی بے وقت اذان سے چراغ بی بی کی نیند اُچٹ جاتی تو وہ دبے پاؤں اپنی کوٹھڑی سے نکلتی اور راہ ٹٹولتی ہوئی باہر آنگن میں اپنے شوہر کی چارپائی پر آ کر آہستہ سے بیٹھ جاتی اور اس کے پاؤں دابنا شروع کر دیتی اور پھر جب تک اسے دوبارہ نیند کے جھونکے نہ آنے لگتے، وہ برابر دابتی رہتی۔

علیا اس کے ہاتھوں کے گرم گرم لمس کا ایسا عادی ہو گیا تھا کہ اس سے اس کی نیند میں ذرا خلل نہ پڑتا بلکہ ایسا آرام ملتا کہ وہ اور بے خبر ہو کر سوتا رہتا۔ اگر کبھی وہ جاگ بھی رہا ہوتا تو چادر کے نیچے دَم سادھے پڑا رہتا۔ یہ چادر دراصل اس کا تہ بند تھی، جسے وہ مچھروں سے بچنے کے لیے رات کو اوڑھ لیا کرتا تھا مگر اس سے اس کا پورا جسم نہیں ڈھکتا تھا، اگر سر چھپاتا تو پاؤں ننگے رہتے۔

صبح کو جب علیا بیدار ہوتا تو چراغ بی بی اس سے پہلے جاگی ہوتی اور آنگن میں وضو کرنے یا کوٹھڑی میں نماز پڑھنے میں مشغول ہوتی، وہ نماز کے الفاظ اس طرح ادا کرتی جیسے کوئی سرگوشی کر رہا ہو۔ خاص طور پر آخر کے دعائیہ فقرے علیا کو صاف سنائی دیا کرتے:

"یا پاک پروردگار! اپنے حبیب کے صدقے میں اس اندھی محتاج کے سر کے سائیں کو ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھ۔ یا پاک پروردگار اپنے حبیب کے صدقے اس کے سب دشمنوں کو

نیچا دکھا۔ یا پاک پروردگار اپنے حبیب کے صدقے اسے ہر بلا سے بچا۔ یا پاک پروردگار میری دعا قبول کر۔ پہلے میں مروں، بعد میں وہ مرے۔ آمین۔"

علیا چارپائی سے اٹھتا۔ چادر کو جھاڑ پٹک کر کمر پر باندھ لیتا۔ چادر کا پھٹا کا سُن کر چراغ بی بی جلدی سے کوٹھڑی سے نکلتی اور بڑی لجاجت سے پوچھتی:

"مجھے بلایا ہے جی؟"

بعض دفعہ علیا حاضر بھی ہوتا تو وہ اسے غائب تصور کر کے آپ ہی آپ بولتی رہتی۔

"مجھ عیبوں بھری کو گلے سے لگایا۔ اس کا اجر اللہ اور اس کا حبیب اس کو دے گا۔ میں اندھی محتاج کس لائق ہوں۔ میں اس کا بدلہ کیا دے سکتی ہوں۔ میں تو آگ بھی نہیں جلا سکتی۔ روٹی بھی نہیں پکا سکتی۔ کپڑا بھی نہیں سی سکتی۔ کوئی گھر کا یا باہر کا کام نہیں کر سکتی۔ ہاں ایک پاؤں دابنا ہے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟"

چراغ بی بی گاؤں کی مسجد کے بوڑھے امام کی بیٹی تھی جس کی ماں بچپن ہی میں مر گئی تھی۔ مولوی صاحب خود تو بینا تھے مگر بیٹی کی آنکھیں چیچک میں جاتی رہی تھیں مولوی صاحب نے بن ماں کی بیٹی کو بڑی مصیبتوں سے پالا تھا۔ گاؤں کے سب چھوٹے بڑے ان کی عزت کرتے تھے۔ گاؤں کے سب نوجوان بلکہ ان کے باپ بھی مولوی صاحب سے کم از کم بغدادی قاعدہ ضرور پڑھ چکے تھے۔ جب امام صاحب کا آخری وقت آیا تو انہوں نے گاؤں کے بڑے بوڑھوں کو بلوایا اور ان سے بڑی عاجزی سے کہا:

میں اپنے پیچھے ایک یتیم بچی چھوڑے جا رہا ہوں۔ وہ کبھی کی بیاہنے کے لائق ہو چکی ہے۔ مگر ابھی تک اس کا بیاہ نہیں ہوا، اگر میرے پیچھے وہ یونہی رہی تو میری روح ہمیشہ تڑپتی رہے گی۔ میں نے عمر بھر آپ لوگوں کی جو بری بھلی خدمت کی ہے اس کے بدلے میں اگر میری بیٹی کو کہیں ٹھکانے لگا دیا جائے تو اس سے میری روح ہی خوش نہیں ہو گی بلکہ آپ لوگوں کو بھی اس کا اجر ملے گا، اس دنیا میں بھی، آخرت میں بھی۔"

اور مولوی صاحب چل بسے۔ ان کی تجہیز و تکفین کے بعد گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے یہ مسئلہ پنچایت میں پیش کیا اور خاص طور پر نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"ہے کوئی تم میں سے وہ غازی مرد، جو خدا ترسی کرے اور امام صاحب کے احسان کا بدلہ اتارے۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ آخر ایک نوجوان کی غیرت جوش میں آئی۔ وہ تھا تو غریب زمیندار کا بیٹا مگر اپنے منچلے پن کی وجہ سے ہر کام میں سب نوجوانوں سے آگے آگے رہتا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کارِ خیر کے لیے خود کو پیش کر دیا۔ یہ علیا تھا۔

اس پر کئی بن بیاہی بیٹیوں کے باپ جو علیا کو داماد بنانے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ گم سم ہو گئے۔ وہ اپنے گاؤں کے نوجوانوں میں سے کسی ایسے شخص سے اس قربانی کی توقع رکھتے تھے جو اُن کی نظر میں سیدھا سادہ ہو اور گاؤں میں اس کی کوئی اہمیت نہ ہو، نہ کہ علیا سے جو اپنی کئی خوبیوں کی وجہ سے گاؤں بھر کے نوجوانوں میں انتخاب تھا، اور اس طرح چراغ بی بی، علیا کے گھر میں بس گئی۔

علیا کو باپ سے ورثے میں زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ملا تھا۔ بڑی محنت سے اس پر کھیتی باڑی کرتا اور جو تھوڑا بہت اناج مل جاتا اس پر صبر و شکر کر کے گزارا کرتا بیوی کا کوئی خاص خرچ نہیں تھا۔ نہ اسے زیوروں اور نئے کپڑوں کی تمنا تھی۔ وہ مسجد کے حجرے میں پلی بڑھی تھی۔ روزہ نماز گویا اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ ابھی بچی ہی تھی کہ پانچوں وقت کی نماز بڑی پابندی سے ادا کرنے اور رمضان کے تیسوں روزے رکھنے لگی تھی۔ اس پر وہ نابینا بھی تھی۔ اسے ماسوائے اللہ کو یاد کرنے کے اور کوئی کام ہی نہ تھا۔ بہت سی دعائیں اس نے چھوٹی عمر میں ہی باپ سے سیکھ لی تھیں۔ ایک دو پارے بھی اسے حفظ تھے۔ علیا کے گھر آ کے اس کے مذہبی جوش میں کوئی کمی نہ ہوئی بلکہ عبادت گزاری نے کچھ زیادہ ہی شدت اختیار کر لی تھی۔ اس کی کوٹھڑی میں آٹھ پہر اس کا مصلیٰ بچھا رہتا جس پر وہ نمازوں کے علاوہ دیر تک وظیفے بھی

پڑھتی رہتی۔ اس کی کوٹھڑی سے اکثر اگر اور لوبان کی خوشبوئیں آتی رہتیں۔ ساتھ ساتھ یا غفور، یارحیم، یا غفور۔ یارحیم کا ورد بھی دھیرے دھیرے بلند ہوتا جاتا۔ ایسے میں اگر علیا گھر آتا تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے کسی خانقاہ میں داخل ہو گیا ہو۔ وہ خود تو نماز روزے کا زیادہ قائل نہ تھا مگر چراغ بی بی کے اس مذہبی ولولے کو احترام کی نظر سے دیکھتا تھا۔ وہ اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لیا کرتا کہ ایسی پاک ہستی کے ساتھ مناکحت کے فرائض انجام دینا بھی عبادت سے کم نہیں ہے۔

علیا نے تھوڑے سے اناج اور چارہ پر گاؤں کی ایک بیوہ کی لڑکی رحمتے کو ہنڈیا روٹی اور گھر کے دوسرے کاموں کے لیے رکھ لیا تھا۔ یہ لڑکی جس کی عمر دس گیارہ برس کی تھی۔ محنتی تو تھی مگر ساتھ شوخ اور چنچل بھی تھی، دن بھر چراغ بی بی کے ساتھ اس کی خوب گزرتی۔ چراغ بی بی اس سے خدا اور رسول کی باتیں کیا کرتی اور رحمتے اسے اِدھر اُدھر کے لطیفے اور چٹکلے اور گاؤں کی روز روز کی خبریں سناتی۔ گاؤں بھر میں صرف رحمتے ہی ایک ایسی لڑکی تھی جس سے چراغ بی بی اپنے دل کے راز کہا کرتی:

"رحمتے، میرا بابا کہا کرتا تھا، بیٹا صبر کر۔ اللہ کا کوئی مودی ضرور آئے گا۔ ضرور آئے گا وہ تجھے خاک سے اٹھائے گا۔ وہ تجھے گلے لگائے گا۔ بابا کا کہنا سچ ہوا۔ آخر میرا شہزادہ آ ہی گیا۔ رحمتے! وہ یوسف سے زیادہ حسین ہے۔ اس میں پیغمبروں والی شان ہے۔ وہ غازی مرد ہے۔ اس نے میری خاطر گدائی قبول کی۔ گاؤں کا نمبردار اپنی بیٹی کو اس سے بیاہنا چاہتا تھا اور سینکڑوں بیگھے زمین اس کے نام لکھنا چاہتا تھا مگر اس نے مجھ عیبوں بھری اندھی کی خاطر، دولت کو ٹھکرا دیا۔ دَھن دولت آنی جانی ہے۔ مرنے پر سارا مال و زر یہیں دھرا رہ جاتا ہے۔ بس نیک اعمال انسان کے ساتھ جاتے ہیں۔"

رحمتے کہتی:

"جاگاں بی بی، اللہ کی سوں چودھری علیا بڑا گبرو جوان ہے، تو بڑی بھاگوں والی ہے۔

اس کے گلے میں چاندی کا تعویذ کالے ڈورے میں بندھا بڑا اچھا لگتا ہے۔"

اس پر چراغ بی بی جوش میں آ کر کہتی:

"رحمتے۔ہے گاؤں میں کوئی اور جوان جو گھوڑے کی سواری میں، کشتی میں، کبڈی میں اس سے بازی لے جا سکے، فصل کاٹنے میں اس کا ہاتھ ایسی تیزی سے چلتا ہے جیسے پانی میں مچھلی چلتی ہے۔ جتنی دیر میں چار جوان فصل کاٹیں اتنی دیر میں وہ اکیلا ان کے برابر کاٹ کے رکھ دیتا ہے۔اس کے بال گھنگھریالے ہیں، اس کا جسم سڈول ہے۔ جب میں اس کے پاؤں دابتی ہوں تو مجھے بڑا مزہ آتا ہے۔جب اکھاڑے کی مٹی اس کے جسم کو لگتی ہے تو وہ اور بھی چمکنے لگتا ہے۔"

ان باتوں کا سب سے اچھا وقت وہ ہوتا جب رحمتے آنگن میں چولہے کے پاس بیٹھی توے پر روٹیاں ڈال رہی ہوتی اور چراغ بی بی اس کے ساتھ ہی چوکی پر آ بیٹھتی، جب وہ علیا کے بعض ایسے کمالات جو ظاہر میں نظر نہ آتے، بیان کرتی تو رحمتے بے اختیار کہہ اٹھتی۔

"اچھا چاگاں بی بی!"

اور جب چراغ بی بی بولتے بولتے تھک جاتی تو رحمتے شروع ہو جاتی۔ "سنا چاگاں بی بی، آج رسولاں کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی۔ اتنی چھوٹی جیسے چوہیا ہو۔ نمبردار کی بیٹی کی شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں ان دنوں۔ سنا ہے کہ شہر سے بینڈ باجے والے بلائے جائیں گے ..... رات مٹھو کی دکان سے پانچ سیر تمبا کو چوری ہو گیا۔"

ایک دن رحمتے روز سے ذرا جلدی آ گئی۔ وہ جوش میں بھری ہوئی تھی جیسے کوئی بڑی انوکھی خبر لائی ہو۔ جیسے ہی علیا کھیت پر روانہ ہوا۔ وہ پھوٹ پڑی:

"سنا چاگاں بی بی! ہمارے قریب جو گاؤں ہے "دھوپ چڑھی" اس میں ایک زمیندار عمر و رہتا ہے۔اس نے نئی شادی کی ہے۔ خود تو کمبخت ساٹھ برس کا ہے مگر دلہن سولہ سترہ برس سے زیادہ کی نہیں ہے۔ سب گاؤں والے اسے برا کہہ رہے ہیں مگر اس کو کسی کی پروا

نہیں بلکہ اس نے سب کو جلانے کے لیے دلہن کا گھونگھٹ اٹھوادیا اور بڑی بڑی عجیب عجیب باتیں شروع کر دیں۔

"سنا ہے اس نے دو سفید گھوڑے خریدے ہیں۔ ایک اپنے لیے ایک دلہن کے لیے۔ ہر روز صبح کو دونوں گھوڑوں پر سوار ہو کر سیر کو نکلتے ہیں۔ کبھی بڈھے کو کوئی کام ہوتا تو وہ گلنار کو اکیلا ہی بھیج دیتا ہے۔ سنا ہے کل گلنار اکیلی گھوڑے پر سوار سیر کرتی ہمارے گاؤں کی طرف آنکلی۔ اس نے گاؤں والوں سے بڑی آزادی سے باتیں کیں۔ کچھ لڑکے اس کے سفید گھوڑے کے پیچھے ہولئے۔ وہ سب اس کو بڑی حیرانی سے دیکھتے تھے۔ اس کا رنگ میموں کی طرح گورا ہے اور بال سنہرے ہیں۔ سنا ہے وہ بڑی خوبصورت ہے۔ اس نے ریشمی قمیص اور شلوار پہن رکھی تھی۔ اس پر بڑے بڑے گلاب کے پھول بنے تھے۔ پاؤں میں زری کی جُوتی تھی۔ اس نے سرخ دوپٹے کو جس کے کناروں پر گوٹا لگا تھا، چھاتی پر بَل دے کر گرہ باندھ لی تھی، وہ بڑی شان سے گھوڑے پر بیٹھی تھی جیسے کہیں کی رانی ہو۔ اس نے ہمارے کھیتوں کی بھی خوب سیر کی۔۔ اور چاگاں بی بی چودھری علیا نے بھی تو اسے دیکھا تھا بلکہ کچھ باتیں بھی کی تھیں۔ شاید وہ راستہ پوچھ رہی تھی۔"

"کیا کہا تُو نے؟ اس نے دیکھا تھا؟ اس نے باتیں کی تھیں؟"

"ہاں چاگاں بی بی۔"

"میرے شہزادے نے؟"

"ہاں علیا چودھری نے۔ چاگاں بی بی۔"

"چل چپ رہ۔ زیادہ باتیں نہ بنا، میرے سر میں درد ہو رہا ہے میں جاتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ چوکی سے اٹھی اور راہ ٹٹولتی ہوئی اپنی کوٹھڑی میں چلی گئی۔ اس دن اس نے رحمتے سے اور کوئی بات نہ کی۔

شام کو علیا کھیتوں سے واپس آیا۔ گھر پر وہ زیادہ تر خاموش ہی رہا کرتا تھا۔ مگر اس شام

وہ گھر میں زیادہ چلا پھرا بھی نہیں۔ پہلے خاموشی سے چارپائی پر بیٹھ کر کھانا کھاتا رہا، پھر حقہ بھرا اور دیر تک پیتا رہا۔ اس عرصے میں چراغ بی بی بھی خاموش رہی مگر جب علیا سونے لگا اور تہ بند کو چادر کی طرح اوڑھ کر چارپائی پر لیٹ گیا تو وہ حسبِ معمول اس کے پاس آئی اور اس کی چارپائی پر بیٹھ کر اس کے پاؤں دابنے لگی مگر ابھی پندرہ منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ علیا نے کہا۔ "چاگاں بس کر، مجھے نیند آرہی ہے۔"

علیا کے اس خلاف معمول رویّے پر وہ بھونچکی رہ گئی۔ اس نے ایک دبی دبی سی آہ بھری اور پھر خاموشی سے اٹھ کر اپنی کوٹھڑی میں چلی گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد اس کی کوٹھڑی سے "یا غفور یارحیم، یا غفور یارحیم۔" کے الفاظ سنائی دینے لگے۔ یہ وظیفہ کوئی گھنٹہ بھر جاری رہا۔ پھر چراغ بی بی ہاتھوں سے راہ ٹٹولتی اس کی چارپائی کے پاس پہنچی اور بڑی ملائمت سے اس کے پاؤں کو جو چادر سے باہر نکلے ہوئے تھے چھوا، اس کا جی چاہا کہ وہ چارپائی پر بیٹھ جائے اور معمول کی طرح اس کے پاؤں دابنا شروع کردے مگر اسے جرأت نہ ہوئی اور وہ واپس اپنی کوٹھری میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد کوٹھڑی سے پھر آواز آنے لگی جیسے کوئی سرگوشی کرتا ہے۔

"مجھ عیبوں بھری کو گلے سے لگایا۔ اس کا اجر اللہ اور اس کا حبیب اس کو دے گا۔ میں اندھی محتاج کس لائق ہوں، یاپاک پروردگار اپنے حبیب کے صدقے میرے سر کے سائیں کو ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھ۔ یاپاک پروردگار اس کے دشمنوں کو زیر کر۔ یاپاک پروردگار اپنے حبیب کے صدقے جو کوئی اس پر حسن کا وار کرے۔ اس کے حسن کو غارت کر، یاپاک پروردگار اپنے حبیب کے صدقے میری دعا قبول کر۔ یاپاک پروردگار پہلے میں مروں بعد میں وہ مرے۔ آمین"

دو گھنٹے بعد وہ اپنی کوٹھڑی سے پھر نکلی اور اس کی چارپائی کے پاس پہنچ کر اس کے پیروں کو ٹٹولنے لگی اور یہ اطمینان کر کے کہ وہ چارپائی پر بدستور چادر تانے سو رہا ہے وہ پھر

اپنی کوٹھڑی میں چلی گئی۔

ابھی کچھ کچھ رات باقی تھی کہ وہ پھر کوٹھڑی سے نکلی اور سائے کی طرح چلتی ہوئی علیا کی چارپائی کے قریب آئی اور اپنے گرم گرم ہاتھوں سے اس کے پاؤں ملنے لگی، پھر اس کے پائنتی زمین پر بیٹھ گئی اور اس کے دونوں پاؤں کے تلووں کو چوما۔ علیا نے سوتے میں کروٹ بدلی اور اپنی ٹانگوں کو سکیڑ کر چادر کے اندر کرلیا۔

جب صبح صادق نمودار ہوئی تو چراغ بی بی کی کوٹھڑی سے پھر آواز آنے لگی، اب کے آواز میں غیر معمولی جوش تھا اور وہ معمول سے زیادہ بلند تھی۔

"اس نے مجھ اندھی عیبوں بھری کی خاطر گدائی قبول کی۔ اس نے مجھے گلے سے لگایا۔ میرا شہزادہ یوسف سے زیادہ حسین ہے۔ اس میں پیغمبروں والی شان ہے۔ ..."

کن رس

بعض لوگوں کو گانے بجانے سے قدرتی لگاؤ ہوتا ہے۔ خود چاہے بے سُرے ہی کیوں نہ ہوں مگر سُریلی آواز پر جان دیتے ہیں۔ راگ ان پر جادو کا سا اثر کرتا ہے رفتہ رفتہ وہ گانے بجانے کے ایسے عادی ہو جاتے ہیں جیسے کسی کو کوئی نشہ لگ جائے۔ صاحب ثروت ہوئے تو عمر بھر گویّوں کی پرورش کرتے رہے، نہیں تو استادوں کی جوتیاں سیدھی کر کے ہی اپنے ذوق کی تسکین کرلی، دراصل ان ہی لوگوں کے لیے موسیقی روح کی غذا کے مصداق ہوتی ہے۔ گانے بجانے والوں کی اصطلاح میں ایسے لوگوں کو کن رسیا" کہتے ہیں۔

فیاض کو بھی قدرت کی طرف سے موسیقی کا کچھ ایسا ہی ذوق عطا ہوا تھا مگر بدقسمتی سے ایک تو وہ پیدا ہی غریب وثیقہ نویس کے گھر ہوا۔ دوسرے اس کا باپ بڑا سخت گیر اور پابندِ صوم وصلوٰۃ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فیاض کا یہ ذوق پنپنے نہ پایا۔ پھر بھی اس نے بچپن سے لے کر جوانی تک جیسے تیسے موسیقی سے اپنی دلبستگی قائم رکھی۔

جب اسکول میں پڑھتا تھا تو کبھی کبھی اسے بھی حمد گانے کو کہا جاتا۔ وہ بھی عجب سماں ہوتا تھا۔ صبح صبح لڑکے قطاریں باندھے کھڑے ہیں اور فیاض ان کے سامنے کھڑا حمد کا ایک ایک مصرعہ گا رہا ہے جسے سارے لڑکے کورس کی صورت میں دہرائے جاتے ہیں۔ قوالی اور سماع کی محفلوں میں بھی وہ بچپن ہی سے شریک ہونے لگا تھا کیونکہ باپ ان میں جانے کی

اجازت دے دیتا بشرطیکہ وہ پڑوس ہی میں کہیں منعقد ہوتیں۔ کبھی کبھی وہ ان براتوں کے ساتھ بھی ہو لیتا جن کے آگے آگے بینڈ باجہ بجتا اور ڈھولکیا زرق برق وردی پر شیر کی کھال پہنے طرح طرح کے کرتبوں سے ڈھول بجاتا جو اس نے گلے میں لٹکا رکھا ہوتا۔ وہ جو سڑک کی پٹری پر کسی ہنڈے کے نیچے میاں میلی سی چادر بچھا ہارمونیم کھول بیٹھ جاتا ہے اور بیوی ڈھولک گھٹنے تلے دبا، گھونگھٹ کے اندر سے کراری کوئل جیسی آواز سے الاپنے لگتی ہے ان کا گانا بھی فیاض بڑی محویت سے سنا کرتا۔ ایسے موقع پر اس کی تمنا ہوتی کہ میں بھی کوئی سستا سا ہارمونیم خرید لوں اور گھر میں گانے کی مشق کیا کروں مگر وہ جانتا تھا کہ باپ کے جیتے جی یہ ارمان پورا ہونا محال ہے۔

طالب علمی ہی کے زمانے میں ایک بار جب اس کے باپ کو کسی ضروری کام سے کسی دوسرے شہر جانا پڑا تھا تو فیاض کا ایک دوست ایک رات اسے تھیٹر دکھانے لے گیا۔ یہ پارسیوں کی کوئی مشہور کمپنی تھی جس میں نامی گرامی ایکٹر اور گویے ملازم تھے۔ کھیل بھی ایسا تھا کہ اس میں شروع سے آخر تک گانا ہی گانا تھا۔ فیاض تمام وقت مبہوت ہو کر سنتا رہا اور پھر برسوں اسے اپنے کانوں میں ان نغموں کی گونج سنائی دیتی رہی۔

فیاض نے اسکول کی تعلیم ختم کی تو باپ نے تنگ دستی کے باوجود اسے کالج میں داخل کرا دیا، اس کا خیال تھا کہ لڑکا جتنی زیادہ تعلیم حاصل کرے گا اتنی ہی اچھی اسے نوکری مل جائے گی۔ کالج میں فیاض نے خود کو زیادہ آزاد محسوس کیا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ باپ کی نظروں سے اوجھل رہ کر اسے کالج کی ”بزم موسیقی“ میں اپنے ذوق کی تسکین کا سامان نظر آنے لگا تھا۔

باپ کا قاعدہ تھا کہ رات کو جب تک فیاض بستر پر لیٹ نہ جاتا وہ خود بھی آرام نہ کرتا اور پھر ات کو وہ دو ایک بار اٹھ کر بیٹے کے پلنگ کے پاس ضرور جاتا ایک دفعہ پچھلے پہر اس نے فیاض کو نیند میں بڑبڑاتے سنا۔ وہ اٹھ کر بیٹے کے پلنگ کے پاس گیا۔ فیاض کی زبان سے

بے خبری میں عجیب عجیب الفاظ نکل رہے تھے۔ کچھ انگریزی کے کچھ اردو کے بیچ بیچ میں وہ کبھی ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگتا، کبھی کراہ اٹھتا۔ باپ بڑے تعجب کے ساتھ یہ کیفیت دیکھتا رہا۔ رات بھر وہ طرح طرح کے اندیشوں میں کھویا رہا۔ اگلے ہی روز اس نے بیٹے کے لیے موزوں رشتہ تلاش کرنا شروع کر دیا اور پھر تھوڑے ہی دنوں میں ایک اپنے سے بھی غریب گھر کی مگر شکل صورت کی اچھی لڑکی منتخب کر کے فیاض کی شادی کر دی اور یوں بیٹے کی آوارگی کے امکانات کا بڑی حد تک سدِباب کر دیا۔

کالج میں فیاض کا تیسرا سال تھا کہ اچانک باپ کا انتقال ہو گیا۔ ماں اس سے ایک برس پہلے ہی سدھار چکی تھی، چنانچہ اب فیاض آزاد تھا مگر یہ آزادی اپنے ساتھ کئی ذمہ داریاں لے کر آئی تھی۔ سب سے اہم مسئلہ اپنی اور اصغری کی، جو ایک بچی کی ماں بن چکی تھی، گزر اوقات کا تھا کیونکہ باپ اپنے پیچھے نہ تو کوئی جائداد ہی چھوڑ مرا تھا اور نہ کچھ روپیہ پیسہ ہی، چنانچہ اگلے روز اس نے کالج کی بجائے دفتروں کا رخ کیا اور نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ اسے اپنی بیوی اور بچی سے بڑی الفت تھی، چنانچہ ان کی خاطر اس نے ادنیٰ سے ادنیٰ محنت مزدوری کو بھی اپنے لیے عار نہ جانا اور جیسے تیسے ان کا پیٹ پالتا رہا۔ آخر مہینوں سڑکوں کی خاک چھاننے اور دفتروں میں دھکے کھانے کے بعد اسے آب کاری کے محکمے میں ایک کلرک کی جگہ عارضی طور پر مل گئی۔

اس نے دن رات کی محنت اور اپنی قابلیت سے جلد ہی اس دفتر میں اپنے لیے مستقل جگہ پیدا کر لی۔ اس کے بعد اسے اپنی آمدنی بڑھانے کی فکر ہوئی کیونکہ دوسری بچی کی پیدائش کے ساتھ ہی گھر کے اخراجات بڑھ گئے تھے، چنانچہ وہ دن کو دفتر میں کام کرتا اور رات کو گھروں پر جا کر لڑکوں کو پڑھاتا اور اس طرح بڑی مشکل سے گھر کا خرچ چلاتا۔

اس زمانے میں اس کا ذوقِ موسیقی فائلوں کے انبار اور جمع خرچ کے اندراجات میں گم ہو کے خواب وخیال بن گیا تھا۔ پھر بھی کسی رات پچھلے پہر کے سناٹے میں اگر وہ جاگ رہا

ہو تا اور کوئی تانگے والا سنسان سڑک پر تانگہ چلاتے ہوئے اپنی سُریلی اور پاٹ دار آواز میں کوئی لوک گیت گاتا ہوا نکل جاتا تو اس کے دِل میں ہوک سی اٹھنے لگتی۔

رفتہ رفتہ اس کی حالت سنبھلتی گئی، یہاں تک کہ دس سال کے عرصے میں وہ اپنی لیاقت، محنت اور خوش اخلاقی کے باعث اسی دفتر میں ہیڈ کلرک بن گیا۔ سب افسر اس کے کام سے خوش تھے اور وہ بھی اپنی حالت پر مطمئن تھا۔ اسے جو مشاہرہ ملتا وہ اس کے اور بیوی بچوں کے گزارے کے لیے کافی تھا اور اب اسے دوسرے کے بچوں کو ان کے گھر پر جا جا کر پڑھانے کی ضرورت نہ رہی تھی۔

جب سے اسے ہیڈ کلرکی ملی تھی اس کا کام خاصا بڑھ گیا تھا۔ اس کا معمول تھا کہ جب سب لوگ دفتر سے چلے جاتے، تو وہ تنہائی میں اپنے ماتحت کلرکوں کے کام کا محاسبہ اور حسابات کی جانچ پڑتال کیا کرتا۔ اس طرح اسے دفتر میں دو ڈھائی گھنٹے زیادہ تو گزارنے پڑتے مگر اس کی دل جمعی ہو جاتی۔ وہ چراغ جلنے سے پہلے .... ہی دفتر سے اٹھتا۔ دفتر سے نکل کر وہ اس باغ کا راستہ لیتا جو فصیل کے ساتھ ساتھ شہر کے گرداگرد چلا گیا تھا۔ اس کا گھر شہر کے اندر ایک تنگ اور گنجان آباد محلّے میں تھا۔ باغ سے ہو کر گھر پہنچنے میں اسے ایک آدھ میل زیادہ چلنا پڑتا، پھر بھی وہ اسے شہر کے پُر شور بازاروں اور تنگ گلیوں والے راستے پر ترجیح دیتا۔

وہ باغ کی کشادہ سڑک پر جس پر سرخ بجری بچھی تھی اور جس پر ہر قسم کی گاڑیوں کے چلنے کی ممانعت تھی، مزے مزے سے قدم اٹھاتا خاصی دیر میں گھر پہنچا کرتا۔ اس ہوا خوری سے اس کے دن بھر کے تھکے ہوئے دماغ کو آسودگی حاصل ہوتی اور جس وقت وہ گھر پہنچتا تو خاصا تازہ دم ہوتا۔ اس کے بیوی بچے ملازمت کے ابتدائی زمانے ہی سے اس کے دیر سے گھر پہنچنے کے عادی ہو چکے تھے۔

ایک دفعہ ہفتے کی شام کو وہ معمول سے بھی کچھ زیادہ ہی دیر میں دفتر سے نکلا۔ یہ گلابی

جاڑوں کے دن تھے۔ ابر چھایا ہوا تھا اور اکا دکا بوند بھی اس کے منہ پر آ پڑتی تھی۔ وہ حسب عادت باغ کی سڑک پر ٹہلتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ سڑک کے کنارے کنارے تھوڑے فاصلے پر بجلی کے کھمبے تھے، جن کی روشنیوں کی قطار سڑک کے ساتھ ساتھ خم کھاتی ہوئی دور سے بڑی بھلی معلوم دیتی تھی۔

فیاض اپنی دُھن میں مست چلا جا رہا تھا کہ اچانک اس کے کان میں کسی ساز کے بجنے کی دھیمی دھیمی آواز پڑنی شروع ہوئی۔ وہ جوں جوں آگے بڑھتا گیا، آواز زیادہ واضح ہوتی گئی۔ آخر جب وہ قریب پہنچا تو اس نے بجلی کے ہنڈے کی روشنی میں دیکھا کہ سڑک کے قریب ہی باغ کے گوشے میں ایک درخت کے نیچے کوئی شخص فقیروں جیسی گدڑی اوڑھے سرکاری بنچ پر اکڑوں بیٹھا ایک بڑا سا ساز بجا رہا ہے۔

اس موسیقی میں بلا کا سوز تھا۔ نغمہ تھا کہ بے اختیار دل میں اترا جاتا تھا۔ رات کی خاموشی میں ایک ایک سُر واضح اور الگ الگ سنائی دے رہا تھا۔ فیاض کے قدم خود بخود رُک گئے اور وہ سازندے پر نظریں جمائے ایک محویت کے عالم میں اس موسیقی کو سننے لگا۔

سازندہ آنکھیں بند کیے اس امر سے بے نیاز کہ کوئی اس کے فن پر دھیان دے رہا ہے یا نہیں، بڑے انہماک کے ساتھ ساز بجا رہا تھا۔ اس کی انگلیاں تھکنے کا نام نہ لیتی تھیں۔ وہ کبھی اس تار پر دوڑتیں، کبھی اس تار پر... دوسرے ہاتھ سے وہ تاروں پر ضربیں لگا رہا تھا اس قدر تیزی کے ساتھ کہ فضا میں ایک مسلسل ارتعاش کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی عجب سماں بندھا ہوا تھا۔

فیاض کے دل و دماغ پر اس موسیقی کا کچھ ایسا اثر پڑا کہ پہلے تو اس کا سانس تیز تیز چلنے لگا، پھر رفتہ رفتہ اعصاب ڈھیلے پڑنے شروع ہوئے اور نقاہت سی محسوس ہونے لگی، پھر ایک آنسو اس کی آنکھ سے بے اختیار ٹپک پڑا۔

فیاض کی زندگی کے پچھلے دس گیارہ سال ایسے سپاٹ گزرے تھے کہ ان میں موسیقی

یا کسی اور فنِ لطیفہ کا کچھ دخل نہ رہا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا مقصد فقط عزت و آبرو کی روزی کمانا اور بچوں کی پرورش کرنا قرار دے لیا تھا اور وہ یہ فرض بڑی مسرت کے ساتھ انجام دے رہا تھا اور اگر اس کی زندگی میں کسی چیز کی کمی رہ جاتی تھی تو اصغری سے اس کی والہانہ گرویدگی اس کمی کو پورا کر دیتی تھی مگر اب اس موسیقی کو سن کر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دل کے اندر کوئی سوئی ہوئی چیز دفعتاً جاگ اٹھی ہو۔

کچھ دیر بعد سازندے نے ساز بجانا بند کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی فیاض کو ایسا محسوس ہوا کہ جس طلسم نے اسے مسحور کر رکھا تھا وہ ٹوٹ گیا، اور اب وہ چاہے تو جا سکتا ہے مگر اتنے ہی میں سازندے نے آنکھیں کھول دیں اور پہلی مرتبہ سڑک پر اپنے واحد سامع کو دیکھا۔ پھر اس خیال سے کہ کہیں وہ چل نہ دے، اس نے جلدی سے ہانک لگائی:

"بابو جی کی خیر ہو، مل جائے کوئی دھیلی پاؤلا فقیر کو نشے پانی کے لیے۔"

فیاض کے قدم رک گئے۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا جس میں اتفاق سے اس وقت صرف ایک دونّی ہی تھی۔ ایسے صاحب کمال کو ایسا حقیر نذرانہ پیش کرتے ہوئے اسے بڑی ندامت محسوس ہوئی۔ آخر اس نے سازندے کی طرف بڑھتے ہوئے ہمت کر کے کہا: "استاد! اس وقت تو یہی قبول کرو، ہاں اگر کھانا کھانا ہو تو میرے ساتھ چلے چلو، میرا گھر یہاں سے قریب ہی ہے۔

سازندے نے لمحہ بھر تامل کیا۔ ساز بجاتے بجاتے یقیناً وہ تھک بھی گیا تھا اور اسے بھوک بھی لگی تھی، ایسے میں گھر کا پکا پکایا گرم گرم کھانا مل جائے تو کیا برا تھا۔

"چلتا ہوں بابو جی! اللہ تمہاری خیر رکھے۔"

اور وہ ساز بغل میں دبا گدڑی سنبھال بنچ سے اٹھ کھڑا ہوا اور فیاض کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ لمبے قد کا دبلا پتلا آدمی تھا۔ اَدھیڑ عمر۔ سر پر لمبی سی ترکی ٹوپی جو بہت میلی ہو گئی تھی اور جس کا پُھندنا ٹوٹ چکا تھا۔ لمبے لمبے پٹے جن میں گھاس پھونس کے تنکے الجھے ہوئے

تھے، کڑبڑی واڑھی جو کئی روز سے منڈائی نہیں گئی تھی۔ آنکھیں سرخ سرخ گویا دُکھنے آئی ہوں، ان میں سے پانی رستا ہوا۔ اس کا لباس جو کرتے پاجامے اور کالی واسکٹ پر مشتمل تھا سخت بوسیدہ اور میلا تھا۔ پاؤں میں ٹوٹا ہوا بوٹ جو اس کے پاؤں کے ناپ سے بڑا تھا اور اسے جوتے کو گھسیٹ گھسیٹ کر چلنا پڑتا پیٹھ میں تھوڑا سا کوب، جو شاید جھک کر ساز بجانے کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔

"یہ باجہ جو تم بجاتے ہو اس کو کیا کہتے ہیں؟" فیاض نے چلتے چلتے پوچھا۔

"اس کو سرود کہتے ہیں، تمہاری خیر رہے، بابو جی۔"

"سرود؟"

"جی ہاں، سرود۔"

"بہت کمال کا بجاتے ہو استاد تم تو۔"

"اجی کمال تو بس اللہ کی ذات کو حاصل ہے بابو جی۔"

"میں نے آج تک اتنا اچھا ساز بجاتے کسی کو نہیں سنا۔"

"کرم ہے کلیر والے بابا کا۔ میں کس لائق ہوں بابو جی۔"

"مجھے تو آج تک خبر ہی نہ تھی کہ موسیقی میں اس قدر دل کشی ہوتی ہے۔"

"اجی کیا پوچھتے ہو بابو جی۔ ایک مرتبہ اس کی چینک لگ جائے تو پھر عمر بھر چھٹکارا مشکل ہے۔ مجھی کو دیکھو، فقیروں سے بدتر حال ہے۔ کمبخت جی کا جنجال ہو گئی ہے۔"

"کب سے یہ ساز بجا رہے ہو استاد؟"

"کوئی چالیس برس کا ریاض ہے بابو جی۔ چار برس کا تھا جب بجانا شروع کیا تھا باوا نے چھوٹا سا بنوا کے دیا تھا کھیلنے کو، کیونکہ میں ان کا سرود بجانے کے لیے بہت مچلا کرتا تھا۔ بس میں اپنے اس کھلونے سے کھیلتا رہتا، اور اپنے کبھی ٹوں ٹاں بھی کر لیا کرتا۔

ایک دن کیا ہوا، اللہ تمہاری خیر رکھے بابو جی، کہ صبح ہی صبح استاد دلدار خاں مرحوم باوا

سے ملنے گھر پر آئے۔ استاد دلدار خاں مرحوم کے سرود کی ساری خدائی میں دھوم تھی، مگر اللہ بخشے بچاروں کی الٹے ہاتھ کی کلائی پر چکی کا پاٹ گر پڑا تھا اور ہاتھ بیبی ہو گیا تھا، خود بجانے سے معذور ہو گئے تھے، بس سکھلایا کرتے تھے، وہ بھی رجواڑوں میں۔ باوا سے ان کا بڑا یارانہ تھا۔

"ہاں تو بابو جی وہ دونوں آنگن میں چارپائی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے، مزے مزے کی باتیں ہو رہی تھیں اور میں ان سے ذرا ہٹ کے زمین پر اپنے اسی کھلونے سے کھیل رہا تھا۔ ایکا ایکی استاد دلدار خاں باوا کی بات کاٹ کر چلا اٹھے:

"اے میاں ذرا سننا! یہ لونڈا کیا بجا رہا ہے؟"

"لو بابو جی، مولا تمہاری خیر رکھے، دونوں نے سنا تو میں گن کری کی گت بجا رہا تھا۔ باوا نے کلام مجید اٹھالیا کہ میں نے بچے کو بتایا ہو تو اسی کی مار پڑے۔ بلکہ میں نے تو اس کے ساز کے کبھی تار بھی ملا کے نہیں دیئے، اس پر استاد دلدار خاں مرحوم باوا سے کہنے لگے، میاں یہ لونڈا تو تم مجھے دے دو۔ دیکھو میرا ہاتھ بیبی ہو گیا ہے۔ دل میں بہت حسرتیں رہ گئی ہیں۔ اب میری جگہ یہ لونڈا دنیا کو بتائے گا کہ دلدار خاں کیا چیز تھا۔

"لو بابو جی، مولا تمہاری خیر رکھے، بڑی حیل حجت ہوئی۔ آخر باوا مان گئے کیونکہ مجھ سے بڑے دو بیٹے اور تھے ان کے۔ استاد مجھے اپنے ساتھ لے آئے۔ بس اس دن سے میں ان کی خدمت میں رہنے لگا۔ چلموں پر آگ رکھتے رکھتے چٹکیاں جل جل گئیں۔ چار چوٹ کی مار مارا کرتے تھے بابو جی مجھے۔ آج جو چار آدمیوں میں میری واہ واہ ہوتی ہے استاد دلدار خاں کی جوتیوں ہی کا صدقہ ہے بابو جی۔"

فیاض نے بڑی دلچسپی سے یہ قصہ سنا۔ جب ختم ہوا تو دونوں کچھ دیر چپ چاپ چلتے رہے۔

"تمہارا نام کیا ہے، بابو جی؟" اچانک سرودیئے نے سوال کیا۔

"مجھے فیاض کہتے ہیں؟"

"طبیعت کے بھی ماشاءاللہ فیاض ہو۔ اسم بامسمّیٰ، اور کام کیا کرتے ہو، بابو جی؟"

"میں ایک دفتر میں ملازم ہوں؟"

"تنخواہ کیا ملتی ہے تمہیں بابو جی؟"

"کچھ زیادہ نہیں، مگر شکر ہے، گزارا ہو جاتا ہے۔"

"پھر بھی کتنی؟"

"یہی کوئی ڈیڑھ سو۔"

"اور بچے کتنے ہیں، ماشاءاللہ سے تمہارے؟"

"دو۔"

"لڑکے یا لڑکیاں؟"

"لڑکیاں"

یہ سن کر سردو یے کی زبان سے ایک مہمل سا جملہ نکلا، پھر وہ کہنے لگا:

"خیر جیتی رہیں، اللہ کی دین ہے اور بابو جی "

فیاض اس کے تابڑ توڑ سوالوں کا جواب دیتے دیتے زچ ہو گیا۔ اس نے اس سلسلے کو روکنے کے لیے خود یہی حربہ استعمال کرنے کی سوچ لی اور خود اس سے سوال کرنے شروع کر دیے، اسے معلوم ہوا کہ سردو یے کا نام حیدری خاں ہے، وہ پیارے خان کا چھوٹا بھائی ہے جو کسی مہاراجہ کے دربار میں "پان سے" روپے پر ملازم ہے۔ ایک بڑا بھائی اور تھا۔ وہ بھی کسی رجواڑے میں ملازم تھا مگر کسی نے دشمنی سے اسے زہر دے کر مار ڈالا۔ اپنی بدمزاجی کی وجہ سے اس کی اپنے گھرانے میں کسی سے نہیں بنتی۔ وہ کسی کا دبیل ہو کر نہیں رہ سکتا۔ اس کی طبیعت میں آزادی اور فقیری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا گھر گھاٹ ہے نہ جورو جاتا۔

جس وقت وہ دونوں باغ سے نکل فصیل کی ایک گلی سے شہر کے اندر داخل ہوئے تو

رات کے کوئی دس بجے کا عمل ہو گا۔ فیاض، حیدری خاں کے آگے آگے چلتا، راستہ دکھاتا دو تین گلیوں سے گزر کر آخر اسے اپنے بالاخانے کے نیچے لے آیا۔

"استاد تم ذرا یہاں گلی میں ٹھہرو۔" اس نے کہا۔ "میں اوپر جا کر پردہ کرا دوں۔"

"بہت دیر نہ لگانا بابو جی، اللہ تمہاری خیر رکھے۔"

فیاض سیڑھیاں چڑھ کر مکان میں پہنچا۔ اس کی بیٹیاں تو سو گئی تھیں مگر اصغری حسبِ معمول اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ فیاض نے مختصر الفاظ میں اسے حیدری خاں سے ملنے اور اپنے ساتھ لانے کا حال سنایا اور تاکید کی کہ جلدی سے کھانا گرم کر لو، پھر وہ لالٹین لے کر نیچے گیا اور حیدری خاں کو اوپر بیٹھک میں لے آیا۔ اس گھر میں باورچی خانے کے علاوہ دو کمرے تھے، ایک بڑا جس میں وہ، اس کی بیوی اور لڑکیاں سویا کرتیں۔ دوسرا چھوٹا جو سیڑھیاں چڑھتے ہی سامنے پڑتا اور بیٹھک کا کام دیتا۔ فیاض اکثر وہاں بیٹھ کر دفتر کا کام کیا کرتا، اس میں ایک پرانی دری بچھی تھی، ایک چھوٹی سی میز، دو کرسیاں اور کتابوں کی ایک الماری تھی۔

حیدری خاں نے سرود کو بہت احتیاط سے کمرے کے ایک کونے میں رکھ دیا، خود دری پر بیٹھ گیا اور گردن پھرا پھرا کر گھر کا جائزہ لینے لگا۔

"کیا کرایہ دیتے ہو بابو جی اس کا؟" اس نے پھر سلسلۂ سوالات شروع کیا۔

"پندرہ روپے!"

"افوہ! اتنے سے مکان کے پندرہ روپے! بہت کرایہ دیتے ہو تم تو بابو جی۔ بجلی بھی تو نہیں ہے اس میں۔"

اس کی چندھی آنکھیں پیتل کے اس پرانے لیمپ پر جمی ہوئی تھیں جو تپائی پر رکھا ہوا تھا اور جس کی چمنی کچھ کچھ دھواں دے رہی تھی۔

"ہاں استاد! کرایہ تو کچھ زیادہ ہی ہے۔" فیاض نے کہا۔ "پر کیا کروں، مدت سے یہیں رہتا ہوں۔ اس محلے میں جی لگ گیا ہے۔"

ایک لمحہ خاموشی رہی۔ پھر حیدری کہنے لگا:

"لے اب بابو جی جلدی سے کھانا لے آؤ۔ اللہ تمہاری خیر رکھے۔"

چند منٹ کے بعد اس کے سامنے دری پر ایک چھوٹا سا دسترخوان بچھا کر کھانا چن دیا گیا۔ کھانا تھا تو معمولی سا مگر پکانے والی نے ایسے سلیقے سے پکایا تھا کہ حیدری خاں کی زبان چٹخارے لینے لگی۔

"خوب پیٹ بھر کر کھاؤ استاد۔" اور یہ کہہ کر فیاض نے اپنے حصے کا سالن بھی جو وہ اندر سے اٹھا لایا تھا اس کے سامنے رکھ دیا۔ حیدری خاں کے سرود کا ابھی تک اس کے دل و دماغ پر ایسا اثر تھا کہ اسے کھانے کی ذرا اشتہانہ تھی۔

"بس بس بابو جی۔" حیدری خاں نے کہا۔ "فقیر کا تو بس دو نوالوں ہی میں پیٹ بھر جاتا ہے، لے اب بس چائے اور پلوا دو۔" اللہ تمہاری خیر رکھے۔"

"چائے ابھی آتی ہے۔ میں نے کیتلی چولہے پر رکھوا دی ہے۔"

برتن ہٹا دیے گئے اور فیاض حیدری خاں کے پاس ہی دری پر بیٹھ گیا، اور بڑی اشتیاق بھری نظروں سے اس کے سرود کو دیکھنے لگا۔ حیدری خاں اس کے اشتیاق کو بھانپ گیا۔ وہ کونے سے اپنا ساز اٹھا لایا اور فیاض کی طرف بڑھا کر کہنے لگا:

"لو شوق سے دیکھو بابو جی۔ ایسا ساز بھی تم نے کم ہی دیکھا ہو گا۔ یہ میرے استاد دلدار خاں مرحوم (کان کی لو چھو کر) کی نشانی ہے۔ کئی سرودیوں نے سینکڑوں روپے کا لالچ دے کر مجھ سے یہ سرود خریدنا چاہا مگر میں نے ان کے روپے پر لات مار دی، میری تو جان ہے اس میں بابو جی جیسے پریوں کی کہانی میں جن کی جان طوطے میں تھی، مجھے کوئی لاکھ روپیہ دے تب بھی میں اس سرود کو اپنے سے جدا نہ کروں۔"

فیاض نے سرود کو اپنی گود میں رکھ لیا۔ اچھا تو یہی وہ طلسمی ساز ہے جس سے ایسے ملکوتی سُر نکلتے ہیں! وہ بڑے غور سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کی عجیب سی بناوٹ اس کی درجنوں

کھونٹیاں، اس کا بڑا سا ڈھانچہ جس پر کھال منڈھی ہوئی، اس کی سینگ کی بنی ہوئی گھوڑی جس پر سارے تار ٹکے تھے، غرض ہر چیز اس کے لیے عجوبہ تھی۔

"اس کو بجاتے کس طرح ہیں بھلا؟" فیاض بے اختیار پوچھ بیٹھا۔

"لو میں تمھیں بتاتا ہوں بابو جی۔" حیدری خاں نے کہا۔ "پہلے یوں آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاؤ، جیسے میں بیٹھا ہوں اور سرود کو یوں اپنے آگے رکھ لو۔ یہ لو جوا اِس کو دہنے ہاتھ کی انگلیوں میں یوں پکڑ لو اور اس طرح تار پر ضرب لگاؤ۔"

فیاض نے ایسا ہی کیا۔ ایک منحنی سی آواز نکلی۔

"پھر ضرب لگاؤ۔"

اب کے آواز کچھ بہتر تھی۔

"شاباش! بس یوں ہی ضربیں لگاتے رہو۔ لو اب بایاں ہاتھ سرود کے نیچے سے نکال لو۔ یوں۔ اب پہلی انگلی سے یوں اس تار کو دباؤ، اور دہنے ہاتھ سے ضرب لگاؤ، دیکھا ایک نئی آواز پیدا ہوئی۔"

سبق یہیں تک پہنچا تھا کہ دوسرے کمرے سے کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔

"خاں صاحب ذرا سرود کو تھامنا، میں چائے لے آؤں۔"

چائے پینے کے بعد موسیقی کی تعلیم پھر شروع ہو گئی۔ حیدری خاں نے فیاض سے کھرج، رکھب، گندھار اور مدھم یہ چار سُر سرود پر نکلوائے۔ اس وقت فیاض کی یہ کیفیت تھی کہ فرطِ شوق سے اس کا بند بند کانپ رہا تھا، اسے یقین ہی نہ آتا تھا کہ یہ سُر میرے ہاتھوں سے نکل رہے ہیں۔ اس سرود نوازی کی دُھن میں اسے یہ بھی دھیان نہ رہا تھا کہ رات تیزی سے گزری جا رہی ہے۔ آخر دوسرے کمرے سے پھر کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ فیاض ناچار اٹھ کر اندر گیا تو اصغری نے کہا:

"شاباش ہے تم کو۔ بارہ بج لیے مگر تمھاری تن تن ختم نہ ہوئی، اب سونے بھی دو گے

کسی کو، شریفوں کا محلہ ہے، لوگ کیا کہیں گے آخر۔"

"تم سچ کہتی ہو۔ بس اب میں ختم کیا چاہتا ہوں۔"

وہ بیٹھک میں آیا تو حیدری خاں کو گدڑی اوڑھے فرش پر دراز پایا۔ سرود کو اس نے پھر کونے میں رکھ دیا تھا۔ اس سے فیاض کو کسی قدر مایوسی ہوئی۔

"بابو جی۔" حیدری خاں نے گدڑی کے اندر سے کہا۔ "رات بہت بیت لی۔ میں نے سوچا اب کہاں جاؤں گا یہیں پڑ رہتا ہوں۔ صبح ہوتے ہی چل دوں گا۔ تمہاری خیر ہو، ذرا لمپ کی بتی نیچی کر دینا پر بجھانا نہیں۔"

"بہت اچھا" فیاض نے کہا، اور وہ لمپ کی بتی نیچی کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اگلے روز صبحدم ابھی سورج نکلنے نہ پایا تھا کہ فیاض بستر سے اٹھ بیٹھک میں آ گیا۔ اس وقت سردی خاصی بڑھ گئی تھی۔ حیدری خاں اپنی گدڑی میں گٹھڑی بنا بے خبر سو رہا تھا مگر فیاض کو جیسے سردی کی کمی بیشی کا کچھ احساس ہی نہ تھا۔ وہ سرود اٹھا فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا اور ہلکے ہلکے ان ہی چاروں سُروں کو بجانے لگا جو حیدری خاں نے رات اسے سکھائے تھے۔ سرود کی آواز سن کر گٹھڑی میں حرکت ہوئی، حیدری خاں نے گدڑی میں سے سر نکالا۔ فیاض کی صورت دیکھی ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر نمودار ہوئی اور اس نے سر پھر گٹھڑی کے اندر کر لیا۔

فیاض بڑے انہماک کے ساتھ سرود پر مشق کرتا رہا۔ اس کام میں اسے ایسی طمانیت حاصل ہو رہی تھی کہ زندگی میں پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ جب اسے سرود بجاتے کافی دیر ہو گئی تو اس کی دونوں بیٹیاں نجمہ اور سلیمہ بھی اس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ دونوں نے سر اور کانوں کو اونی رنگ دار گلوبند سے ڈھک رکھا تھا۔ نجمہ کی عمر گیارہ برس تھی اور سلیمہ کی نو برس۔ دونوں بڑی پیاری پیاری بچیاں تھیں۔ وہ ایک معصومانہ ادا کے ساتھ جس میں حیرت کے ساتھ ساتھ تمسخر کا عنصر بھی شامل تھا، باپ کو یہ بڑا سا عجیب و غریب ساز بجاتے دیکھنے

لگیں۔ ہنسی ان کے ہونٹوں پر آ آ کر رک جاتی:

"میں نے کہا آج دفتر نہیں جاؤ گے؟" اصغری نے چلمن کے پیچھے سے کہا:

"اتوار ہے بھئی اتوار۔"

یہ کہہ کر فیاض پھر سرود بجانے میں مشغول ہو گیا۔ اصغری نے حیدری خاں کو گدڑی میں منہ چھپائے بے خبر سوتے دیکھا تو دوپٹہ سنبھالتے ہوئے بیٹھک میں چلی آئی اور فیاض کے کان کے قریب منہ لا کر کہنے لگی:

"یہ کب دفان ہوگا؟"

"خدا کے لیے چپ رہو۔ کہیں سن نہ لے، بڑا صاحبِ کمال آدمی ہے۔"

"ہوا کرے۔ میں پوچھتی ہوں یہ جائے گا کب؟"

"بس ناشتہ کرا کے بھیج دیں گے۔ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ کہیں اٹھ نہ بیٹھے۔"

کوئی دس بجے کے قریب حیدری خاں جمائیاں لیتا، اپنی کالی کالی انگلیوں کو جن کے ناخن بے تحاشہ بڑھے ہوئے تھے اور ان میں میل بھرا تھا، چٹخاتا ہوا اُٹھ کر بیٹھ گیا، فیاض ابھی تک سرود بجانے میں منہمک تھا۔ اس تین چار گھنٹے کے ریاض سے ان چاروں سُروں کی خوب مشق ہو گئی تھی، سُر روانی اور زور کے ساتھ نکلنے لگے تھے۔ حیدری خاں کو فیاض کے اس انہماک پر اچنبھا سا ہوا۔

"لو بابو جی۔ اب تم گنڈا بندھوانے کی فکر کرو۔ تم نے تو کمال ہی کر دیا۔ تم تو سچ مچ بجانے لگے۔ مجھے اب تک جو شاگرد ملا کم بخت گوڑھ ہی ملا۔ تم جیسا ذہین شاگرد ہو تو تین ہی مہینے میں استاد نہ بنا دوں تو میری مونچھیں منڈوا دینا، پر یہ سن رکھو میاں، میری ٹیوشن کی فیس سو روپیہ مہینہ ہے سو روپیہ مہینہ!" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔ "ایک بات ہے بابو جی، ماشاء اللہ سے تمہارے ڈیل ڈول پر یہ ساز پھبتا بھی خوب ہے، شیر کے بچے معلوم ہوتے ہو شیر کے بچے!"

ناشتہ ہولیا مگر حیدری خاں کے رخصت ہونے کے آثار دکھائی نہ دیے۔ اس پر دوسرے کمرے میں اصغری نے پھری کنڈی کھٹکھٹائی۔ فیاض اٹھ کر اندر گیا۔

''میں نے کہا آج سودا سلف نہیں آنے کا؟ تم کو توگا نے بجانے میں کھانے پینے کی بھی سدھ نہ رہی، مگر بچوں کو تو بھوکا نہ مارو۔''

''اوہو۔ میں تو بھول ہی گیا تھا۔ لو ابھی بازار جاتا ہوں۔''

جس وقت فیاض کپڑے بدل کر بیٹھک میں آیا تو حیدری خاں بھی سر پر اپنی بے پُھندنے کی میلی ٹوپی رکھ، سرود بغل میں دبا، گدڑی سنبھال چلنے کو تیار کھڑا تھا۔ فیاض کا منہ اتر سا گیا۔

''کیوں استاد کہاں چل دیے؟''

''ذرا جا کر نشہ پانی کروں گا۔'' حیدری خاں نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

''ایک روپیہ ہو تو دلوا دو۔''

فیاض فوراً اندر جا کر روپیہ لے آیا۔

''خیر ہو بابو جی کی۔' اس نے روپیہ واسکٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا ''شاید شام کو پھر آنا ہو۔''

اس نے ایک اور جمائی لی۔ واقعی اس کا نشہ ٹوٹ رہا تھا۔ وہ دروازے کی طرف چلا۔ جب تک وہ سیڑھیوں سے اتر نہ گیا فیاض برابر دروازے پر کھڑا اسے جھانکتا رہا۔ اس کے جانے کے بعد فیاض کو اچانک ایک بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ کاش حیدری خاں اپنا سرود یہیں چھوڑ جاتا اور وہ آج چھٹی کے دن خوب خوب مشقیں کرتا رہتا۔ وہ کھویا کھویا سا چارپائی پر لیٹ گیا۔ رات سے اس پر ایک مسلسل اضطراب کی کیفیت طاری تھی۔ اسے نیند بھی اچھی طرح نہ آئی تھی۔ اصغری نے اس کی اداسی کو بھانپ کر کہا:

''یہ ایکا ایکی کیسا شوق لگ گیا ہے تمہیں۔ ڈوم ڈھاڑی بنو گے ؟اور یہ موا فقیر!''

فیاض نے بات کاٹ کر کہا:

"جس کو تم موا فقیر کہتی ہو ملک میں جواب نہیں اس کا۔"

"نگلا سے نہ ہو۔ بھاڑ میں جائے، مجھے تو یہ ڈر ہے کہ نامراد نے گھر دیکھ لیا ہے۔ اب تو روز ہی آدھمکا کرے گا۔"

"کاش ایسا ہی ہو۔"

"تو کیا ساز بجانا سیکھو گے تم؟"

"کاش میں اسے سو روپیہ ٹیوشن فیس دے سکتا!"

اصغری کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

سودا سلف آیا۔ کھانا پکا۔ میاں بیوی اور لڑکیاں کھانے بیٹھیں مگر فیاض نے دو چار نوالوں کے بعد ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ اصغری نے یہ حال دیکھا تو اس کو سچ مچ تشویش ہونے لگی، پچھلے چند گھنٹوں میں وہ اسے بہت بدلا ہوا پا رہی تھی، وہ نہ تو اس کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتا۔ نہ اس کی بات غور سے سنتا اور نہ ڈھنگ کا جواب دیتا۔ لڑکیوں کی طرف بھی اس کی کچھ توجہ معلوم نہ ہوتی تھی۔

دن ڈھل گیا۔ شام ہو گئی، چراغ جل گئے مگر حیدری خاں نہ آیا۔ فیاض بار بار سیڑھیوں میں جھانکتا پھر آ کر بستر پر لیٹ جاتا پھر اٹھ بیٹھتا، اس کی بے چینی بڑھتی ہی جا رہی تھی آخر آٹھ بجے کے قریب سیڑھیوں میں کسی کے کھنکارنے کی آواز سنائی دی۔ یہ حیدری خاں ہی تھا وہ جھوم رہا تھا، اس کی آنکھیں پچھلی رات سے زیادہ سرخ ہو رہی تھی، اس کے حواس بجا نہ تھے۔ معلوم ہوتا تھا آج اس نے کچھ زیادہ ہی نشہ پانی کر رکھا ہے سرود کو دیکھ کر فیاض کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"لو میاں آ گئے ہم۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔" یہ کہہ کر وہ آلتی پالتی مار فرش پر بیٹھ گیا۔

"فیاض میاں۔ ذرا بہو سے کہہ کر چائے بنوالو۔ بس چائے ہی۔ میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

پھر نہ جانے کیا ترنگ اٹھی کہ وہ سرود بجانے لگا۔ ابتدا تو بڑے جوش و خروش سے کی مگر دو ہی منٹ بعد انگلیاں سست پڑنے لگیں اور جب اندر سے چائے بن کر آئی تو وہ سرود پر جھکا خراٹے لے رہا تھا۔

فیاض نے اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا، مگر اس پر ایسی بے ہوشی کی نیند طاری تھی کہ مطلق آنکھ نہ کھولی۔ فیاض نے سرود کو اس کی گرفت سے الگ کر کے اسے آہستگی سے فرش پر لٹا دیا اور گدڑی اوڑھا دی، پھر بڑے اشتیاق کے ساتھ سرود کو اُٹھا کر بجانا شروع کر دیا۔

اگلے روز حیدری خاں کی آنکھ صبح سویرے ہی کھل گئی، دیکھا فیاض اس کے قریب ہی بیٹھا اس کے بتائے چاروں سروں کی مشق کر رہا ہے۔ وہ سَراہے بغیر نہ رہ سکا۔

"فیاض میاں! ماشاء اللہ سے کیا سچے سُر نکال رہے ہو، واہ واہ جی خوش ہو گیا۔ آج میں تمہیں اگلے تین سُر بھی بتا دوں گا، پھر سپتک مکمل ہو جائے گی۔"

اور سچ مچ تھوڑی ہی دیر میں حیدری خاں نے پنچم، دھیوت اور نکھاد کے سُر بھی فیاس کے ہاتھ سے نکلوا دیے۔ خوشی سے فیاض کی آنکھوں میں آنسو آ گئے مگر جلد ہی بادلِ ناخواستہ اسے موسیقی کی یہ تعلیم ختم کرنی پڑی کیونکہ آٹھ بجنے والے تھے اور اسے دفتر جانے کے لیے تیار ہونا تھا۔

حیدری خاں نے ناشتے کے بعد اپنا سرود اٹھایا۔ اس دفعہ اسے روپیہ مانگنے کی ضرورت نہ پڑی کیونکہ فیاض نے خود ہی اندر سے روپیہ لا کر اسے دے دیا تھا۔

"خوش رہو میاں۔" حیدری خاں بولا۔ پھر چند لمحے تامل کر کے اس نے بڑے گمبھیر لہجہ میں کہنا شروع کیا:

"سنو میاں۔ اگر تمہیں مجھ سے سیکھنا ہے تو تمہیں میری تین شرطیں منظور کرنی

ہوں گی۔ یوں تو یہ شرطیں بہت آسان معلوم ہوں گی، پر غور کرو تو دشوار بھی بہت ہیں، کیونکہ میں سڑی مشہور ہوں، ذرا بھی کوئی کام میری مرضی کے خلاف ہو تو مجھے بڑا قلق ہوتا ہے۔ اپنی اس بدمزاجی ہی کی خاطر میں نے فقیری قبول کی ہے۔ لو اب وہ شرطیں بھی سن لو۔ اوّل یہ ہے کہ صبح کو تمہیں میرے ناشتے اور نشے پانی کا انتظام کرنا ہوگا۔ دوپہر کو میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ صبح ادھر تم دفتر کو چلے اور ادھر میں کھسکا شام کو جب تم دفتر سے آچکو گے تو میں بھی اپنے پھر پھرا کے پہنچ جایا کروں گا دوسری شرط یہ کہ رات کا کھانا ہم دونوں ساتھ ساتھ کھائیں گے اور تیسری شرط یہ کہ میں سویا یہیں بیٹھک میں کروں گا، وہ جو میں نے سو روپیہ مہینہ ٹیوشن کی بات کی تھی وہ تو میں تم سے مذاق کرتا تھا میاں۔ مجھے روپے کا لالچ ہوتا تو حویلیاں نہ کھڑی کرلی ہوتیں اب تک۔ بس یہی ہیں میری شرطیں، اگر تمہیں منظور ہوں تو بسم اللہ!"

فیاض کچھ دیر گردن جھکائے ہوئے سوچ میں ڈوبا رہا، جب اس نے سر اٹھایا تو سب سے پہلے اس کی نظر چلمن پر پڑی، حیدری خاں کی طرح اصغری بھی اس کے جواب کی منتظر تھی۔

"خان صاحب!" اس نے دھیمی آواز مگر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "مجھے آپ کی تینوں شرطیں منظور ہیں۔ آج سے آپ میرے استاد ہیں۔"

اسی شام حیدری خاں اپنا بوریا بدھنا لے فیاض کے ہاں اٹھ آیا۔ یہ بوریا بدھنا کیا تھا، ٹین کا ایک ٹرنک جس کا روغن اُڑا ہوا اور کنڈا غائب تھا۔ حیدری خاں نے اسے بند کرنے کے لیے رسّی باندھ رکھی تھی۔ ایک مٹی کا سڑا سا حقہ تھا اور ایک پیالہ۔

اصغری کے دل کو چوٹ تو لگی اور اس نے کچھ آنسو بھی بہائے مگر وہ طبعًا ان اطاعت گزار بیویوں میں سے تھی جو شوہر کو مجازی خدا سمجھتی ہیں اور ہر حال میں ان کی خوشنودی کی جویا رہتی ہیں۔ موسیقی سے میاں کے اس جنون کی حد تک بڑھے ہوئے شوق کو دیکھ کر اس

نے زیادہ مزاحمت نہ کی اور حیدری خاں کا اپنے ہاں رہنا منظور کر لیا۔ دو چار ہی دن میں اسے حیدری خاں کی سرشت کا اندازہ بھی ہو گیا۔ وہ نشہ باز تو تھا مگر بد نظر ہر گز نہ تھا۔ پرائی بہو بیٹیوں کو تاکنے جھانکنے کی اسے عادت نہ تھی۔ وہ اصغری کو ہمیشہ بہو یا بیٹی کہہ کر پکارتا اور جب تک فیاض باہر رہتا گھر کے نزدیک نہ پھٹکتا۔

سب سے پہلے فیاض کو حیدری خاں کی ظاہری حالت سدھارنے کی فکر ہوئی حیدری خاں بہتیرا منع کرتا رہا، مگر اس نے ایک نہ سنی۔ اس نے حیدری خاں کے لیے ایک نیا جوڑا سلوایا۔ اس کے پاس بڑھیا سیاہ کپڑے کی شیروانی تھی جسے وہ کبھی کبھی پہن لیا کرتا تھا۔ یہ شیروانی دو ایک جگہ سے مسک تو گئی تھی مگر ابھی اچھی حالت میں تھی۔ وہ اسے ایک درزی کے پاس لے گیا اور اس میں قطع و برید کر کے اسے خاں صاحب کے ناپ کا بنوا لیا۔ پھر اس نے خاں صاحب کی ترکی ٹوپی کو دُھلوا کے اس میں نیا پُھندنا لگوایا۔ اس نے خاں صاحب کے لیے ایک مضبوط جوتا بھی خریدا۔ پھر ان سب چیزوں کو ایک سوٹ کیس میں رکھ، خاں صاحب کو ساتھ لے ایک حمام میں پہنچا۔ پہلے تو خاں صاحب کے پٹوں کو مختصر کرایا۔ داڑھی منڈوائی، مونچھوں کو ترشوایا، ناخن کٹوائے، پھر حمام والے سے دو تین مرتبہ حمام میں پانی بھروا کے اسے خوب نہلوایا، اس کے کپڑے بدلوائے۔ جس وقت حیدری خاں حمام سے نکلا تو وہ ایک اچھا خاصا معقول انسان نظر آنے لگا۔

اس وقت دو پہر ہو چکی تھی، ظہر کا وقت قریب تھا۔ دونوں گھر واپس آ رہے تھے کہ راستے میں ایک مسجد نظر آئی۔ حیدری خاں وہیں ٹھہر گیا۔ اس نے بڑی رقت بھری آواز میں فیاض سے کہا:

"فیاض بیٹے۔ آج بڑی مدت کے بعد پاک صاف ہوا ہوں اور کپڑے بھی پاک ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ آج اپنے مولا کے سامنے ذرا سر جھکا لوں۔"

فیاض کو کچھ تعجب تو ہوا مگر اس نے خاں صاحب کی خواہش کو رد نہ کیا اور وہ دونوں

دوسرے نمازیوں کے ساتھ مسجد میں داخل ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب حیدری خاں مسجد سے نکلا تو اس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہو گئی تھی۔ لباس کی اس تبدیلی کے ساتھ ہی اس کے طور طریقے بھی ایک دم بدل گئے۔ اس کی زبان سے وہ بات بات پر دعائیہ کلمات کا نکلنا بند ہو گیا۔ اس کی بجائے اس کے انداز تخاطب میں ایک تحکم پایا جانے لگا۔ جس وقت فیاض اس کے ہمراہ بازار سے گزر رہا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مؤدب شاگرد استاد کے ساتھ ساتھ جا رہا ہو۔

اصغری نے حیدری خاں کی یہ وضع دیکھی تو حیران رہ گئی۔ اسے پہلے پہل اس شخص سے جو کراہیت محسوس ہوئی تھی وہ جاتی رہی تھی۔ حیدری خاں نجمہ، اور سلیمہ سے بڑی شفقت سے پیش آنے لگا تھا۔ فیاض اسے ہر روز نشے پانی کے لیے جو ایک روپیہ دیا کرتا تھا، وہ اس میں سے دو تین آنے بچا ان بچیوں کے لیے کچھ مٹھائی یا پھل ضرور خرید لاتا۔ بچیاں چند ہی روز میں اس سے خوب مانوس ہو گئیں۔ وہ اسے ”خاں صاحب جی“ کہہ کر بلاتیں۔

حیدری خاں اصغری کے کھانا پکانے کی بھی سچے دل سے تعریف کیا کرتا۔ وہ کہتا:

”بیٹی سبحان اللہ کیا لذیذ کھانا پکاتی ہو، جو راجوں اور نوابوں کو بھی نصیب نہیں ان کے کھانوں میں تو بس تکلف ہی تکلف ہوتا ہے۔ مزہ خاک بھی نہیں۔“

رفتہ رفتہ اس کی تعریفوں میں اصغری کو مزہ آنے لگا۔ وہ کبھی کوئی خاص چیز پکاتی تو دل میں کہتی ”دیکھیں آج خاں صاحب کیا کہتے ہیں۔“ اب خاں صاحب پر گھر میں آنے جانے کی کوئی پابندی نہ رہی تھی کیونکہ اصغری نے میاں کا عندیہ پا کر ان سے پردہ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ حیدری خاں سے کہا کرتی: ”خاں صاحب! آپ دوپہر کا کھانا بھی گھر ہی آ کر کھا لیا کریں۔“ مگر حیدری خاں کو یہ وقت تکیوں میں گزارنا زیادہ پسند تھا۔

ادھر فیاض خاں کے ذوق و شوق کو دیکھ کر حیدری خاں نے اسے پوری توجہ سے سرود کی تعلیم دینی شروع کر دی تھی۔ اس نے مہینے ڈیڑھ مہینے کے اندر ہی فیاض کو دو تین

راگوں کی الاپ اور کچھ گتیں بھی سکھادی تھیں اور اب فیاض سرود نوازی میں روز بروز ترقی کرنے لگا تھا۔ اگرچہ اس پر حیدری خاں کے اخراجات کا پورا بوجھ پڑ گیا تھا جس کی وجہ سے وہ بہت تنگدست ہو گیا تھا۔ پھر بھی وہ خوش تھا، ایسا خوش کہ زندگی میں پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

چونکہ حیدری نے بازاروں میں بیٹھ کر سرود بجانا اور رانگنا ترک کر دیا تھا اس لیے اس کا سرود زیادہ تر گھر ہی میں رہتا۔ اس نے فیاض کو پوری اجازت دے رکھی تھی کہ وہ جب تک چاہے اس کے سرود پر ریاض کرتا رہے۔ فیاض صبح کو دفتر جانے سے پہلے دو گھنٹے خوب ریاض کرتا۔ دفتر میں سارا دن اس کی انگلیاں فائلوں پر یوں دوڑتی رہتیں جیسے وہ سرود بجانے کی مشق کر رہا ہو۔ اب وہ ٹھیک پانچ بجے دفتر سے چھٹی کر لیتا اور شہر کے پُر شور بازاروں اور تنگ گلیوں سے ہوتا ہوا جلد سے جلد گھر پہنچ جاتا۔ چھٹی کے روز سرود کو ہاتھ سے چھوڑنے کی اسے قسم ہو جاتی۔

تھوڑے ہی دنوں میں حیدری خاں کے دل میں فیاض کی انسیت بے حد بڑھ گئی۔ وہ اس سے اس طرح پیش آتا جیسے باپ اپنے بیٹے سے۔ وہ اب تکیوں میں زیادہ دیر نہ ٹھہرتا بلکہ فیاض کے دفتر سے آنے سے گھنٹہ دو گھنٹہ قبل ہی وہ گلی میں اس کے مکان کے نیچے چارپائی ڈال کر بیٹھ جاتا، اکثر اوقات وہ اکیلا ہی ہوتا مگر کبھی کبھی اس کے دو تین دوست بھی اس کے ساتھ آجاتے اس پر گلی میں گانے بجانے کے لیے لمبے تذکرے چل نکلتے۔

"میاں جانتے بھی ہو لفظ موسیقی کے معنی کیا ہیں۔" حیدری خاں اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہتا۔ "اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے استاد دلدار خاں (کان کی لو چھو کر) کہا کرتے تھے کہ یہ یونانی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں ہَوا میں گرہ لگانا۔ اب تم خود ہی اندازہ کر لو کہ یہ فن کس قدر مشکل ہے۔"

پھر وہ مکان کی سیڑھیوں میں منہ کر کے پکارتا۔ "نجمہ بیٹی! دو تین پان بھیج دینا۔"

کبھی کبھی فیاض کو بھی استاد کی خوشنودی کے لیے گلی ہی میں بیٹھ جانا پڑتا، ایسے موقع

پر حیدری خاں اپنے دوستوں سے فخریہ کہتا:

"میاں! یہ عطائی اب تم سب کے گنڈا باندھے گا۔ہے تو مولوی کا بیٹا مگر خدا کی دین ہے۔ہاتھ ایسا سُریلا ہے کہ سرودیوں کے گھرانوں کے لونڈوں کا بھی کیا ہوگا۔"

اور فیاض کے ماتھے پر شرم سے پسینہ آجاتا اور وہ نیچی نظریں کیے یہ باتیں سنتا رہتا۔

ایسے میں جو لوگ گلی میں آجارہے ہوتے ان کی نظریں بے اختیار اس منڈلی پر اٹھ جاتیں اور وہ تھوڑی دور تک اِدھر مڑ مڑ کر دیکھتے ہوئے چلے جاتے۔

یہ محلہ خاص شرفا کا تھا۔زیادہ تر متوسط طبقے کے لوگ ہی یہاں رہتے تھے مگر کچھ گھر کھاتے پیتے لوگوں کے بھی تھے۔کچھ مولویوں اور ثقہ قسم کے لوگوں کے تھے۔ایک چھوڑ تین تین مسجدیں اس چھوٹے سے محلے میں تھیں۔علی الصباح مرغوں کی ککڑوں کوں کے ساتھ ہی آگے پیچھے مسجدوں سے اذانیں سنائی دینے لگتیں اور سارے محلے پر ایک تقدس کی فضا چھا جاتی۔

فیاض کو اس محلے میں رہتے دس برس ہو چکے تھے۔اس عرصے میں کبھی کسی کو اس سے وجہ شکایت پیدا نہ ہوئی تھی۔سب لوگ اسے خاموش، کم آمیز اور شریف سمجھ کر پسند کرتے تھے۔مگر اب حیدری خاں کے آجانے کی وجہ سے گھر پر دن رات گانے بجانے کا جو ہنگامہ رہنے لگا تو اس پر محلے والے ٹھٹکے۔انہیں تعجب تھا کہ فیاض نے اپنے گھر پر ایسے عجیب و غریب قماش کے لوگوں کے تسلط کو کیسے گوارا کر لیا پھر فیاض کو یہ بھی تو احساس نہیں کہ ان لوگوں کی بیہودہ حرکات کا اس کی زوجہ اور معصوم بچیوں کے اخلاق پر کتنا گھناؤنا اثر پڑتا ہوگا۔جگہ جگہ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ناراضگی کی لہر بڑھتی ہی چلی گئی، یہاں تک کہ ایک شام جب فیاض دفتر سے گھر آرہا تھا تو گلی کے موڑ پر اس کی مڈ بھیڑ محلے کی بڑی مسجد کے امام صاحب سے ہوئی۔

"السلام علیکم۔" امام صاحب نے مصافحہ کرنے کے بعد سینے پر ہاتھ رکھا اور یوں گویا

ہوئے۔ ”برادر، میں کئی دن سے آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ بات یہ ہے کہ آپ کو موسیقی سے ازحد لگاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ ہرچند اسلام میں خوش آوازی اور لحن کو بڑا درجہ حاصل ہے۔ مگر استغفر اللہ! یہ خرافات جو دن رات آپ کے گھر پر ہوتی رہتی ہیں ان کی تو کسی صورت میں بھی اجازت نہیں ہے، بلاشک آپ اپنے فعل کے خود مختار ہیں اور رب العزت کے سامنے آپ اپنے اعمال کے خود جواب دہ ہوں گے مگر یہ مسئلہ صرف آپ ہی کی ذات تک محدود نہیں ہے بلکہ پورے محلّے پر آپ کی ان خرافات کا نہایت قبیح اثر پڑ رہا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ جناب ٹھنڈے دل سے میری اس گزارش پر غور فرمائیں گے اور ان لغویات سے جلد چھٹکارا حاصل کر لیں گے۔ بس مجھے یہی کہنا تھا۔“

جس وقت فیاض گھر پہنچا تو وہ بڑا رنجیدہ اور دل شکستہ تھا۔ اتفاق سے حیدری خاں ابھی گھر نہیں آیا تھا۔ فیاض سیدھا اپنے کمرے میں جا کر چارپائی پر لیٹ گیا گو اس کا دل ریاض کرنے کے لیے بے چین تھا مگر اسے سرود کو ہاتھ لگانے کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ اصغری نے اس کی یہ کیفیت دیکھی تو پوچھا:

”نصیبِ دشمناں کچھ طبیعت خراب ہے، آپ کی؟“

”نہیں تو۔“ فیاض نے کہا مگر وہ بستر سے نہ اٹھا۔

آخر جب شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تو حیدری خاں آیا۔ فیاض سیڑھیوں ہی سے اس کے قدموں کی چاپ سن کر جلدی سے سرود اٹھا بجانے بیٹھ گیا۔ وہ اب استاد سے ڈرنے لگا تھا اور اس پر ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ اس نے یہ دو گھنٹے یونہی ضائع کر دیے۔

”فیاض بیٹے“ حیدری خاں نے بیٹھک میں قدم رکھتے ہی کہا: ”تھک گئے ہو تو ذرا دم لے لو۔ بھئی آج میں نے اپنے ایک واقف کار کے ذریعے تمہارے لیے بمبئی سے اچھا سا سرود منگوانے کا بندوبست کر ہی لیا۔ اب اللہ نے چاہا تو جلد ہی طبلچی کا انتظام بھی ہو جائے گا۔“

فیاض نے تشکر آمیز نظروں سے استاد کی طرف دیکھا مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ اس کے بعد حیدری خاں اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ اتنے ہی میں کھانے کا وقت ہو گیا اور یوں فیاض اس شام سرود سے کنارہ کش ہی رہا مگر اس کے دل میں اہلِ محلّہ اور امام مسجد کے خلاف سخت غصہ بھرا ہوا تھا۔

اگلے روز فیاض وقت سے کچھ پہلے ہی دفتر چلا گیا۔ دوپہر کو حیدری خاں ایک شخص کو ساتھ لیے ہوئے آیا، جس کی وضع قطع پنڈتوں کی سی تھی۔ پردہ کرا دیا گیا اور وہ دونوں بیٹھک میں فرش پر بیٹھ گئے۔ ٹھیک اسی وقت نجمہ اور سلیمہ استانی سے پڑھ کر گھر آئیں۔ انہوں نے حیدری خاں کو سلام کیا۔

''جیتی رہو میری بچیو۔'' حیدری خاں نے پُر شفقت لہجہ میں کہا۔ ''ہاں بھئی ذرا بستے رکھ کر اِدھر آ جاؤ۔ آج تمہارا امتحان لیں گے ہم۔''

دونوں لڑکیاں بستے ماں کے حوالے کر خاں صاحب کے سامنے ادب سے آ کر بیٹھ گئیں۔ خان صاحب نے سرود اٹھایا اور اس کا ایک سُر بجا کر نجمہ سے کہا:

''لے بیٹی ذرا اس آواز کے ساتھ اپنی آواز تو ملا۔ شاباش۔''

نجمہ کچھ شرمائی مگر خان صاحب کے اصرار پر آواز ملانے کی کوشش کرنے لگی۔

''بیٹی اونچی آواز سے کہو آ۔ آ۔ یوں۔''

لڑکی ذہین تھی، تھوڑی سی مشق کے بعد اس نے ساز کے سُر کے ساتھ اپنی آواز ملا دی، اس پر حیدری خاں نے اپنے ساتھی پنڈت کی طرف پُر معنی نظروں سے دیکھا، اور کہا:

''کیوں کالکا پرشاد جی؟''

کالکا پرشاد نے تحسین آمیز نظروں سے نجمہ کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔ اس کے بعد چھوٹی بہن سلیمہ کی باری آئی۔ وہ اپنی آپا کو آواز ملاتے دیکھ چکی تھی، اس لیے وہ جلد ہی اس

امتحان میں پوری اتر گئی۔ ایک بار پھر حیدری خاں نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر کہا:

"کیوں کالکا پرشاد جی؟"

کالکا پرشاد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے دو تین مرتبہ "ہوں ہوں" کہا، اس کے بعد حیدری خاں نے نجمہ اور سلیمہ سے کہا:

"بس جاؤ۔ شاباش شاباش! منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھاؤ۔"

جب لڑکیاں چلی گئیں تو وہ کالکا پرشاد سے کہنے لگا:

"شام کو ان کا باپ آئے گا تو اس سے بات کروں گا۔" پھر وہ تھوڑی دیر کے بعد اپنے دوست کو لے کر چلا گیا۔

اس شام جب فیاض دفتر سے آیا تو اصغری بھری بیٹھی تھی، اسے دیکھتے ہی برس پڑی:

"دیکھو جی اب تک تو ہم تمہاری سب باتیں مانتے چلے گئے تھے مگر اب معاملہ حد سے بڑھ گیا ہے۔ میں اپنی لڑکیوں کو ہرگز ہرگز گانا نہ سیکھنے دوں گی۔"

"کچھ بتاؤ تو سہی ہوا کیا۔ تم تو معموں میں باتیں کر رہی ہو۔"

"آج دوپہر کو خان صاحب آئے تھے۔ ان کے ساتھ کوئی پنڈت جی بھی تھے۔ نجمہ اور سلیمہ بھی اسی وقت اسکول سے آئی تھیں۔ پہلے خان صاحب نے دونوں لڑکیوں کو گوایا، پھر نہ جانے چپکے چپکے آپس میں کیا باتیں کرتے رہے۔ میں چلمن میں سے سب دیکھتی رہی۔ سنو جی! اگر خان صاحب چاہیں کہ میری معصوم بچیاں رنڈیوں کی طرح ناچنے گانے لگیں تو یہ ہونے کا نہیں، چاہے مجھے ان کو لے کر میکے ہی کیوں نہ بیٹھ رہنا پڑے۔"

فیاض کچھ کہنے ہی کو تھا کہ اتنے میں حیدری خاں بھی آ گیا۔

"فیاض بیٹے۔" اس نے بیٹھک میں قدم رکھتے ہی کہنا شروع کیا۔ "اللہ تمہاری عمر میں برکت دے۔ میں تم سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں اور اصغری بیٹی اللہ تیرا سہاگ قائم رکھے، تو بھی کان دھر کے سن۔ تم دونوں نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ دونوں

بیٹیاں ماشاء اللہ سے دو تین برس میں جوان ہونے کو ہیں۔ تم نے کچھ ان کی شادی بیاہ کی بھی فکر کی۔ مجھے تو نظر آتا نہیں کہ تم نے ان کے لیے کچھ جہیز جمع کیا ہو اور پھر تم کر بھی کیا سکتے ہو۔ ڈیڑھ سو روپلی کی بھلا حقیقت ہی کیا ہے۔ آخر تم ان معصوم بچیوں کو کس طرح ٹیگ لگاؤ گے۔ کسی کنجڑے قصائی کو تو خدانخواستہ تم بیٹی دینے سے رہے۔ رہے دفتروں کے بابو جن کو تیس چالیس روپلی سے زیادہ تنخواہ نہیں ملتی، ان کو لڑکی دینا ایسا ہی ہے جیسا بھاڑ میں جھونک دینا۔ بچیاں ماشاء اللہ سے ایسی خوبصورت ہیں جیسے چاند کا ٹکڑا۔ ان کو تو کسی قدر دان رئیس کے ہاں رانی بن کر راج کرنا چاہیے مگر میاں صاحبزادے امیر لوگ شادی بیاہ کے معاملے میں بڑی مین میخ نکالتے ہیں لیکن خوبصورت ہو، پڑھی لکھی ہو، بہت سا جہیز لائے اور پھر اسے کوئی ہنر بھی آتا ہو جیسے گانا یا مصوری۔ مگر ان بچیوں میں سوائے صورت شکل کے اور رکھا ہی کیا ہے۔

"مجھے کئی دن سے اس بات کی بڑی فکر تھی۔ تم دونوں میاں بیوی تو سو جاتے تھے مگر میں رات رات بھر اس فکر میں غلطاں پیچاں رہتا تھا۔ آخر سوچ سوچ کر میں نے یہ ترکیب نکالی ہے کہ ان لڑکیوں کو تھوڑا سا ناچ گانا سکھا دیا جائے۔ تم جانو آج کل امیر امرا میں ناچ گانے کا شوق کس قدر ترقی پر ہے۔ پہلے ہندوؤں نے یہ بات شروع کی تھی۔ ان کی دیکھا دیکھی اب مسلمان بھی اپنی بیٹیوں کو گانا بجانا سکھلانے لگے ہیں۔

"میں دوپہر کو پنڈت کالکا پرشاد کو لایا تھا۔ وہ شہر کے نامی کتھک ہیں۔ نواب شمشیر علی خاں کی لڑکیاں، رائے بہادر ستنام کی لڑکیاں، چودھری نیک عالم کی لڑکیاں آج کل انہی سے سیکھ رہی ہیں۔ ان تین گھرانوں کو تو میں جانتا ہوں۔ اللہ جانے اور کتنے گھرانوں میں جاتے ہوں گے۔

"تو میاں صاحبزادے، خدا شاہد ہے تم مجھے بیٹوں سے بھی زیادہ عزیز ہو اور اصغری بیٹی تو بھی میری سگیوں سے کم نہیں۔ میں نے جو بات سوچی ہے تمہارے ہی بھلے کے لیے

سوچی ہے۔ میرے نہ آل ہے نہ اولاد، جو کچھ ہو تمہیں ہو۔ پھر میں تمہارا بُرا کیوں چاہوں گا۔"

اس تقریر کے آخری حصے کے دوران حیدری خاں کی آواز شدتِ جذبات سے بھرا گئی تھی اور ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تھے۔ آخر وہ کرتے کے دامن سے آنسو پونچھتا ہوا اُٹھا اور یہ کہتا ہوا سیڑھیوں کی طرف چلا:

"تم دونوں خوب سوچ سمجھ لو۔ اگر منظور ہو تو کل ہی سے بچیوں کی تعلیم شروع کرادی جائے ... لو اب میں چلتا ہوں۔ میرے کچھ دوست نیچے کھڑے ہیں، مجھے ان سے کام ہے۔ میں ذرا دیر میں آؤں گا۔"

اس کے جانے کے بعد فیاض اور اصغری دیر تک خاموش بیٹھے ایک دوسرے کا منہ تکا کیے۔ آخر فیاض نے سکوت توڑا:

"کہو کیا کہتی ہو؟"

"میری سمجھ میں تو کچھ آتا نہیں۔" اصغری نے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے کہ خاں صاحب جو کچھ کہتے ہیں درست ہی کہتے ہیں۔ واقعی ہم نے بچیوں کے مستقبل کا کچھ خیال نہیں کیا اور جو تمہیں اس میں برائی نظر آتی ہو تو ہمارے ہوتے کوئی کیا کر سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔"

"میں کچھ نہیں جانتی۔ تم مختار ہو، جو چاہے کرو۔"

حیدری خاں رات کو کوئی دس بجے کے قریب گھر آیا۔ اصغری نے اس کے اور فیاض کے لیے کھانا گرم کیا۔ کھانے کے دوران میں فیاض نے مسجد کے امام سے اپنی ملاقات کا حال سنایا۔ حیدری سنتے ہی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"وہ تو میں پہلے ہی سمجھے ہوئے تھا بیٹے، مگر تم کوئی فکر نہ کرو، اپنے کام سے کام رکھو۔ جب دیکھیں گے کہ کوئی چارہ نہیں تو اس محلّے ہی کو چھوڑ دیں گے۔"

یہ سن کر فیاض کی کچھ کچھ ہمت بندھی اور اس نے پھر ریاض شروع کر دیا۔

اس واقعہ کے دو دن بعد لڑکیوں کے ناچ گانے کی تعلیم شروع ہو گئی۔ اب محلّے والوں کے کانوں میں ظہر سے لے کر عصر تک کچھ اس قسم کی آوازیں، گھنگھروؤں کی جھنکار کیساتھ مل کر سنائی دینے لگیں۔

تاتت تھئی تھئی۔ تاتت تھئی تھئی۔ ایک دو تین چار۔ ایک دو تین چار۔ تاتت تھئی تھئی۔ تاتت تھئی تھئی۔ ایک دو تین۔ ایک دو تین۔

اگلے روز جب نجمہ اور سلیمہ استانی کے ہاں پڑھنے گئیں تو پانچ ہی منٹ بعد بستے اٹھائے واپس آگئیں۔ استانی نے بچیوں سے کہا تھا کہ تم یہاں نہ آیا کرو۔

اسی روز شام کو مالکِ مکان فیاض سے ملنے آیا۔ وہ سر جھکائے تھا۔ شرم کے مارے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ پچھلے دس برس میں اسے فیاض سے کسی قسم کی شکایت پیدا نہ ہوئی تھی، نہ فیاض نے کبھی مکان کی مرمّت کے لیے کہا تھا نہ سفیدی کرانے کے لیے اور کرایہ ہر مہینے بلاناغہ پیشگی ہی اس کی دکان پر پہنچ جاتا تھا۔

"معاف کیجئے گا فیاض صاحب۔" آخر اس نے زبان کھولی۔ "میں آپ کی بڑی عزت کرتا ہوں خواہ آپ کو گانے بجانے کا شوق ہی کیوں نہ ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ خود مجھے بھی موسیقی سے دلچسپی ہے مگر کیا کروں ان کم بخت محلّے والوں نے میری دکان پر آ آ کر میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ آپ کے ہاں کا نقشہ ایسے بھیانک طریقے سے کھینچتے ہیں گویا محلّے بھر کی بہو بیٹیوں کی عزت خطرے میں پڑ گئی ہے میں جانتا ہوں کہ یہ سراسر جھوٹ ہے مگر اتنے آدمیوں کے سامنے مجھ اکیلے کی کچھ پیش نہیں چلتی۔ آپ جیسے شریف اور ایمان دار کرایہ دار کو گنوا کر مجھے بڑا دکھ ہو گا مگر کیا کروں مجبور ہوں، امید ہے آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔"

"میں سمجھ گیا ہوں۔" فیاض نے جواب دیا۔ "آپ فکر نہ کیجئے، میں ہفتے بھر میں مکان خالی کر دوں گا۔"

جب یہ ماجرا حیدری خاں کے کانوں تک پہنچا تو وہ بول اٹھا:

''چلو یہ جھگڑا بھی نمٹا۔ فیاض بیٹے ہم خود اس مکان میں رہنا نہیں چاہتے۔ شہر میں ایک سے ایک اچھا مکان موجود ہے اور کرایہ بھی کم۔''

''مگر خاں صاحب! مجھے مکان تلاش کرنے کی فرصت کہاں!''

''تم فکر نہ کرو میری جان۔ آج کیا دن ہے، جمعرات۔ بس اسی اتوار تک میں خود مکان تلاش کرلوں گا۔ اس دن تمہیں چھٹی بھی ہوگی۔ آسانی سے اسباب لے چلیں گے۔''

حیدری خاں نے سچ مچ اتوار سے پہلے ہی مکان تلاش کرلیا۔ وہ فیاض کو مکان دکھانے لے گیا۔ جس علاقے میں یہ مکان واقع تھا، وہ شہر سے الگ تھلگ مضافات کی سی کیفیت رکھتا تھا۔ فیاض کا اس علاقے میں کبھی جانا نہیں ہوا تھا۔ بازار خوب چوڑا تھا۔ آمنے سامنے اونچے اونچے مکان، نیچے دکانیں، کسی میں بنیا، کسی میں قصاب کسی میں کنجڑا، بساطی تنبولی بزاز، ان سب اشیاء کی دکانیں جنہیں خریدنے کے لیے فیاض کو لمبی لمبی گلیاں طے کرنی پڑتی تھیں۔ علاوہ ازیں جوتے والوں کی دکانیں لانڈری والے، کیمسٹ، ایک کارخانہ بسکٹ بنانے کا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک یتیم خانہ تھا اور ایک جگہ حکیم بھورے میاں کے مطب کا بورڈ لگا تھا۔

ان دکانوں کے اوپر خوبصورت پختہ مکان تھے، کوئی تین منزل کا تو کوئی چار منزل کا۔ زیادہ تر مکانوں کے دروازے اور کھڑکیاں یا تو بند تھیں یا ان پر چلمنیں پڑی تھیں۔

اسی نواح میں حیدری خاں نے فیاض کے لیے دو کمروں کا ایک فلیٹ تلاش کیا تھا۔ یہ عمارت کی دوسری منزل پر تھا جس کے نیچے ایک ایرانی چائے خانہ تھا۔ فلیٹ کے دونوں کمرے صاف ستھرے اور کشادہ تھے۔ بجلی اور نل کا انتظام، ٹائلوں کے فرش، چوڑے چوڑے دروازے، کھلی کھلی کھڑکیاں، ان کے روشن دانوں میں سرخ سبز نیلے پیلے رنگوں کے شیشے کٹاؤدار پھولوں کی وضع کے لگے تھے۔ بازار کے رخ ایک خوبصورت بالکونی تھی اسے دیکھ کر فیاض کی باچھیں کھل گئیں۔ یہاں وہ گرمی کے دنوں میں چھوٹی سی چوکی بچھا کر

سرود کا ریاض کیا کرے گا۔ وہ مارے خوشی کے استاد سے لپٹ گیا۔

"فیاض بیٹے!" حیدری خاں نے اس کے خیال کو بھانپتے ہوئے کہا۔ "یہاں تمہیں کوئی نہیں روکے گا۔ جی چاہے تو ساری رات سرود بجاتے رہو۔"

فیاض خوشی خوشی اصغری کو یہ مژدہ سنانے گھر آیا۔ مکان کی اتنی بہت خوبیاں سن کر اصغری اور نجمہ و سلیمہ کو بھی اس کو دیکھنے کا اشتیاق ہوا، مگر حیدری خاں نے کہا:

"بس ایک ہی دفعہ چل کے دیکھ لینا۔ فوراً اسباب باندھنا شروع کر دو۔ تاکہ تیسرے پہر تک وہاں پہنچ جائیں۔"

دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر فیاض، حیدری خاں، اصغری اور دونوں لڑکیاں جلدی جلدی اسباب باندھنے میں مصروف ہو گئیں۔ پچھلے دس برس میں نہ جانے کیا کیا ضروری اور غیر ضروری سامان اکٹھا ہو گیا تھا جس کا چھانٹنا مشکل تھا۔ صلاح یہ ٹھہری کہ نئے مکان میں پہنچ کر چھانٹ لیں گے۔ فی الحال تو سارے کا سارا جوں کا توں وہاں پہنچا دیا جائے، پھر بھی سامان باندھتے باندھتے اور ٹھیلہ آتے آتے چار بج ہی گئے، جس وقت یہ لوگ اپنے نئے مکان میں پہنچے تو شام ہونے کو تھی۔

فیاض، اس کی بیوی اور بیٹیاں صبح سے کام کرتے کرتے ایسی تھک گئی تھیں کہ انہوں نے مکان کا جائزہ بھی نہ لیا۔ چاروں ایک کمرے میں بڑی سی دری بچھا اس پر پڑ رہے مگر حیدری خاں کے چہرے پر تھکاوٹ کے کچھ آثار ظاہر نہ ہوتے تھے۔ وہ کہیں جانے کی سوچ رہا تھا۔

"فیاض بیٹے اندر سے کنڈی لگا لینا۔" اس نے سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ جب تک میں نہ آؤں، کنڈی نہ کھولنا۔ اگر مجھے دیر ہو جائے تو گھبرانا نہیں۔"

یہ کہہ کر وہ سیڑھیوں سے اتر گیا۔ اس کے جانے کی دیر تھی کہ چاروں کو نیند نے

آ دبوچا اور وہ ڈھائی گھنٹے خوب بے خبر سوتے رہے۔ سب سے پہلے فیاض کی آنکھ کھلی۔ اس نے خود کو گھٹاٹوپ اندھیرے میں پایا۔ وہ جانتا تھا کہ دیوار پر بجلی کا بٹن کہاں ہے مگر اس خیال سے اس نے روشنی نہ کی کہ کہیں اصغری اور بچیوں کی نیند نہ اُچٹ جائے۔ وہ اندھیرے میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا بالکونی کی طرف گیا اور اس کے آہنی کٹہرے پر جھک کر اس نواح کی سیر دیکھنے لگا۔ آمنے سامنے اغل بغل، نیچے اوپر جس طرف بھی اس کی نظر گئی اسے ایک نئی کیفیت دکھائی دی۔ اس نے دیکھا کہ آس پاس کے تمام فلیٹوں میں بجلی کی تیز روشنی ہو رہی ہے اور کمروں کے دروازے اور کھڑکیاں جن پر دن کو چقیں پڑی تھیں، اب چوپٹ کھلے ہیں۔ جو کمرہ اس کے فلیٹ کے عین سامنے تھا، اس میں اجلی چاندنی کا فرش بچھا ہے۔ گاؤ تکیے لگے ہیں۔ پاندان، خاصدان پیچسدان قرینے سے رکھے ہیں اور وہ سارا اہتمام ہے جو کسی دعوت کے موقع پر کیا جاتا ہے مگر یہ کمرہ ابھی اپنے مکینوں سے خالی ہے۔

ادھر سے ہٹ کر اب اس کی نظر نیچے بازار پر پڑی۔ اس وقت وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ وہ دکانیں جن میں دن کو آٹا، دال، گھی، گوشت، سبزی، کپڑا، سونا چاندی، تانبا، پیتل، بکتا تھا وہ تو سب بند تھیں اور ان کے ٹھکانوں پر گل فروش چنگیروں میں طرح طرح کے ہار گجرے کنگن چمپا کلی وغیرہ کے پھولوں کے گہنے سجائے دکان سجائے بیٹھے تھے۔ گندھیوں نے اپنی بڑی بڑی پٹاریاں کھول رکھی تھیں۔ ان کی چھوٹی چھوٹی عطر کی رنگ برنگی شیشیاں دور سے چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

ایک جگہ مٹھائی کے بڑے بڑے تھال چنے ہوئے تھے جن میں قسم قسم کے لڈو، قلاقند، اور جلیبیاں سجی تھیں۔ امرتی اور برفی کے قلعے بنے تھے۔ یتیم خانے کا پھاٹک بند تھا، اس کے باہر اس وقت نظر بندی کا تماشہ ہو رہا تھا۔ ایک جگہ ایک نوجوان جو شاید نابینا تھا، گاندھی ٹوپی پہنے ہارمونیم بجا کر گا رہا تھا۔ پاس ہی چادر پر اکنیاں دونیاں ٹکے پیسے بکھرے پڑے تھے۔ ہر شخص خوش طبعی کے سبھاؤ میں تھا۔ میلے کا سا سماں بندھا ہوا تھا۔ بازار میں

خاصی بھیڑ تھی۔ جب کوئی بڑی سی چمکتی ہوئی موٹر پوں پوں کرتی ہوئی گزرتی تو لوگ سامنے سے یوں ہٹ جاتے جیسے سمندر میں دخانی کشتی چلنے سے جھاگ چھٹ جاتے ہیں۔

فیاض کو اپنے فلیٹ کے سامنے جو کمرہ خالی نظر آیا تھا۔ اب اس میں چہل پہل ہونے لگی تھی۔ لوگ آتے جاتے تھے اور گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھتے جاتے تھے۔ یکبارگی طبلے پر تھاپ پڑی اور ایک غیرت ناہید رو پہلی پشواز پہنے چھم سے محفل میں کودی اور نرت کرنے لگی۔ ہاتھ پاؤں کی چلت پھرت اس غضب کی تھی کہ ہر ہر ادا پر دیکھنے والوں کے دل مسلے جاتے۔ تحسین کی صدائیں بلند ہوتیں مگر رقاصہ کو اپنے حسن اور اپنے کمالِ فن پر ایسا ناز تھا کہ وہ ہر توصیف سے بے نیاز معلوم ہوتی تھی۔

فیاض ایک حیرت کے عالم میں بالکونی پر کھڑا یہ ماجرا دیکھ رہا تھا کہ اسے محسوس ہوا جیسے اندھیرے میں کوئی سایہ سا اس کے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا ہے۔ فیاض کچھ لمحے ساکت و جامد کھڑا رہا۔ سائے نے بھی کوئی حرکت نہ کی۔ آخر اس نے گردن پھیر کر دیکھا تو وہ اس کی بیوی اصغری تھی۔

بہروپیا

یہ اس زمانے کی بات ہے جب میری عمر بس کوئی تیرہ چودہ برس کی تھی، ہم جس محلے میں رہتے تھے وہ شہر کے ایک بارونق بازار کے پچھواڑے واقع تھا۔ اس جگہ زیادہ تر درمیانے طبقے کے لوگ یا غریب غربا ہی آباد تھے البتہ ایک پرانی حویلی وہاں ایسی تھی جس میں اگلے وقتوں کی نشانی کوئی صاحبزادہ صاحب رہا کرتے تھے، ان کے ٹھاٹھ تو کچھ ایسے امیرانہ نہ تھے مگر اپنے نام کے ساتھ، "رئیس اعظم" لکھنا شاید وہ اپنا فرضِ منصبی سمجھتے تھے۔ اَدھیڑ عمر بھاری بھرکم آدمی تھے۔ گھر سے باہر ذرا کم ہی قدم نکالتے، ہاں ہر روز تیسرے پہر حویلی کے احاطہ میں اپنے احباب کے جھرمٹ میں بیٹھ کر گپیں اڑانا اور زور زور سے قہقہے لگانا ان کا دل پسند مشغلہ تھا۔

ان کے نام کی وجہ سے اکثر حاجت مند، یتیم خانوں کے ایجنٹ اور طرح طرح کے چندہ اُگاہنے والے ان کے دروازے پر سوالی بن کر آیا کرتے۔ علاوہ ازیں جادو کے پروفیسر، رمال، نجومی، نقل، بھاٹ اور اسی قماش کے دوسرے لوگ بھی اپنا ہنر دکھانے اور انعام اکرام پانے کی توقع میں آئے دن ان کی حویلی میں حاضری دیا کرتے۔

جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں، ایک بہروپیا بھی طرح طرح کے روپ بھر کر ان کی حویلی میں آیا کرتا۔ کبھی خاکی کوٹ پتلون پہنے، چمڑے کا تھیلا گلے میں ڈالے، چھوٹے

چھوٹے شیشوں اور نرم کمانیوں والی عینک آنکھوں پر لگائے چٹھی رساں بنا ہر ایک سے بیرنگ خط کے دام وصول کر رہا ہے۔ کبھی جٹادھاری سادھو ہے۔ لنگوٹ کسا ہوا جسم پر بھبوت رمائی، ہاتھ میں لمبا سا چمٹا، سرخ سرخ آنکھیں نکال نکال "بم مہادیو" کا نعرہ لگا رہا ہے۔ کبھی بھنگن کے روپ میں ہے جو سرخ لہنگا پہنے، کمر پر ٹوکرا، ہاتھ میں جھاڑو لیے جھوٹ موٹ پڑوسنوں سے لڑتی بھڑتی آپ ہی آپ بکتی جھکتی چلی آ رہی ہے۔

میرے ہم سبقوں میں ایک لڑکا تھا مدن۔ عمر میں تو وہ مجھ سے ایک آدھ برس چھوٹا ہی تھا مگر قد مجھ سے نکلتا ہوا تھا، خوش شکل بھولا بھالا مگر ساتھ ہی بچوں کی طرح ٹلا کا ضدی۔ ہم دونوں غریب ماں باپ کے بیٹے تھے۔ دونوں میں گہری دوستی تھی۔ اسکول کے بعد کبھی وہ میرے محلّے میں کھیلنے آجاتا، کبھی میں اس کے ہاں چلا جاتا۔

ایک دن سہ پہر کو میں اور مدن صاحبزادہ صاحب کی حویلی کے باہر سڑک پر گیند سے کھیل رہے تھے کہ ہمیں ایک عجیب سی وضع کا بوڑھا آدمی آتا دکھائی دیا۔ اس نے مہاجنوں کے انداز میں دھوتی باندھ رکھی تھی، ماتھے پر سیندھور کا ٹیکہ تھا۔ کانوں میں سنہری بالے، بغل میں ایک لمبی سی سرخ بہی داب رکھی تھی۔ یہ شخص حویلی کے پھاٹک پر پہنچ کر پل بھر کو رُکا، پھر اندر داخل ہو گیا۔

میں فوراً جان گیا، یہ حضرت سوائے بہروپیے کے اور کون ہو سکتے تھے مگر مدن ذرا ٹھٹکا۔ اس نے بہروپیے کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"مدن جانتے ہو ابھی ابھی اس حویلی میں کون گیا ہے؟"

"ہاں، کیوں نہیں۔"

"بھلا بتاؤ تو؟"

"کوئی مہاجن تھا۔"

"یہاں کیوں آیا؟"

''میں کیا جانوں۔ تمہارے اس رئیس اعظم نے کچھ قرض ورض لیا ہوگا اس سے۔''

''ارے نہیں پگلے یہ تو بہروپیا ہے بہروپیا!''

''بہروپیا؟'' مدن نے کچھ حیرانی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''بہروپیا کیا ہوتا ہے؟''

''ارے تم نہیں جانتے۔ یہ لوگ طرح طرح کے روپ بھر کر امیر امراء کو اپنا کمال دکھاتے ہیں اور ان سے انعام لیتے ہیں۔''

''تو کیا یہ شخص روز آتا ہے؟''

''نہیں، ہفتے میں بس ایک دو بار۔ روز روز آئے تو لوگ پہچان جائیں، بہروپیوں کا کمال تو بس اسی میں ہے کہ ایسا سوانگ رچائیں کہ لوگ دھوکا کھا جائیں۔ اور سچ سمجھنے لگیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ شہر میں دو تین مہینے سے زیادہ نہیں ٹکتے۔''

''کیا ان کو ہر دفعہ انعام ملتا ہے؟''

''نہیں تو۔ یہ جب پندرہ بیس مرتبہ روپ بھر چکتے ہیں تو آخری بار سلام کرنے آتے ہیں، بس یہی وقت انعام لینے کا ہوتا ہے۔''

''بھلا کتنا انعام ملتا ہوگا انہیں؟''

''کچھ زیادہ نہیں۔ کہیں سے ایک روپیہ کہیں سے دو روپے اور کہیں سے کچھ بھی نہیں۔ یہ رئیس اعظم صاحب اگر پانچ روپے بھی دے دیں تو بہت غنیمت جانو۔ بات یہ ہے کہ آج کل اس فن کی کچھ قدر نہیں رہی۔ اگلے وقتوں کے امیر لوگ تو اس قسم کے پیشے والوں کو اتنا انعام دے دیا کرتے تھے کہ انہیں مہینوں روزی کی فکر نہ رہتی تھی۔ مگر آج کل تو یہ بے چارے بھوکوں مر رہے ہوں گے اور......''

میں کچھ اور کہنے ہی کو تھا کہ اتنے میں وہی بہروپیا مہاجن بنا ہوا حویلی کے پھاٹک سے نکلا۔ مدن جو کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا، اسے دیکھ کر چونک پڑا۔ بہروپیا ہماری طرف دیکھ کر مسکرایا اور پھر بازار کی طرف چل دیا۔

بہروپئے کا پیٹھ موڑنا تھا کہ مدن نے اچانک میرا ہاتھ زور سے تھام لیا اور دھیمی آواز میں کہنے لگا:

"اسلم آؤ اس بہروپئے کا پیچھا کریں اور دیکھیں کہ وہ کہاں رہتا ہے، اس کا گھر کیسا ہے۔ اس کا کوئی نہ کوئی میک اپ روم تو ہوگا ہی، شاید اس تک ہماری رسائی ہو جائے، پھر میں یہ بھی دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنی اصلی صورت میں کیسا لگتا ہے۔"

"مدن دیوانے نہ بنو۔" میں نے کہا "نجانے اس کا ٹھکانہ کدھر ہے۔ ہم کہاں مارے مارے پھریں گے۔ نجانے ابھی اس کو اور کن کن گھروں میں جانا ہے ..."

مگر مدن نے ایک نہ سنی۔ وہ مجھے کھینچتا ہوا لے چلا۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس کے مزاج میں طفلانہ ضد تھی۔ ایسے لوگوں کے سر پر جب کوئی دُھن سوار ہو جائے تو جب تک اسے پورا نہ کر لیں نہ خود چین سے بیٹھتے ہیں نہ دوسروں کو چین لینے دیتے ہیں۔ ناچار میں اس کی دوستی کی خاطر اس کے ساتھ ہو لیا۔

یہ گرمیوں کی ایک شام تھی، کوئی چھ کا عمل ہوگا، اندھیرا ہونے میں ابھی کم سے کم ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ میں دل ہی دل میں حساب لگانے لگا۔ ہمارا علاقہ شہر کے عین وسط میں ہے۔ یہاں پہنچتے پہنچتے اگر بہروپیے نے آدھے شہر کا احاطہ بھی کر لیا ہو تو ابھی آدھا شہر باقی ہے جہاں اسے اپنی فن کی نمائش کے لیے جانا ضروری ہے۔ چنانچہ اگر زیادہ نہیں تو دو گھنٹے تو ضرور ہی ہمیں اس کے پیچھے پیچھے چلنا پڑے گا۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ایک سے دوسرے بازار میں گزرتا جا رہا تھا۔ راستے میں جب کبھی کوئی بڑی حویلی یا کسی مکان کا دیوان خانہ نظر آتا تو وہ بلا تکلف اندر داخل ہو جاتا اور ہمیں دو تین منٹ باہر اس کا انتظار کرنا پڑتا۔ بعض بڑی بڑی دکانوں میں بھی اس نے حاضری دی مگر وہاں وہ ایک آدھ منٹ سے زیادہ نہ رکا۔

شفق کی کچھ کچھ سرخی ابھی آسمان پر باقی تھی کہ ان حاضریوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

کیونکہ بہروپیا اب شہر کے دروازے سے باہر نکل آیا تھا اور فصیل کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا۔

ہم نے اب تک بڑی کامیابی سے اپنے کو اس کی نظروں سے اوجھل رکھا تھا۔ اس میں بازاروں کی ریل پیل سے ہمیں بڑی مدد ملی تھی مگر اب ہم ایک غیر آباد علاقے میں تھے جہاں اکا دکا آدمی ہی چل پھر رہے تھے چنانچہ ہمیں قدم قدم پر یہ دھڑکا تھا کہ کہیں اچانک وہ گردن پھیر کر ہمیں دیکھ نہ لے۔ بہر حال ہم انتہائی احتیاط کے ساتھ اور اس سے خاصی دور رہ رہ کر اس کا تعاقب کرتے رہے۔

ہمیں زیادہ چلنا نہ پڑا۔ جلد ہی ہم ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے جہاں فصیل کے ساتھ ساتھ خانہ بدوشوں اور غریب غربا نے پھونس کے جھونپڑے ڈال رکھے تھے۔ اس وقت ان میں سے کئی جھونپڑوں میں چراغ جل رہے تھے۔ بہروپیا ان جھونپڑوں کے سامنے سے گزرتا ہوا آخری جھونپڑے کے پاس پہنچا جو ذرا الگ تھلگ تھا۔ اس کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ جھونپڑے کے باہر ایک ننھی سی لڑکی جس کی عمر کوئی تین برس ہوگی اور ایک پانچ برس کا لڑکا زمین پر بیٹھے کنکریوں سے کھیل رہے تھے، جیسے ہی انہوں نے بہروپیے کو دیکھا، وہ خوشی سے چلّانے لگے: "ابا جی آگئے! ابا جی آگئے!" اور وہ اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ بہروپیے نے ان کے سروں پر شفقت سے ہاتھ پھیرا، پھر وہ ٹاٹ کا پردہ سرکا کر بچوں سمیت جھونپڑے میں داخل ہو گیا۔ میں نے مدن کی طرف دیکھا۔

"کہو اب کیا کہتے ہو؟"

"ذرا رکے رہو۔ وہ ابھی مہاجن کا لباس اتار کر اپنے اصلی روپ میں باہر نکلے گا۔ اتنی گرمی میں اس جھونپڑے کے اندر کہاں بیٹھا جائے گا۔"

ہم نے کوئی پندرہ بیس منٹ انتظار کیا ہو گا ٹاٹ کا پردہ پھر سرکا اور ایک نوجوان آدمی ململ کی دھوتی کرتا پہنے پٹیاں جمائے، سر پر دو پلی ٹوپی ایک خاص انداز سے ٹیڑھی رکھے

جھونپڑے سے باہر نکلا، بوڑھے مہاجن کی سفید مونچھیں غائب تھیں اور ان کے بجائے چھوٹی چھوٹی سیاہ آنکھیں اس کے چہرے پر زیب دے رہی تھیں۔

"یہ وہی ہے۔" یکبارگی مدن چلا اٹھا۔"وہی قد، وہی ڈیل ڈول۔"

اور جب ہم اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے تو اس کی چال بھی ویسی ہی تھی جیسی مہاجن کا پیچھا کرنے میں ہم نے مشاہدہ کی تھی۔ میں اور مدن حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔اب کے اس نے یہ کیسا روپ بھرا؟ اس وقت وہ کن لوگوں کو اپنے بہروپ کا کمال دکھانے جارہا ہے؟"

وہ شخص کچھ دور فصیل کے ساتھ ساتھ چلتا رہا، پھر ایک گلی میں ہوتا ہوا دوبارہ شہر کے اندر پہنچ گیا۔ ہم بدستور اس کے پیچھے لگے رہے۔ وہ بازار میں چلتے چلتے ایک پنواڑی کی دکان پر رک گیا۔ ہم سمجھے کہ شاید پان کھانے رکا ہے مگر نہ تو اس نے جیب سے پیسے نکالے اور نہ پنواڑی نے اسے پان بنا کے دیا۔ البتہ ان دونوں میں کچھ بات چیت ہوئی جسے ہم نہیں سن سکے۔ پھر ہم نے دیکھا کہ پنواڑی دکان سے اتر آیا اور بہروپیا اس کی جگہ گدی پر بیٹھ گیا۔

پنواڑی کے جانے کے بعد اس دکان پر کئی گاہک آئے جن کو اس نے سگریٹ کی ڈبیاں اور پان بنا بنا کے دیے۔ وہ پان بڑی چابکدستی سے بناتا تھا جیسے یہ بھی کوئی فن ہو۔

ہم کوئی آدھے گھنٹے تک بازار کے نکڑ پر کھڑے یہ تماشہ دیکھتے رہے اس کے بعد ایک دم ہمیں سخت بھوک لگنے لگی اور ہم وہاں سے اپنے اپنے گھروں کو چلے آئے۔

اگلے روز اتوار کی چھٹی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ صبح آٹھ نو بجے تک سو کر کل کی تکان اُتاروں گا مگر ابھی نور کا تڑکا ہی تھا کہ کسی نے میرا نام لے کر پکارا اور دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ نیچے گلی میں جھانک کر دیکھا تو مدن تھا۔

میں پیچ و تاب کھاتا سیڑھیوں سے اترا۔

"اسلم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

"کیوں کیا بات ہے؟"

"جلدی کرو، کہیں بہروپیا صبح ہی صبح گھر سے نہ چل دے۔"

"بھئی تم بھی کمال کرتے ہو۔ اب اس کا خیال چھوڑ دو مدن۔ پھر رات تم نے اسے دیکھ بھی تو لیا تھا۔"

"واہ، میں نے بہروپیے کو تھوڑا ہی دیکھا تھا۔ وہ تو پنواڑی تھا۔"

اور اس نے مجھے ایسی التجا بھری نظروں سے دیکھا کہ میرا دل فوراً پسیج گیا۔

جب، ہم کبھی دوڑتے، کبھی تیز تیز قدم اٹھاتے فصیل کی طرف جا رہے تھے تو مدن نے مجھے بتایا کہ رات بھر وہ بہروپیے کو خواب میں طرح طرح کے روپ میں دیکھتا رہا، پھر صبح کو چار بجے کے قریب آپ ہی آپ اس کی آنکھ کھل گئی اور اس کے بعد پھر اسے نیند نہ آئی۔

ابھی سورج نکلنے نہیں پایا تھا کہ ہم بہروپیے کے جھونپڑے کے پاس پہنچ گئے۔ پچھلی رات ہم نے اندھیرے میں اس علاقے کا صحیح جائزہ نہ لے سکے تھے مگر اب دن کی روشنی میں ہمیں ان جھونپڑوں کے مکینوں کی غربت اور خستہ حالی کا بخوبی اندازہ ہو گیا۔ بہروپیے کے جھونپڑے پر ٹاٹ کا جو پردہ پڑا تھا اس میں کئی پیوند لگے تھے۔

ہم دو تین بار اس کے جھونپڑے کے سامنے سے گزرے۔ ہر بار ہمیں اندر سے بچوں کی آوازیں، دو ایک نسوانی آوازوں کے ساتھ ملی ہوئی سنائی دیں، آخر کوئی دس منٹ کے بعد ایک شخص بوسیدہ سا تہمد باندھے، بنیان پہنے، ایک ہاتھ میں گڑوی تھامے جھونپڑے سے برآمد ہوا۔ اس کی داڑھی مونچھ صاف تھی۔ سانولا رنگ۔ اس کو دیکھ کر اس کی عمر کا صحیح اندازہ کرنا مشکل تھا۔

وہ شخص آگے آگے اور ہم اس کے پیچھے پیچھے کچھ دور فصیل کے ساتھ ساتھ چلے۔ آگے ایک باڑا آیا جس پر کچھ گائیں، بھینسیں کھونٹوں سے بندھی ہوئی تھیں، وہ شخص اس باڑے کے اندر چلا گیا اور میں اور مدن باہر ہی اس کی نظروں سے اوجھل ایک طرف کھڑے

ہو گئے جہاں سے ہم اس کی حرکات و سکنات کو بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ اس نے ایک بھینس کو پچکارا، پھر وہ زمین پر بیٹھ کر اس کے تھنوں کو سہلانے لگا، اس کو دیکھ کر ایک بڈھا جو بھینسوں کے پاس ایک چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا اور ایک بڑی سی بالٹی لے آیا۔ اب اس شخص نے بھینس کو دوہنا شروع کیا۔ ہم اگرچہ اس سے کچھ دور کھڑے تھے مگر دودھ کی دھاروں کی آواز دھیمی سن سکتے تھے۔

جب وہ ایک بھینس کو دوہ چکا تو دوسری کی طرف گیا۔ پھر تیسری کی طرف۔ اس کے بعد گایوں کی باری آئی۔ اس نے دو تین گایوں کو بھی دوہا، جن کے دودھ کے لیے بڈھے نے ایک بالٹی لا کر رکھ دی تھی۔

اس کام میں کوئی ایک گھنٹہ صَرف ہوا۔ بڈھے نے اس کی گڑوی کو دودھ سے بھر دیا جسے لے کر وہ باڑے سے نکل آیا۔ ہم پہلے ہی وہاں سے کھسک لیے تھے جب وہ ذرا دور چلا گیا تو میں نے مدن کو چھیڑنے کے لیے کہا:

"لو اب تو حقیقت کھل گئی تم پر۔ چلو اب گھر چلیں۔ ناحق تم نے میری نیند خراب کی۔"

"مگر بھیا وہ بہروپیا کہاں تھا۔ وہ تو گوالا تھا۔ آؤ تھوڑی دیر اور اس کا پیچھا کریں۔"

میں نے مدن سے زیادہ حیل وحجت کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ہم کچھ دیر اِدھر اُدھر ٹہلتے رہے۔ ہم نے اس کا ٹھکانا تو دیکھ ہی لیا تھا۔ اب وہ ہماری نگاہوں سے کہاں چھپ سکتا تھا۔

جب ہمیں اس کے جھونپڑے کے آس پاس گھومتے آدھ گھنٹہ ہو گیا تو ہمیں ایک تانگہ فصیل کے ساتھ والی سڑک پر تیزی سے ادھر آتا ہوا دکھائی دیا۔ یہ تانگہ بہروپیے کے جھونپڑے کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ اس میں کوئی سواری نہ تھی۔ جو شخص تانگہ چلا رہا تھا اس نے تانگے کی گھنٹی پاؤں سے دبا کر بجائی۔ اس کی آواز سنتے ہی ایک آدمی جھونپڑے سے نکلا، اس نے کوچوان کا سا خاکی لباس پہن رکھا تھا۔ اس کو دیکھ کر تانگے والا تانگے سے اتر پڑا

اور یہ شخص تانگے میں آبیٹھا اور راسیں تھام گھوڑے کو بڑی مہارت سے ہانکنے لگا۔ جیسے ہی تانگہ چلا پہلے شخص نے پکار کر کہا۔

"تانگہ ٹھیک دو بجے اڈّے پر لے آنا۔"

دوسرے شخص نے گردن ہلائی۔ اس کے بعد ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ تانگہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میں اور مدن یہ ماجرا دیکھ کر ایسے حیران رہ گئے کہ کچھ دیر تک ہماری زبان سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔ آخر مدن نے سکوت کو توڑا۔

"چلو یہ تو معلوم ہو ہی گیا کہ یہ شخص دو بجے تک کیا کرے گا۔ اتنی دیر تک ہمیں بھی چھٹی ہو گئی۔ اب ہمیں ڈھائی تین بجے تک یہاں پہنچ جانا چاہیے۔"

میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ سچ یہ ہے کہ اس بہروپیے کے معاملے سے اب خود مجھے بھی بہت دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور میں اس کی اصلیت جاننے کے لیے اتنا ہی بیتاب ہو گیا تھا جتنا مدن۔

ہم لوگ کھانے پینے سے فارغ ہو کر تین بجے سے پہلے ہی پھر بہروپیے کے جھونپڑے کے آس پاس گھومنے لگے۔ جھونپڑے کے اندر سے بچوں اور عورتوں کی آوازوں کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی کسی مرد کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ اس سے ہم نے اندازہ کر لیا کہ بہروپیا گھر واپس پہنچ گیا ہے۔

ہمیں زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا اور اب کے بہروپیا ایک اور ہی دھج سے باہر نکلا۔ اس نے سیاہ چغہ پہن رکھا تھا۔ سر پر کالی پگڑی جو بڑی خوش اسلوبی سے باندھی گئی تھی۔ گلے میں رنگ برنگی تسبیحیں، ترشی ہوئی سیاہ داڑھی، شانوں پر زلفیں بکھری ہوئی۔ اس نے بغل میں لکڑی کی ایک سیاہ صندوقچی داب رکھی تھی معلوم ہوتا تھا کہ آج اس نے ایک صوفی درویش کا سوانگ بھرا ہے مگر ابھی کل ہی تو وہ مہاجن کے روپ میں شہر کا دورہ کر چکا تھا اور کوئی نیا

روپ بھرنے کے لیے اسے دو تین دن کا وقفہ درکار تھا، پھر آج کس لیے اس نے یہ وضع بنائی ہے؟ اس سوال کا ہمارے پاس کوئی جواب نہ تھا چنانچہ ہم چپکے چپکے اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے، وہ شخص جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا شہر میں داخل ہو گیا۔ وہ کئی بازاروں میں سے گزرا مگر خلافِ معمول وہ کسی حویلی یا دکان پر نہیں رکا۔ معلوم ہوتا تھا آج اسے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے اور داد پانے کا کچھ خیال نہیں ہے۔

تھوڑی دیر میں ہم جامع مسجد کے پاس پہنچ گئے جو شہر کے بیچوں بیچ واقع تھی اور جس کے آس پاس ہر روز تیسرے پہر بازار لگا کرتا تھا اور اتوار کو تو وہاں بہت ہی چہل پہل رہا کرتی تھی، میلہ سا لگ جاتا تھا۔ پھیری والے ہانک لگا لگا کے طرح طرح کی چیزیں بیچتے تھے، بچوں کے سلے سلائے کپڑے، چٹریاں، ٹوپیاں، کنگھیاں، چٹلے ازار بند، عطر پھلیل، اگر بتی، کھٹمل مارنے کا پوڈر، مٹھائیاں، چاٹ، علاوہ ازیں تعویذ گنڈے والے، جڑی بوٹی والے اور ایسے ہی اور پیشے والے، اپنی انوکھی وضع اور اپنی مخصوص صدا سے اس بازار کی رونق بڑھاتے تھے۔

ہمارا بہروپیا بھی خاموشی سے ان لوگوں میں آ کر شامل ہو گیا۔ اس نے اپنی سیاہ صندوقچی کھول کر دونوں ہاتھوں میں تھام لی۔ اس صندوقچی میں بہت سی چھوٹی چھوٹی شیشیاں قرینے سے رکھی تھیں۔ اس نے کچھ شیشیاں صندوقچی کے ڈھکنے پر بھی جما دیں، پھر بڑے گمبھیر لہجے میں صدا لگانی شروع کی:

"آپ کی آنکھوں میں دھند ہو، لالی ہو، خارش ہو، ککرے ہوں، بینائی کمزور ہو، پانی ڈھلکتا ہو، رات کو نظر نہ آتا ہو تو میرا بنایا ہوا خاص سرمہ "نین سکھ" استعمال کیجیے۔"

"یہ سرمہ اسم با مسمّیٰ ہے۔ اس کے لگاتے ہی آنکھوں میں ٹھنڈک پڑ جاتی ہے۔ آیئے ایک سلائی لگوا کر آزمائش کر لیجیے۔ اس کے کچھ دام نہیں۔

سرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشم خریدار پہ احساں میرا"

میں اور مدن حیرت زدہ ہو کر بہروپیے کو دیکھنے لگے۔ ہمیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا تھا مگر اس نے سچ مچ سرمہ فروشی شروع کر دی تھی۔ دو تین آدمی اس کے پاس آ کھڑے ہوئے اور اس سے باری باری آنکھوں میں سرمے کی سلائی لگوانے لگے۔

ہم جلد ہی وہاں سے رخصت ہو گئے۔ ہم نے بہروپیے کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنے کا خیال چھوڑ دیا۔

جوار بھاٹا

ایک شجرۂ نسب

چھجو

باپ کا نام باوجود تحقیق بسیار معلوم نہ ہو سکا۔ کسی گاؤں میں کبابی کی دکان کرتے تھے۔

شیخ مسیتا

چھجو کے بیٹے۔ شہر میں پان سگریٹ کی دکان تھی، پھر عطاری کرنے لگے

حکیم عمردراز

شیخ مسیتا کے بیٹے۔ اَن پڑھ تھے مگر ساری عمر حکمت کرتے رہے۔ بلا کے زیرک تھے اگر تعلیم سے بہرہ یاب ہوتے تو نہ جانے کیا کیا کمالات ان کی ذات سے ظہور میں آتے۔ کہتے ہیں انہیں کیمیا بنانے کا شوق تھا جو جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ جو کچھ کماتے اسی کی نذر

ہو جاتا مگر آخری عمر میں انہوں نے کیمیاگری سے توبہ کرلی۔

چودھری شمس الدین

حکیم عمر دراز کے بیٹے۔ پرائمری کی تین جماعتوں تک تعلیم پائی۔ ان کا شمار شہر کے بڑے بڑے ٹھیکہ داروں میں ہوتا تھا۔ خاصی دولت کمائی اور صاحبِ جائیداد بھی ہوئے۔

حاجی شفاعت احمد

چوہدری شمس الدین کے بیٹے۔ انٹرنس تک تعلیم پائی مدتوں ایک سرکاری دفتر میں کلرکی کرتے رہے، اسی دفتر میں ترقی کرتے کرتے سپرنٹنڈنٹ ہوگئے، پنشن ملی۔ حج کو گئے۔

(نوٹ: ان کے وقت سے اس خاندان کے ہاتھ سے کاروبار نکل گیااور اس کے افراد ملازمت کے رشتے میں منسلک ہونے لگے)

قاری غوث محمد

حاجی شفاعت احمد کے بیٹے۔ ابھی کالج میں زیر تعلیم ہی تھے کہ حاجی صاحب نے اپنے رسوخ سے کام لے کر انہیں ریلوے کی گارڈ کی نوکری دلوادی۔ بڑے خوش الحان واقع ہوئے تھے۔ کالج کے زمانے میں قرأت بھی سیکھی تھی جس کی وجہ سے قاری کہلائے۔ نماز کبھی قضا نہ ہونے دی۔ اس کی وجہ بعض لوگ یہ بیان کرتے ہیں کہ ریل کی نوکری نے انہیں وقت کا بہت پابند بنادیا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب!

خان صاحب غضنفر علی شاہ، سب پولیس انسپکٹر

قاری غوث محمد کے بیٹے، بی اے تک تعلیم پائی۔ بعد میں پھلور جاکر پولیس کی

ٹریننگ حاصل کی، بہت بارعب اور وجیہہ تھے۔ مزاج بلا کا غصیلہ تھا۔ بات بات پر ماتھوں پر لال پیلے ہوتے تھے، بڑے دلاور اور من چلے تھے، بڑے بڑے نامی ڈاکوؤں کو کمال شجاعت سے گرفتار کیا تھا۔ شہر کے سارے بدمعاش اور اٹھائی گیرے ان کے نام سے کانپتے تھے۔ ان کی دلاوری کے قصے اکثر تھانے کے سپاہیوں کے گھروں میں مشہور تھے۔ مگر ان کی بدمزاجی اور کثرتِ شراب نوشی کے باعث افسرانِ بالا ان سے ناخوش رہتے تھے، یہی وجہ تھی کہ تھانیداری سے آگے ترقی نہ کر سکے۔ ان کی قومیت ہمیشہ ایک عقدہ بنی رہی۔ جہلا انہیں "غضنفر علی شاہ سیّد بادشاہ" کہہ کر پکارتے جس کی وہ کبھی تردید نہ کرتے۔ خود وہ اپنے دستخط "خاں صاحب غضنفر علی" کیا کرتے تھے۔

شیخ تراب علی چشتی صابری بی اے، ایل ایل بی ایڈووکیٹ

خان صاحب غضنفر علی شاہ سب انسپکٹر پولیس کے بیٹے۔ شہر کے قابل ترین وکلاء میں گنے جاتے تھے۔ بڑے خوش طبع اور بذلہ سنج واقع ہوئے تھے۔ ظریفانہ اشعار بھی کہا کرتے تھے۔ قابلیت سے کہیں زیادہ ان کی بذلہ سنجی ان کی کامیابی کا باعث ہوئی۔ انھوں نے اپنے پیشے کی مصلحتوں کو نظر میں رکھ کر اپنے نام کے ساتھ شیخ لکھنا زیادہ مناسب سمجھا۔ ایک اہلِ حال بزرگ کی نظر کرم نے چشتی صابری بنا دیا۔

ڈاکٹر تحسین علی ایم بی بی ایس فزیشن اینڈ سرجن

شیخ تراب علی بی اے، ایل ایل بی ایڈووکیٹ کے بیٹے۔ ہر چند والد کا پیشہ، وکالت تھا مگر انھوں نے ڈاکٹری کو ترجیح دی۔ شاید وجہ یہ ہو کہ ان کے جدِ امجد حکیم عمر دراز حکمت میں بڑا نام پیدا کر چکے تھے چنانچہ انھوں نے بھی اپنے مورثِ اعلیٰ کے نقش قدم پر چل کر خلقِ خدا کی خدمت میں عمر بسر کر دی۔

مسٹر الیاس ہارون بار ایٹ لا

ڈاکٹر تحسین علی ایم۔ بی۔ بی۔ ایس فزیشن اینڈ سرجن کے بیٹے، ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ پہلے وکالت کی ڈگری حاصل کی۔ پھر ولایت جاکر بیرسٹری پاس کی۔ خاندان کو عزت اور شہرت دینے کا موجب ہوئے۔ دولت بھی خوب کمائی۔

خان بہادر میاں رکن الدین ممبر لیجسلیٹو کونسل

مسٹر الیاس ہارون بار ایٹ لا کے بیٹے۔ ان کی عمر کا بیشتر حصہ سیاسی جدوجہد میں گزرا۔ ہر چند زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے مگر اپنی خداداد ذکاوت وذہانت کے باعث خاندان کا نام خوب روشن کیا۔

ابھی نوعمر ہی تھے کہ خدمتِ وطن کا جذبہ ایک جنون بن کر سر میں سما گیا اور وہ کالج کو خیر باد کہہ ایک اصلاحی جماعت میں بطور رضاکار بھرتی ہوگئے اور دیہات میں جاجاکر تقریریں کرنے لگے۔ اس طرح چار پانچ برس میں خطابت کی بہت اچھی مشق بہم پہنچالی۔ شہر واپس آئے تو پورے لیڈر بن چکے تھے۔ آواز قدرتی طور گمبھیر اور سُریلی تھی۔ اپنی تقریروں میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے اردو فارسی کے موزوں اشعار بڑی خوش الحانی سے پڑھا کرتے تھے۔ ان کا یہ اندازِ خطابت سامعین کو بہت متاثر کرتا تھا۔ اتفاق سے اس زمانے میں ملک میں لیڈری کا بازار کچھ سرد سا پڑ گیا تھا۔ بیکار مباش کچھ کیا کر کے مصداق میونسپل کمیٹی کی ممبری کے لیے کھڑے ہوئے مگر کامیابی نہ ہوئی، ہر چند ووٹ خاصے حاصل کر لیے تھے، اس سے دل میں قدرے مطمئن تھے۔ اگلی مرتبہ پھر الیکشن کے لیے اپنا نام پیش کیا۔ اب کے حفظِ ماتقدم کے طور پر تین ماہ قبل ایک ہفتہ وار اخبار نکال لیا تھا جس میں اپنے حریفوں پر خوب خوب چوٹیں کیں اور اپنی صلاحیتوں کو اُجاگر کیا۔ پھر کیا تھا اللہ نے

کامیاب کر دیا۔ ہوتے ہوئے لجسلیٹو کونسل کے ممبر بھی ہو گئے۔ سرکار نے "خان بہادر" کا خطاب دیا مربعے بھی ملے۔

(نوٹ: ان کے وقت سے اس خاندان کے افراد سرکاری خطابات سے نوازے جانے لگے۔)

آنریبل سرداراشکوہ چیف جسٹس ھائیکورٹ

خان بہادر میاں رکن الدین ممبر لجسلیٹو کونسل کے صاحبزادے۔ ان کا زمانہ نسبتاً پُر امن رہا۔ انہیں زیادہ جدوجہد نہ کرنی پڑی کیوں کہ خاندان کی شہرت اور باپ کی خدمات کے باعث انہیں ہر جگہ ہردلعزیزی حاصل ہوئی اور سرکار نے بھی ان کی قدرومنزلت کی۔ ان کے زمانے میں خاندان کی دولت وثروت میں قابلِ قدر اضافہ ہوا۔

رائیٹ آنریبل سر جمشید جاہ بہادر پی۔سی، کے۔سی

ایس۔ آئی، کے، سی، آئی، ای، گورنر۔

آنریبل سرداراشکوہ چیف جسٹس ہائی کورٹ کے فرزندار جمند۔ انہوں نے، خاندان کے نام کو شہرت وجلالت کے اوجِ کمال پر پہنچادیا۔

خان بہادر صوفی بیدار بخت ۔ بی ۔اے جاگیردار

رائٹ آنریبل سر جمشید جاہ بہادر پی سی، کے سی۔ ایس آئی، کے سی آئی ای کے فرزند دل بند۔ بی اے تک تعلیم پائی۔ بچپن ہی سے عزت پسند اور منکسر المزاج واقع ہوئے تھے۔ مذہب کی طرف رجحان زیادہ تھا۔ خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ نہ اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ جانے کی ضرورت تھی نہ ملازمت کی حاجت۔ عمر بھر گوشہ نشین ہو کر یادالہٰی میں مصروف رہے۔ سرکار نے ان کی مرضی اور امید کے خلاف "خان بہادر" کا خطاب دے دیا، اسی میں رضائے الٰہی سمجھ کر خاموش ہو رہے۔

صاحبزادہ نسیم عرف چھوٹے مرزا رئیس اعظم

خان بہادر صوفی بیدار بخت۔ بی۔اے جاگیردار کے بیٹے۔ انٹرنس تک تعلیم پائی پھر اپنی جاگیر کا انتظام کرنے لگے۔ باپ کی طرح انہوں نے بھی کسی قسم کی ملازمت کو اپنے لیے حرام جانا اور آخر ضرورت بھی کیا تھی۔ خوب رئیسانہ ٹھاٹھ سے رہے۔ بہت خوش وضع اور نفاست پسند تھے۔ کہتے ہیں جیسا کھانا انہوں نے کھایا اور جیسا کپڑا انہوں نے پہنا، کم ہی کسی رئیس کو نصیب ہوا۔ اپنے نام میں ''مرزا'' کا اضافہ سب سے پہلے انہوں نے ہی کیا۔

ابوالخیال مرزا ہیکل

صاحبزادہ نسیم عرف چھوٹے مرزا رئیس اعظم کے بیٹے۔ آٹھویں جماعت میں فیل ہونے کے بعد دل تعلیم سے ایسا اچاٹ ہوا کہ پھر اسکول کا رخ نہ کیا۔ شاعری سے بچپن سے لگاؤ تھا۔ دو چار شاعر ہر وقت ان کی مصاحبت میں رہتے تھے۔ خود بھی شعر کہتے تھے۔ مشہور تھا کہ فیضانِ شعر کی حالت میں چادر اوڑھ کر چارپائی پر لیٹ جاتے اور گھنٹوں لوٹتے پوٹتے رہتے اور جب تک غزل پوری نہ ہو جاتی چارپائی سے نہ اٹھتے۔

''نوائے ہیکل'' کے نام سے ایک دیوان بہت سارو پیہ خرچ کر کے اعلیٰ آرٹ پیپر پر سنہری روشنائی سے چھپوایا جس میں عربی، فارسی، اردو اور بھاشا چاروں زبانوں کا کلام جمع کیا گیا تھا۔ یہ دیوان اب ناپید ہے۔

خدا مغفرت کرے بڑے مرنجان مرنج علم دوست بزرگ تھے۔ اپنی زندگی میں قلمی کتب اور پرانی تصاویر کا بڑا نادر ذخیرہ جمع کیا تھا۔ نہ معلوم ان کے انتقال کے بعد اس کا کیا حشر ہوا۔

ننھے مرزا

ابوالخیال مرزا ہیکل کے صاحبزادے۔ واجبی تعلیم پائی۔ انگریزی سے بالکل کورے رہے۔ والد کی بے حد خواہش رہی کہ انہیں بھی شعر و سخن سے لگاؤ پیدا ہو تاکہ خاندان

میں شمع سے شمع روشن رہے مگر ان کو شاعری سے مس نہ تھا۔ ان کا رجحان بچپن سے موسیقی کی طرف تھا۔ باپ کی مخالفت کے باوجود ملک کے نامی گرامی گویّوں کو بلوا کر ان سے فنِ موسیقی سیکھتے رہے۔ سات مرتبہ گوالیار کا سفر اختیار کر کے تان سین کی قبر پر گئے اور ہر مرتبہ اس املی کے درخت کا پتہ توڑ کر کھایا جو اس کی قبر پر سایہ کئے ہوئے ہے۔ پہلے کئی برس تک گانا سیکھتے رہے مگر چونکہ آواز بہت اچھی نہ تھی اس لیے استادوں کے مشورے سے گانا ترک کر کے ستار کا شوق کرتے رہے۔ انھیں لے اور تال کا بڑا گیان تھا، کہتے ہیں کہ سوتے میں ان کے دہنے پاؤں کا انگوٹھا تال دیتا رہتا تھا۔

ان کے پاس پرانے وقتوں کا ایک طنبورہ تھا جس کے متعلق مشہور تھا کہ محمد شاہی دربار کے گویّے نعمت علی خاں سدا رنگ کا ہے۔ پیرانہ سالی میں انہوں نے موسیقی کے بارے میں ایک کتاب بھی "صدائے دل نشیں" کے نام سے تصنیف کی تھی مگر چھپنے سے پہلے ہی اس کا مسوّدہ شاید ان کا کوئی دوست چرا لے گیا تھا۔ اس صدمے نے مرزا کی کمر توڑ ڈالی اور یہ چند ہی روز بعد انتقال کر گئے۔

لاڈلے مرزا

ننھے مرزا کے فرزند دل بند، صرف قاعدہ پڑھ کر رہ گئے۔ بہت لاابالی طبیعت کے آدمی تھے۔ ایک دفعہ ایک فلم دیکھنے گئے۔ اس میں لیلیٰ نامی ایک حسین اور طرحدار ایکٹرس نے کام کیا تھا، یہ اس پر ریجھ گئے اور اسے اپنے عقد میں لانے کی تدبیریں کرنے لگے۔ بہت سی دولت خرچ کر کے اس تک رسائی حاصل کی۔ بڑے بڑے گراں قدر تحائف اسے پیش کیے یہاں تک کہ اس کے نام سے ایک فلم کمپنی بھی قائم کر ڈالی۔ آخر لیلیٰ شادی پر آمادہ ہو گئی۔ شادی کے دوسرے ہی برس فلم کمپنی فیل ہو گئی اور لیلیٰ کسی ایکٹر کے ساتھ بھاگ گئی۔ لیلیٰ کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا تھا جسے وہ مرزا ہی کے پاس اپنی نشانی کے طور پر چھوڑ

گئی تھی۔اس کی پرورش کے لیے نرس رکھی گئی۔

مرزا کی بیشتر جائیداد لبنیٰ کے عشق کی نذر ہو گئی تھی۔ بس لے دے کر ایک مکان اور چند دکانیں رہ گئی تھیں۔ان کے کرائے پر گزر اوقات کرنے لگے۔

محمد شفیع

لاڈلے مرزا کے بیٹے۔اسٹیشن کے قریب ایک چھوٹے سے ہوٹل کے مالک ہیں۔ بڑی مشکل سے گزارا ہوتا ہے۔سنا ہے کہ اب انہوں نے چوری چھپے شراب بھی بیچنی شروع کر دی ہے۔اللہ بس باقی ہوس۔

یہ پری چہرہ لوگ

پت جھڑ کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ بیگم بلقیس تراب علی ہر سال کی طرح اب کے بھی اپنے بنگلے کے باغیچے میں مالی سے پودوں اور پیڑوں کی کاٹ چھانٹ کرا رہی تھیں۔ اس وقت دن کے کوئی گیارہ بجے ہوں گے۔ سیٹھ تراب علی اپنے کام پر اور لڑکے لڑکیاں اسکولوں اور کالجوں میں جا چکے تھے چنانچہ بیگم صاحب بڑی بے فکری کے ساتھ آرام کرسی پر بیٹھی مالی کے کام کی نگرانی کر رہی تھیں۔

بیگم تراب علی کو نگرانی کے کاموں سے ہمیشہ بڑی دلچسپی رہی تھی۔ آج سے پندرہ سال پہلے جب ان کے شوہر نے جو اُس وقت سیٹھ تراب علی نہیں بلکہ شیخ تراب تھے اور سرکاری تعمیرات کے ٹھیکے لیا کرتے تھے۔ اس نواح میں بنگلہ بنوانا شروع کیا تھا تو بیگم صاحب نے اس کے تعمیر کے کام کی بڑی کڑی نگرانی کی تھی اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ یہ بنگلہ بڑی کفایت کے ساتھ اور تھوڑے ہی دنوں میں بن کر تیار ہو گیا تھا۔

بیگم تراب علی کا ڈیل ڈول مَردوں جیسا تھا۔ آواز اونچی اور گمبھیر اور رنگ سانولا جو غصّے کی حالت میں سیاہ پڑ جایا کرتا چنانچہ نوکر چاکر ان کی ڈانٹ ڈپٹ سے تھر تھر کانپنے لگتے اور گھر بھر پر سناٹا چھا جاتا۔ ان کی اولاد میں سے تین لڑکے اور دو لڑکیاں سنِ بلوغت کو پہنچ چکے تھے، مگر کیا مجال جو ماں کو پلٹ کر جواب دے لیں یا نظر ملا کر بات ہی کر سکیں، اور تو اور خود سیٹھ

تراب علی بیوی کے کاموں میں دخل دیتایااس کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرناپسند نہ کرتے تھے چنانچہ بیگم صاحب پورے خاندان پرایک ملکہ کی طرح حکمران تھیں۔ عمراور خوش حالی کے ساتھ ساتھ ان کی فربہی بھی بڑھتی جارہی تھی اور فربہی کے ساتھ رعب اور دبدبہ بھی۔

ان پندرہ برس میں جو انہوں نے اس نواح میں گزارے تھے ۔۔ یہاں کے قریب قریب سبھی رہنے والوں سے بخوبی واقف ہوگئی تھیں۔ بعض گھروں سے میل ملاپ بھی تھا اور کچھ بیبیوں سے دوستی بھی۔ وہ اس علاقے کے حالات سے خود کو باخبر رکھتی تھیں یہاں تک کہ املاک کی خرید و فروخت اور بنگلوں میں نئے کرایہ داروں کی آمد اور پرانے کرایہ داروں کی رخصت کی بھی انھیں پوری خبر رہتی تھی۔

اس وقت بیگم تراب علی کی تیز نظروں کے سامنے مالی کا ہاتھ بڑی پُھرتی سے چل رہا تھا۔ اس نے پودوں اور چھوٹے چھوٹے پیڑوں کی کاٹ چھانٹ تو قینچی سے کھڑے کھڑے ہی کرڈالی تھی اور اب وہ اونچے اونچے درختوں پر چڑھ کر بیگم صاحب کی ہدایات کے مطابق سُوکھے یازائد ٹہنے کلہاڑی سے کاٹ کاٹ کر نیچے پھینک رہا تھا۔

کچھ دیر بعد بیگم صاحب بیٹھے بیٹھے تھک گئیں اور کرسی سے اٹھ کر بنگلے کی چاردیواری کے ساتھ ساتھ ٹہلنے لگیں۔ بنگلے کے آگے کی دیوار کے ساتھ ساتھ جو پیڑ تھے ان میں دو ایک تو خاصے بڑے تھے جن کی چھاؤں گھنی تھی۔ خاص کر ولایتی بادام کا پیڑ۔ اس کا سایہ نصف بنگلے کے اندر اور نصف باہر سڑک پر رہتا تھا۔ دن کو جب دھوپ تیز ہو جاتی تو کبھی کبھی کوئی راہگیر یا خوانچے والا ذرا دم لینے کو اس کے سائے میں بیٹھ جاتا تھا۔

بیگم بلقیس تراب علی جیسے ہی اس پیڑ کے پاس پہنچیں ان کے کان میں دیوار کے باہر سے کسی کے بولنے کی آواز آئی۔ انھوں نے اس آواز کو فوراً پہچان لیا۔ یہ اس علاقے کی مہترانی سگو کی آواز تھی جو اپنی بیٹی جگو سے باتیں کر رہی تھی۔ یہ ماں بیٹیاں بھی اکثر دوپہر کو

اسی پیڑ کے نیچے ستانے یا ناشتہ پانی کرنے بیٹھ جایا کرتی تھیں۔

بیگم بلقیس تراب علی نے پہلے تو ان کی باتوں کی طرف دھیان نہ دیا مگر پھر ایکا ایکی ان کے کان میں کچھ ایسے الفاظ پڑے کہ وہ چونک اٹھیں۔ سگو اپنی بیٹی سے پوچھ رہی تھی:

"کیوں ری تو نے طوطے والی کے ہاں کام کر لیا تھا؟"

"ہاں۔" جگو نے اپنی مہین آواز میں جواب دیا۔

"اور کھلونے والی کے ہاں؟"

"وہاں بھی۔"

"اور تپ دق والی کے ہاں؟"

اب کے جگو کی آواز سنائی نہ دی۔ شاید اس نے سر ہلا دینے ہی پر اکتفا کیا ہوگا۔

"اور کالی میم کے ہاں؟"

اب تو بیگم تراب علی سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ بے اختیار پکار اٹھیں:

"سگو۔ اری او سگو۔ ذرا اندر آئیو۔"

سگو کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس کی باتیں کوئی سن رہا ہوگا۔ خصوصاً بیگم بلقیس تراب علی، جن کی سخت مزاجی اور غصے سے اس کی روح کانپتی تھی۔ وہ پہلے تو گم سم رہ گئی۔ پھر مری ہوئی آواز میں بولی:

"ابھی آئی بیگم صاحب!"

تھوڑی دیر بعد وہ آنچل سے سینے کو ڈھانپتی، لہنگا ہلاتی، بنگلے کا پھاٹک کھول کر اندر آئی۔ جگو اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ دونوں ماں بیٹیوں کے کپڑے میلے چیکٹ ہو رہے تھے۔ دونوں نے سر میں سرسوں کا تیل خوب لیسا ہوا تھا۔

"سلام بیگم صاحب!" سگو نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ابھی تک اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ کس قصور کی بنا پر اسے بیگم صاحب کے حضور پیش ہونا پڑا ہے،

بیگم صاحبہ نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا:

"کیوں ری مردار! یہ تو باہر بیٹھی کن لوگوں کے نام لے رہی تھی؟"

"کیسے نام بیگم صاحب؟"

"اری! تو کہہ رہی تھی ناطوطے والی، کھلونے والی، تپ دق والی، کالی میم؟"

سگو نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

"وہ تو بیگم صاحب، ہم آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔"

"دیکھ سگو سچ سچ بتادے ورنہ میں جیتا نہ چھوڑوں گی۔"

سگو پل بھر کو خاموش رہی۔ اس نے جان لیا کہ بیگم صاحب سے بات چھپانی مشکل ہو گی اور اس نے بڑی لجاجت سے کہنا شروع کیا:

"وہ بات یہ ہے کہ بیگم صاحب ہم لکھت پڑھت تو جانتے نہیں اور ہم کو لوگوں کے نام بھی معلوم نہیں۔ سو ہم نے اپنی نسانی کے لیے ان کے نام رکھ لیے ہیں۔"

"اچھا تو یہ طوطے والی کون ہے؟"

"وہ جو بڑا سا گھر ہے نا اگلی گلی میں نکڑ والا . . ."

"فاروق صاحب کا؟"

"جی بیگم صاحب وہی۔ ان کی بیوی نے طوطا پال رکھا ہے۔ ہم ان کو نسانی کے لیے طوطے والی کہتے ہیں۔"

"اور یہ کھلونے والی کون ہے؟"

"وہ جو میت کے برابر والے بنگلے میں رہتی ہیں۔"

بیگم تراب علی نے اس علاقے کا نقشہ ذہن میں جمایا ذرا غور کیا، پھر بولیں۔

"اچھا بخش الٰہی صاحب کا مکان؟"

"جی سرکار وہی۔"

"اری کم بخت تو ان کی بیگم کو کھلونے والی" کیوں کہتی ہے۔ جانتی بھی ہے وہ تو لکھ پتی ہیں لکھ پتی، کھلونے تھوڑا ہی بیچتے ہیں۔"

"جب دیکھو ان کی کوٹھی میں ہر طرف کھلونے ہی کھلونے بکھرے رہتے ہیں، بہت بڑھیا بڑھیا کھلونے، یہ بڑے بڑے ہوائی جہاز، چلنے والی باتیں کرنے والی گڑیا۔ بجلی کی ریل گاڑی، موٹریں ..."

"اری موئی یہ کھلونے تو وہ خود اپنے بچوں کے کھیلنے کے لیے ولایت سے منگواتے ہیں بیچتے تھوڑا ہی ہیں۔

"ہم تو نسانی کے لیے کہتے ہیں بیگم صاحب۔"

"اور یہ کالی میم کس بی صاحبہ کا خطاب ہے؟"

"وہ جو کرستان رہتے ہیں نا۔۔"

"مسز ڈی فلوری؟"

"جی ہاں، وہی۔"

"ہے کمبخت تیرا ناس جائے۔۔ .اور تپ دق والی کون ہے؟"

"ادھر کو۔" سگو نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ بڑی سڑک پر پہلی گلی کے نکڑ والا جو گھر ہے اس میں ہر وقت ایک عورت پلنگ پر پڑی رہے ہے اور میز پر بہت سی دواؤں کی سیسیاں نجر آوے ہیں۔"

بیگم صاحب بے اختیار مسکرا دیں، ان کا غصہ اب اُتر چکا تھا اور وہ سگو کی باتوں کو بڑی دلچسپی سے سن رہی تھیں کہ اچانک ایک بات ان کے ذہن میں آئی اور ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ڈانٹ کر بولیں:

"کیوں ری مردار تو نے میرا بھی تو کوئی نہ کوئی نام ضرور رکھا ہوگا۔ بتا کیا نام رکھا ہے؟ سچ سچ بتا ئیو، نہیں تو مارتے مارتے بھرکس نکال دوں گی۔"

"سگوذرا ٹھٹکی مگر فوراً ہی سنبھل گئی۔"

"بیگم صاحب چاہے ماریئے چاہے جندہ چھوڑ یئے ہم تو آپ کو بیگم صاحب ہی کہتے ہیں۔"

"چل جھوٹی مکار!"

"میں جھوٹ نہیں بولتی سرکار، چاہے جس کی قسم لے لیجئے .. کیوں ری جگو، ہم بیگم صاحب کو بیگم صاحب ہی کہتے ہیں نا؟"

"مجھے تو تم ماں بیٹیوں کی بات پر یقین نہیں آتا۔" بیگم تراب علی بولیں۔ اس پر سگو خوشامدانہ لہجہ میں کہنے لگی:

"اجی آپ ایسی سکھی (سخی) اور گریب پرور ہیں۔ بھلا ہم آپ کی سان میں ایسی گستاکھی کہہ سکتے ہیں۔"

بیگم صاحب کا غصہ کچھ دھیما ہوا اور انہوں نے سگو کو نصیحت کرنی شروع کی:

"دیکھو سگو۔ اس طرح شریف آدمیوں کے نام رکھنا ٹھیک نہیں۔ اگر ان کو پتہ چل جائے تو تجھے ایک دم نوکری سے جواب دے دیں۔"

"اچھا بیگم صاحب۔ اس دفعہ تو ہمیں معاف کر دیں۔ آگے کو ہم کسی کو ان ناموں سے نہیں بلائیں گے۔"

سگو نے جب دیکھا بیگم صاحب کا غصہ بالکل اتر گیا ہے تو اس نے زمین پر پڑے ہوئے ٹہنوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

"بیگم صاحب۔" اس نے بڑی لجاجت سے کہنا شروع کیا۔ "کھدا حجور کے صاحب اور بچوں کو سدا سکھی رکھے، یہ جو دو ٹہنے آپ نے کٹوائے ہیں یہ تو آپ ہمیں دے دیجئے سرکار۔ جھونپڑی کی چھت کئی دنوں سے ٹوٹی ہوئی ہے اس کی مرمت ہو جائے گی۔ گریب دعا دیں گے۔"

بیگم بلقیس تراب علی پہلے تو خاموش رہیں مگر جب سگو نے زیادہ گڑگڑانا شروع کیا تو پسیج گئیں:

"اچھا اپنے آدمی سے کہنا اُٹھا لے جائے۔"

"کھدا آپ کو سکھی رکھے بیگم صاحب، کھدا . "

بیگم صاحب اس کی دعا پوری نہ سن سکیں کیونکہ ان کو ایک ضروری کام یاد آ گیا اور وہ بنگلے کے اندر چلی گئیں۔

دوپہر کو بارہ بجے کے قریب سگو اور جگو سب کام نمٹا کر گھر جا رہی تھیں کہ سامنے سے ایک مہتر منڈاسا باندھے جھاڑ دے سڑک پر گرد و غبار کے بادل اڑاتا جلد جلد چلا آ رہا تھا۔

دونوں ماں بیٹیاں اس کے قریب پہنچ کر رک گئیں۔

"آج بڑی دیر میں سڑک جھاڑنے نکلے ہو، جگو کے بادا؟"

"ہاں جرا آنکھ دیر میں کھلی تھی۔"

یہ کہہ کر وہ مہتر آگے بڑھ جانا چاہتا تھا کہ اس کی بیوی نے روک لیا

"سن جگو کے بادا۔ جب سڑک جھاڑ چکیو تو ڈھڈ و کے بنگلے پر چلے جائیو وہاں دو بڑے بڑے ٹھنے کٹے پڑے ہیں، انھیں اُٹھا لائیو۔ میں نے ڈھڈو سے اِجاجت لے لی ہے۔"

بُحران

جب سے سرکار نے لوگوں کو مکانات تعمیر کرانے کے لیے زمینیں الاٹ کرنی شروع کی ہیں اس شہر کی کایا ہی پلٹ گئی ہے۔ آس پاس کے وہ علاقے جو میلوں تک ویران پڑے تھے، اب ان میں جگہ جگہ کھدائیاں ہو رہی ہیں۔ اَن گنت راج مزدور مستری اور ٹھیکہ دار ایک عجیب سی بے چینی اور عجلت کی کیفیت کے ساتھ کام کرتے اور اِدھر سے اُدھر دوڑتے بھاگتے نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آثارِ قدیمہ کا کوئی بہت بڑا محکمہ اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ آ براجا ہے اور کسی بھرے پُرے قدیمی شہر کو جو صدیاں گزریں کسی آفتِ ناگہانی کے سبب زمین میں دھنس گیا تھا جوں کا توں باہر نکالنے کی سعی کر رہا ہے۔

مکان بنوانے کی آرزو انسان کی فطرت کا لازمہ ہے۔ یہ وہ آرزو ہے جو بچپن ہی سے جب وہ گھروندے بنا بنا کر کھیلتا ہے اس کے دل میں گھر کر لیتی ہے اور پھر عمر بھر کبھی ابھرتی کبھی دبتی رہتی ہے۔ عمر کے کسی دور میں بھی جب کبھی اسے ذرا سی بھی خوش حالی نصیب ہوتی ہے وہ اپنی اس دیرینہ خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ صاحبِ جائداد ہونے کا فخر حاصل کر سکے۔

حکومت کی اس امداد کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر وہ شخص جو تھوڑی سی بھی مقدرت رکھتا تھا کچھ

زیادہ سوچے سمجھے بغیر مکان بنوانے پر کمربستہ ہو گیا۔ کچھ لوگ بے سہارے ہی کسی لطیفۂ غیبی کے بھروسے پر تعمیر کے منصوبے باندھنے لگے۔

سہیل ایک سرکاری کالج میں فلسفہ کا پروفیسر ہے۔ وہ دبلا پتلا کم آمیز اور خاموش طبع انسان ہے۔ وہ شہر کے بیچوں بیچ ایک کمرے والے فلیٹ میں اپنی بیوی اور دو بچیوں کے ساتھ رہتا تھا۔ جب تک بچیاں چھوٹی چھوٹی تھیں، جیسے تیسے گزر ہوتی چلی جاتی تھی مگر اب جب کہ لڑکیاں بڑی بڑی ہو گئی ہیں، سب کے ایک کمرے میں سونے سے قباحتیں پیدا ہونے لگی ہیں۔

آخر سہیل نے ایک ہاؤسنگ سوسائٹی کی وساطت سے چھ سو مربع گز زمین شہر سے باہر ایک وسیع علاقے میں خرید لی۔ پندرہ ہزار روپیہ حکومت سے قرض مل گیا۔ کوئی تین ہزار روپیہ پاس تھا۔ کالج سے دو مہینے کی چھٹی لی اور مکان کی تعمیر میں مصروف ہو گیا۔

بد قسمتی سے بسم اللہ ہی غلط ہوئی۔ جس ٹھیکہ دار کو مکان کا ٹھیکہ دیا گیا وہ تعمیر شروع کرنے سے قبل دو تین مرتبہ پلاٹ پر آیا اور زمین پر اکڑوں بیٹھ کر مختلف زاویوں سے اس کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر ایک دن اس نے مکان کے نقشے کو دیکھ دیکھ کر زمین پر چونے سے کچھ نشانات لگائے۔ اس موقع پر اس نے نیک شگون کے طور پر بازار سے کچھ شیرینی منگوا کر آس پاس کے راج مزدوروں میں بانٹی۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے سہیل سے پانچ سو روپے پیشگی مانگے جو اسی وقت دے دیے گئے۔

دوسرے روز ٹھیکہ دار کچھ ایسا گم ہوا کہ نہ جانے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ پروفیسر سہیل کو بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شخص کئی بھولے بھالے آدمیوں کو اسی طرح جُل دے چکا ہے۔ اس کی بیوی نے یہ ماجرا سنا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ آخر سہیل نے فیصلہ کیا کہ آئندہ تعمیر کا کام ٹھیکے پر نہ دیا جائے

بلکہ امانی پر کرلیا جائے۔

چاند خان کسی دفتر میں چپراسی ہے، وہ ہے تو اَدھیڑ عمر مگر اس کا جسم خوب گٹھا ہوا ہے۔ دن بھر سائیکل چلا چلا کے اس کی ٹانگیں خوب مضبوط ہو گئی ہیں گو رنگ زیادہ کالا پڑ گیا ہے۔

وہ اپنی بُڑھیا ماں، بیوی، دو بیٹوں اور ایک بیٹی کے ساتھ پھونس کے جھونپڑوں کی ایک کالونی میں رہا کرتا تھا۔ بڑا لڑکا علی الصباح اخبار بانٹتا۔ چھوٹا لڑکا اسکول جاتا، بیٹی پڑوس کے ایک بابو کے گھر میں دس روپے ماہوار پر صبح شام برتن مانجھنے جایا کرتی۔ اچانک چاند خاں کا نصیبہ کھلا۔ اسے ستر مربع گز زمین الاٹ ہو گئی اور ڈیڑھ ہزار روپیہ گورنمنٹ سے قرض بھی مل گیا۔ اس کی بیوی نے چاندی کے کڑے اور پازیبیں اتار کر میاں کو دیں کہ انہیں بیچ کر مکان پر لگا دو۔ وہ تو کانوں سے چاندی کی بالیاں بھی اتارنا چاہتی تھی مگر میاں نے یہ کہہ کر روک دیا کہ ان کے تو کوئی آٹھ آنے بھی نہ دے گا۔

شام کو چاند خاں کی بیوی نے کالونی کے گوالے سے جو سائیکل پر دودھ بیچنے جایا کرتا تھا بڑی لجاجت سے کہا:

"تمہارے بھیا مکان بنوا رہے ہے۔ آگے دالان پیچھے دو کمرے۔ غسل خانہ کوئی کرایہ دار ہو تو ذرا نظر میں رکھیو۔"

ایک فوجی افسر کو جس کی لمبی لمبی اکڑی ہوئی مونچھیں ہیں، چار سو مربع گز زمین ملی ہے۔ وہ ہر روز ڈیوٹی سے فارغ ہوتے ہی وردی پہنے ٹرک پر سیدھا اپنے زیر تعمیر مکان پر پہنچ جاتا اور پیٹی میں پستول لٹکائے گھنٹوں کڑی دھوپ میں راج، مزدوروں کے درمیان پھرتا اور ان کے کام کی نگرانی کرتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی وہ ان سے اپنے جنگی کارنامے بھی بیان کرتا ہے، اس کے پاس جو پستول ہے وہ اس نے بقول خود ایک جرمن افسر کو قتل کر کے حاصل کیا تھا۔

پروفیسر سہیل کے مکان کی نیو رکھی جا چکی ہے، چونکہ اس نے کسی کتاب میں پلر اسٹائل کی تعمیر کیبڑی تعریف پڑھی تھی، اس لیے اس نے اسی طرز پر مکان بنانے کا فیصلہ کیا ہے، اور اب لوہے کے سریے کھڑے کر کے ستونوں کی بھرائی ہو رہی ہے، وہ ہر روز ایک کاپی میں معماروں اور مزدوروں کی حاضری درج کرتا اور ہفتے کے ہفتے سب کا حساب چکتا کر دیتا۔

سہیل نے ایک مستری کو جو شکل صورت سے خاصا تجربہ کار معلوم ہوتا تھا، اس کی روزانہ اجرت کے علاوہ پچاس روپے ماہوار زائد دینا منظور کر رکھا ہے تاکہ وہ اپنے کام کے ساتھ ساتھ دوسروں کے کام کی نگرانی بھی کرتا رہے۔ سہیل نے یہ انتظام اس لیے کیا کہ ایک تو وہ تعمیری کام کی کچھ عملی واقفیت نہ رکھتا تھا، گو اس نے کتابی معلومات کافی حاصل کرلی تھی۔ دوسرے دو ماہ کی رخصت ختم ہونے کے بعد وہ وہاں کی نگرانی کے لیے موجود بھی نہ رہ سکتا تھا۔

مگر اس مستری کی نگرانی کے باوجود کام بہت آہستہ آہستہ ہو رہا تھا۔ اس سلسلے میں چوکیدار اور دوسرے ذریعوں سے جو اطلاعات پروفیسر سہیل کے کانوں تک پہنچیں ان کا لب لباب یہ تھا:

(الف) جب سے اس مستری کو دوسروں کے کام کا نگران مقرر کیا گیا ہے اس نے اپنے ہاتھ سے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔

(ب) یہ مستری صرف ان ہی کاریگروں اور مزدوروں کو کام پر لگاتا ہے جو اپنی اُجرت کا چوتھائی حصہ اس کو بطور کمیشن دینا منظور کرتے ہیں۔

(ج) چونکہ مزدوروں کو پوری مزدوری نہیں ملتی، اس لیے وہ دل لگا کے کام نہیں کرتے۔

علاوہ ازیں آئے دن جھگڑے بھی ہوتے رہتے اور سیمنٹ کی بوریوں کی گنتی میں تو ہر روز کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہو ہی جاتی۔

سہیل سب کچھ دیکھتا سنتا مگر زبان نہ ہلاتا۔

ایک دن شام کو جب راج مزدور چھٹی کر گئے اور چوکیدار نماز پڑھنے میں مشغول ہو گیا تو پروفیسر سہیل کا ایک ہمسایہ جس کا مکان دو تین پلاٹ چھوڑ کر بن رہا تھا، اس کے پاس آیا اور کہنے لگا:

"پروفیسر صاحب! کیا آپ سچ مچ اپنا سیمنٹ بیچنا چاہتے ہیں؟"

"نہیں تو! کیوں کیا بات ہے؟"

"کل آپ کا مستری دو مزدوروں کی پیٹھ پر دو بوریاں اٹھوائے میرے پاس آیا تھا اور میرے ہاتھ سیمنٹ فروخت کرنا چاہتا تھا۔ مجھے کچھ شک گزرا اور میں نے لینے سے انکار کر دیا۔ اس پر وہ مزدوروں کو لیے ہوئے کسی اور سمت چل دیا۔"

سہیل نے مستری کو موقوف کر دیا مگر بدقسمتی اس کے ساتھ ہی تعمیر کا کام رک گیا اور نئے مستری کی جستجو ہونے لگی۔

چاند خاں چپراسی نے ایک ٹھیکہ دار سے دوستی گانٹھی۔ وہ سگرٹ، پان اور چائے سے اس کی تواضع کرتا اور اس کو خوش کرنے کے لیے بڑی چاپلوسی کی باتیں کرتا بڑے بڑے افسروں کی گھریلو زندگی کے خفیہ حالات مزے لے لے کر بیان کرتا۔ آخر ٹھیکہ دار نے اس کا مکان رعایتاً بنا دینے کی حامی بھر لی۔ جس دن دفتر میں چھٹی ہوتی چاند خاں اور اس کے بیٹے خود مزدوروں کی طرح کام کرتے۔

اس کے گھر کی دیواریں کھڑی ہو گئیں اور دروازوں اور کھڑکیوں کی چوکھٹیں بھی چنائی میں لے لی گئیں مگر چھت تک پہنچتے پہنچتے چاند خاں کے پاس دام ختم ہو گئے۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو جو کسی دوسرے شہر میں آڑھت کی دکان کرتا تھا لکھا کہ میں سخت بیمار ہوں، ہسپتال میں پڑا ہوں، مرنے کے قریب ہوں۔ اگر تم میری جان بچانا چاہتے ہو تو فوراً

دو سو روپے بھیج دو۔ دو ہفتے گزر گئے مگر بھائی نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس پر چاند خاں نے بھائی کو بھاری بھاری مغلظات سنائیں جو چاند خاں ہی سنا سکتا تھا اور سود پر قرض دینے والے پٹھانوں کی تلاش شروع کر دی۔

ایک دن ایک عورت جو سیاہ برقع پہنے ہوئے تھی، ہر اس جگہ جاتی ہوئی دیکھی گئی جہاں مد لگ رہی تھی۔ وہ بڑے دردناک لہجہ میں راج مزدوروں سے یوں خطاب کرتی:

"اے مسلمان بھائیو! میں ایک بیوہ ہوں، میرا شوہر فلاں دفتر میں ہیڈ کلرک تھا کہ اچانک اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے مرنے سے میں بے یار و مددگار رہ گئی ہوں۔ للہ میرے یتیم بچوں پر ترس کھاؤ اور مجھے کوئی ایماندار مستری دلواؤ۔" مستری اور راج مزدور اپنا کام چھوڑ بڑی توجہ سے اس کی تقریر سنتے اور جب وہ اپنا مدعا کہہ چکتی تو اسے کوئی جواب دیئے بغیر پھر اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے۔

دو باپ بیٹے اپنی نگرانی میں چار سو گز کے ایک پلاٹ پر مکان بنوا رہے تھے باپ کو تعمیر کے کام کی خاصی سُوجھ بوجھ تھی، بیٹا حساب کتاب اور لین دین کے کاموں میں ہوشیار تھا۔ جب لوہا بندھ چکا اور سنٹرنگ ہو چکی تو ایک خاص دن چھت ڈالنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ مگر اس دن نہ تو مستری ہی پہنچا اور نہ بھرائی والے ہی آئے۔ آخر باپ بیٹوں نے اِدھر اُدھر سے دو چار مزدور پکڑے اور ان کی مدد سے خود ہی چھت ڈالنے پر تیار ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ یہ چھت دس روز میں جا کر پڑی۔ ایک ایک کمرے پر دو دو دن صَرف ہوئے۔ اس واقعہ کا اس نواح میں کئی روز تک چرچا رہا۔

ایک وکیل صاحب نے زمین کا ٹکڑا تو خاصا بڑا خرید لیا مگر اتنا بڑا مکان بنوانے کی استطاعت نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے وسط میں صرف ایک کمرہ اور ایک باورچی خانہ بنوالیا اور

دیواروں پر پلستر، سفیدی یا رنگ روغن کرائے بغیر باقاعدہ طور پر رہنا شروع کر دیا۔ان کا کنبہ خاصا بڑا تھا۔رات کو یہ لوگ لالٹین جلاتے، چونکہ یہ پلاٹ سر راہ تھا جس پر آنے جانے والے کی نظر پڑتی تھی اس لیے انھوں نے پلاٹ کے گرداگرد چار دیواری کی جگہ پودے اگا دیئے۔اس سے چند ہی ہفتوں میں باڑھ بن گئی جس سے اچھا خاصا پردہ ہو گیا مگر ایک دن مٹی ڈھونے والوں کے بہت سے گدھے اس طرف سے گزرے۔صحرا میں وہ اس ہریالی کو دیکھ کر بری طرح اس پر ٹوٹ پڑے اور جب تک گھر کے زن و مرد ہاتھوں میں ڈنڈے لیے شور مچاتے ان کو نکالنے کے لیے پہنچے، انھوں نے آدھی سے زیادہ باڑھ صاف کر دی۔

پروفیسر سہیل کے ہاں تعمیر کا کام پھر شروع ہو گیا تھا۔اپنے پچھلے تلخ تجربے کے بعد جس میں ان کی نصف سے زیادہ چھٹی یوں ہی برباد ہو گئی تھی، اس نے مستریوں کی بے ایمانیوں پر چشم پوشی شروع کر دی تھی، وہ دیکھتا کہ بعض کاریگر دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد اپنے ٹفن کے خالی ڈبوں کو سیمنٹ سے بھر لیتے ہیں۔وہ دیکھتا کہ لوہار لوہا باندھنے والے تار کے پونڈ کے پونڈ غائب کر دیتا ہے۔وہ دیکھتا کہ بڑھئی پیمائش کر کے اس سے جتنی لکڑی منگواتا ہے اس سے آدھی بھی دروازے اور کھڑکیاں بنانے میں صرف نہیں کرتا۔وہ ہر روز چھٹی کے وقت لکڑی کے کئی کارآمد ٹکڑے سیمنٹ کی خالی بوری میں برادے کے ساتھ بھر کر سائیکل کے پیچھے باندھ لے جاتا ہے وہ دیکھتا کہ چوکیدار مستریوں کے ساتھ ملا ہوا ہے۔مستری اکثر کام سے غائب رہتے ہیں مگر وہ ان کی رپورٹ نہیں کرتا۔وہ یہ سب کچھ دیکھتا مگر دم نہ مارتا۔رات کو وہ اپنی بیوی سے ان لوگوں کی دغابازیاں بیان کرتا۔بیوی سن سن کر آنسو بہاتی رہتی۔

اُس کی دو مہینے کی چھٹی ختم ہو گئی اور وہ پھر کالج جانے لگا مگر درس و تدریس میں اس کا مطلق دل نہ لگتا۔اُس کا دوپہر کا کھانا بالکل چھوٹ گیا تھا۔وہ کالج سے گھر جانے کے بجائے

پلاٹ کا رُخ کرتا اور وہاں سے شام کو بڑی دیر میں گھر پہنچتا۔ غضب یہ ہوا کہ ابھی مکان کا بہت سا کام باقی تھا کہ مستریوں کی بے ایمانی، عمارتی سامان کی نایابی اور بلیک مارکیٹ سے اس کی خریداری کے باعث اس کا سرمایہ ختم ہو گیا۔ رفتہ رفتہ بیوی کے زیورات، ریڈیو، بائیسکل، کپڑا سینے کی مشین، کیمرا، گھڑیاں اور کئی مفید اشیاء مکان کی بھینٹ چڑھنے لگیں، اس کے پاس نایاب کتابوں، قلمی تصویروں اور پرانے بادشاہوں کے سکوں کا بہت نادر ذخیرہ تھا وہ سب کوڑیوں کے مول بک گیا اس کی آدھی سے زیادہ تنخواہ مکان کی تعمیر میں اٹھ جاتی۔ اس نے سگرٹ پینا چھوڑ دیا گھر میں دونوں وقت دال بھاجی پکنے لگی۔ کسی کے پاس پہننے کے لیے ڈھنگ کا کپڑا نہ رہا۔ کالج میں پرنسپل سمیت کوئی پروفیسر یا لیکچرار ایسا نہ تھا جس کا وہ سو پچاس کا مقروض نہ ہو۔ وہ شب و روز غموں فکروں میں گھلنے لگا۔ اس کی صحت جواب دینے لگی۔

جس علاقے میں پروفیسر سہیل کا مکان بن رہا تھا اس کے قریب ہی چار سو گز کے ایک پلاٹ پر کسی دفتر کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر کا مکان بھی زیرِ تعمیر تھا۔ اس شخص نے اپنے تحکمانہ اثر و رسوخ کو کام میں لاتے ہوئے ہر چیز سستے داموں خریدی تھی اور ہر کام رعایت سے کرا لیا تھا، پھر بھی مکان کی تیاری میں چار پانچ ہزار روپے کی کسر رہ گئی۔ یہ رقم اس نے ایک ڈاکٹر سے جسے رہائش کے لیے مکان کی تلاش تھی، دو سال کے پیشگی کرائے کے طور پر حاصل کر لی۔ جب مکان بن کر تیار ہوا تو اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی بیوی جو مصری برقع پہنے ہوئے تھی، اپنے نصف درجن بچوں کو لے کر آ گئی اور مکان پر قابض ہو گئی۔ ڈاکٹر یہ دیکھ کر بہت سٹپٹایا مگر اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے بڑی لجاجت سے اس سے کہا کہ چند روز میرے بیوی بچوں کو اپنے مکان کا چاؤ پورا کر لینے دو، پھر ہم اسے خالی کر دیں گے۔

مگر یہ چند روز ہفتوں میں بلکہ مہینوں میں تبدیل ہو گئے۔ اب اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے ڈاکٹر کی خوشامدیں کرنی شروع کر دیں کہ مجھے اسی مکان میں رہنے دو۔ میرے پاس رہنے

کو کوئی جگہ نہیں۔ کچا ساتھ ہے۔ میں آپ کا روپیہ جو میں نے پیشگی وصول کر لیا تھا ماہانہ قسطوں کی صورت میں ادا کروں گا۔

اس پر ڈاکٹر نے وکیل کے ذریعے سے اسے۔ نوٹس دیا اور قانونی چارہ جوئی کی دھمکی دی۔ آخر اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے مکان خالی کر دینے ہی میں مصلحت سمجھی۔ مکان سے نکلتے وقت اس کی بیوی اور بچے زار و قطار رو رہے تھے۔

ایک اونچے عہدہ دار نے دو ہزار مربع گز زمین پر ایک عالیشان بنگلہ تعمیر کروایا اور اس میں خوشنما باغیچہ بھی لگوایا۔ اس کا نام "رین بسیرا" تجویز ہوا۔ ایک دوست نے مشورہ دیا کہ اس پر "ہذا من فضل ربی" بھی لکھوا دیا جائے۔ عہدہ دار نے اس رائے کو پسند کیا اور جلی خطِ نسخ میں یہ الفاظ بنگلے کی پیشانی پر کندہ کرا دیے۔ دو ہفتے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ یہ بنگلہ جس پر کوئی نوے ہزار روپے لاگت آئی تھی، ڈیڑھ لاکھ میں بک گیا۔

چاند خاں کو بالآخر ایک ایسا کرایہ دار مل ہی گیا جس نے حامی بھر لی کہ میں تمہارے ادھورے مکان کو مکمل کرا دوں گا، بشرطیکہ تم ابھی سے مجھے اس میں بس جانے دو۔ چاند خاں کو مجبوراً اس کی یہ شرط منظور کر لینی پڑی۔ اس کی بیوی نے مکان کا کرایہ دار مل جانے کی خوشی میں گنے کے رس کی کھیر پکائی اور سارے جھونپڑی والوں کا منہ میٹھا کرایا۔

خدا خدا کر کے پروفیسر سہیل کا مکان تکمیل کو پہنچا، مگر وہ اس قدر ناقص بنا تھا کہ اس کے اندر جاتے ہوئے پروفیسر کی جمالیاتی حس سخت مجروح ہوتی تھی۔ دیواروں میں کوب، کھڑکیاں اور دروازے ٹیڑھے، بینکے، برآمدہ بے ڈھنگا، ایک طرف سے چھوٹا ایک طرف سے بڑا۔ ماربل چپس کے فرشوں میں ابھی سے دراڑیں پڑ گئی تھیں پھر وہ یہ بھی وثوق سے نہ کہہ سکتا تھا کہ اس کی تعمیر میں مستریوں نے لوہا اور سیمنٹ پوری مقدار میں استعمال کیا ہے یا

نہیں اور اس میں رہنے سے جان کا خطرہ تو نہ ہوگا۔ بہت روز تک وہ مکان خالی پڑا رہا۔

آخر ایک دن اس نے جرأت کر کے اخبار میں اشتہار دے ہی ڈالا۔ اس کی توقع کے خلاف تین چار ہی روز میں اسے پچاس ساٹھ خطوط وصول ہو گئے۔ ان میں سے نصف کے قریب غیر ملکیوں کے تھے۔ یہ لوگ سفارت خانوں یا تجارتی فرموں سے تعلق رکھتے تھے اور مکان نہ ملنے کے باعث ہوٹلوں میں بھاری کرائے ادا کر رہے تھے۔

پروفیسر سہیل نے چار پانچ اچھی اچھی اسامیوں کو منتخب کیا اور مکان دکھانے کے لیے بلوایا۔ اس کے اچنبھے اور خوشی کی حد نہ رہی جب ان لوگوں میں سے کسی نے بھی ان نقائص کی طرف اشارہ تک نہ کیا جو وہ اپنی دانست میں اس مکان میں پاتا تھا۔ آخر ایک جرمن کو اس نے اپنا مکان کرائے پر دے دیا، اسے اتنی رقم پیشگی کرائے کے طور پر مل گئی کہ وہ اس سے ایک چھوٹا سا نیا مکان بنا سکے۔

اس معاملے کے یوں خوش اسلوبی سے نمٹ جانے کے بعد وہ شاداں و فرحاں گھر پہنچا اور بیوی سے کہنے لگا۔

"اچھا ہی ہوا کہ ہم خود اس مکان میں نہ گئے۔ ایک تو اس کی بناوٹ بڑی ناقص ہے، دوسرے اس میں رہنا بھی خطرے سے خالی نہیں مگر اب مجھے مکان بنوانے کا بخوبی تجربہ ہو گیا ہے۔ اب کے میں انتہائی احتیاط سے کام لوں گا اور خدا نے چاہا تو ایسا مکان بنواؤں گا جو بے عیب ہوگا۔ پھر خواہ کوئی مجھے کتنا ہی روپیہ دے میں اسے کرائے پر نہیں اٹھاؤں گا۔ وہ مکان ہمارے اپنے رہنے کے لیے کافی ہوگا کیوں کہ لڑکیاں بڑی ہو گئی ہیں اور ہم سب کا ایک ہی کمرے میں سونا اخلاقی لحاظ سے اچھا نہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے اخبار اٹھایا اور اس کا وہ کالم بڑے غور سے پڑھنے لگا جس میں خالی پلاٹوں کی خرید و فروخت کے اشتہار درج تھے۔

سُرخ گلاُب

اس کا اپنا گھر تو کوئی تھا ہی نہیں مگر گاؤں کے ہر گھر کو وہ اپنا ہی گھر سمجھتی تھی۔ دن میں وہ کبھی کسی گھر میں دکھائی دیتی کبھی کسی گھر میں۔ کبھی ذیل دار کے ہاں تمباکو کوٹ رہی ہوتی۔ کبھی شمے گوجر کے ہاں چھاچھ بلو رہی ہوتی، کبھی مائی تاباں کے ساتھ اس کچی دیوار پر جس نے سارے گاؤں کا احاطہ کر رکھا تھا، اُپلے تھاپتی دکھائی دیتی، غرض جب دیکھو وہ گاؤں والوں کے کسی نہ کسی کام میں جتی ہی نظر آتی۔

کسی کسی روز وہ گاؤں والوں کی بکریاں اس پہاڑی پر چرانے لے جاتی جس پر چن شاہ ولی کا مزار تھا اور جہاں پیڑوں اور جھاڑیوں پر رنگ برنگے جھنڈے بارہ مہینے لہرایا کرتے۔ یہ جھنڈے آس پاس کے دیہات کے ان زائرین نے باندھے تھے جن کی مرادیں چن شاہ ولی کے فیض سے پوری ہو گئی تھیں۔

وہ یہ سارے کام ہنسی خوشی کیا کرتی اور صلے کا کبھی خیال تک اس کے ذہن میں نہ آتا۔ کسی نے کچھ رُوکھا سُوکھا دے دیا تو کھالیا، کہیں سے کوئی پھٹا پرانا کپڑا مل گیا تو پہن لیا ورنہ اپنے حال میں مست رہا کرتی۔ اس کی اوڑھنی میں جگہ جگہ چھید تھے جن میں سے اس کے لمبے بھورے بال دھول اور تنکوں سے اَٹے ہوئے کسی سادھو کی جٹا کی طرح دکھائی دیتے۔

وہ اسی گاؤں کی ایک نائن کی بیٹی تھی۔ باپ کی اس نے صورت نہیں دیکھی تھی، چار برس کی ہوئی تو ماں بھی چل بسی اور کوئی رشتے دار تھا نہیں بس گاؤں ہی میں رُل رلا کر پل گئی۔ گاؤں کی ہر عورت خواہ وہ ذیلدارنی ہوتی یا مہترانی، اس کی "چاچی" تھی، اور گاؤں کا ہر مرد اس کا "چاچا"

پندرہ برس کی عمر کو پہنچ کر اس نے خوب ہاتھ پاؤں نکالے، روپ بھی نکھر آیا۔ آنکھیں بڑی بڑی اور رسیلی جیسی ہرنیوں کی۔ شروع شروع میں جس کسی نے دیکھا حیران رہ گیا اور دل میں کہنے لگا۔ "ارے یہ وہی نائن کی چندھی لونڈیا کاکی ہے جو چھ سات برس اُودھر ننگ دھڑنگ نالیوں میں لوٹا کرتی تھی!"

کاکی کی عمر چار پانچ برس ہی کی تھی کہ اس میں مجذوبیت کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ اگر ماں باپ زندہ ہوتے تو شاید اس کے علاج کی کچھ فکر کرتے یا کم سے کم اسے شعور کی کچھ باتیں ہی سکھاتے۔ گاؤں والوں کو تو اس کی پروا تھی نہ ضرورت۔ ان کی ہمدردی تو بس یہیں تک تھی کہ کبھی کبھی اس کے ہاتھ میں گڑ کی بھیلی یا گاجر پکڑا دی جاتی۔ وہ جوں جوں بڑی ہوتی گئی اس کے اور اعضا تو نشوونما پاتے رہے مگر دماغ کمزور ہی رہا۔ جوانی کو پہنچ کر بھی وہ مجذوب کی مجذوب رہی مگر اس کا یہ مرض گاؤں والوں کے لیے بڑے فائدے کا موجب تھا کیونکہ وہ دن بھر اس سے طرح طرح کے کام لیتے رہتے جنہیں وہ نا سمجھی میں بے تکان کرتی رہتی۔

کاکی نے اپنے دماغ کی کمزوری کے باوجود ایک بات میں بڑی ترقی کی تھی اور وہ یہ کہ اس کی زبان خوب چلنے لگی تھی۔ جس گھر میں بھی جاتی اپنی اوٹ پٹانگ باتوں سے اس کے مکینوں کا دماغ چاٹ جایا کرتی، جب بات کرنے کو کوئی نہ ملتا تو آپ ہی آپ بولتی رہتی، کبھی کبھی اسے مارا پیٹا بھی جاتا مگر جلد ہی گھر کی کوئی بڑی بوڑھی اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے اسے بہلا لیتی اور یہ خطرہ دور ہو جاتا کہ کہیں وہ ناراض ہو کر اس گھر کا آنا جانا ہی بند کر دے۔

جب کاکی کے کپڑے میلے ہو جاتے تو پٹواری کی بیوی اسے صابن کا ایک ٹکڑا دے کر کہتی: "کاکی تیرے کپڑوں سے بڑی بدبو آنے لگی ہے جا انگنائی میں بیٹھ کر انہیں دھولے۔" کاکی انکار کرتی تو پٹوارن زبردستی اس کے کپڑے اتروا کر اس سے دھلواتی۔ شلوار یا کُرتا کہیں سے پھٹا ہوتا تو اسے سوئی دھاگا دیا جاتا۔ مگر کاکی سینا پرونا نہ جانتی تھی۔ اس پر پٹوارن کو خود ہی اس کے پھٹے ہوئے کپڑے سینے پڑتے مگر اس کے عوض کاکی کو گھنٹوں پٹوارن کی کمر دابنی پڑتی۔

جس روز کاکی گاؤں والوں کی بکریاں چرانے لے جاتی اسے کسی نہ کسی گھر سے بیسن کی دو روٹیاں اور تھوڑا سا مکھن ایک پوٹلی میں باندھ کر دے دیا جاتا۔ پہاڑی پر پہنچ کر بکریاں اپنے آپ چرتی رہتیں اور وہ خود بھی ان ہی کی طرح ادھر اُدھر گھومتی رہتی۔ وہ اونچے اونچے سپاٹ ٹیلوں پر بے دھڑک چڑھ جاتی۔ کبھی کسی درخت کی اونچی ڈال پر چڑھ بیٹھتی، کبھی کسی جھاڑی کے نیچے ٹھنڈی زمین پر لیٹ جاتی اور آپ ہی آپ باتیں کرنے لگتی یا دور سے آتی ہوئی رہٹ کی گھوں گھوں سنتی رہتی۔ کبھی پہاڑی کی چوٹی پر جا پہنچتی جہاں سے ایک طرف چمن شاہ ولی کے مقبرے کا سبز گنبد نظر آتا اور دوسری طرف گاؤں کا بڑا سہانا منظر دکھائی دیتا۔

منالی کی آبادی چار پانچ سو نفوس سے زیادہ نہ تھی۔ یہ ویسا ہی کچے گھروندوں کا بے ترتیب مجموعہ تھا جیسے پنجاب کے اور گاؤں ہوتے ہیں۔ گرداگرد کچی دیوار جس پر اُپلے تھپے ہوئے، بیچوں بیچ بے ڈھنگی سڑک کہیں سے تنگ کہیں سے کشادہ، پیچ کھاتی اور قریب قریب ہر گھر کے آگے سے گزرتی ہوتی۔ سڑک کے دونوں طرف بیل گاڑیوں کے پہیوں نے مستقل طور پر نالیاں سی بنا دی تھیں۔ جب کیچڑ نہ ہوتی تو ان نالیوں میں پہیے بڑی روانی سے چلتے اور بیلوں کو زور نہ لگانا پڑتا۔ گاؤں کی دیوار پر صبح ہی سے بہت سے کوّے آ بیٹھتے اور دن بھر کائیں کائیں کا شور برپا رکھتے ان کے علاوہ گاؤں کے لڑکے بھی کھدر کے میلے کچیلے کُرتے پہنے، ننگی ٹانگیں، بعض لنگوٹی اور بعض صرف ایک دھاگا سا کمر پر باندھ کر دیوار پر ایک ٹانگ

اِدھر ایک ٹانگ اُدھر گھوڑے کی سی سواری کرتے نظر آتے۔

منالی میں دو تین مکان پختہ اینٹوں کے بنے ہوئے بھی تھے، مگر یہ گاؤں کی دیوار سے باہر کھیتوں کے بیچ میں تھے۔ ان میں ایک بڑا مکان تو ذیلدار کا تھا، اور دوسرا اس سے ذرا فاصلے پر چھوٹا مکان پٹواری کا۔ کاکی کا آنا جانا زیادہ تر ان ہی دو مکانوں میں رہتا تھا۔

چمن شاہ بڑے زبردست ولی مانے جاتے تھے۔ مشہور تھا کہ جو کوئی عرس کے روز ان کے مزار پر آ کر مراد مانگے، خاص کر اولاد کی مراد، تو وہ جلد ہی یا کچھ عرصے بعد پوری ہو کے رہتی تھی۔ ان کی ایک کرامت یہ بھی تھی کہ دیہاتی عورتیں خاص طور پر چمن شاہ ولی کی بڑی معتقد تھیں۔ ان کی ایک کرامت یہ بھی تھی کہ مراد مانگنے والی کو پہلے ہی سے معلوم ہو جاتا کہ میری تمنا بر آئے گی یا نہیں۔ اگر بر آنے والی ہوتی تو چمن شاہ ولی خود سائلہ کے خواب میں آ کر اس کی بشارت دیتے۔ یہ بشارت کیا تھی، سرخ گلاب کا ایک پھول۔ ولی سفید گھوڑے پر سوار ہاتھ میں پھول تھامے جسے وہ بار بار سونگھتے سائلہ کے پاس سے گزرتے اور وہ پھول اس کی جھولی میں پھینک دیتے۔ آنکھ کھلنے پر جب سائلہ گھر کے لوگوں کو یہ مژدہ سناتی تو سب اسے مبارک باد دینے لگتے۔

چمن شاہ ولی کی ان کرامتوں کے تذکرے گاؤں کے ہر گھر میں اکثر ہوتے رہتے تھے۔ کاکی بڑے غور سے ان باتوں کو سنا کرتی۔ کبھی کبھی وہ خود بھی کوئی بات پوچھنے لگتی:

"اچھا چاچی جب چمن شاہ ولی نے تیری جھولی میں پھول پھینکا تو وہ پیدل تھا یا گھوڑے پر؟"

"گھوڑے پر۔"

"وہ شکل و صورت کا کیسا تھا؟ بڈھا تھا یا جوان؟"

"چپ کر پگلی، کنواری لڑکیاں ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالتیں۔"

"کیوں کنواری لڑکیوں کو کیا ہوتا ہے؟"

گھر کی مالکہ کے پاس اس کا کوئی جواب نہ ہوتا، اور اودھر کاکی جواب کا انتظار کیے بغیر چمن شاہ ولی کے بارے میں کوئی اور بات پوچھنے لگتی اور مالکہ کو خواہ مخواہ کوئی کام پیدا کر کے کاکی کو اس میں اُلجھا دینا پڑتا۔

تیسرے پہر وہ بکریوں کو ہانکتی ہوئی پہاڑی پر سے اترتی۔ گاؤں میں پہنچ کر بکریاں تو اپنے اپنے ٹھکانے پر خود بہ خود چلی جاتیں اور وہ سیدھی مولے گنڈیری والے کی دکان پر پہنچتی اور اس سے گانٹھیں مانگتی۔ مولا گنڈیریاں تو گنے کے موسم میں بیچا کرتا تھا مگر سارا سال وہ اسی نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ خواہ اس نے گڑ کی ریوڑیوں، میٹھے چنوں اور دال موٹھ کا خوانچہ ہی کیوں نہ لگا رکھا ہو۔ یہ شخص سیاہ فام اور بدرُو تھا۔ اس پر چیچک میں اس کی ایک آنکھ بھی جاتی رہی تھی۔ چالیس کے قریب عمر تھی۔ دس سال ہوئے اس کی بیوی مر گئی تھی مگر اس نے دوسری شادی نہیں کی بس دن بھر اپنی ایک آنکھ سے گاؤں کی لڑکیوں کو گھورا کرتا۔

وہ کاکی کو اس وقت سے جانتا تھا جب وہ پانچ چھ برس کی بچّی تھی اور عموماً ننگی پھرا کرتی تھی۔ اسی وقت سے وہ اس کے پاس گانٹھیں مانگنے آنے لگی تھی، کاکی کو دیکھ کر وہ حیران ہوتا کہ لڑکیاں کتنی جلدی جوان ہو جاتی ہیں، اس کے ساتھ ہی اس کی نگاہیں کاکی کے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے کپڑوں پر پڑتیں جن میں سے اس کے سڈول گھٹنے یا سفید سینے کا کچھ حصہ دکھائی دے رہا ہوتا اور اس کا دل خواہ مخواہ کاکی سے حجت بازی کرنے کو چاہتا۔

"گانٹھیں نہیں ہیں، پھر آنا۔"

"وہ جو پڑی ہیں چاچا تیرے گھٹنے کے نیچے۔"

"یہ میں نے اپنے لیے رکھی ہیں۔"

"تو گنڈیریاں کیوں نہیں چوستا چاچا؟"

"واہ! گنڈیریاں چوسوں تو بیچوں کیا . ! میں کہتا ہوں کاکی تو دن بھر جن لوگوں کے کام کرتی رہتی ہے، ان سے پیسے کیوں نہیں مانگتی، پھر تو جتنی چاہے گنڈیریاں چوس سکتی

ہے۔ گانٹھوں سے تیرے دانت نہیں دُکھتے۔"

"نہیں اللہ کی سوں، مجھے گانٹھیں ہی اچھی لگتی ہیں۔ ... لا چاچا جلدی گانٹھیں دے دے۔ دیر ہو رہی ہے۔" اور مولا دو چار گانٹھیں اسے دے ہی دیتا۔

چیت کا مہینہ نصف سے زیادہ گزر چکا تھا۔ چن شاہ ولی کے عرس کی تاریخ قریب آ رہی تھی۔ چونکہ یہ عرس ایسے زمانے میں ہوتا، جب دیہاتی فصل کی کٹائی سے فارغ ہو چکے ہوتے اور اپنی محنتوں کا صلہ پا کر خوشحالی کی ایک ہلکی سی جھلک ان کی زندگیوں میں نظر آنے لگتی، اس لئے وہ خوشی خوشی اپنی بساط کے مطابق عرس کی تیاریاں کرنے لگتے۔

چن شاہ کے مزار کا پرانا مجاور جس کا نام جیون سائیں تھا، مزار کے آس پاس کی زمین کو جھاڑ جھنکار سے صاف کرتا نظر آتا تھا۔ اس نے گاؤں والوں سے دو جوان مانگے اور ان کی مدد سے مزار کی دیواروں اور بُرجیوں پر سفیدی کی اور گنبد پر سبز رنگ کیا۔ ادھر گاؤں کی عورتوں میں ہر وقت چن شاہ ولی ہی کا ذکر رہنے لگا۔ وہ ہر روز پہلے سے بھی زیادہ بے تابی کے ساتھ عرس کے دن کا انتظار کرنے لگیں۔

اب کے جن عورتوں کو مراد مانگنی تھی، ان میں گاؤں کے ذیلدار کی بیوی بھی تھی جس کا نام خیر النساء تھا، وہ ایک موٹی بھسپھس بد مزاج اور غصہ ور عورت تھی چند مہینوں سے وہ کاکی کو بہلا پھسلا کر زیادہ تر اپنے پاس ہی رکھنے لگی تھی۔ وہ اس سے طرح طرح کی محنت مشقت کے کام لیا کرتی۔ جب عرس کے دن قریب آئے تو اس نے کچھ تو کاکی کی خدمت گزاریوں کے صلے میں اور کچھ مراد مانگنے کی خوشی میں اسے گھٹیا جاپانی ریشم کا ایک سوٹ سلوا دیا جس پر گلاب کے بڑے بڑے پھول چھپے ہوئے تھے۔

جب عرس کا دن آیا تو خیر النساء نے کاکی کو گرم پانی سے خوب نہلوایا۔ گھر کی ایک بوڑھی عورت نے اس کے سر میں سرسوں کا تیل ڈال کر کنگھی کی اور ایک سرخ چنلا اس کی چوٹی میں گوندھا گیا جو اس کے بھورے بالوں پر خوب سجنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں کاجل ڈالا

گیا۔ ریشمی کپڑوں اور بناؤ سنگار سے اس کا روپ کئی گنا بڑھ گیا اور وہ کسی زمیندار کی بہو بیٹی معلوم ہونے لگی:

"کاکی" ذیلدارنی نے کہا۔ "تو میرے ساتھ ساتھ ہی رہیو۔"

"اچھا چاچی۔"

"اور جب میں مزار پر دعا مانگنے بیٹھوں تو تو بھی میرے پاس ہی بیٹھ جائیو۔"

"چاچی، تیرے تو اولاد ہے تو مراد کیوں مانگے گی؟"

"میرے اب تک لڑکیاں ہی ہوئی ہیں۔ میری تمنا ہے چن شاہ ولی مجھے ایک چاند سا بیٹا بھی دیں۔"

کاکی کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

"چاچی میں بھی مراد مانگوں گی؟"

"ہٹ نگلی تیرا ابھی بیاہ ہی کب ہوا ہے۔"

"تو میرا بیاہ کب ہوگا؟"

"چپ کم بخت کیسی باتیں منہ سے نکالتی ہے۔"

کاکی کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی کہ خیر النساء نے زور سے اس کی چٹیا کھینچ کر اسے چپ کرا دیا۔

چن شاہ ولی کا مزار زیادہ دور نہیں تھا اس لیے ذیلدارنی کاکی اور چند رشتہ دار عورتوں کے ساتھ پیدل ہی پہاڑی کی طرف روانہ ہو گئی۔

اس روز ابھی تڑکا ہی تھا کہ دور دور کے گاؤں سے عورتوں اور بچوں سے بھری ہوئی بیل گاڑیاں آنی شروع ہو گئی تھیں۔ مرد ساتھ ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ ان میں کچھ گھوڑوں پر بھی سوار تھے۔ یہ گاؤں کے بانکے سجیلے نوجوان تھے۔ رنگدار لنگیاں باندھے، بوسکی کی قمیصیں پہنے چاندی کے بٹن لگائے خواہ مخواہ گھوڑے کو ایڑ بتاتے اور رخ رخ کرتے چلے

آتے۔ کبھی یہ بھی دیکھنے میں آتا کہ میاں آگے گھوڑے پر بیٹھا ہے، بیوی پیچھے ہے۔ بیوی نے ایک ہاتھ سے میاں کی کمر پکڑ رکھی ہے اور دوسرے ہاتھ سے بچے کو سہارا دے رکھا ہے جو اُن دونوں کے بیچ ماں کی چھاتی سے چمٹا دودھ پی رہا ہے۔

بہت سی عورتیں جن کے گاؤں قریب ہی تھے، ٹولیاں بنا کر پیدل آ رہی تھیں۔ ان میں ہر عمر کی عورتیں تھیں، نئی نویلیاں پور پور مہندی رچی ہوئی، سرخ جوڑا سرخ دوپٹہ جس میں چُنٹیں پڑی ہوئی۔ کناروں پر گوٹا ٹکا ہوا۔ ہونٹ کثرت سے دنداسہ ملنے سے سیاہی مائل پیازی ہو گئے تھے اور آنکھوں سے کاجل بہا جاتا تھا۔ اَدھیڑ عمر کی دیہاتنیں، لمبی تڑنگی، ان کی اور ہی وضع تھی۔ موٹی ململ کے کُرتے، کھدر کی شلواریں۔ جنھیں ہلکا ہلکا نیل دیا ہوا۔ سر اور سینے کو لٹھے کی چادر میں چھپائے، چلتے وقت ان کی گردن سیدھی اور نگاہیں سامنے رہتی تھیں۔ یہ عادت انھیں سالہا سال سر پر بدنے اور مٹکے یا اناج کی گٹھڑیاں بغیر ہاتھوں کے سہارے اٹھا کر چلنے کے باعث آپ ہی آپ پڑ گئی تھی۔

مزار سے ذرا فاصلے پر ایک جگہ کو ہموار کر کے میدان سا بنا لیا گیا تھا جہاں لنگر کی دیگیں چڑھا دی گئی تھیں۔ آس پاس کے چھوٹے چھوٹے قصبوں سے کچھ دکان دار سستے کھلونے لے آئے تھے اور زمین پر چادریں بچھا کر دکانیں سجا دی تھیں۔ کچھ لوگ بانس کی چھتریوں پر غبارے، پھرکیاں، پپیہے، بھونپو وغیرہ دھاگوں سے لٹکائے خود بین باجہ بجاتے ہوئے میلے کی رونق بڑھا رہے تھے۔

ایک طرف پہاڑی کے نیچے چرخ اور ہنڈولے گڑے تھے جن کی چرخ چوں سے پیہم ایک گونج سی سنائی دے رہی تھی۔ بچوں کے علاوہ خاصی بڑی عمر والے مرد بھی چرخ پر بیٹھے شور غل مچا رہے تھے۔ کبھی کبھی دو چار منچلی عورتیں بھی ہنڈولوں میں بیٹھ جاتیں اور جب ہنڈولا اوپر آسمان کی طرف جاتا تو وہ ڈر کر چیخنے لگتیں اور اپنے بچوں کو اور بھی بھینچ کر سینوں سے چمٹا لیتیں۔ کئی پیڑوں میں جھولے پڑے تھے، جن میں کہیں مرد اور کہیں عورتیں پینگیں

بڑھا رہے تھے۔

سہ پہر ہوتے ہوتے اتنی مخلوق جمع ہو گئی کہ پہاڑی پر چلنا پھرنا مشکل ہو گیا۔ زمین کے علاوہ پہاڑی کے سب پیڑوں کی ڈالوں پر بھی آدمی ہی آدمی نظر آنے لگے۔ جو زائرین مراد مانگنے آئے تھے وہ پہاڑی پر چڑھ کر مزار کے اندر پہنچتے اور قبر کے سرہانے یا پائینتی، جہاں بھی جگہ مل جاتی بیٹھ کر خشوع و خضوع کے ساتھ دعا میں مشغول ہو جاتے۔ قبر پر سبز رنگ کی نئی ریشمی چادر ڈال دی گئی تھی۔ زائرین پھول اور چڑھاوے اسی پر چڑھاتے تھے۔

ذیلدارنی نے اپنے قافلے کے ساتھ ایک گھنے پیڑ کے نیچے ڈیرا جمایا تھا، وہ شام کے قریب پھولوں کی چادر، لڈو اور نذر کی دوسری چیزیں لے کر مراد مانگنے گئی، کاکی اور دو ایک عورتیں اس کے ہمراہ تھیں، قبر کے سرہانے تھوڑی سی خالی جگہ دیکھ کر انھوں نے جلدی سے اس پر قبضہ جمالیا اور ٹھس ٹھنسا کر وہیں بیٹھ گئیں، پھر ذیلدارنی اور دوسری عورتوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ کاکی نے بھی ان کی پیروی کی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگی آخر دعا ختم ہوئی اور یہ عورتیں مزار سے نکل کر پھر اسی پیڑ کے نیچے اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئیں۔

اب شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ ہر چند گیسوں کا انتظام کیا گیا تھا مگر ان کی تعداد دو تین سے زیادہ نہ تھی۔ ایک گیس مزار کی کوٹھڑی کے باہر صحن میں رکھا گیا تھا، ایک پہاڑی راستے کے بیچوں بیچ تاکہ زائرین کو ٹھوکر نہ لگے اور ایک اس جگہ جہاں لنگر تقسیم کیا جاتا تھا۔ باقی تمام جگہوں پر تیل کی کپّیاں چراغ یا مشعلیں جلائی گئی تھیں۔ کچھ لوگ گھر سے لالٹین لے آئے تھے، وہ بھی کہیں کہیں روشن تھیں مگر ان سب کی روشنی اتنی مدھم تھی کہ ہر طرف نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

رسم کے مطابق سب زائرین کو رات یہیں گزارنی تھی۔ دیہات کے لوگ اور خاص طور پر عورتیں رات کو جلد ہی سو جانے کی عادی ہوتی ہیں، اس پر میلہ دیکھنے اور گھومنے

پھرنے سے وہ تھک کر چور ہو گئی تھیں، بعض نے تو لنگر کا بھی انتظار نہ کیا اور دریوں اور چٹائیوں پر جہاں جگہ ملی پڑ کر سو گئیں۔

رات کو نو بجے کے قریب لنگر تقسیم کیا گیا اور میلے میں ایک مرتبہ پھر چہل پہل پیدا ہو گئی۔ آخر دس بجتے بجتے یہ ہنگامہ بھی ختم ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی زائرین کی بیشتر تعداد کو نیند نے بے سدھ کر دیا۔

کاکی ذیلدارنی کی پائنتی لیٹی ہوئی تھی۔ عرس کی ریل پیل، ہنگامے، کھیل کود، شور و غل، بھانت بھانت کی صورتیں، عورتوں کا چن شاہ ولی کے مزار پر جانا اور اولاد کی مراد مانگنا، دن بھر یہ سب تماشے دیکھ دیکھ کر اس کے کمزور دماغ میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا تھا جس سے اس کی نیند اڑ گئی تھی۔ کچھ دیر تو وہ یونہی پڑی رہی، پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پہاڑی پر اب بھی کہیں کہیں لوگ ہنس بول رہے تھے۔ ایک طرف ذرا فاصلے پر ملنگوں کی منڈلی جمی ہوئی تھی اور کچھ لوگ مٹکے کی لے کے ساتھ گا رہے تھے:

”چل سنتاں دے سنگ نی جے تو ہوناں سنت نی“

اس منڈلی سے بار بار ایک شعلہ اندھیرے میں لپکتا اور لمحہ بھر کو بعض شکلوں کو اُجاگر کر دیتا۔ کاکی کچھ دیر یہ منظر دیکھتی رہی، پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس وقت ذیلدارنی اور دوسری عورتیں نیند میں مدہوش تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی اس منڈلی کی طرف جانے لگی۔ جب ذرا قریب پہنچی تو ایک گرے ہوئے درخت کا تنا نظر آیا اور وہ اس پر بیٹھ گئی۔ یہاں سے اسے وہ شعلہ زیادہ روشن اور اوپر اٹھتا ہوا دکھائی دینے لگا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ انہماک کے ساتھ یہ تماشہ دیکھنے لگی۔

تھوڑی دیر میں اس منڈلی میں سے ایک آدمی اٹھا اور زور زور سے کھانستا ہوا اس کی طرف آنے لگا جدھر کاکی درخت کے تنے پر بیٹھی تھی۔ کاکی نے اسے جھٹ پہچان لیا۔

''چاچا مولا تو یہاں کیا کر رہا ہے؟''

''تو کون ہے؟''

''واہ مجھے نہیں پہچانا؟''

مولے نے اپنی واحد آنکھ کو ملا اور بے اختیار بول اٹھا:

''او ہو ہو ہو۔ بھئی واہ یہ تو اپنی کاکی ہے۔''

اس نے کاکی کو ہمیشہ برے حال میں دیکھا تھا۔ مگر اب اس کا یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔

''بھئی رب کی سوں کاکی تو ان کپڑوں میں بڑی خوب صورت لگ رہی ہے۔''

''چاچا۔ یہ کپڑے ذیلدارنی نے سلوائے ہیں۔''

''اچھا! شاباش ہے بھئی۔''

''چاچا تجھے ایک بات بتاؤں؟''

''بتا۔''

''جب ذیلدارنی نے لڑکے کی مراد مانگی تو میں نے بھی لڑکے کی دعا مانگی، آہاہا جی۔ چاچا یہ بات ذیلدارنی کو نہ بتانا۔

مولے نے کچھ جواب نہ دیا اس کا دماغ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ عین اس وقت منڈلی سے پھر ایک شعلہ لپکا۔ کاکی اسے دیکھتے ہی چلا اٹھی:

''چاچا۔ یہ آگ سی کیا نکلتی ہے؟''

''کون سی آگ؟''

''وہ دیکھو پھر نکلی۔''

اس اثنا میں کئی شعلے پے در پے لپکے۔ مولے نے دیکھا تو مسکرانے لگا:

''اس کو لاٹ کہتے ہیں پگلی۔ تو نے یہ لاٹ پہلے کبھی نہیں دیکھی؟''

"کبھی نہیں۔ چاچا چل مجھے دکھا۔"

مولا گھبرا سا گیا۔

"آج نہیں پھر کبھی سہی۔"

"نہیں۔ میں آج ہی دیکھوں گی۔"

"اچھا ٹھہر۔" اس کے جسم میں ایک کپکپی سی دوڑ رہی تھی۔

"ایک شرط ہے۔"

"کیا؟"

"کسی کو بتائے گی تو نہیں۔"

"کبھی نہیں۔"

"قسم کھا چن شاہ ولی کی۔"

"چن شاہ ولی کی سوں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔"

"یاد رکھ۔ تو نے قسم توڑ دی تو چن شاہ ولی تجھ پر غصے ہوگا اور تیری مراد کبھی پوری نہیں کرے گا۔"

"کہہ جو دیا چاچا نہیں بتاؤں گی۔"

"اچھا تو ٹھہر۔ میں وہ لاٹ یہیں لاتا ہوں ...."

علی الصباح ذیلدارنی کاکی کو، جو دری سے ذرا ہٹ کر زمین پر بے ہوش پڑی تھی، جھنجھوڑ کر جگا رہی تھی مگر اس کی آنکھ کھلنے میں نہ آتی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ کہتی جاتی:

"خندی نے ایک ہی دن میں زمین پر لوٹ لوٹ کر کپڑوں کا کیاناس کر دیا اری اٹھتی ہے یا دوں ایک لات۔"

"اٹھتی ہوں چاچی۔" آخر بڑی مشکل سے کاکی نے اپنی آنکھیں کھولیں جو اس وقت بہت سرخ ہو رہی تھیں۔

''اونا شدنی اُٹھ۔ میلہ ختم ہو گیا۔ سب لوگ جا رہے۔ جلدی سے برتن سنبھال، دری لپیٹ، ذیلدار صاحب انتظار کر رہے ہوں گے۔''

کاکی کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ پیاس سے حلق سوکھ رہا تھا۔ وہ جیسے تیسے اٹھی، مگر کھڑی ہوئی تو ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔ گرتی پڑتی درخت کے تنے کے پاس پہنچی جہاں پانی کی مٹکی رکھی تھی اور لوٹا بھر کر پانی پیا۔ پھر منہ پر چھینٹے دیئے، رفتہ رفتہ اس کے حواس درست ہونے لگے۔

چن شاہ ولی کے عرس کو ابھی ایک مہینہ ہی گزرا تھا کہ گاؤں کی عورتوں نے کاکی کے مزاج میں ایک تبدیلی دیکھی۔ وہ یہ کہ اسے کھانے پینے کی رغبت نہ رہی کہاں تو ایسی پیٹو کہ دن میں کئی کئی مرتبہ کھانا کھاتی اور چھاچھ کے گڑوے کے گڑوے پی ڈالتی، یا اب یہ حال کہ کھانا دیکھ کر اسے متلی ہونے لگتی، ویسے بھی اسے ابکائیاں آتی رہتیں۔ یہ کیفیت چار پانچ ہفتے تک رہی۔ اس کے بعد منائی کی عورتیں یہ دیکھ کر دم بخود رہ گئیں کہ کاکی کا پیٹ روز بروز پھولتا جا رہا ہے۔

سب سے پہلے ذیلدارنی پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا۔

''او کاکی کی بچی، تجھے تو حمل ہے کمبخت۔''

ذیلدارنی کی بات اس کی سمجھ میں نہ آئی اور وہ حیوانوں کی طرح اس کا منہ تکنے لگی۔

''کاکی سچ سچ بتا تو کس آدمی سے ملی تھی؟''

''کسی سے بھی نہیں چاچی۔''

''تو پھر رنڈی یہ حرام کا بچہ تیرے پیٹ میں کیسا ہے؟''

''میرے پیٹ میں بچہ ہے چاچی؟'' یک بارگی کاکی کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ ''تو سچ کہتی ہے چاچی؟ آہا! پھر تو چن شاہ ولی نے میری مراد پوری کر دی۔''

دو چار دن میں یہ خبر پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ وہ جس طرف بھی جاتی، مرد اس کو

گھورتے اور عورتیں اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دیتیں مگر کاکی کو اب نہ جھڑکیوں کا ڈر تھا نہ مار پیٹ کا خوف، اس پر اب ہر وقت ایک جذب کی کیفیت طاری رہنے لگی۔ وہ اکثر اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی۔ کبھی اس طرح خطاب کرنے لگتی جیسے کوئی اس کے سامنے کھڑا ہے، جس کو وہ تو دیکھ رہی ہے مگر کوئی اور نہیں دیکھ پاتا، کبھی ہنسنے لگتی تو ہنسے ہی چلی جاتی اور رونے لگتی تو گھنٹوں روتی ہی رہتی۔ گاؤں کے اکثر گھروں میں اب بھی اس کا پھیرا رہتا مگر کہیں چند منٹ سے زیادہ نہ ٹکتی۔ کبھی آپ ہی آپ کہہ اٹھتی:

"ہاں چاچی، میرے پیٹ میں بچہ ہے۔ مجھے چمن شاہ ولی نے دیا ہے، وہ اس رات میرے پاس آیا تھا، اس نے دانتوں میں سرخ گلاب کا پھول داب رکھا تھا مجھے دیکھا تو مسکرانے لگا۔ پھر اس نے وہ پھول میری جھولی میں پھینک دیا"

اور شیے گوجر کی بیوی سے، جو ہمیشہ اس سے شفقت سے پیش آتی تھی، اس نے کہا:

"چمن شاہ ولی ہر رات میرے پاس آتا ہے۔ ایک دفعہ وہ اپنے سفید گھوڑے پر سوار تھا۔ میں نے کہا۔ چمن شاہ ولی مجھے سیر کرا۔ اس نے کہا اچھا۔ پھر اس نے مجھے اپنے پیچھے بٹھالیا، اور دور دور کی سیر کرائی۔ اس کا گھوڑا دریاؤں کے اوپر چلتا تھا پہاڑوں پر چڑھتا تھا۔ آسمان پر اڑتا تھا۔ میں نے چمن شاہ ولی کی کمر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا۔ چمن شاہ نے کہا۔ کاکی ڈر نہیں، تو گرے گی نہیں۔"

اور پٹواری کی نئی بیوی سے جو عمر میں کاکی سے تین چار سال ہی بڑی تھی اس نے کہا:

"تجھے پتہ نہیں چاچی، چمن شاہ ولی بڈھا نہیں، نہ اس کی ڈاڑھی ہے۔ وہ بڑا گبھرو جوان ہے۔ اس کے لمبے لمبے گھنگھریالے بال ہیں جو اس کے شانوں پر لٹکتے ہیں۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگا، کاکی تیرے بال بڑے الجھے ہوئے ہیں، لا میں انھیں سلجھادوں، اور وہ اپنی انگلیوں سے میرے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔"

کبھی کبھی وہ مولے گنڈیری والے کی دکان پر بھی جاتی۔

"چاچا مولا دیکھا جن شاہ ولی نے میری مراد پوری کر دی، لا تھوڑی سی گانٹھیں تو دے۔"

مولے کے چہرے کا رنگ یکبارگی زرد پڑ جاتا اور وہ گھبراہٹ میں بہت سی گنڈیریاں اس کی جھولی میں ڈال دیتا۔

ایک دن وہ ذیلدارنی کے گھر پہنچی، تو خیر النساء نے پہلے تو اسے سینکڑوں گالیاں دیں۔ پھر چٹیا پکڑ کو خوب گھسیٹا اور بہت سی لاتیں اور تھپڑ بھی رسید کیے۔

"خبردار رنڈی اگر پھر کبھی میرے گھر میں قدم رکھا۔"

"چاچی۔" کاکی نے بلک بلک کر روتے ہوئے کہا۔ "تو نے مجھے مارا ہے۔ رات جن شاہ آئے گا تو میں اس سے کہوں گی ذیلدارنی بہت بری ہے۔ اس کی مراد کبھی پوری نہ کرنا۔"

اور پھر گاؤں والوں نے پنچایت کی جس میں گاؤں کے سب چھوٹے بڑے شامل ہوئے اور فیصلہ کیا گیا کہ چونکہ کاکی کی وجہ سے گاؤں کی سخت بدنامی ہو رہی ہے اس لیے گاؤں سے نکال دیا جائے۔

اس فیصلے کو عمل میں لانے کے لیے علی الصباح ایک بیل گاڑی کا انتظام کیا گیا اور اس میں کاکی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے سوار کر دیا گیا۔

یہ بیل گاڑی دن بھر نامعلوم راہوں سے گزرتی رہی اور شام کو ایک اجاڑ مقام پر پہنچ کر رک گئی، وہاں کاکی کے ہاتھ پاؤں کھول دیے گئے اور اسے زبردستی بیل گاڑی سے اتار دیا گیا۔

منالی میں کچھ دنوں اس واقعہ کا چرچا رہا۔ مگر جب دو تین مہینے گزر گئے اور کاکی کو نہ تو کسی نے دیکھا اور نہ اس کی کوئی خبر ہی آئی تو یہ بات آپ سے آپ گاؤں والوں کے ذہن سے اتر گئی۔

دن پر دن گزرتے گئے، یہاں تک کہ پھر چیت کا مہینہ آ گیا۔ زمین سے ہر طرف پھر بہار کی مہک اٹھنے لگی۔ کسان فصلوں کی کٹائی سے فارغ ہوئے اور ایک بار پھر جن شاہ ولی

کے عرس کی تیاریاں ہونے لگیں۔

پچھلے برس خیر النساء کی مراد تو پوری نہیں ہوئی تھی مگر اسی گاؤں کی دو عورتوں پر چن شاہ کی نظر کرم ہو گئی تھی۔ ذیلدارنی کو اپنی محرومی کا رنج تو بہت تھا، مگر وہ مایوس نہیں ہوئی تھی، اُسے یقین تھا کہ اب کے چن شاہ ولی ضرور خواب میں اپنا دیدار کرائیں گے۔

آخر عرس کا دن آ پہنچا۔ اس دفعہ پچھلے سال سے بھی زیادہ زور شور سے میلہ بھرا۔ شام کو چن شاہ ولی کی قبر پر مراد مانگنے والی عورتوں کا اس قدر جمگھٹ ہو گیا کہ سانس لینا مشکل تھا۔ مگر یہ فرطِ عقیدت سے اور بھی قبر پر پلی پڑتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہم جس قدر زیادہ تکلیف اٹھائیں گے اسی قدر جلد ہماری مراد پوری ہو گی۔

اس ہجوم میں خیر النساء بھی ولی کی قبر کے سرہانے بیٹھی تھی۔ وہ چڑھاوا چڑھا چکی تھی اور بہت منت وزاری سے بیٹے کے لیے دعا بھی مانگ چکی تھی۔ وہ درگاہ سے اٹھنے ہی کو تھی کہ ایک عورت جس کی وضع فقیرنیوں کی سی تھی ہجوم کو چیرتی ہوئی قبر کے قریب پہنچنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کی گود میں تین چار مہینے کا بچہ تھا۔ دبلا پتلا، ہڈیوں کی مالا۔ وہ یا تو سو رہا تھا یا اس میں اتنی سکت ہی نہ رہی تھی کہ آنکھ کھولے۔

اس عورت کی نظر جیسے ہی خیر النساء پر پڑی۔ اس کی آنکھیں ایک دم چمک اٹھیں۔

"دیکھ او ذیلدارنی میرا بیٹا دیکھ۔ یہ مجھے چن شاہ نے دیا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا بچہ بڑے فخر سے خیر النساء کو دکھایا۔ ذیل دارنی نے کاکی کو فوراً پہچان لیا۔

"او بے حیا بے شرم یہ تُو ہے؟ دور ہو یہاں سے حرام کا پِلّا لے کر۔"

"آہاہاہا۔ تو مجھ سے جلتی ہے ذیلدارنی کیونکہ چن شاہ نے تجھے بیٹا نہیں دیا۔ اس نے مجھے بیٹا دیا۔ آہاہاہا۔"

کاکی کے چہرے سے وحشیانہ خوشی ظاہر ہو رہی تھی۔ ذیل دارنی غصے سے کانپنے لگی۔

اس نے چاہا کہ آگے بڑھ کر کاکی کا منہ نوچ لے مگر درمیان میں کئی عورتیں حائل تھیں جو حیرت سے کبھی ذیلدارنی کا منہ تکتی تھیں کبھی کاکی کا۔

"ٹھہر تو جارنڈی۔ ابھی تجھے اس گاؤں سے پھر نکلواتی ہوں۔ اب کے تیرا سر مونڈھا جائے گا اور تیرا منہ کالا کر کے تجھے گدھے پر سوار کیا جائے گا۔"

مگر کاکی پر ذیلدارنی کی ان دھمکیوں کا کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ خیر النساء کو چڑانے کے لیے بلا بر کہے جارہی تھی۔

"تو مجھ سے جلتی ہے ذیلدارنی۔ کیونکہ چن شاہ ولی تیرے پاس راتوں کو نہیں آتا، وہ تیرے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی نہیں کرتا۔ وہ تجھے اپنے سفید گھوڑے پر بٹھا کر آسمان کی سیر نہیں کراتا۔ تو ہمیشہ جلتی بھنتی رہے گی ذیلدارنی! چن شاہ تجھے کبھی بیٹا نہیں دے گا۔"

وہ عورتیں جو پہلے تعجب سے کاکی کو دیکھ رہی تھیں اور جن میں سے بعض کو شاید اس سے کچھ ہمدردی بھی پیدا ہو گئی تھی اس کی زبان سے اب چن شاہ ولی کی شان میں گستاخانہ باتیں سن کر دانتوں سے اپنی انگلیاں کاٹنے لگیں۔

اتنے میں درگاہ کا متولی جیون سائیں جو باہر دالان میں چٹائی پر بیٹھا تھا، شور سن کر اندر آ گیا۔ ذیلدارنی نے اسے دیکھتے ہی چلانا شروع کیا:

"دیکھ سائیں بابا! یہ کاکی بے حیا نہ جانے کہاں سے حرام کا پلا لے آئی ہے اور درگاہ کی بے ادبی کر رہی ہے۔ اسے چٹیا سے پکڑ کر نکال دے۔"

جیون سائیں تھا تو ادھیڑ عمر مگر تھا خوب ہٹا کٹا۔ وہ آگے بڑھا ہی تھا کہ کاکی نے سہم کر چیخ ماری

"چن شاہ۔ یہ لوگ مجھے مار رہے ہیں۔ مجھے بچا، مجھے بچا۔"

مگر کوئی اس کی مدد کو نہ پہنچا۔ ادھر جیون سائیں عورتوں کو آگے سے ہٹاتا ہوا قریب آتا جارہا تھا۔ اچانک کاکی نے گود کے بچے کو جو ابھی تک سویا ہوا تھا، چن شاہ ولی کی قبر کے نرم

نرم پھولوں پر لٹادیا اور خود ہرنی کی طرح طرارہ بھر درگاہ سے نکل بھاگی۔

اس کی یہ حرکت ایسی غیر متوقع تھی کہ سب لوگ دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ آخر ذیلدارنی اور دو تین عورتوں نے پکڑلو پکڑلو۔ کا شور مچایا۔ اس پر کچھ دیہاتی کاکی کے پیچھے بھاگے مگر وہ کودتی پھاندتی پہاڑی کے ایک ایسے ٹیلے پر چڑھ گئی جو بالکل سپاٹ تھا اور جس پر چڑھنا خطرناک سمجھا جاتا تھا لوگ کچھ دیر نیچے کھڑے اسے دیکھتے رہے مگر کسی کو اس کے پیچھے جانے کی جرأت نہ ہوئی، آخر دو ایک من چلے نوجوانوں نے ہمت کی مگر ابھی انہوں نے آدھا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ کاکی نے ٹیلے کے دوسری طرف پہنچ کر، جس کے نیچے ایک کھائی تھی، بے جھجک چھلانگ لگا دی۔ شاید اسے کچھ چوٹ آ گئی تھی کیونکہ وہ کچھ دیر زمین پر بیٹھی رہی، آخر وہاں سے اٹھی اور اس طرف کا رخ کیا جہاں سے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ فصل کی کٹائی کے بعد یہ جگہ اب ایک کھلا میدان بن گئی تھی۔

اب گاؤں سے کئی آدمی اسے پکڑنے کے لیے دوڑ پڑے تھے مگر وہ ان کے آگے آگے ہی رہی۔ ہاں ایک دفعہ دو آدمیوں نے اسے پکڑ ہی لیا ہوتا۔ مگر اس میں نہ جانے کہاں سے ایک منہ زور گھوڑی کی سی طاقت آ گئی تھی کہ اس نے جھٹک کر اپنے ہاتھ چھڑا لیے اور پھر تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا۔

ساری رات اس کا تعاقب جاری رہا۔ صبح کو جب سورج نکل رہا تھا تو وہ ایک میدان میں اپنا پیچھا کرنے والوں میں ایسی گھر گئی کہ فرار کی کوئی صورت نہ رہی، جب اسے پکڑا گیا تو وہ ایک درندے کی طرح کانپ رہی تھی، خاردار جھاڑیوں میں الجھ الجھ کر اس کے کپڑوں کی دھجیاں اُڑ گئی تھیں اور اب اس کے جسم پر ایک تار بھی نہ رہا تھا۔

اسے کئی آدمیوں نے دبوچ رکھا تھا۔ ایک آدمی اپنے سر سے پگڑی اتار کر اس کے ہاتھ باندھنے لگا۔ وہ پہلے تو چپ چاپ اپنے ہاتھ بندھتے دیکھتی رہی، پھر یکبارگی جوش آیا اور اس نے وحشیانہ جدوجہد سے اپنے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اس پر

اس نے اس شخص کی طرف جس نے اس کے ہاتھ باندھے تھے غضب ناک نظروں سے دیکھا اور پھر پیشتر اس کے کہ وہ کچھ مدافعت کر سکے، اچک کر اس کا کان اپنے دانتوں میں لے لیا اور چبا ڈالا۔

فرار

اس شام میں دفتر سے تھکا ہارا گھر پہنچا ہی تھا کہ میری بیوی نے بڑی تشویش کے لہجہ میں مجھ سے کہا: ابھی ابھی نانا جان کے ہاں سے پیغام آیا ہے، سرفراز کے ماموں کی حالت یکلخت بہت بگڑ گئی ہے، امید نہیں وہ آج کی رات بھی کاٹ سکیں۔ ہم سب کو فوراً بلایا گیا ہے۔"

سرفراز ماموں ہمارے وسیع کنبے کے قریب قریب ہر فرد کے بڑے محبوب تھے۔ ان کی عمر پچاس برس کی ہو چکی تھی مگر ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ ابھی پچھلے دنوں میری والدہ نے بڑی اہتمام سے ان کی پچاسویں سالگرہ منائی تھی۔ وہ دعوت میں بڑے چہک رہے تھے اور چھوٹے بڑے ہر ایک پر پھبتیاں کہہ رہے تھے مگر اس دعوت کے اگلے ہی روز وہ اچانک بیمار ہو گئے۔ کچھ عجیب ہی سا مرض تھا جسے ڈاکٹر یا حکیم کوئی بھی ٹھیک طور پر تشخیص نہ کر سکا تھا۔ ان کی حالت روز بروز خراب ہوتی چلی گئی اور وہ بے حد کمزور ہو گئے۔ ہر شخص کے دل سے ان کی تندرستی کے لیے دعائیں نکلتی تھیں مگر مرض میں کچھ افاقہ نہ ہوتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس مرض سے جانبر نہ ہو سکیں گے۔

میری بیوی نے جلد جلد بچوں کے کپڑے بدلے۔ خود بھی لباس تبدیل کیا اور تھوڑی ہی دیر میں ہم نانا جان کے ہاں پہنچ گئے۔ میرے سب بھائی بہن اور دوسرے عزیزو

اقارب پہلے ہی وہاں پہنچ چکے تھے۔ میری والدہ جو میرے والد کے انتقال کے بعد زیادہ تر ننھیال ہی میں رہنے لگی تھیں، سرفراز ماموں کو بہت چاہتی تھیں۔ انھیں اپنے چھوٹے بھائی کی اس بیماری کا سخت صدمہ تھا وہ غم سے نڈھال ہو رہی تھیں مگر ضبط کئے ہوئے تھیں۔ وہ بڑی جاں فشانی سے ان کی تیمارداری کرتی رہی تھیں۔ ان سے معلوم ہوا کہ میرے ضعیف نانا نانی اس صدمے کی تاب نہ لا کر اپنے حواس کھو بیٹھے ہیں۔ انہیں ان کے کمرے میں بند کر دیا گیا ہے اور کسی کو ان سے ملنے جلنے نہیں دیا جاتا۔

جس کمرے میں سرفراز ماموں بستر مرگ پر پڑے تھے، اس میں ان کی مسہری کے علاوہ صرف ایک چھوٹی میز دوائیں وغیرہ رکھنے کے لیے اور ایک کرسی ڈاکٹر کے بیٹھنے کے لیے رہنے دی گئی تھی، باقی سامان اٹھوا دیا گیا تھا۔ سرفراز ماموں طبعاً بڑے خوش خلق اور ملنسار تھے مگر اس بیماری نے رفتہ رفتہ انھیں سخت تنک مزاج بنا دیا تھا، وہ میری والدہ کے سوا اور کسی کا اپنے پاس آنا پسند نہ کرتے تھے۔ کہتے للہ مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

بیماری کے آخری ایام میں تو ان کی تنہائی پسندی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ انہوں نے تمام کانسی اور پیتل کے مجسمے، عورت مرد کی تصویریں، قدرتی نظارے، یہاں تک کہ خوش خطی کے مرقعے بھی اپنے کمرے سے نکلوا دیے تھے۔ کہتے: "ان سے ذہنی سکون میں خلل پڑتا ہے۔"

اقربا کے بیٹھنے کے لیے ملحقہ کمرے میں انتظام کیا گیا تھا، میرے تینوں بھائی، دو بیاہتا بہنیں اور ان کے بچے اسی کمرے میں جمع تھے، ان میں ہم بھی شامل ہو گئے۔ ہم دو دو تین تین مل کر دبے پاؤں سرفراز ماموں کے کمرے میں جاتے اور تھوڑی دیر ان کی مسہری کے پاس کھڑے رہ کر دبے پاؤں واپس آ جاتے۔

سرفراز ماموں پر اس وقت غشی طاری تھی۔ دیر سے انہوں نے آنکھ نہیں کھولی تھی ہر چند ڈاکٹر جواب دے چکے تھے مگر ابھی تک کئی لوگوں کو امید تھی کہ شاید وہ بچ جائیں۔

قریب ہی ایک اور کمرے میں قرآن خوانی ہو رہی تھی اور ان کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگی جا رہی تھیں۔

ایک مرتبہ ان کے کمرے کو مہمانوں سے خالی دیکھ کر میں اکیلا ہی اندر چلا گیا تاکہ ایک بار اور انھیں جی بھر کر دیکھ لوں۔ وہ بچپن میں مجھ پر خاص طور سے شفقت فرماتے تھے اور سب سے زیادہ میری ہی فرمائشیں پوری کیا کرتے تھے اور ادھر میں بھی ان سے کچھ زیادہ ہی مانوس تھا۔

وہ مسہری پر چت لیٹے ہوئے تھے۔ صرف ان کا چہرہ کھلا ہوا تھا، باقی سارا جسم ایک سیاہ پشمینے کی ہلکی چادر سے، جس کے کناروں پر چھوٹی بوٹی کی سرخ خوشنما بیل کڑھی ہوئی تھی، ڈھکا ہوا تھا۔ انھوں نے پچھلے دو تین ہفتوں سے ڈاڑھی نہیں منڈوائی تھی، اس کی وجہ سے ان کے رخساروں پر ایک چھوٹی سی کٹر بڑی ڈاڑھی نکل آئی تھی جو کمرے کی مدھم روشنی میں ان کے گندمی رنگ کے چہرے پر بہت بھلی لگتی تھی۔

میں ان کی مسہری کے اور قریب پہنچ گیا اور ان کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔ ہر چند ان کی آواز نے جواب دے دیا تھا مگر ابھی تک ان کا سانس بگڑنے نہ پایا تھا۔ ان کے چہرے سے ایک عجیب طرح کی آسودگی جھلکتی تھی، کسی قسم کا کرب کا نشان نہ تھا، بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ چین کی نیند سو رہے ہیں۔

میں ان کے چہرے کو دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک انھوں نے آنکھیں کھول دیں اور ایسا معلوم ہوا جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر تک یہی کیفیت رہی۔ رفتہ رفتہ ان کی آنکھوں کا تجسس غائب ہونے لگا اور اس کی جگہ ایک خفیف سی مسکراہٹ جھلکنے لگی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ انھوں نے مجھے پہچان لیا ہے۔ اس لمحے میں بھی اپنا غم بھول گیا اور مسکرانے لگا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ان کی مسکراہٹ ان کی آنکھوں سے نکل کر ان کے ہونٹوں اور رخساروں پر پھیل گئی۔ بلا شبہ یہ ان کی وہی مخصوص مسکراہٹ تھی، جس میں ہمیشہ

شرارت کا ایک خفیف سا عنصر چھپا رہتا تھا۔

اس کے بعد دھیرے دھیرے ان کی آنکھیں بند ہوتی گئیں اور وہ مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ میں جلد ہی ان کے کمرے سے چلا آیا۔ اس ملاقات کا میرے دل پر بہت گہرا اثر پڑا تھا۔ مجھے اپنے جذبات پر قابو نہ رہا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے۔ اس خیال سے کہ میری بہنیں اور خاص طور پر میری بیوی بچے میری اس کمزوری کو دیکھ کر پریشان نہ ہوں، میں چپکے سے کوٹھی سے باہر نکل آیا اور باغیچے میں ٹہلنے لگا۔

سرفراز ماموں کی اوّلین یاد جو میرے دل میں ابھری اس وقت کی تھی جب میں پانچ چھ برس کا تھا وہ پچیس سال کے نوجوان تھے۔ وہ بہت عمدہ عمدہ کپڑے پہنا کرتے اور بڑے بنے سنورے رہا کرتے۔ وہ اکثر اپنی بہن سے ملنے آیا کرتے جو عمر میں ان سے پانچ سال بڑی تھیں۔ ہم بھائی بہن جیسے ہی برآمدے میں ان کی آواز سنتے، جہاں کہیں بھی ہوتے اُڑ کر ان کے پاس جا پہنچتے اور ان سے لپٹ جاتے، وہ ہمارے لئے طرح طرح کی چوسنے والی مٹھائیاں، ٹافیاں، پستہ بادام اور کبھی کبھی چھوٹے چھوٹے کھلونے لے کر آیا کرتے۔ یہ چیزیں وہ اپنی جیبوں میں سے نکال نکال کر ہمیں دیا کرتے اور بہت خوش ہوتے۔ مٹھائی اور کھلونوں کے علاوہ کئی اور طریقوں سے بھی ہمارا دل بہلایا کرتے۔ وہ ہمیں جادو کے کھیل دکھاتے جنھیں دیکھ کر ہم دنگ رہ جاتے۔ کہانیاں سناتے جنھیں سن کر بڑی ہنسی آتی۔ وہ ہمارے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے اور کبھی کبھی ہمارے اصرار پر ہمیں گانا بھی سناتے۔ ان کا یہی وطیرہ اپنے بھائیوں اور دوسرے اقربا کے بچوں کے ساتھ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہمارے خاندان کے سارے بچے ان کے بے حد گرویدہ تھے۔ بچوں کے علاوہ بڑے بھی ان سے ملنے کے مشتاق رہتے تھے مگر ان کے پاس وہ زیادہ دیر نہ ٹھہرتے بس چند منٹ رسمی باتیں کر کے کسی بہانے سے کھسک لیتے۔

میں نے اب تک سرفراز ماموں کی خوبیاں ہی گنوائی ہیں مگر ان میں برائیاں بھی کئی

تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اوّل درجے کے سست تھے اور محنت سے بہت جی چراتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے دونوں بڑے بھائی تو کبھی کے گریجویٹ ہو کر اونچے اونچے عہدوں پر پہنچ گئے اور یہ برسوں اسکول ہی میں لٹکے رہے اور آخر میٹرک کیے بغیر ہی انھیں تعلیم ختم کردینی پڑی۔ لطف یہ کہ وہ کند ذہین نہیں، بلکہ بڑے ذہن تھے بس ایک ذرا لکھنے پڑھنے میں ان کا جی نہ لگتا تھا۔

دوسرا عیب ان میں یہ تھا کہ وہ حد درجے کے ڈرپوک تھے۔ جھگڑے فساد کا تو کیا ذکر جہاں ذرا گھر کے اندر یا باہر کوئی طیش میں آ کر اونچی آواز میں بولنے لگا، یہ وہاں سے کھسکے۔ تیسرے حضرت لپاڑیئے بھی غضب کے تھے اور گپ تو ایسی ہانکتے کہ جس کا سر ہو تا نہ پیر۔ پھر انھیں ورزش سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جب تک اسکول میں رہے کسی قسم کے کھیل میں حصہ نہ لیا۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ وہ قدرتی طور پر پیدا ہی دبلے پتلے اور کمزور ہوئے تھے۔ یہ کمزوری بڑے ہونے پر بھی قائم رہی چنانچہ ان کے دونوں بھائی تو خوب کڑیل جوان نکلے مگر یہ دھان پان ہی رہے۔

نانا جان کو اپنے چھوٹے بیٹے کے تعلیم میں اور دنیاوی ترقی میں اپنے بھائیوں سے پیچھے رہ جانے کا افسوس تو ہوا مگر ان کی شفقت میں ذرا فرق نہ آیا بلکہ وہ اس کی کچھ زیادہ ہی دل جوئی کرنے لگے۔ وہ خدا کے فضل سے آسودہ حال اور صاحبِ جائیداد تھے۔ اراضی کے علاوہ ان کے متعدد مکان اور دکانیں تھیں جن کے کرائے کی ہر مہینے ایک معقول رقم آیا کرتی تھی۔ انھوں نے یہ سوچ کر کہ سرفراز کو اپنی کم علمی کی وجہ سے کوئی مناسب سرکاری نوکری تو ملنے سے رہی اور نہ وہ کوئی کاروبار ہی کر سکتے ہیں، ان کے ذمے یہ کام سپرد کردیا کہ وہ جائیداد کا کرایہ اگاہا کریں اور آمدنی اور خرچ کا حساب رکھا کریں۔ اس کام کے عوض میں ان کا ایک معقول مشاہرہ مقرر کردیا گیا۔

یہ کام ان کی سست اور آرام طلب طبیعت کے لئے بہت موزوں تھا، انھیں نہ تو دفتر

جانا پڑتا تھا، نہ کسی قسم کی بھاگ دوڑ کرنی پڑتی، بس مزے سے گھر ہی میں رہتے یا اپنے عزیزوں کے ہاں چلے جاتے اور ان کے بچوں کے ساتھ اپنا وقت گزارتے، اس پر بھی ان کی یہ حالت تھی کہ جب دیکھو چہرے سے تکان برس رہی ہوتی، ہائے وائے کرتے اور کہتے "چلو بچو! ذرا میرے ہاتھ پاؤں داب دو، وہ ہمارے لئے مٹھائیاں وغیرہ تو لایا ہی کرتے تھے مگر جب ہم سے "مُٹھی چپی" کی خدمت لینی ہوتی تو اس کے صلے میں ایک الگ تھیلے میں بہت سی چیزیں بھر کر لاتے۔ ہم ان کے ساتھ کسی الگ تھلگ کمرے میں چلے جاتے۔ وہ اپنی شیروانی اتار دیتے اور بستر پر چت لیٹ جاتے، پھر کوئی بچہ ان کے بازو دابتا، کوئی ان کی ٹانگوں پر کھڑے ہو کر چلتا، کوئی سر میں تیل ڈال کر انگلیوں سے سہلاتا اور وہ ایک ایک دو دو منٹ کے بعد سب کو ٹافیاں سنگترے کی پھانکیں اور دوسری چوسنے والی مٹھائیاں بانٹتے رہتے۔ یہ سلسلہ بعض اوقات گھنٹوں جاری رہتا۔ ہم لوگ مٹھائیوں کے لالچ میں تھکنے کا نام نہ لیتے اور ادھر وہ انعام واکرام کی بارش جاری رکھتے۔ ہماری اس خدمت گزاری سے ان کے تھکے ہوئے اعضا کو یقیناً آرام پہنچ رہا ہوتا کیونکہ ان کے پژمردہ چہرے پر آہستہ آہستہ بشاشت آتی جاتی اور ان کی آنکھیں جو پہلے بجھی بجھی ہوتیں، روشن ہو جاتیں۔

آخر وہ کہتے: "بچو۔ اب بس کرو۔ شکریہ! بہت شکریہ۔"

پھر وہ غسل خانے میں جا کر منہ ہاتھ دھوتے، شیروانی پہنتے اور ہمارے سروں پر ہاتھ پھیرتے اور جلد ہی پھر آنے کا وعدہ کرتے ہوئے چلے جاتے۔ ہم جب امی سے یہ واقعہ بیان کرتے تو وہ ہنستیں اور کہتیں: "بے چارہ سرفراز!"

سرفراز ماموں اپنی اس آسودہ زندگی سے بہت مطمئن تھے لیکن اب مشکل یہ آپڑی کہ نانا جان کو ان کی شادی کی فکر ہوئی۔ ان کے لئے جگہ جگہ رشتے ڈھونڈے جاتے لگے مگر ان کے سامنے جس لڑکی کا نام لیا جاتا جھٹ اسے رد کر دیتے۔ کہتے "ابھی کیا جلدی ہے۔ جب وقت آئے گا تو میں خود کہہ دوں گا۔"

مگر مہینے اور سال گزرتے جاتے تھے اور وقت نہیں آنے پاتا تھا۔ ناناجان سخت فکرمند رہنے لگے تھے۔ ان کی تمنا تھی کہ اپنی زندگی میں اپنے بڑے بیٹوں کی طرح ان کا گھر بھی رَستابستا دیکھ لیں، مگر وہ راضی نہ ہوتے تھے، گو اب والد کی آزردگی انھیں بھی کسی قدر پریشان کرنے لگی تھی۔

اسی زمانے کا ذکر ہے۔ ایک دن شام کو گھر آئے بہت چپ چپ اور سنجیدہ صورت بنائے ہوئے تھے۔ ان کے والد اور بڑے بھائیوں کو تعجب ہوا۔ پوچھا کیا بات ہے بھئی۔ یہ خاموش رہے مگر صورت پہلے سے بھی زیادہ سنجیدہ بنالی۔ اس پر بھائیوں نے اصرار کیا تو یوں گویا ہوئے:

"آپ روز روز کہا کرتے تھے۔ لیجیے میں نے اپنی پسند کی لڑکی تلاش کرلی ہے۔"

اس کے بعد انھوں نے بتایا کہ وہ پچھلے روز شام کو نمائش دیکھنے گئے تھے۔ وہاں اتفاق سے انھوں نے ایک لڑکی کو جو اپنے والدین کے ہمراہ آئی تھی، بے پردہ دیکھ لیا بس اسی وقت سے اس کی صورت ان کے دل میں ایسی بس گئی ہے کہ کسی طرح محو نہیں ہوتی۔ انھوں نے ڈرائیور کو انعام دے کر اس کے والد کا نام اور پتہ بھی پوچھ لیا ہے اور وہ اسی شہر کے رہنے والے ہیں۔

"کیا نام ہے؟" ناناجان نے پوچھا۔

"نواب ظہیرالدولہ۔" سرفراز ماموں نے نام کے ایک ایک جزو پر زور دیتے ہوئے کہا۔

یہ نام سننا تھا کہ ناناجان اور ہمارے دونوں بڑے ماموں حیران و پریشان ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ سرفراز ماموں خاموشی سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

اس کے بعد ان کی تمام خوش طبعی اور زندہ دلی جیسے ایک دم رخصت ہو گئی۔ کھانا پینا بھی برائے نام ہی رہ گیا۔ انھوں نے اپنے عزیزوں کے گھروں میں آنا جانا بھی موقوف

کر دیا۔ وہ سارا سارا دن اپنے کمرے میں بند بستر پر پڑے رہا کرتے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر ایک دن ہماری نانی جان نے اپنے شوہر سے کہا "نواب ظہیر الدولہ بڑے آدمی سہی، ان کا خاندان بھی اونچا سہی لیکن پیغام تو بھیج کر دیکھو۔"

نانا جان نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس پر نانی جان نے خود ہی شہر کی دو تین مشاطاؤں کو جو رشتے کرانے میں مشہور تھیں، اپنے ہاں بلوایا، اور ان سے صلاح مشورہ کیا۔ پھر بسم اللہ کر کے ایک مغلانی کے ذریعے پیغام بھیج ہی دیا۔

ایک ہفتے کے بعد وہاں سے جواب آیا کہ نواب صاحب خاندان کی بلندی و پستی کے زیادہ قائل نہیں ہیں مگر ان کے ہونے والے داماد کے لئے کم از کم یہ شرطیں ضروری ہیں۔ ایک تو وہ اچھی شکل و صورت کا ہو۔ دوسرے کم از کم گریجویٹ ہو اور تیسرے اس کے والدین اس قدر آسودہ ضرور ہوں کہ وہ دو لاکھ روپیہ نقد بطور حق مہر لڑکی کے نام بنک میں جمع کرا سکیں۔

نانا جان کو اس جواب سے بڑی مایوسی ہوئی۔ ہر چند ان کا شمار شہر کے کھاتے پیتے لوگوں میں ہوتا تھا مگر وہ اپنی ساری جائیداد بیچ دیتے تب بھی دو لاکھ روپیہ جمع نہ کر سکتے تھے اور بالفرض روپے کا انتظام ہو بھی جاتا تو سرفراز کے گریجویٹ ہونے کی شرط بڑی ٹیڑھی تھی کیونکہ وہ تو انٹرنس بھی پاس نہ کر پائے تھے، بس ایک ہی شرط تھی جس پر وہ پورے اترتے تھے، وہ یہ کہ شکل و صورت کے بڑے اچھے تھے بلکہ کہنا چاہئے کہ حسین تھے چنانچہ نواب ظہیر الدولہ کے جواب پر عام طور پر یہی تصور کیا گیا کہ وہ چونکہ بڑے بُردبار اور نیک دل ہیں، اس لئے انھوں نے صاف انکار کر کے اپنے ایک معزز ہم وطن کو ناراض کرنا مناسب نہیں سمجھا اور جان بوجھ کر ایسی شرطیں لگا دی ہیں، جن کا پورا کرنا سرفراز ماموں اور ان کے متعلقین کے لئے ممکن نہ ہو۔

نانا جان نے اپنے دونوں بڑے بیٹوں کی موجودگی میں سرفراز ماموں کو صورتِ حال

سے آگاہ کیا۔ ماموں چپکے بیٹھے ان کی باتیں سنتے رہے۔ جب ان کے گریجویٹ نہ ہونے کا ذکر آیا تو فوراً بول اٹھے:

"یہ کیا مشکل بات ہے۔ یہ شرط تو میں آسانی سے پوری کر سکتا ہوں۔"

اس پر ان کے دونوں بڑے بھائی کہنے لگے۔ "اگر تم اسے پورا کر دو تو روپیہ ہم کسی نہ کسی طرح مہیا کر ہی لیں گے ، خواہ ہمیں اپنے حصے کی جائداد بیچنی ہی کیوں نہ پڑے۔"

اس شام گھر والوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ سرفراز ماموں کتابوں کی گٹھڑی اٹھائے چلے آرہے ہیں۔ انھوں نے کسی سے بات نہ کی، سیدھے اپنے کمرے میں پہنچے اور اندر سے دروازہ بند کر لیا اور یوں انہوں نے اکیلے ہی بغیر کسی کی مدد کے پڑھائی شروع کر دی۔ وہ کھانا کھانے کے لیے باہر نہ آتے بلکہ کھانا کمرے کے اندر ہی منگوالیا کرتے۔ ان کے تمام عزیزوں کو سخت تعجب تھا کہ جو شخص عمر بھر ایسا آرام طلب اور سست رہا ہو، اس میں اچانک اتنی ہمت کہاں سے آگئی کہ وہ دن رات مشین کی طرح کام کرنے لگے۔

جب ایک ہفتہ گزر گیا، تو انھوں نے اپنی والدہ سے کہا "نواب ظہیر الدولہ کو کہلوادیا جائے کہ ان کی شرطیں منظور کر لی گئی ہیں مگر انھیں کچھ مہلت دینی ہوگی۔"

اتفاق سے آئندہ میٹرک کے امتحان میں صرف تین ہی مہینے تھے، انھوں نے پرائیویٹ طور پر امتحان دیا اور اچھے نمبروں سے پاس ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے فارسی کے ایک اعلیٰ امتحان کی تیاری شروع کر دی، جس کو پاس کرنے کے بعد وہ ایف۔ اے اور بی۔ اے کے صرف انگریزی کے امتحان دے کر بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر سکتے تھے۔

اگلے دو سال میں انھوں نے فارسی اور ایف۔ اے انگریزی کے امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کر لئے۔ جب نواب ظہیر الدولہ کو اس کی اطلاع پہنچی تو وہ بڑے متعجب ہوئے۔ ادھر ان کی صاحبزادی بھی یہ سن کر پھولی نہ سمائی کہ کوئی شخص اس کی خاطر اتنی مصیبت

جھیل رہا ہے۔ اسے اپنی بعض بے تکلف سہیلیوں کے ذریعے سرفراز ماموں کی خوش جمالی اور خوش طبعی کا حال معلوم ہو گیا تھا، اور وہ بے دیکھے ہی ان پر ریجھ گئی تھی۔

اس پر لڑکی کی والدہ نے نواب صاحب سے کہا کہ، لڑکا بہت نیک اطوار ہے۔ خواہ مخواہ کی شرطیں لگا کر شادی میں کیوں دیر کی جا رہی ہے، ممکن ہے ایسا داماد پھر ہاتھ نہ آئے۔ نواب صاحب نے کچھ دیر تامل کیا اور پھر نیم رضامند سے ہو گئے، لیکن جب ان کا یہ منشا کسی ذریعے سے نانا جان تک پہنچایا گیا تو سرفراز ماموں نے یہ کہہ کر نامنظور کر دیا کہ جو شرطیں لگائی گئی ہیں ان کی پوری پوری پابندی کی جائے گی۔

بی۔ اے کے امتحان کے دن قریب آ گئے۔ سرفراز ماموں دن رات مطالعہ میں مصروف ہو گئے اور امتحان دیا تو کامیاب رہے۔ اس طرح وہ صرف تین سال کے عرصے میں گریجویٹ بن گئے، ادھر ان کے والد اور بھائیوں نے حق مہر کے دو لاکھ روپے کا انتظام بھی کر لیا۔

شادی کی تاریخ مقرر کی گئی۔ دونوں طرف زور شور سے تیاریاں ہونے لگیں اور دونوں خاندان خوش خوش اس روزِ سعید کا انتظار کرنے لگے۔

آخر کار وہ دن آ پہنچا۔ سرفراز ماموں سیاہ بانات کی شیروانی پہنے، سر پر مشہدی پگڑی باندھے، اصیل گھوڑے پر سوار، براتیوں کے ساتھ دلہن کے گھر روانہ ہوئے۔ یہ قصہ سارے شہر میں مشہور ہو چکا تھا۔ لوگ دولہا کو دیکھنے کے اشتیاق میں بازاروں کے دونوں طرف یوں قطار باندھے کھڑے تھے جیسے کسی مشہور لیڈر کا جلوس گزرنے والا ہو۔

اس برات کی کیفیت اب تک میری آنکھوں میں پھر رہی ہے کیونکہ میں بھی اپنے بھائیوں کے ساتھ بڑھیا کپڑے پہنے اس میں شامل تھا۔ اس وقت میری عمر دس برس کی ہو گی۔

جب ہم نواب صاحب کی محل سرا کے سامنے پہنچے تو خود نواب صاحب، نانا جان اور

سرفراز ماموں کی پذیرائی کے لئے دروازے پر موجود تھے۔ محل سرا کے اندر ایک وسیع دالان کے سامنے قیمتی شامیانوں کے نیچے دولہا کے بیٹھنے کے لئے مسند رکھی گئی۔ جو بیش قیمتی ایرانی قالینوں اور زربفت کے گاؤ تکیوں سے آراستہ تھی سرفراز ماموں اپنے والد اور بھائیوں کے ساتھ اس پر بٹھا دیئے گئے۔ ہر چند ان کا چہرہ پھولوں اور سونے کے تاروں سے گندھے ہوئے سہرے سے چُھپا ہوا تھا، اور کوئی شخص ان کی دلی کیفیت کو بھانپ نہ سکتا تھا مگر میں نے ان کے قریب پہنچ کر کسی نہ کسی طرح ان کے چہرے کی ایک جھلک دیکھ ہی لی۔ اچانک ایک نامعلوم خوف سے میرا دل دھڑک اٹھا۔ سرفراز ماموں بڑے فکر مند ہو رہے تھے۔

جب لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے تو مولوی صاحب جنھیں نکاح خوانی کی رسم ادا کرنی تھی، سبز جزدان میں لپٹا ہوا قرآن مجید بغل میں دبائے نمودار ہوئے اور سرفراز ماموں کے قریب پہنچے۔ اس وقت میرے دل نے نہ معلوم کیوں اور بھی زور زور سے دھڑکنا شروع کر دیا۔

چند لمحے اضطراب میں گزرے۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ سرفراز ماموں نے اپنے منجھلے بھائی کے کان میں جو اُن کے قریب بیٹھے تھے کچھ کہا اور پھر ایک دَم اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے منجھلے بھائی نے نواب صاحب کے ایک کارندے سے کہا کہ یہ ذرا غسل خانے میں جانا چاہتے ہیں۔

سرفراز ماموں اس شخص کی رہنمائی میں منجھلے بھائی کے ہمراہ غسل خانے تک پہنچے۔ وہ اس میں بمشکل ایک منٹ ٹھہرے پھر باہر نکل آئے۔ غسل خانہ ذرا فاصلے پر تھا۔ واپسی پر وہ اپنے دونوں ہمراہیوں سے ذرا آگے آگے چلنے لگے۔ اچانک ان کی نظر محل سرا کے پھاٹک پر پڑی اور انھوں نے بجائے شامیانے کی طرف جانے کے پھاٹک کا رخ کیا اور پیشتر اس کے کہ کوئی ان کے ارادے کو بھانپ سکے، وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے پھاٹک سے باہر نکل آئے۔ سڑک پر پہنچ کر انھوں نے سہرے کو تو ایک طرف پھینکا اور زری کی سلیم شاہی جوتی جو

خاص طور پر اِس موقع کے لئے بنوائی گئی تھی، ہاتھ میں پکڑ کر بے تحاشا ایک طرف کو بھاگنا شروع کر دیا۔ پھاٹک پر جو لوگ کھڑے تھے کچھ دیر تک وہ سکتے کے سے عالم میں رہے، پھر اچانک وہ بھی سرفراز ماموں کے تعاقب میں بھاگنے لگے مگر اتنی ہی دیر میں وہ کہیں کے کہیں پہنچ چکے تھے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ اپنی اس تحقیر پر نواب ظہیر الدولہ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ادھر ہمارے نانا جان مارے شرم کے گڑے جاتے تھے۔ ان کی سمجھ میں اور تو کچھ نہ آیا، بے اختیار نواب صاحب کے قدموں میں گر پڑے اور کہا "حضور معاف کر دیں، ضرور یہ نالائق دیوانہ ہو گیا ہے، میں ابھی اسے عاق کرتا ہوں۔ میرے جیتے جی وہ کبھی میرے گھر میں قدم نہ رکھ سکے گا۔"

مگر نواب صاحب کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ بولے "مہربانی فرما کر فوراً میرے گھر سے دفان ہو جیے۔" یہ کہا اور مٹھیاں بھینچتے ہوئے محل سرا کے اندر چلے گئے۔

ہم بہت بے آبرو ہو کر وہاں سے نکلے۔ راستے بھر کسی نے کسی سے بات نہ کی جب گھر پہنچے تو عورتوں نے رو رو کر کہرام مچا دیا۔ ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ نواب صاحب کے ہاں اس سے بھی زیادہ کہرام مچا تھا۔ دلہن غش کھا کر گر پڑی اور تین دن تین رات تک اسے ہوش نہ آیا۔ اس کے والدین اس کی زندگی سے مایوس ہو ہو گئے آخر اس کی جان تو بچ گئی مگر اسے صحت یاب ہونے میں چھ مہینے لگ گئے۔

سرفراز ماموں کے متعلق کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔ وہ کہاں غائب ہو گئے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ انھوں نے خود کشی کر لی ہے بعض کہتے کہ وہ کسی دور دراز ملک کو فرار ہو گئے ہیں غرض جتنے منہ اتنی ہی باتیں!"

دس برس تک ان کی کوئی خبر نہ آئی اور پھر ایک صبح اچانک وہ اپنے والد کے ہاں آ دھمکے۔ جیسے کہاوت ہے کہ وقت زخموں کو مندمل کر دیتا ہے۔ یہی معاملہ ان کے ساتھ بھی پیش آیا۔ ان کو زندہ سلامت دیکھ کر نانا جان اور تمام عزیزوں کا دل باغ باغ ہو گیا۔

عورتوں نے ان کی بلائیں لیں اور خوب ڈھولک پر گا بجا کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

ادھر اسی اثنا میں نواب صاحب کی بیٹی کی شادی ایک نواب زادے سے ہو چکی تھی اور وہ دو لڑکوں کی ماں بھی بن چکی تھی، چونکہ نواب زادہ خوب صورت بھی تھا اور نوجوان بھی اور پھر نجابت اور امارت میں بھی وہ اپنے سسر سے کسی طور کم نہ تھا اس لئے سرفراز ماموں کے ساتھ اس رشتہ کا نہ ہونا نیک فال ہی تصور کیا گیا اور اس واقعہ کو جلد ہی بُھلا دیا گیا۔

سرفراز ماموں نے مرتے دم تک یہ راز کسی کو نہ بتایا کہ وہ اپنی شادی کے روز بھاگ کیوں گئے تھے اور اس دس سال کی مدت میں وہ کہاں کہاں رہے اور روپے پیسے کے بغیر انھوں نے کیسے گزر کی۔ جب کبھی ان سے پوچھا جاتا، تو ان کی آنکھوں میں ایک پُر اسرار مسکراہٹ، جس میں شرارت کا خفیف سا عنصر چھپا ہوتا، جھلکنے لگتی۔ یہی پُر اسرار مسکراہٹ رفتہ رفتہ ان کے کردار کا ایک جزو بن گئی۔

میں نے اس مسئلے پر بہت غور کیا لیکن ان کے فرار کی اصل وجہ نہ سمجھ سکا۔ ممکن ہے اس میں ان کی طبعی بزدلی کو دخل ہو یعنی انہیں اپنی ازدواجی صلاحیتوں پر اعتماد نہ ہو یا یہ وجہ ہو کہ وہ بیوی بچوں کا بوجھ اٹھانے سے ڈرتے ہوں یا شاید یہ وجہ ہو کہ وہ اپنے والد اپنے بھائیوں اور ان کے بچوں سے ان کی جائیداد چھین کر انھیں مفلس وقلاش بنانا نہیں چاہتے تھے۔

بندروالا

میں شہر کے جس علاقے میں رہتا تھا، وہیں ایک صاحب بھی رہتے تھے نام توان کا کچھ لمبا سا تھا مگر اس علاقے کے لوگوں میں وہ مسٹر شاہ کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ وہ کسی دفتر میں اونچے عہدے پر فائز تھے اور ایک چھوٹے سے خوش نما بنگلے میں رہائش پذیر تھے۔ بڑے خلیق اور ملنسار معلوم ہوتے تھے کیونکہ ان کے بنگلے کے باہر صبح شام دو ایک موٹریں کھڑی نظر آیا کرتی تھیں۔

میں صبح کو ٹہلنے نکلتا تو کبھی کبھی ان سے ملاقات ہو جاتی خصوصاً چھٹی کے روز۔ انھیں کسی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ مجھے شعر و ادب سے لگاؤ ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ مجھ سے بڑے التفات سے پیش آتے اور اپنے بنگلے پر آنے کی دعوت دیتے۔ میں اسے ان کی خوش اخلاقی پر محمول کرتا اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ بہانہ کر کے ٹال دیا کرتا مگر ایک دن جو انھوں نے مجھے سہ پہر کی چائے پر مدعو کیا تو میں انکار نہ کر سکا۔

مجھے معلوم تھا کہ ان کا تین چار سال کا ایک صاحبزادہ ہے جس کو میں نے کئی بار ان کی انگلی پکڑے ساتھ ساتھ چلتے دیکھا تھا۔ بڑا بھولا بھالا پیارا پیارا۔ میں نے بازار سے ٹافیوں اور چوسنے والی مٹھائیوں کی دو تھیلیاں خریدیں اور وقت مقررہ پر ان کے بنگلے پہنچ گیا۔

وہ غالباً میرے ہی منتظر تھے۔ خود پھاٹک پر مجھے لینے آئے اور میری آمد پر بڑی

مسرت کا اظہار کیا۔ ڈرائنگ روم میں لے گئے اور ایک نرم اور آرام دہ صوفے پر مجھے بٹھایا۔ ڈرائنگ روم بڑے تکلف سے سجایا گیا تھا۔ قیمتی قالینوں، دیواروں پر خوش نما تصاویر، چینی کے ظروف، آرٹ کے نوادر، غرض ہر چیز ان کی خوشحالی کی غمازی کرتی تھی۔

اسی ڈرائنگ روم کے ایک گوشے میں ان کا صاحبزادہ چند بیٹری سے چلنے والے کھلونوں، موٹر، ہوائی جہاز، ٹینک وغیرہ سے کھیلنے میں مشغول تھا، اس کو دیکھ کر مسٹر شاہ نے پیار سے کہا:

"مانی، دیکھو انکل آئے ہیں، انھیں سلام کرو۔"

لڑکا چونکا اور جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا مگر اس کی نظریں ابھی تک کھلونوں پر گڑی تھیں۔

"مانی بیٹے سلام کرو انکل کو۔ شاباش"

لڑکے نے باپ کی طرف دیکھا، پھر اپنے ننھے منے ہاتھ سے پیشانی کو چھو کر مجھے سلام کیا۔ میں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ٹافیوں اور چوسنے والی مٹھائیوں کی تھیلیاں اسے دے دیں۔

"انکل کو تھینک یو کہو مانی۔"

لڑکے نے کچھ تامل کیا۔

"دیکھو انکل تمھارے لئے کیسی اچھی اچھی سوئیٹس لائے ہیں۔ انھیں تھینک یو کہو، شاباش!"

آخر لڑکے نے اپنی باریک آواز میں آہستہ سے تھینک یو کہہ ہی دیا۔ میں نے دوبارہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"ماشاءاللہ بڑا پیارا ہونہار بچہ ہے۔ خدا عمر دراز کرے۔"

مسٹر شاہ کا چہرہ کھل اٹھا۔

اتنے میں ایک خاتون ہلکے سبز رنگ کی ساری میں ملبوس ڈرائنگ روم میں تشریف لائیں۔ قدرے شوخ میک اپ کیا ہوا جس کی ضرورت نہ تھی کیونکہ وہ خاصی قبول صورت تھیں۔ عمر میں وہ مسٹر شاہ سے جو چالیس کے پیٹے میں معلوم ہوتے تھے یقیناً آٹھ برس چھوٹی ہوں گی۔ مسٹر شاہ نے میری ادبی صلاحیتوں کے بارے میں کچھ زیادہ ہی مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے اپنی بیگم سے میرا تعارف کرایا جس پر انھوں نے بڑے ادب سے مجھے سلام کیا۔ میں نے اپنی منکسر المزاجی کو ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے ظاہر کرتے ہوئے ان کے سلام کا جواب دیا اور وہ ڈرائنگ روم ہی میں ایک بڑی سی میز پر چائے کے برتن سجانے میں مصروف ہو گئیں۔

میں نے مسٹر شاہ سے پوچھا:

"آپ کا صاحبزادہ ماشاءاللہ بہت ذہین ہے، کسی نرسری اسکول میں جاتا ہے؟"

"ابھی تو کسی میں بھی نہیں۔ میں خود ہی گھر پر اس کو پڑھاتا ہوں۔ یہ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ شروع ہی سے اسے پڑھنے کا شوق پیدا ہو جائے۔ مانی بیٹے، ذرا انکل کو، اے بی سی تو سناؤ۔"

رفتہ رفتہ لڑکے کی جھجک دور ہوتی جا رہی تھی۔ اب کے اس نے بغیر شرمائے اے سے لے کر زیڈ تک پوری اے بی سی فر فر سنادی۔

لڑکے نے ذرا سے تامل کے بعد ایک سے سو تک گنتی بھی سنادی۔ اس کے بعد پہاڑوں کی باری آئی۔ لڑکے نے یہ مرحلہ بھی طے کر لیا۔ پھر اسی کی فرمائش پر انگریزی کی ایک مشہور نرسری رائم بھی گا کر سنادی۔

اس دوران میں وہ دو ایک بار رُکا بھی مگر باپ کی صورت دیکھتے ہی اسے اپنا آموختہ جلد ہی یاد آ جاتا تھا۔

اب تو مسز شاہ بھی خاصی بے تکلفی سے باتیں کرنے لگی تھیں۔

"صاحب کیا بتاؤں، مسٹر شاہ کو تو بس یہی دُھن ہے کہ لڑکے کو اسکول بھیجنے سے پہلے ہی لائق فائق بنادیں۔ اس کی چوتھی سال گرہ میں بس چند ہی مہینے رہ گئے ہیں اس کے بعد وہ اسکول جانے لگے گا۔ مسٹر شاہ چاہتے ہیں کہ اس سے پہلے ہی اردو کے کچھ مشہور شعر بھی اسے یاد کرادیں، اور کچھ تو یاد کرا بھی دیے ہیں۔ غالب کا وہ کون سا شعر تھا جو

میں نے جلدی سے قطع کلام کرتے ہوئے کہا:

"معاف کیجئے گا بیگم صاحب! آپ کا صاحبزادہ بے شک بہت ذہین ہے مگر بیچارہ اس وقت بہت تھک گیا ہوگا۔ میں وہ شعر کسی اور روز سن لوں گا۔"

مسز شاہ بولیں۔ "اجی آپ تھکنے کو کہتے ہیں۔ مسٹر شاہ تو صبح صبح ہی اسے اُٹھا کر بٹھادیتے ہیں، اپنے ساتھ ہَواخوری کو لے جاتے ہیں۔ اپنے ساتھ ورزش کراتے ہیں اور ورزش بھی سخت قسم کی۔ وہ جو جاپانی کشتی جوڈو کراتے کہلاتی ہے، اس کے بھی تو کچھ داؤں پیچ سکھاتے ہیں . .

چائے کے دوران بھی گفتگو کا موضوع زیادہ تر اُن کا صاحبزادہ ہی رہا۔

آخر جب کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد میں مسٹر شاہ کے بنگلے سے نکلا تو مجھے بڑی تھکاوٹ معلوم ہوئی۔ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا تھوڑی ہی دور چلا تھا کہ ایک جگہ سڑک سے ہٹ کر میں نے ایک مجمع دیکھا جس میں بوڑھے، بچے، جوان سبھی دائرہ باندھے کھڑے تھے۔ ان کے قہقہوں کی آوازیں سن کر میرے قدم خود بخود اس مجمع کی طرف اٹھنے لگے۔ دیکھتا کیا ہوں کہ بندر کا تماشا ہو رہا ہے جسے تماشائی بڑے ذوق و شوق سے دیکھ رہے ہیں۔

بندر ایک چھوٹی سی سرخ رنگ کی انگریزی ٹوپی پہنے تھا جسے بندر والے نے اس کی تھوڑی کے نیچے ڈوریوں سے باندھ دیا تھا۔ وہ پچھلے پاؤں پر انسانوں کی طرح سیدھا کھڑا تھا اور دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھے خوب مٹک مٹک کے اور اکڑ اکڑ کے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر چل رہا تھا۔ ساتھ ساتھ بندر والا ڈگڈگی بجا بجا کے کہے جا رہا تھا۔

"بس پلپلی صاحب۔ بہت ہو چکی کلفٹن کی سیر، اب گھر کو سدھارو.... لو صاحب بہادر تمہاری میم صاحب تو ناراض ہو کر ولایت چلی گئیں۔ اب تمہیں روٹی پکا کے کون کھلائے گا؟... کیا کہا خود پکاؤ گے؟ وہ کیسے ...؟ بھئی واہ صاحب بہادر واہ، تم روٹی پکانا تو خوب جانتے ہو ... کیا کہا دشمن سے لڑو گے۔ لڑو گے! بندوق چلانی آتی ہے؟ .... لو یہ رہی تمہاری بندوق بھلا باندھو تو نشانہ! بیٹھ کر نشانہ باندھو ... شاباش ... اب کھڑے ہو کر نشانہ باندھو۔ شاباش .... اب لیٹ کر نشانہ باندھو بہت ٹھیک ... شاباش! شاباش! ارے یہ کیا؟ ہوائی جہاز کو نشانہ بنانا چاہتے ہو ...؟ بھئی تم تو بڑے بہادر نکلے۔ تم نے تو سچ مچ دشمن کو بھگا ہی دیا۔"

بندر نے ان کرتبوں کے علاوہ اور بھی کئی تماشے دکھائے۔ مثلاً سر کو ہلا کر ہاں یا نہیں کا اشارہ کرنا، ہوا میں قلابازی لگانا، شیک ہینڈ کرنا، دونوں ہاتھوں کے بل الٹا ہو کر چلنا، کانوں کو ہلانا وغیرہ۔

ان کرتبوں کے دوران بندر کبھی کبھی دانت کچکچانے یا چڑچڑانے لگتا مگر بندر والے کی لکڑی، رسّی کا جھٹکا اور آنکھ کا اشارہ جلد ہی اسے راہ پر لے آتا تھا۔

میری ساری کلفت دور ہو چکی تھی۔

جب میں گھر لوٹ رہا تھا تو اچانک میرے ذہن میں یہ سوال ابھرا:

بندر والا تو خیر ڈگڈگی بجا کر تماشائی اکٹھے کر لیتا ہے۔ کیا مسٹر شاہ کو اس مقصد کے لیے ہمیشہ دعوتوں کا سہارا لینا پڑتا ہے؟

رُوحی

اے میرے بچپن کے دوست!

ایک طویل مدت کے بعد تمہارا خط ملا۔ میں تو تمہاری طرف سے مایوس ہی ہو چکا تھا مگر تمہارے اس خط کو پا کر مجھے ایسی خوشی ہوئی کہ اس کا اظہار مشکل ہے۔ تمہارے خط سے معلوم ہوا کہ تم بفضل خدا ابھی تک تندرست و توانا ہو، اور پیرانہ سالی کے باوجود نہ تو جہاں گردی سے تمہارا جی ہی بھرا ہے اور نہ سیر و سیاحت سے تمہارے پاؤں ہی تھکے ہیں۔

تم نے پچھلا خط روم سے لکھا تھا۔ اس امر کو دس برس گزر چکے ہیں اور اب تم ہونولولو میں ہو جہاں سے تم نے یہ خط لکھا ہے۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ طویل وقفوں کے بعد سہی مگر تم مجھے یاد تو کر ہی لیتے ہو۔ میں تمہارے سیر و سیاحت اور تمہاری مہم جوئی کے حالات بڑی دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ میں خوش ہوں کہ تم بھی میرے معاملات سے دلچسپی رکھتے ہو۔ کیونکہ تم نے میری زندگی کے پچھلے دس برس کے واقعات پوری تفصیل کے ساتھ دریافت کئے ہیں۔ تم نے لکھا ہے کہ تم تین ماہ تک مندرجہ ذیل پتہ پر میرے جواب کا انتظار کرو گے، لہٰذا تعمیل ارشاد کرتا ہوں۔

میں اب خاصا بوڑھا ہو چکا ہوں۔ میرے سر کے بال تقریباً سفید ہو گئے ہیں، کمر میں کسی قدر خم بھی آ گیا ہے۔ شاید کچھ ایسی ہی کیفیت تمہاری بھی ہو مگر میرے تصور میں تو تم

اب بھی وہی جوان رعنا ہو جو آج سے تقریباً نصف صدی قبل میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کالج کی گراؤنڈ میں گھوما کرتا تھا۔

تم جانتے ہو کہ جہاں تک شعر وادب، فنونِ لطیفہ بالخصوص موسیقی ومصوّری کا تعلق ہے ہماری طبیعتوں میں بڑی مماثلت رہی ہے مگر ساتھ ہی ایک بڑا فرق بھی رہا ہے وہ یہ کہ تم ہمیشہ سے مہم جُو اور سیلانی ٹھہرے ہو اور میں ہمیشہ سے آرام طلب اور سہل انگار ہوں۔ تم نے اپنی آزادیٔ طبع کو ہر چیز سے مقدم جانا اور اسی وجہ سے عمر بھر خود کو تاہل کی زنجیر میں نہیں جکڑا اور میں نے تعلیم کے بعد ملازمت میں منسلک ہوتے ہی ایک چھوٹا سا گھر بسا لیا۔

تم کو عابدہ کی موت یاد ہو گی اور یہ بھی یاد ہو گا کہ کس طرح وہ شادی کے دوسرے ہی برس مجھے ایک بچّی کا تحفہ دے کر ہمیشہ کے لئے مجھ سے رخصت ہو گئی تھی۔ میں اس بچّی سے نفرت بھی کرتا تھا اور محبت بھی۔ نفرت اس لئے کہ اس کی وجہ سے میں ایک متاعِ عزیز سے محروم ہو گیا تھا اور محبت اس لئے کہ وہ آخر تھی تو میرا خون ہی میں نے اس کی خاطر دوسری شادی کا خیال ہی ترک نہیں کر دیا بلکہ جنسِ لطیف کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔

میں دل وجان سے سلیمہ کی پرورش کرتا رہا۔ میں نے اس کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ جب وہ جوان ہوئی تو ہو بہو اپنی ماں کی تصویر تھی۔ ویسے ہی خدوخال، ویسے ہی بُھورے بال، ویسی ہی دراز قامت۔ اس کی ذمہ داری اس وقت تک مجھ پر رہی جب تک کہ اس کی شادی نہ ہو گئی۔ اسے یونیورسٹی کے زمانے ہی میں اپنے ایک ہم سبق سے دلبستگی ہو گئی تھی۔ یہ صاحبزادہ خاصے خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ شادی کے بعد وہ دونوں دو سال تک اپنے ہی ملک میں رہے۔ پھر شوہر کا تبادلہ کاروبار کے سلسلے میں ممالک غیر میں ہو گیا جہاں وہ اب اپنے بچّوں کے ساتھ خوش وخرم زندگی بسر کر رہے ہیں۔

سلیمہ کی شادی کے بعد میں نے اس بوڑھی ماما کو جسے عابدہ نے ملازم رکھا تھا اور جس نے اس کی موت کے بعد سلیمہ کی پرورش میں میری بہت مدد کی تھی اپنے ہی پاس رہنے دیا

تھا، البتہ اب وہ میرا دونوں وقت کا کھانا پکا کر سر شام اپنے بیٹے اور بہو کے پاس چلی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ میرا ایک پرانا خدمتگار خدا بخش بھی تھا جو مالی کا کام بھی کرتا تھا اور میری دیکھ بھال بھی۔

پچپن برس کی عمر کو پہنچ کر میں ملازمت سے سبکدوش ہو گیا۔ کوئی نیا کام شروع کرنے کو نہ تو جی ہی چاہا اور نہ اس کی ضرورت ہی محسوس ہوئی۔ ماہانہ پنشن اور ملازمت کے دوران بچائی ہوئی پونجی کی بدولت مجھے ہر ماہ اتنی رقم مل جاتی کہ میں اس سے خاصی آرام و آسائش کی زندگی گزار سکوں۔ مکان جس میں میں رہتا تھا وہ بھی میری ہی ملکیت تھا جسے میں نے ملازمت کے ابتدائی برسوں ہی میں سرکاری سہولتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تعمیر کرالیا تھا۔ اس مکان میں مجھے پہلی مرتبہ وہ سکون اور تنہائی نصیب ہوئی جس کا میں عمر بھر خواہاں رہا تھا۔ میرا زیادہ تر وقت مطالعہ میں صَرف ہوتا۔ گھر سے بہت کم باہر نکلتا، نہ کہیں آتا نہ جاتا۔ جب بیٹھے بیٹھے تھک جاتا تو اپنے بنگلے کے چھوٹے سے باغیچے میں چہل قدمی کر لیا کرتا۔

میرے دوست! شاید تم پوچھو کہ اس مکان میں چوبیں گھنٹے تن تنہا رہتے ہوئے تمھارا جی گھبرا نہ جاتا ہوگا۔ نہ کوئی دوست نہ کوئی ساتھی، نہ محرمِ راز نہ غمگسار یہ پہاڑ سے دن، یہ سُونی سُونی راتیں تنہا کیسے کٹتی ہوں گی! تمھارا یہ سوال دنیا والوں کے نقطۂ خیال سے شاید درست ہو مگر شاید تمھیں یاد رہا ہو کہ میری طبیعت شروع ہی سے تنہائی پسند رہی ہے۔ جب اسکول میں پڑھتا تھا تو اکثر چھٹی کے روز کتاب لے کر گھر سے نکل جاتا اور باغ کا کوئی سُنسان گوشہ تلاش کر کے دن بھر مطالعہ میں مصروف رہتا۔ کالج کے زمانے میں بھی جیسا کہ تم جانتے ہو میں دوسرے طلباء سے الگ تھلگ ہی رہا، تم البتہ وہ واحد شخص ہو جس کی دوستی اور رفاقت میری خوشیوں کا سرچشمہ بنی۔

پھر جب میں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوا تو اپنی رفیقۂ حیات کو جنون کی حد تک چاہنے لگا اور اس کی خاطر مجھے اپنے کئی اصول توڑنے اور اپنی عادتیں بدلنی پڑیں مگر یہ میری

انتہا درجہ کی بدقسمتی تھی کہ عابدہ جلد ہی میرا ساتھ چھوڑ گئی اور سلیمہ کی تعلیم و تربیت کا سارا بوجھ مجھ پر پڑ گیا۔ اس کی دیکھ بھال اور دفتروں کی مصروفیات نے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ میں دوبارہ لذتِ تنہائی سے بہرہ مند ہو سکتا۔ آخر جب سلیمہ کی شادی خیر و خوبی سے انجام پا گئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہ سچ ہے کہ سلیمہ کے چلے جانے کے بعد کچھ دنوں مجھے یہ گھر بہت سُونا سُونا معلوم ہوا لیکن پھر جلد ہی مجھے محسوس ہونے لگا جیسے میری کوئی کھوئی ہوئی چیز رفتہ رفتہ مجھے واپس مل رہی ہے۔ پھر جب میں ملازمت سے سبکدوش ہوا تو میری مسرت کا ٹھکانہ ہی نہ تھا کیونکہ لامحدود فراغت کا ایک طویل زمانہ میرے سامنے تھا۔

تم لوگ جو عورت کو دنیا جہاں کی مسرتوں کا گہوارہ سمجھتے ہو، تم کو کیا معلوم کہ عورت کے سوا دنیا میں اور بھی کئی دل لبھالینے والی چیزیں ہیں جن سے روح کو تسکین اور دماغ کو فرحت ملتی ہے۔ شاعری! کون ہے کہ میرؔ، غالبؔ، حافظؔ، عمر خیامؔ، کیٹسؔ، شیلیؔ کے نغمات سن کر اس کے سازِ دل کے تار جھنجھنا نہ اٹھیں۔ یہی حال مصوری، موسیقی اور دوسرے فنونِ لطیفہ کا ہے۔

تم کبھی یہاں آؤ تو دیکھو کہ میں نے دنیا بھر کے شعر و ادب کے کیسے کیسے شاہکار اپنے گھر میں جمع کر رکھے ہیں جن کے مطالعہ کو میں مدتوں ترستا رہا ہوں۔ دنیا بھر کے باکمال مصوروں کی تصویریں میرے گھر کی زینت ہیں۔ میں انھیں پہروں دیکھتا رہتا ہوں۔ میں ان سے باتیں کرتا ہوں۔ میں ان کی خاموشی کا راز سمجھتا ہوں۔

پھر دنیا بھر کی کلاسیکی موسیقی کے ریکارڈ میرے پاس ہیں۔ ان کو سنتا ہوں تو مجھ پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے کائنات کے سربستہ راز مجھ پر عیاں ہو رہے ہیں۔ انسان کے جذبات و حسیات، حسن و عشق، نفرت و محبت، گناہ و ثواب، صلح و جنگ کی کیسی کیسی تمثیلیں ان شاعروں، مصوروں اور موسیقی دانوں نے اپنے اپنے فن کے ذریعے پیش کی ہیں۔ کیسے کیسے ناول اور ڈرامے لکھے گئے جن کو پڑھتے وقت

محسوس ہوتا ہے کہ ہم بھی ان کے کرداروں کے ساتھ ساتھ اسی ماحول میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ منا گی کے یہ شاہکار عورت ذات سے کتنے مختلف ہیں، نہ یک بیک ساتھ چھوڑ دینے والے، نہ دغا فریب دینے والے، نہ کچھ طلب کرنے والے ..... ! پیارے دوست معاف کرنا۔ میں نہ جانے کدھر بھٹک گیا۔

میری ملازمت سے سکبدوشی کو چند ہی ہفتے گزرے تھے کہ بوڑھی ماما جس کا نام نصیبن بوا تھا اپنے گھر سے آئی تو باورچی خانے میں جانے کے بجائے سیدھی میرے کمرے میں چلی آئی۔ وہ کچھ گھبرائی ہوئی سی تھی، سانس پھولا ہوا تھا۔ میں نے اس کے چہرے سے بھانپ لیا کہ وہ مجھ سے کوئی خاص بات کہنا چاہتی ہے۔

"نصیبن بوا! کیا بات ہے، خیریت سے تو ہو؟" میں نے بڑی نرمی سے پوچھا۔

نصیبن بوا نے اپنی گھبراہٹ پر کسی قدر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "خدا حضور کو سلامت رکھے ویسے تو سب خیریت ہے مگر ایک معاملے میں حضور کی مدد کی ضرورت ہے......"

"کس معاملے میں؟"

"بڑا نیکی کا کام ہے حضور۔ خدا آپ کو اس کا بڑا اجر دے گا۔"

"بتاؤ تو سہی نصیبن بوا میں کیا کر سکتا ہوں؟"

بہت سوال و جواب کے بعد معلوم ہوا کہ نصیبن بوا نے پچھلے دو تین دن سے ایک بے سہارا لڑکی کو اپنے گھر میں پناہ دے رکھی ہے۔ یہ لڑکی یتیم ہے اور اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ پڑھی لکھی ہے اور ایک اسکول میں بچوں کو پڑھاتی ہے اس کام سے اسے اپنے گزارے کے لئے خاصی رقم مل جاتی ہے۔ وہ پچھلے دس ماہ سے اسی اسکول کی ایک بڑی استانی کے ساتھ رہتی تھی۔ اس استانی نے نوکری چھوڑ دی اور کسی اور شہر چلی گئی چنانچہ اس لڑکی کو بھی اپنا کمرہ خالی کرنا پڑا۔ نصیبن بوا اس لڑکی کو اپنے محلے میں پریشان حال پھرتے دیکھ کر، اور اس پر ترس کھا کر اپنے گھر لے گئی۔ وہ دو دن سے شہر کے کئی علاقوں میں اس لڑکی کے لئے

کرایہ پر کمرہ تلاش کرتی رہی ہے مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ جن گھروں نے اسے کمرہ دینے پر آمادگی ظاہر کی انھیں نصیبن بوا نے لڑکی کی کم عمری کے سبب (اس کی عمر صرف بیس سال ہے) مناسب نہیں سمجھا۔ ان میں یا تو مردوں کی کثرت تھی، یا ان کا رہن سہن مشکوک تھا۔ وہ دو ایک ہوسٹلوں میں بھی گئی مگر ان میں بھی کوئی جگہ خالی نہیں ملی۔ آخر میں نصیبن بوا نے مجھ سے درخواست کی کہ وہ کمرہ جو سلیمہ بی بی کی شادی کے بعد سے اب تک خالی پڑا ہے، اُس میں اس لڑکی کو دو ایک مہینے کے لئے ٹھہرالیا جائے۔ اس عرصے میں وہ لڑکی کوئی نہ کوئی ٹھکانہ تلاش کر ہی لے گی۔

میں بوڑھی ماما کی یہ بات سن کر بھونچکا سا رہ گیا۔ میں کچھ دیر خاموش رہا پھر اپنے اسی نرم لہجہ میں جس سے میں ہمیشہ اس سے مخاطب ہوتا تھا، کہا:

"نصیبن بوا! ذرا سوچو تو۔ جس مکان میں ایک مرد اکیلا رہتا ہو اس میں ایک نوجوان بن بیاہتا لڑکی کیسے رہ سکتی ہے؟ آس پاس کے لوگ کیا کہیں گے۔ طرح طرح کی چہ میگوئیاں نہ ہوں گی! یہ گھر بدنام نہ ہو جائے گا! مجھے حیرت ہے کہ تمھارے دل میں یہ خیال پیدا ہی کیونکر ہوا؟"

"حضور، میں جانتی ہوں کہ یہ معاملہ ذرا مشکل ہے لیکن میں تیس برس سے حضور کا نمک کھا رہی ہوں۔ میں نے حضور جیسا شریف اور نیک دل انسان کہیں نہیں دیکھا۔ حضور کے بارے میں کوئی برا خیال دل میں لا ہی نہیں سکتا۔ رہا دنیا والوں کا معاملہ تو ایک نیک کام کے لئے حضور کو دنیا والوں کی باتوں کا کچھ خیال نہیں کرنا چاہیے۔ اس لڑکی کا چال چلن دیکھئے۔ اگر اسکول والوں کو اس کے بارے میں ذرا سا بھی شبہ ہوتا تو وہ اسے استانی کی نوکری دیتے ہی کیوں؟ اس لڑکی کی آنکھوں میں حیا ہے، شرم ہے۔ میں عورت ہوں۔ وہ مجھ سے بات کرتے ہوئے بھی نظریں جھکائے ہی رکھتی ہے۔ اس کی صورت ایسی بھولی بھالی ہے کہ بے اختیار اس پر ترس آتا ہے۔ اگر میری کوٹھریا اس قابل ہوتی تو میں اسے اپنے پاس ہی رکھ

لیتی۔ اسے یہاں ہمیشہ تھوڑا ہی رہنا ہو گا حضور، بس دو ایک مہینے ہی کی تو بات ہے، اللہ حضور کو اس کا اجر دے گا اور وہ لڑکی بھی عمر بھر دعائیں دے گی۔"

پیارے دوست! نصیبن بوا کی اس درخواست نے مجھے عجب غلجان میں ڈال دیا۔ جب عابدہ نے اسے ملازم رکھا تھا تو وہ ایک کم عمر بیوہ تھی جس کا تین چار سال کا ایک لڑکا تھا۔ وہ دیہات کی رہنے والی اَن پڑھ عورت تھی مگر عابدہ نے چند ہی مہینوں میں اسے تربیت دے کر خاصا مطلب کا بنا لیا تھا۔ اس نے لڑکے کو تو اپنے بھائی بھاوج کے پاس چھوڑا اور خود ہمارے پاس رہنے لگی تھی، پھر جب عابدہ نے انتقال کیا تو سلیمہ کی پرورش زیادہ تر اسی نے کی تھی۔ اس لحاظ سے میں اس کا بڑا احسان مند تھا چنانچہ میں ہمیشہ اس سے نرمی کا سلوک کیا کرتا تھا۔ اس کی تیس سالہ ملازمت کے دوران مجھے کبھی اس سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اسے نہ تو چوری کی عادت تھی نہ جھوٹ بولنے کی۔ اسے سلیمہ سے سچی محبت تھی چنانچہ جب شادی کے بعد ہم نے اسے رخصت کیا تو نصیبن بوا ایسی پھوٹ پھوٹ کر روئی جیسے یہ اس کی اپنی لختِ جگر ہو، پھر جب تک اس کے اپنے لڑکے کی شادی نہ ہو گئی وہ میرے ہی گھر میں رہتی رہی۔ لڑکے کی شادی کے بعد البتہ وہ میری اجازت سے رات کو بیٹے اور بہو کے پاس چلی جاتی کیونکہ بیٹا اپنی بیوی کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ نصیبن بوا کی ایک بات اور بھی تھی وہ یہ کہ اس سے پہلے اس نے مجھ سے کبھی کوئی درخواست نہیں کی تھی اور یہ درخواست بھی اس نے بڑی مجبوری کے عالم میں اور مجھ پر پورا بھروسہ کر کے کی تھی، چنانچہ اس کا دل توڑنا میرے لئے بہت مشکل ہو گیا۔

اچانک ایک خیال میرے ذہن میں آیا کہ شاید نصیبن بوا کو اس لڑکی کا کھانا وغیرہ بھی پکانا پڑتا ہو اور اس طرح اسے کچھ مالی فائدہ پہنچنے کی امید ہو مگر دوسرے ہی لمحے میں نے اس خیال کو دل سے نکال دیا کیونکہ نصیبن بوا لالچی ہرگز نہ تھی تاہم میں نے تھوڑی سی مدافعت اور کی مگر بالآخر میں نے نصیبن بوا کے آگے ہتھیار ڈال ہی دیئے۔

اگلے روز کوئی عام تعطیل تھی۔ اسکول اور دفاتر بند تھے۔ میں ابھی اپنی خواب گاہ ہی میں تھا کہ برآمدے اور بڑے کمرے میں تیز اور سبک قدموں کی آواز سن کر مجھے احساس ہوا کہ گھر میں کوئی تیسرا آدمی بھی موجود ہے۔ میری بیٹی کا کمرہ جو اس کی شادی کے بعد سے اب تک بند پڑا تھا کھلوایا اور صاف کرایا گیا۔ یہ کمرہ بنگلے کے سامنے کے رخ ایک گوشے میں تھا۔ یہاں سے باغیچے کا منظر اور بنگلے کا پھاٹک نظر آتا تھا۔ میرا کمرہ بنگلے کے دوسرے گوشے میں تھا۔ ان دونوں کمروں کے درمیان وسیع برآمدہ تھا جس سے ملحق ایک بڑا کمرہ تھا جو بیک وقت ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم دونوں کا کام دیتا تھا۔ اس کے برابر میں ایک اور بیڈ روم تھا جسے میں نے لائبریری میں تبدیل کر لیا تھا۔ میں عام طور پر مطالعہ اور لکھنے پڑھنے کا کام اسی کمرے میں کیا کرتا تھا۔ یہ یک منزلہ مکان زیادہ بڑا نہیں تھا مگر میری آسائشوں کے لئے کافی تھا۔

تھوڑی دیر بعد میرے کمرے کے دروازے پر دستک کے ساتھ نصیبن بوا کی آواز سنائی دی:

"ناشتہ تیار ہے سرکار۔"

اور پھر جب ڈائننگ روم میں ناشتہ کر رہا تھا تو بوڑھی ماما نے مسکراتے ہوئے کہا:

"روحی آگئی ہے سرکار، کیا آپ اُسے دیکھنا پسند کریں گے؟"

"نہیں نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "آج نہیں۔ پھر کبھی دیکھا جائے گا۔"

تو اس لڑکی کا نام روحی ہے! میں نے دل میں کہا۔

میں دن بھر حسبِ معمول اپنے مشاغل میں مصروف رہا اور وہ لڑکی بھی دن بھر اپنے کمرے ہی میں بند رہی۔ کھانا بھی اس نے اپنے کمرے ہی میں کھایا۔ اگلے روز میں صبح جلدی بیدار ہو گیا تا کہ جب وہ اسکول جانے لگے تو میں کھڑکی کے پردے کے پیچھے سے اس کی ایک جھلک دیکھ سکوں۔ میرے دوست شاید تم میری اس بات پر ہنسو لیکن یہ محض ایک انسانی

جذبہ تھا جسے تجسس نے خود بخود میرے دل میں پیدا کر دیا تھا۔

مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ میں نے دیکھا کہ ایک دُبلی پتلی لمبے قد کی لڑکی سفید رنگ کی شلوار قمیض پہنے، دوپٹہ اوڑھے، ہاتھ میں سیاہ ہینڈ بیگ لئے جلد جلد قدم اٹھاتی باغیچے سے گزری اور پھاٹک کا چھوٹا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ میں اس کی شکل صورت بالکل نہ دیکھنے پایا۔

اسی روز سہ پہر کو جب نصیبن بوا چائے کی ٹرے لئے لائبریری میں آئی جہاں میں عموماً چائے پیا کرتا تھا تو وہ بڑی خوش معلوم ہوتی تھی۔ کہنے لگی:

"خدا حضور کو سلامت رکھے۔ روحی یہاں بہت خوش ہے۔ اسے بہت آرام ملا ہے۔ یہ بنگلہ اس کے اسکول سے کچھ زیادہ دور بھی نہیں۔ رکشا ٹیکسی آسانی سے مل جاتی ہے اور نہ ملے تو پیدل بھی آجا سکتی ہے۔"

ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس کے دوران میں میرا اور روحی کا آمنا سامنا نہ ہو سکا۔ دو ایک مرتبہ اور میں نے صبح اُٹھ کر اپنے کمرے سے اس کو اسکول جاتے ہوئے دیکھا مگر مجھے اس کی صرف پشت ہی دکھائی دی، صورت نہ دیکھ سکا۔

یہ بھی کوئی چھٹی ہی کا دن تھا جب میں اپنی لائبریری میں گیا تو وہاں اس لڑکی کو پایا۔ وہ شیلفوں میں رکھی ہوئی کتابوں کو بڑی اشتیاق بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میرے اچانک وہاں آجانے سے وہ ایک دَم گھبرا سی گئی، اور سر پر اپنے ڈوپٹے کو درست کرنے لگی۔

"سر" اس نے بڑی لجاجت سے کہا۔ "معافی چاہتی ہوں کہ آپ کی اجازت کے بغیر آپ کی لائبریری میں آگئی، ویسے بڑی بی نے مجھے اجازت دے دی تھی اور کہا تھا کہ میں خود صاحب سے اجازت لے لوں گی۔ شاید وہ آپ سے کہنا بھول گئیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ باقی شیلف کھلے ہیں، ان میں سے آپ جونسی کتاب چاہیں نکال کر پڑھ سکتی ہیں۔"

"بہت بہت شکریہ!"

آج جب پہلی مرتبہ میں نے اس کی صورت دیکھی تو اچانک مجھے احساس ہوا کہ نصیبن بوا نے یقیناً ایک بات مجھ سے چھپائی تھی وہ یہ کہ یہ لڑکی غیر معمولی طور پر حسین تھی۔ اس کے خدوخال میں بلا کی جاذبیت تھی۔ آنکھوں میں ذہانت کی چمک، شائستہ لہجہ، مجھ سے گفتگو کے دوران اس نے اپنی نظریں جھکائے رکھی تھیں۔

"آپ کس قسم کی کتابیں پڑھتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"سر مجھے فرانسیسی ادب سے خاص طور پر دلچسپی ہے اور کسی قدر انگریزی شاعری سے بھی۔ کالج کے زمانے ہی سے مجھے ادب کے مطالعے کا شوق پیدا ہو گیا تھا مگر ابا جان کے انتقال پر مجھے کالج چھوڑ دینا پڑا اور نوکری تلاش کرنی پڑی۔ امی جان کا پہلے ہی کئی سال ہوئے انتقال ہو چکا تھا.... "

میں نے اس ناخوشگوار موضوع کو بدلنے کے لئے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا:

"آپ کو فرانسیسی ادب میں کون سی کتاب سب سے اچھی لگی؟"

"سر۔ مجھے فلابیئر کی "مادام بواری" بہت پسند ہے، اس کو انگریزی میں پڑھنے کے بعد میں نے کالج میں فرانسیسی زبان کو بھی ایک سبجیکٹ کے طور پر لے لیا تھا اور فرانسیسی سے کچھ شد بد ہو گئی تھی۔"

میں نے کہا: "میرے کتب خانے میں فلابیئر کی قریب قریب تمام کتابیں موجود ہیں۔ علاوہ ازیں بالزاک، زولا، وکٹر ہیوگو، موپاساں کی بھی متعدد کتابیں ہیں۔ روسی مصنفین میں آپ کو ترگنیف، ٹالسٹائی، دوستوفسکی، چیکوف اور گورکی کی کتابیں ملیں گی۔"

جب میں یہ نام گنوا رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ ہر نام پر روحی کی آنکھیں چمک چمک اٹھتیں تھیں۔

"سر۔ کیا مجھے ان کتابوں کو پڑھنے کی اجازت ہو گی؟"

"ہاں۔ کیوں نہیں۔"

"اپنے ساتھ اسکول لے جانے کی بھی؟ مجھے ہر روز کوئی نہ کوئی پیریڈ خالی مل جاتا ہے۔ میں کتابوں کو بڑی حفاظت سے پڑھتی ہوں۔ میں ان پر اخباری کاغذ چڑھا لیتی ہوں تاکہ سرورق میلا نہ ہونے پائے۔"

"آپ کو جس کتاب کی ضرورت ہو بے جھجک الماری سے نکال کر لے جا سکتی ہیں۔"

"تھینک یو سر۔"

اس ملاقات کے بعد کوئی آٹھ دس روز تک میں اس سے دوبارہ نہیں مل سکا۔ البتہ جب وہ اسکول چلی جاتی تو میں لائبریری میں جا کر دیکھتا کہ وہ کون سی کتاب اپنے ساتھ لے گئی ہے۔ اس نے پہلے تو شولوخوف کی "کنواری زمین" کے دونوں حصے پڑھے اور اس کے بعد دوستوفسکی کی "احمق" کا مطالعہ شروع کیا۔ میں یہ بھی دیکھتا کہ ہر روز رات کو اس کے کمرے کی بتی دیر تک روشن رہتی ہے۔

ایک دن سہ پہر کو میں اپنے باغیچے میں ٹہل رہا تھا جس کو خدا بخش نے خاصا سرسبز بنا رکھا تھا کہ اتنے میں ایک ٹیکسی بنگلے کے پھاٹک پر رکی۔ روحی بنگلے میں داخل ہوئی۔ پل بھر کے لئے ہماری نظریں ملیں پھر جھٹ اس نے اپنی نظریں نیچی کر لیں اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں تھوڑی دیر تک اور باغیچے میں ٹہلتا رہا، پھر لائبریری میں پہنچا تو دیکھا کہ وہ پہلے سے وہاں موجود ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹک سی گئی۔ مگر جلد ہی اس نے خود کو سنبھال لیا۔

"سر۔" اس نے کہا۔ "میں آپ کی نوازشوں سے کچھ زیادہ ہی فائدہ اٹھانے لگی ہوں۔ آپ مجھے باعثِ زحمت تو نہ سمجھتے ہوں گے!"

میں نے کہا: "ہرگز نہیں۔ کوئی ادب سے دلچسپی رکھتا ہے تو مجھے خوشی ہوتی ہے، پھر آپ کے ذوق شوق پر تو مجھے اور بھی مسرت ہے۔"

"سر میرا جی چاہتا ہے کہ کبھی کبھی زیرِ مطالعہ کتاب کے بارے میں آپ کی رہنمائی

بھی حاصل کروں۔ بعض دفعہ کتاب پڑھ کر دل میں طرح طرح کے سوال پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب مجھے نہیں سُوجھتا۔ مثال کے طور پر دوستوافسکی کے ناول ”احمق“ میں پرنس مِش کنِ کے کردار نے خاصا الجھن میں ڈال دیا ہے۔ یہ شخص بیک وقت دیوانہ بھی ہے اور فرزانہ بھی۔ دنیاوی معاملات سے لاتعلق بھی ہے اور دنیاداری کا خواہشمند بھی محبت کا جذبہ اس کے دل میں بڑی شدت سے ابھرتا ہے مگر اپنی ناکامی پر اسے کوئی خاص افسوس بھی نہیں ہوتا بلکہ اپنے رقیب تک سے بڑی دردمندی سے باتیں کرتا ہے جس نے اس کی اور اپنی دونوں کی محبوبہ کو قتل کر دیا ہے۔ کیا دنیا میں سچ مچ ایسے لوگ ہوتے ہیں؟“

جس وقت وہ یہ کہہ رہی تھی تو بیچ بیچ میں رک رک بھی جاتی تھی جیسے سوچ سوچ کے کہہ رہی ہو۔

میں نے کہا: ”دوستوافسکی نے یہ بڑا اعجوبہ کردار اختراع کیا ہے۔ ایسے لوگ اِس دنیا میں شاذونادر ہی نظر آتے ہیں۔ دراصل اس نے پرنس مشن کنِ کے روپ میں انسانِ کامل کا ایک نمونہ پیش کیا ہے اور تمام اعلیٰ وارفع صفات اس کی ذات میں بھر دی ہیں جیسے سچ بولنا، صاف دل ہونا، انسان کی بھلائی چاہنا، اس سے محبت کرنا اس کی خطاؤں کو بخش دینا۔ مال وزر اور عزت و جاہ سے بے نیاز ہونا وغیرہ۔ وہ بظاہر سادہ لوح نظر آتا ہے مگر کوئی اسے بیوقوف نہیں بنا سکتا، کیونکہ وہ لوگوں کے دِلوں کا حال جانتا ہے۔ اس کردار کا المیہ یہ ہے کہ ایسے انسانِ کامل کو بھی آخر میں ناکامی ہی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔“

روحی بظاہر اس جواب سے مطمئن معلوم ہوتی تھی، وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی،

”سر، دوستوافسکی کی ناول نگاری کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟“

میں نے کہا: ”میں اسے دنیا کا عظیم ترین ناول نگار سمجھتا ہوں۔ اگر دنیا کے سات بہترین ناول چنے جائیں تو ان میں سے تین بلاشبہ دوستوافسکی ہی کے ہوں گے اور ان تین میں ”احمق“ ضرور شامل ہوگا۔ اس کے ناولوں کے بارے میں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ

وہ بہت جلدی میں لکھے گئے اور ان پر مصنف کو زیادہ غور و خوض کا موقع بھی نہیں ملا۔ ایک مرتبہ تو وہ قرضوں کے بوجھ تلے ایسا دب گیا کہ اس کے جیل جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا چنانچہ اس صورتِ حال سے نپٹنے کے لئے اسے ایک پبلشر سے ایک ماہ میں ایک نیا ضخیم ناول لکھ دینے کا معاہدہ کرنا پڑا۔ اس کام کے سلسلے میں ایک شارٹ ہینڈ جاننے والی لڑکی کی خدمات حاصل کی گئیں، بس پھر کیا تھا وہ تیزی سے بولتا جاتا تھا اور وہ لڑکی شارٹ ہینڈ میں لکھتی جاتی تھی اور یوں ایک مہینے کی بجائے چھبیس ہی دن میں یہ ناول مکمل کر لیا گیا۔ اس واقعہ کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ جب یہ ناول تخلیق ہو رہا تھا تو اسی دوران میں دوستوفسکی اور اس لڑکی میں جو اس سے عمر میں پچیس تیس برس چھوٹی تھی، قلبی رشتہ استوار ہو گیا اور انہوں نے جلد ہی شادی کر لی۔"

روحی میری باتوں کو بہت غور سے سن رہی تھی۔ میرے آخری جملے پر وہ ذرا ٹھٹکی۔ پل بھر کے لئے اس کے ہونٹوں پر ایک لطیف تبسّم نمودار ہوا اور پھر وہ "تھینک یو سر" کہہ کر لائبریری سے چلی گئی۔

رفتہ رفتہ اب ہم میں باہمی حجاب اٹھنے لگا تھا۔ میں اب اس سے "آپ" کے بجائے "تم" کہہ کر مخاطب ہونے لگا تھا۔ اگرچہ وہ ہمیشہ مجھے "سر" ہی کہا کرتی۔ ہم اکثر لائبریری میں یا کبھی باغیچے میں ادب، شاعری، موسیقی اور مصوّری پر گفتگو کیا کرتے۔ ہر چند روحی کو موسیقی اور مصوّری سے کوئی عملی دلچسپی نہ تھی مگر وہ اچھے کلاسیکل گانوں کے ریکارڈ بہت شوق سے سنا کرتی اور دنیا کے نامی گرامی مصوّروں کی تصاویر کو غور سے دیکھتی۔ میں ان فنون کی باریکیاں بیان کرتا تو وہ میری باتوں کو ایسی توجہ سے سنتی گویا ایک ایک نکتے کو اپنے دل میں اتار لینا چاہتی ہے۔

میرے دوست! تم تصور کر سکتے ہو کہ جس شخص نے تیس برس تک کسی عورت کے جسم کو چھوا تک نہ ہو، وہ ہر روز ایک خوش شکل، خوش ذوق، ذہین، شائستہ خاتون کو اس

قدر قریب سے دیکھتا ہو کہ بعض دفعہ تصاویر کو دیکھنے یا کسی کتاب کی عبارت کو مل کر پڑھنے کے دوران چہروں کے درمیان صرف چند انچ کا فاصلہ رہ جاتا ہو تو اس کے دل کی کیا کیفیت ہوتی ہوگی۔ میری تنہائی کی زندگی میں اس لڑکی کا آنا ایسا تھا جیسے کوئی کسی پرانے تالاب میں پتھر پھینک دے اور اس میں بھنور پڑنے لگیں۔

اس طرح دو مہینے گزر گئے!

ایک دن جب روحی اسکول کو روانہ ہوئی تو نصیبن بوا میرے پاس آئی اور بڑے گھمبیر لہجہ میں کہنے لگی:

"صاحب۔ روحی کو ہمارے پاس رہتے ہوئے دو مہینے گزر چکے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب اسے کوئی اور ٹھکانہ دیکھنا چاہیئے ورنہ میں آپ کی نظروں میں جھوٹی بن جاؤں گی۔"

میں ششدر رہ گیا۔

"میں سمجھتی ہوں۔" وہ پھر بولی۔ "اس کے لئے سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ وہ کسی شریف مرد کو دیکھ کر اس سے شادی کر لے مگر مصیبت یہ ہے کہ اسے مردوں سے کوئی خاص دلچسپی ہی معلوم نہیں ہوتی یا یہ کہ ابھی تک کوئی مرد اس کی نظروں میں جچا ہی نہیں۔"

میں نے کہا: "نصیبن بوا جہاں تک اس کے یہاں رہنے کا تعلق ہے مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں، کیونکہ شروع شروع میں اس کے متعلق جو اندیشے پیدا ہوئے تھے وہ سب بے بنیاد ثابت ہوئے۔ وہ واقعی بہت شریف سیدھی سادی لڑکی ہے۔" رہا اس کی شادی کا معاملہ، تو اس میں نہ تم اس کی مدد کر سکتی ہو نہ میں۔ اس لئے میری رائے میں جب تک اس کی رہائش کا کوئی مناسب انتظام نہ ہو جائے وہ یہیں رہ سکتی ہے۔"

یہ سن کر نصیبن بوا کچھ دیر تک کھوئی کھوئی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر اس نے ایک لمبا سانس لیا اور باورچی خانے میں چلی گئی۔ معاملے کے اس پہلو کی طرف میرا کبھی دھیان ہی نہیں گیا تھا، جیسے کوئی سہانا خواب دیکھنے میں محو ہو اور اچانک اس کی آنکھ کھل

جائے۔

دو تین روز کے بعد نصیبن بُوا پھر میرے پاس آئی اور کہنے لگی:

"صاحب۔ روحی بی بی نے خواہش ظاہر کی ہے کہ وہ آئندہ دونوں وقت کا کھانا اور شام کی چائے خود آپ کو دیا کرے۔ ناشتہ اس لئے نہیں کہ اسے صبح ہی صبح اسکول جانا ہوتا ہے اور صاحب سچی بات تو یہ ہے کہ اب میں خود بھی بہت بوڑھی ہو گئی ہوں۔ زیادہ کام کی مجھ میں ہمت نہیں رہی۔ میں دونوں وقت کھانا پکا دیا کروں تو یہ بھی بڑی بات ہے۔"

میں نے کہا۔ "نصیبن بوا اگر تمھاری اور اس لڑکی کی یہی مرضی ہے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

نصیبن بوا مجھے دعائیں دیتی ہوئی خوش خوش چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے دل میں کہا روحی بہت خوددار لڑکی ہے۔ شروع شروع میں جب اس نے نصیبن بوا کے ذریعے کمرے کے کرائے اور کھانے پینے کے خرچ کے سلسلے میں کچھ رقم پیش کرنی چاہی تھی تو میں نے یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ یہ دو ایک ماہ کی عارضی رہائش ہے۔ اس عرصے کے لئے اس کی حیثیت اس گھر میں ایک مہمان کی سی ہوگی مگر اب جب نصیبن بُوا نے اس سے میری اور اپنی تازہ بات چیت کا تذکرہ کیا ہوگا تو اس کی غیرت نے گوارا نہ کیا ہوگا کہ وہ آئندہ بھی یہاں مفت ہی رہے اور مفت ہی کھائے پیئے، لہٰذا اس کے بدلے میں اس نے اپنی خدمات پیش کی ہوں گی۔ بہرحال صورتِ حال کچھ بھی ہو میں نے اس نئے انتظام کو اپنے لئے ایک خوشگوار تبدیلی تصور کیا۔

میرے دوست! مجھے اعتراف ہے کہ جب سے روحی اس گھر میں آئی تھی میرے معمولات رفتہ رفتہ بدلتے جا رہے تھے۔ میں نے ہر وقت آرام کرسی پر بیٹھے کتاب پڑھتے رہنے یا موسیقی سنتے رہنے کی عادت کو بڑی حد تک ترک کر دیا تھا۔ میں اب اکثر اپنے چھوٹے سے باغیچے میں پھولوں اور پودوں کی نشو و نما میں دلچسپی لینے لگا تھا میں پودوں کی سُوکھی پتیوں -

کو اپنے ہاتھ سے نوچ نوچ کر الگ کرتا۔ میں خدا بخش کو نئے نئے پھول اگانے، کیاریوں میں تبدیلیاں کرنے، پودوں کو جھاڑ جھنکار سے صاف کرنے کی ہدایتیں دیتا۔ غرض آرام طلبی کی زندگی چھوڑ کر کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کا ایک ولولہ سا میرے دل میں اٹھنے لگا۔

اس میں شک نہیں کہ روحی کے غیر معمولی حسن و جمال، اس کے متناسب اعضاء اس کی جوانی، اس کی مشرقی شرم و حیا، اس کی ذہانت، اس کی سلیقہ مندی کا میرے دل پر گہرا اثر ہوا تھا۔ مجھے اس سے جو لگاؤ پیدا ہو گیا تھا اس میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جارہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس جذبے کو کیا نام دوں۔ اس زمانے میں میری جو کیفیت تھی اسے میں تمہاری دلچسپی کے لئے عقل و دل کے ایک مکالمے کی صورت میں لکھتا ہوں:

عقل: بڑے میاں! تم عمر کے جس حصے سے گزر رہے ہو اس میں احتیاط کی بے حد ضرورت ہے۔

دل: کیوں نہیں۔ میں پوری احتیاط برت رہا ہوں۔

عقل: تو پھر تمہارے معمولِ زندگی میں فرق کیوں آ گیا ہے، یا تو تم آٹھ آٹھ دن ڈاڑھی نہیں مونڈتے تھے یا اب ہر روز بلاناغہ شیو کرنے لگے۔ اب تم پہلے سے کہیں زیادہ وقت نہانے دھونے میں صَرف کرتے ہو۔ ہر وقت صاف ستھرے رہتے ہو۔ دن میں دو دو مرتبہ لباس تبدیل کرتے ہو۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

دل: کوئی خاص وجہ نہیں۔ انسان پر طرح طرح کے دور آتے رہتے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی زندگی کا ایک دور ہے۔

عقل: اور یہ آئینے کے سامنے دیر دیر تک کھڑے اپنی صورت کیوں دیکھتے رہتے ہو؟

دل: میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ کیا میں شکل صورت سے بھی اتنا ہی بوڑھا لگتا ہوں جتنا عمر کے لحاظ سے ہوں۔

عقل: آخر یہ معلوم کرنے کی کوئی وجہ! دیکھو بڑے میاں خود کو دھوکا نہ دو۔ اصل بات یہ ہے کہ روحی تمھارے دل کو بھا گئی ہے اور یہ کوئی عجیب بات بھی نہیں کیونکہ مَردوں کو اکثر بڑھاپے میں جوان لڑکیوں سے عشق ہو جاتا ہے۔

دل: نہیں، یہ بات نہیں۔ سچ یہ ہے کہ مجھے اس لڑکی کی بے کسی پر اس سے ہمدردی پیدا ہو گئی ہے جیسے اپنے کسی عزیز یا دوست سے پیدا ہو جاتی ہے۔

عقل: نہیں، یہ وہ ہمدردی نہیں۔ اس کا نام ہے محبت، لگاوٹ! تم نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ تمھاری اور روحی کی عمروں میں کتنا فرق ہے، پینتیس سال کا، بڑے میاں پینتیس سال کا! اور یہ اتنی طویل مدت ہے کہ اس میں اپنی اولاد خود بڑی ہو کر صاحبِ اولاد بن جاتی ہے اور پھر تم نے یہ بھی سوچا کہ تمھارے متعلق فریقِ ثانی کا کیا خیال ہے؟ یہ سچ ہے روحی تمھارا بڑا احترام کرتی ہے، ہمیشہ نظریں جھکا کر تم سے بات کرتی ہے۔ ممکن ہے وہ تم کو ایک مخیّر، شریف، بزرگ، یا شاید اپنا باپ سمجھ کر ایسا کرتی ہو۔ اکثر لڑکیاں جو باپ کی شفقت سے محروم ہو جاتی ہیں ان میں انسیت کا یہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے جسے یہ بوڑھے لگاوٹ تصور کر لیتے ہیں مگر جب ان پر لڑکی کے اصلی جذبات عیاں ہوتے ہیں تو انھیں ایک دھچکے کے ساتھ اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے۔

اور حضرتِ دل سے اس کا کوئی جواب نہ بن پڑا۔

پیارے دوست! اس مکالمے سے تمھیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اس زمانے میں میرے دل پر کیا گزر رہی تھی بے شک میں روحی کو والہانہ طور پر چاہنے لگا تھا لیکن میں نے دل میں عہد کر رکھا تھا کہ میں کسی اشارے کنائے سے بھی روحی پر یہ بات ظاہر نہ ہونے دوں گا۔ روحی کے آنے سے پہلے میں بڑی پُرسکون زندگی بسر کر رہا تھا۔ شعر و ادب، موسیقی، مصوری میرے یہ مشاغل مجھے اپنی تنہائی کا احساس ہی نہ ہونے دیتے تھے اور میں اپنی زندگی سے پورے طور پر مطمئن تھا مگر جب سے روحی سے مجھے وابستگی پیدا ہوئی تھی، ان مشاغل

سے میری طبیعت اچاٹ سی ہو گئی تھی بس ایک خیال تھا جو میرے دماغ پر مسلط ہو گیا تھا، وہ یہ کہ میں تنہا ہوں، میں تنہا ہوں۔ مجھے برسوں پہلے کسی ایسے مونس کو تلاش کر لینا چاہیے تھا، جس سے اپنے دل کی بات کہہ سکتا، جو میرے دکھ درد میں شریک ہوتا، جس کی موانست میرے لئے راحتِ جاں ہوتی۔

جب سے روحی نے مجھے کھانا وغیرہ کھلانے کی خدمت اپنے ذمہ لی تھی۔ میں اس کے اسکول سے واپس آنے سے گھنٹوں پہلے اس کا منتظر رہنے لگا تھا، بلآخر جب وہ بنگلے میں داخل ہوتی تو میرے کان دور ہی سے اس کے سبک قدموں کی آواز کو سن لیتے۔ میں دل ہی دل میں تصور کرنے لگتا کہ اب وہ اپنے کمرے میں پہنچی ہو گی۔ اب اس نے اپنا بیگ میز پر رکھا ہو گا۔ اب اس نے لباس تبدیل کیا ہو گا۔ اب وہ باورچی خانے میں گئی ہو گی۔ اب وہ میرے کمرے کی طرف چلی ہو گی۔ اب وہ دروازے پر دستک دے گی: "سر کھانا کھا لیجئے" میرے اس اندازے میں صرف ایک آدھ منٹ ہی کا فرق ہوتا تھا۔ میں جب تک کھانا کھاتا رہتا وہ میرے آس پاس ہی کھڑی رہتی، ایک دو مرتبہ میں نے اس سے کہا بھی:

"روحی! تم بھی میرے ساتھ ہی کیوں نہیں کھانا کھا لیا کرتیں۔ اسکول سے آ کر تمہیں بھوک لگتی ہو گی۔" مگر اس نے انکار کر دیا۔

"نہیں سر! مجھے اسکول سے آ کر فوراً بھوک نہیں لگتی۔ آپ پہلے کھانا کھا لیجئے میں بعد میں کھا لوں گی۔"

رات کا کھانا بھی وہ خود ہی میز پر چنتی۔ مگر میرے اصرار کے باوجود وہ کھانے میں شریک نہ ہوتی، البتہ سہ پہر کی چائے ہم دونوں ایک ساتھ ہی پیتے، اور یہی وقت ہوتا تھا گفتگو کرنے کا۔ ہم کبھی شعر و ادب کی باتیں کرتے، کبھی پھول پودوں کی، کبھی موسموں کی، تبدیلیوں کی، میں اکثر بیچ بیچ میں خاموش ہو جاتا، اور وہ حیرانی سے میرے جواب کے انتظار میں میرا منہ تکتی رہتی۔ میں جلد ہی ہوش میں آ جاتا اور اپنے کو لعن طعن کرتا کہ میں نے ایسا

کیوں کیا، کیونکہ میں کسی طور بھی روحی کو اپنی حالتِ زار سے واقف ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

اسی طرح ایک مہینہ اور گزر گیا۔

اس دوران میں میری حالت پہلے سے بھی ابتر ہو گئی۔ میری صحت روز بروز گرنے لگی۔ مجھے کھانے پینے سے کچھ رغبت نہ رہی۔ دل ہر وقت بے چین رہنے لگا۔ راتوں کو دیر دیر تک جاگتا رہتا اور جب نیند آتی تو سوتے سوتے چونک چونک اٹھتا مگر میں نے روحی کو اپنی حالت سے کسی طرح خبردار نہ ہونے دیا۔ وہ میری کم خوری کی شکایت کرتی تو میں بدہضمی یا کوئی اور بہانہ کر کے ٹال دیا کرتا۔

کبھی کبھی مجھے اپنے پر غصہ بھی آتا کہ یہ مصیبت میں نے خود اپنے ہاتھوں مول لی ہے۔ مجھے نصیبن بوا کی بات پر کان نہیں دھرنا چاہیئے تھا۔ مجھے بڑی سختی کے ساتھ صاف صاف اس سے کہہ دینا چاہیئے تھا کہ بڑی بی جو تم چاہتی ہو یہ ممکن ہی نہیں وہ شاید کچھ ٹسوے بہاتی یا شاید کچھ دنوں چپ چپ رہتی یا شاید نوکری ہی چھوڑ دیتی میں یہ سب کچھ سہہ لیتا مگر روحی اس گھر میں نہ آنے پاتی اور میں اس مصیبت میں گرفتار نہ ہوتا۔

اپنی اس محرومی و مایوسی کی زندگی میں اچانک ایک نیا جذبہ میرے دل میں بیدار ہونا شروع ہوا اور یہ تھا غم کھانے کی لذت کا جذبہ۔ اس لذت نے جلد ہی ایک نشے کی سی صورت اختیار کر لی۔ اپنی پُرسکون زندگی میں میں شاید دس یا پندرہ سال اور زندہ رہتا۔ یہاں تک کہ موت آ کر مجھے ہمیشہ کی نیند سلا دیتی مگر یہ کیسی حسرت و افسوس کی بات ہوتی کہ میں اس لذتِ غم سے ہمیشہ نا آشنا ہی رہتا۔ میری یہ محرومی و مایوسی کی زندگی، میری گزشتہ پُرسکون زندگی سے اس لحاظ سے بہتر تھی، کہ ہر چند ناکام ہی سہی مگر دل میں تمنائیں تو پیدا ہوتی ہیں، ولولے تو اٹھتے ہیں۔ اپنی حرماں نصیبی سے یوں سمجھوتہ کر لینے کے بعد میرے دل کی بے کلی بڑی حد تک دور ہو گئی اور میں نے اسے اپنا مقدر سمجھ کر تسلیم کر لیا۔

اب جاڑوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ موسلا دھار بارش جو ہوئی تو اس کے تھمتے ہی سردی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ اسی زمانے میں ایک رات میں اپنی خوابگاہ میں سو رہا تھا کہ کوئی تین بجے کے قریب میری آنکھ کھل گئی۔ غسل خانے میں گیا مگر بے احتیاطی سے خود کو کسی گرم چادر میں نہیں لپیٹا۔ گرم گرم لحاف سے نکلا تھا، اچانک ہوا لگ گئی۔ پلنگ پر واپس آیا تو میری آنکھوں سے پانی جاری تھا۔ سانس کچھ پھولا ہوا تھا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے پانچ چھ چھینکیں آئیں۔ میں نے لحاف میں سر کو چھپا لیا مگر اس سے اور دم گھٹنے لگا۔ منہ باہر نکالا تو آنکھوں کے ساتھ ناک سے بھی پانی بہنے لگا۔ سخت گھبراہٹ ہونے لگی، سانس لینا دشوار ہو گیا مگر میں نے جیسے تیسے رات کا بقیہ حصہ کاٹ ہی لیا۔

صبح کو نصیبن بوا آئی تو میری یہ حالت دیکھ کر بہت گھبرائی، دوڑی دوڑی جا کر روحی کو بلا لائی۔ وہ بھی مجھے اس حال میں دیکھ کر سخت پریشان ہوئی۔ اس نے اسی وقت لبادہ اوڑھا اور گھر سے نکل گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ شہر کے ایک مشہور ڈاکٹر کو لے کر آ گئی۔ ڈاکٹر نے میری نبض دیکھی، میرے سینے کا معائنہ کیا اور فوراً ایک انجکشن لگایا۔ کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے انھیں سخت نمونیہ ہو گیا ہے، بہت احتیاط کرنی ہو گی۔ دیکھ بھال کے لئے ایک نرس کی بھی ضرورت ہو گی ...''

روحی فوراً بول اٹھی: ''میں خود ان کی نرسنگ کروں گی۔ میں نے کالج کے زمانے میں نرسنگ کا ابتدائی کورس بھی پاس کر لیا تھا۔ میں ٹیکہ لگانا بھی جانتی ہوں۔''

میں اس وقت تیز بخار میں پھنک رہا تھا۔ مجھ پر نیم بیہوشی کی کیفیت طاری تھی۔ میں سب کچھ سن رہا تھا، مگر مجھ میں بولنے کا یارا نہ تھا۔

ڈاکٹر نے کئی دوائیں اور انجکشن تجویز کئے جنھیں لانے کے لئے روحی ڈاکٹر کے ہمراہ ہی چلی گئی۔ اس دن وہ اسکول نہیں گئی۔

پیارے دوست! اس قصے کو کہاں تک طول دوں۔ مختصر یہ کہ میں کوئی دو ہفتے تک

بستر پر پڑا رہا۔ اس دوران میں روحی نے دل و جان سے میری تیمار داری کی، وہ اپنا زیادہ تر وقت میرے ہی کمرے میں گزارتی، وقت پر مجھے دوائیں پلاتی، اور بڑی احتیاط سے انجیکشن لگاتی تاکہ مجھے کم سے کم تکلیف ہو، اس نے اسکول سے دو ہفتوں کی چھٹی لے لی تھی، سچ یہ ہے کہ یہ اس کی خدمت گزاری ہی تھی جس نے اس مہلک مرض سے میری جان بچائی۔

بیماری کے دوران میں جب مجھے کچھ کچھ افاقہ ہونے لگا تو جب کبھی میں اس کی طرف دیکھتا، اس کے ہونٹوں پر ایک دلآویز مسکراہٹ نمودار ہوتی جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں سمجھتا ہوں یہ مسکراہٹ دواؤں سے کہیں زیادہ زود اثر ثابت ہوئی اور میں جلد جلد اچھا ہونے لگا۔

اگرچہ اب میں غسل خانے میں خود اُٹھ کر جانے لگا تھا مگر میری کمزوری کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر نے دو تین دن تک اور بستر پر آرام کرنے کی ہدایت کی تھی۔

ایک دن شام کو روحی میری دوائیں وغیرہ خریدنے بازار گئی تو مجھے بستر پر لیٹے لیٹے وحشت سی ہونے لگی۔ میں بستر سے اٹھا اور چھڑی کے سہارے آہستہ آہستہ گھر میں اِدھر اُدھر چلنے پھرنے لگا۔ میں لائبریری میں بھی گیا جہاں پچھلے پندرہ روز سے میں نے قدم نہیں رکھا تھا۔ میں شیلفوں پر نظر ڈال رہا تھا کہ لائبریری کی بڑی میز پر مجھے سیاہ رنگ کی ایک کتاب نظر آئی۔ یقیناً میری لائبریری کی کوئی کتاب اس سے ملتی جلتی نہ تھی، بلاشبہ یہ کتاب روحی ہی کی ہو سکتی ہے۔ میں اسے میز سے اٹھا کر اس کے ورق الٹنے لگا۔ یہ روحی کی ڈائری تھی جس میں وہ روزمرہ کے واقعات پر اپنے تاثرات لکھا کرتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے میری دوائیں لانے کی جلدی میں وہ اسے یہیں بھول گئی۔

پیارے دوست! پہلے تو مجھے خیال آیا کہ اسے وہیں میز پر جوں کا توں رکھ دوں کیونکہ کسی کی پرائیویٹ تحریر کو پڑھنا سخت اخلاقی جرم ہے، لیکن میرے دل میں روحی کی محبت کا جوش بھڑک رہا تھا۔ اس نے مجھے اخلاقیات سے بے پرواہ بنا دیا میں وہیں میز کے قریب کرسی

پر بیٹھ گیا اور اس کی ڈائری کے اوراق الٹنے پلٹنے لگا۔ بعض تاثرات میرے لئے موجب حیرت تھے۔ اس ڈائری کے چند اقتباسات یہاں درج کرتا ہوں:

خدا کا شکر ہے کہ آخر مجھے سر چھپانے کو جگہ مل گئی۔ اگر نصیبن بوا میری مدد نہ کرتیں تو میرا کیا حشر ہوتا، یہ سوچتے ہوئے بھی دل کانپنے لگتا ہے۔

میں اس گھر میں کتنی خوش ہوں۔ صاحب کا کتب خانہ کتنا بڑا ہے! کیسی کیسی نادر کتابیں اس میں موجود ہیں جن کو پڑھنے کو میرا دل تڑپتا ہے۔ صاحب نے کیسی فراخ دلی سے ان کتابوں کو پڑھنے کی اجازت دے دی ہے لیکن میں یہاں اپنی عارضی رہائش کے دوران آخر کتنی کتابیں پڑھ سکوں گی!

صاحب کتنے خوش اخلاق، شریف الطبع اور نیک نفس ہیں۔ ان کا مطالعہ کتنا وسیع ہے۔ انھوں نے کیسی خوبی سے ان الجھنوں کو دور کر دیا ہے جو دوستوافسکی کے ناول ''احمق'' کے پڑھنے سے میرے دل میں پیدا ہو گئی تھیں۔

وہ شارٹ ہینڈ جاننے والی لڑکی دوستوافسکی سے پچیس تیس سال چھوٹی تھی، پھر بھی وہ اس سے محبت کرنے لگی۔ کیا محبت کا تعلق عمر سے بھی ہوتا ہے؟ کیا صرف ہم عمر ہی ایک دوسرے سے محبت کر سکتے ہیں؟

میں صاحب کی بیماری میں اُن کی جو خدمت کر رہی ہوں، یہ اُس احسان کا بدلہ نہیں ہے جو صاحب نے اپنے ہاں پناہ دے کر مجھ پر کیا ہے۔ اس میں انسانی ہمدردی کو بھی زیادہ دخل نہیں ہے، تو کیا دوستوافسکی کی اُس شارٹ ہینڈ جاننے والی لڑکی کی طرح میرے

خیالات بھی ڈانواں ڈول ہو رہے ہیں ....؟

میں نے ڈائری بند کر دی اور اُسے اسی جگہ میز پر رکھ دیا جہاں سے میں نے اٹھایا تھا۔
اگلی صبح رُوحی کو نوکری پر اسکول جانا تھا کیونکہ اُس کی دو ہفتے کی چھٹی ختم ہو چکی تھی۔ جب وہ مجھے دوا پلا کر جانے لگی تو میں نے دل کو مضبوط کر کے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے کہا:
"رُوحی! اب تمہیں کبھی اسکول جانے کی ضرورت نہ ہو گی۔"
وہ پہلے تو کچھ دیر حیرانی سے میرا منہ تکتی رہی، پھر رفتہ رفتہ اُس کے ہونٹوں پر وہی دلآویز مسکراہٹ پھیلنے لگی جس کا مشاہدہ میں نے بیماری کے دَوران میں کیا تھا۔
دو ماہ کے بعد ہماری شادی ہو گئی۔
دوست، یہ نہ سمجھنا کہ میں نے شادی سے پہلے اُس کی ہر طرح رضامندی حاصل نہیں کر لی تھی۔ میں نے تو اُسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ میں اُس سے عمر میں پینتیس سال بڑا ہوں اور یہ کہ میری بیٹی عُمر میں اُس سے بھی کئی سال بڑی ہے۔
اُس نے کہا:
"سر! عُمر میں چھوٹا بڑا ہونا کوئی بات نہیں۔ سچی خوشی کی چند گھڑیاں 'عُمر بھر کی طویل، بے کیف اور پُر مصائب زندگی سے لاکھ درجہ بہتر ہیں۔"
ہم نے دو سال بڑی محبت در فاقت میں گزارے۔ ہم شہروں شہروں گھومتے پھرے۔ اس دوران میں اس کا حُسن پہلے سے بھی زیادہ نکھر آیا تھا اور میں پھر ایک بچّی کا باپ بن گیا تھا۔
لیکن پیارے دوست! میری زندگی کا یہ عجیب المیہ ہے کہ ازدواجی زندگی مجھے راس نہیں اور میری قسمت میں ہمیشہ تنہا رہنا ہی لکھا ہے۔ ایک صبح رُوحی اچانک نہ جانے کس طرح ایک پُر اسرار مرض وائرس کا شکار ہو گئی اور پھر چند ہی گھنٹوں میں میرے اور ڈاکٹروں کے دیکھتے دیکھتے اُس نے دَم توڑ دیا۔ موت کے وقت بھی اُس کے ہونٹوں پر اُس کی مخصوص

دلآویز مسکراہٹ تھی۔

جیسا کہ عابدہ کے مرنے پر میں نے اپنے ہاتھوں اپنا خاتمہ کر لینے کا ارادہ کیا تھا مگر پھر سلیمہ کے خیال نے مجھے زندہ رہنے پر مجبور کیا تھا بالکل اسی طرح روحی کی موت پر بھی میرے دل میں زندہ رہنے کی کوئی تمنا نہ رہی تھی مگر ننھی یاسمین نے مجھے خودکشی کے خیال سے باز رکھا۔ وہ اس حادثے سے بے نیاز، جو اس پر گزرا تھا، ہنستی، کھلکھلاتی میری گود میں آ کر بیٹھ گئی۔

روحی کی موت کو اب سات برس گزر چکے ہیں اور یاسمین، جس کی عمر اب آٹھ برس ہے، میرے دل کی راحت اور میری آنکھوں کا نور ہے۔

فقط

تمھارا۔۔۔

ہماری نئی کتابیں ۲۰۰۰ـ۱۹۹۹

- **نیلی چھتری** — ظفر عمر
  اردو زبان کا مشہور جاسوسی ناول
- **سیر کر دنیا کی** — رضیہ فصیح احمد
  امریکہ کا سفر نامہ
- **افسانہ آدمی ہے** — بشریٰ رحمٰن
  افسانوں کا مجموعہ
- **حرف شناسائی** — ادا جعفری
  تازہ مجموعہ کلام
- **فکرِ ایاز** — ترتیب آصف فرخی
  شیخ ایاز شخص اور شاعر
- **ذکرِ ایاز** — ترتیب آصف فرخی
  شیخ ایاز شخصیت اور فن
- **ساہیوال جیل کی ڈائری** شیخ ایاز — ترجمہ کرن سنگھ
- **ن۔م۔ راشد۔** — ڈاکٹر آفتاب احمد
  شاعر اور شخص
- **میزانِ نثر** (جلد اول، دوم، سوم) — ترتیب لطیف الزماں خاں
  مضامین رشید احمد صدیقی